ماہنامہ سرگزشت

فروری 2016

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بےحرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 26 ❖ شمارہ 01 ❖ فروری 2016ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی ہاشمی	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

آج دل کر رہا ہے کہ ایک کہانی سناؤں۔ بہت چھوٹی سی کہانی ہے۔ ایک صاحب نے موبائل ریپئرنگ کی دکان کھول رکھی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ دکان بند کرنے ہی والے تھے کہ ایک گاہک آگیا۔ اس نے موبائل آگے بڑھا کر کہا کہ یہ آن نہیں ہو رہا ہے۔ ان صاحب نے موبائل ہاتھ میں لیتے ہی کہا، چیک کرنے کی فیس تین سو روپے ہے۔ گاہک راضی ہو گیا۔ ان صاحب نے موبائل کھولا اور خامی ایک نظر میں پکڑلی۔ انہوں نے نہایت پھرتی سے موبائل کے مائیک کا اسکرو ڈھیلا کیا اور مائیک کو دراز میں گرالیا۔ ننھا سا پرزا گاہک کو کیسے نظر آتا کہ کب وہ دراز میں گرا۔ ان صاحب نے موبائل کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ایل سی ڈی اڑ گئی ہے۔ پاور سسٹم بیٹھ گیا ہے۔ کل ملا کر چار سے پانچ ہزار کا خرچ آئے گا۔ اتنی رقم میں بالکل نیا سیٹ مل جائے گا۔ یہ دیکھیے بالکل ایسا ہی سیٹ، قیمت صرف ساڑھے تین ہزار۔ چائنا کا ہے اس لیے سستا ہے۔ ان صاحب نے اپنا موبائل واپس لیا۔ ساڑھے تین ہزار میں نیا سیٹ خریدا چیکنگ کی فیس تین سو روپے دی۔ روپے لے کر ان صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دکان بند کرتے کرتے بھی چیکنگ کے تین سو، مائیک پانچ سو تک بک جائے گا وہ اور ایک ہزار نئے سیٹ پر منافع مل گیا۔ اس نے دکان بند کی اور برابر والے آصف کی دکان پر پہنچا۔ وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے اس لیے رات میں ساتھ ہی نکلتے۔ آصف نے کپڑوں کی تہ لگاتے ہوئے کہا ایک محترمہ نے جان کھالی تھی۔ جو کپڑا دکھاؤ وہ اس کی سو دو سو قیمت کم لگاتی۔ بڑی مشکل سے تین سو روپے میٹر والا پانچ سو روپے میٹر پر تھمایا۔ دونوں نے قہقہہ لگایا اور دکان کو تالا لگا کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑے۔ رکشے والے سے پوچھا کہ نیو کراچی چلو گے۔ رکشے والے نے اثبات میں سر ہلا کر کہا لیکن تین سو لوں گا کیونکہ آج سی این جی بند ہے رات بھی زیادہ ہو رہی ہے خالی آنا ہوگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بڑبڑانے لگے۔ "ہر ایک نے لوٹ مچا رکھی ہے، کیا ہوگا اس ملک کا۔" رکشا ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ دو بائیک سواروں نے انہیں روک لیا۔ پستول دکھا کر ان کے پرس اور موبائل چھین لیے ان دونوں نے اپنے خریداروں کو لوٹا تھا، رکشا والے نے سی این جی کی بندش کے بہانے ان کو لوٹا اور ڈاکوؤں نے سرِ راہ ان تینوں کو ہر چیز سے محروم کر دیا۔ جو، جیسے آیا تھا، ویسے ہی چلا گیا۔

بالکل یہی کچھ تو ہو رہا ہے پھر ہم کہتے ہیں کہ ملک بھر میں لوٹ مچی ہوئی ہے لیکن اپنا احتساب نہیں کرتے کہ اس لوٹ کا ذمہ دار کون ہے؟

معراج رسول

عکسِ داستاں

مغربی پنجاب کا ضلع گورداس پور مسلم اکثریتی ضلع تھا اس ضلع میں ایک قدیم تاریخی شہر ہے بٹالہ جس کے چپے چپے سے مسلم تاریخ کے آثار جھلکتے تھے۔ یہاں آباد تمام کے تمام خاندان اپنی ایک تاریخ رکھتے تھے۔ انہی خاندان میں ایک خاندان مفتیوں کا بھی تھا۔ شہنشاہی کے دور میں اس خاندان کے کسی بزرگ کو مفتی کا خطاب عطا ہوا تھا تب سے یہ لاحقہ اس خاندان کے لیے ضروری ہوگیا تھا۔ اسی خاندان میں 12 ستمبر 1905ء میں اس نے جنم لیا۔ گھرانہ پرانی اقدار کا پجاری تھا۔ ماضی میں جینے والے لوگ تھے۔ گھر کا ہر فرد "پدرم سلطان بود" کی رٹ لگا نا وتیرہ بنائے ہوئے تھا۔ اس کے دادا کا انتقال عین جوانی میں ہوگیا تھا۔ اس لیے اس کے والد کی پرورش اس کے دادانے کی۔ باپ اور دادا کی پرورش کے انداز میں ایک نمایاں فرق آجانا ضروری ہے۔ والد کے پرداخت میں کڑا تیور ضروری ہے جب کہ دادا کے اندازِ پرورش میں رحم و درگزر کا جذبہ غالب رہتا ہے۔ یہی اس کے والد کے ساتھ ہوا۔ دادا نے درگزر کا فیاضانہ رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے والد کے مزاج میں رنگینی کا عنصر کچھ زیادہ ہی در آیا۔ رنگ روپ کی محفلوں میں وقت گزرتا مگر انتہائی احتیاط کے ساتھ یہ راز کسی پر آشکار نہ ہوجائے اس کا خاص خیال رکھا جاتا۔ بیوی گھر میں راہ تکتی رہتی۔ ان حالات میں وہ پیدا ہوا۔ 1905ء میں اس کی ولادت ہوئی تھی اور 1910ء تک وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگا تھا۔ احساس کے آئینے میں اپنا تجزیہ کرنے پر قادر ہوگیا تھا۔ تب تک وہ گھر میں رہتے ہوئے بھی خود کو گھر سے دور محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی نظروں میں گھر وہ تھا جہاں اس کے والد اور نئی امی رہتی تھیں۔ وہ تو اپنی ماں اور بڑی بہن کے ساتھ باہر بنے کمروں میں سے ایک میں رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا بن گیا تھا۔ گلی میں ہم عمر بچوں کی فوج چیخم دھاڑ مچائے رکھتی، طرح طرح کے کھیل کھیلتی لیکن یہ ان میں شامل نہ ہوتا، گلی میں جانا تو درکنار ضرورت کے علاوہ اندرونِ خانہ بھی نہ جاتا۔ والد گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس لیے اسے بھی وہیں داخل کیا گیا تھا۔ پڑھنے میں بھی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مارے باندھے پاس نمبر لیتا ہوا میٹرک تک جا پہنچا۔ میٹرک کے بعد اسے اسلامیہ کالج لاہور بھیجا گیا۔ وہاں بھی فطرت میں چھپی ازلی جھجک آڑے آئی۔ وہاں سے انبالہ کے بی ڈی پی ایم کالج اور اس کے بعد ہندو مہا سبھا کالج امرتسر چلا آیا۔ 1927ء میں وہ پھر سے اسلامیہ کالج لاہور آگیا۔ تھرڈ ایئر مکمل کرنے کے لیے 1929ء میں اس نے بی اے کرلیا۔ تعلیم سے فارغ ہوا تو پہلی جنگِ عظیم کا سانحہ ایک نئے روپ میں پھن کاڑھے سامنے کھڑا تھا۔ پوری دنیا مالی انحطاط کے زد میں آئی ہوئی تھی۔ دفتروں میں تخفیف کا کلہاڑا چل رہا تھا۔ نئی نوکریاں ناپید تھیں۔ وہ اسٹینو گرافر کی حیثیت سے کمشنر راولپنڈی کے دفتر میں لگ گیا لیکن یہ ملازمت بغیر تنخواہ والی تھی۔ تنخواہ والی ملازمت کے لیے اس نے سینٹرل ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس دوران اس نے مطالعہ میں بھی دلچسپی لینا شروع کردی۔ ادب کی رنگینی پسند نہ آئی تو سنجیدہ مضامین میں دلچسپی لی۔ برٹرینڈرسل، ہالڈین، نطشے، برگساں، فرائیڈ کو خوب پڑھا۔ 1931ء میں سینٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہوا تو انحطاط کا عفریت مزید بھیانک ہوچکا تھا۔ پروفیسر کی تنخواہ 65 سے 120 روپے تک گرچکی تھی۔ پھر بھی اس نے تدریس کو پیشہ بنائے رکھا۔ انہی دنوں اس کی دوستی نذر محمد راشد سے ہوئی۔ راشد نخلستان نامی جریدہ مرتب کررہے تھے اور ن م راشد کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے اس سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی اس نے فرمائش کا تدنظر رکھتے ہوئے اردو فلم ڈبلن پر طنزیہ مضمون لکھا۔ وہ مضمون ہیڈ ماسٹر کی نظروں سے گزرا تو انہوں نے گوجرہ ہائی اسکول کے سالنامے کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ بس اس نے گھر کے موضوع پر افسانہ "الجھاؤ" لکھ دیا۔ ادبی دنیا ایک معروف جریدہ تھا اس کے ایڈیٹر کی نظروں سے افسانہ گزرا تو اس نے افسانے کی فرمائش کریں۔ 1936ء میں پہلا افسانہ "جھکی جھکی آنکھیں" چھپا۔ اس زمانے میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، فیاض محمود بیدی کے افسانے خوب چھپ رہے تھے۔ منٹو روسی افسانوں میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ غلام عباس گاہے گاہے لکھتے تھے اور یہ سب ادب برائے ادب کے قائل تھے۔ پھر ترقی پسندی کا شہرہ ہوا۔ قاسمی، حسن عسکری، احمد عباس، اپندر ناتھ اشک میدان میں آگئے۔ اسی دوران چوہدری برکت علی نے اس کا پہلا مجموعہ "ان کہی" شائع کیا۔ اسے اتنا پسند کیا گیا کہ پے در پے چار مجموعے طبع ہوئے۔ 1945ء میں اس نے محکمۂ تعلیم چھوڑ دیا اور ریڈیو میں ملازمت کرلی۔ 1947ء میں اپنی فلمی کہانی "سلطانہ رضیہ" فلمانے بمبئی چلا گیا مگر تقسیم کی وجہ سے واپس آگیا۔ کبھی فوج میں کبھی ریڈیو آزاد کشمیر میں تو کبھی محکمۂ اطلاعات میں نوکری کرتا رہا۔ اسی دوران اس نے اپنا معرکۃ الآرا ناول علی پور کا ایلی پیش کردیا۔ جی ہاں یہ اسی ممتاز مفتی کی داستان ہے جسے علی پور کا ایلی نے امر کردیا ہے۔ جو کچھ حد تک خود اس کی داستان کا عکس بھی ہے۔

☆عبدالجبار رومی انصاری نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''اور تمہارے بس میں کردیا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (القرآن)۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بہت سی نشانیاں رکھی ہیں جو بے حد پُراسرار بھی ہیں اور نہایت دلچسپ بھی اور ایسی نشانیاں کسی نہ کسی واقعہ یا کسی اتفاق کی صورت میں سامنے آتی رہتی ہیں اور ایسی پُراسرار اور دلچسپ چیزیں ہمیشہ ہی تجسس اور بے چینی میں مبتلا رکھتی ہیں ہر مذہب معاشرہ اور ہر تہذیب میں کسی نہ کسی طرح غیر مرئی وجود سے متعلق کوئی نہ کوئی تصور ضرور موجود ہوتا ہے اور انسان کا ایسی چیزوں سے سخت خوف زدہ ہونا ایک فطری عمل ہے لیکن اس کے باوجود ان سب کے بارے میں، جو بھی پُراسراریت قائم کرتی ہے، کے بارے میں جاننے کی خواہش سے انسان کبھی بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا۔ آج کے دور میں بھی ایسے واقعات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں کہ جنہیں سن کر یا دیکھ کر ہی پتا پانی ہوجائے۔ سرگزشت کا پُراسرار نمبر بھی بھرپور معلومات، واقعات اور مناظر قارئین کے ذہنوں میں انمٹ نقوش چھوڑ جائے گی۔ کاشف زبیر کی کہانی ''سراب'' تو پہلے ہی بہت پُراسرار ہے۔ جو ایسے جانوروں، لوگوں کے درمیان گھومتی زبردست تحریر ہے۔ جس کے واقعات پڑھ کے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ رشین سیاح جس ''نادیدہ عفریت'' کی بھینٹ چڑھے وہ بھی ایک پُراسرار معما ہی بن گئے کہ جن کی موت کا سبب معلوم کرنے والوں کی عقل نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ میں نے پڑھا تھا جس میں ترین سو سال پرانی ممی کی تحقیق کرنے سات افراد جاتے ہیں اور وہ سب کے سب خوف ناک موت کا شکار ہوجاتے ہیں۔ دوسری سچ بیانی بھی ٹھیک رہی۔ معمولی سی سرسراہٹ نے ذہن میں وہ جو پراسرار اور خوفناک فلمیں دیکھ رکھی تھیں انہی کا ڈر جگا دیا اور سویرا بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ تیسری سچ بیانی ''خواب یا سچائی'' بھی کافی دلچسپ رہی۔ ضلع قصور میں ایک مسجد واقع ہے جو جنوں والی مسجد کہلاتی ہے اس کے متعلق بھی کافی پراسرار باتیں مشہور ہیں۔ ''انسان نما'' بھی یاپئی کو دیکھنے کے بے شمار واقعات ملتے ہیں لیکن سبھی میں یہی کہا گیا کہ وہ ریچھ یا گوریلا بن مانس کی طرح کا کوئی جانور ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا۔ ''خون آشام'' واقعی عجیب قصہ تھا جس کو پڑھ کے ہی جھرجھری سی آنے لگی۔ بھیڑیوں نے دو انسانی بچوں کو پالا اور پھر ان میں بھی ویسی ہی اپنی جیسی جبلت بھر دی کہ وہ خون آشام بن گئے۔ ''ننھے شیطان'' بھی کافی حیران کن تحریر تھی، اللہ ہی بہتر جانتا ہے اس طرح کے چھوٹے بچوں میں ایسی کون سی قوت ہوتی ہے جس کی بنا پر انہیں ماضی یا مستقبل کے واقعات کا علم ہوجاتا ہے اور یہی باتیں بڑوں کو حیران کن خوف میں مبتلا کردیتی ہیں۔ ''خوف ناک فلمیں'' تو کہانیاں پڑھنے سے بھی زیادہ ڈر خوف پیدا کرتی ہیں ایسے ایسے سین کہ دل دہل جائے اور کمزور دل حضرات تو اس کی تاب بھی نہیں لاسکتے۔ ''پردۂ اسرار'' میں خواجہ شمس الدین عظیمی سے متعلق بیش بہا معلومات پڑھنے کو ملیں جو کائنات کے اسرار پر بھی ایسی گہری نظر رکھتے تھے کہ ان کے دیے ہوئے فارمولے سائنس اور روحانیت کو یکجا کرتے نظر آتے۔ بے شک وہ ایک بڑی شخصیت تھے جن کا فیض آج بھی روحانی اور شعور قلندر کی صورت میں جاری ہے۔ ''توہم پرستی'' واقعی لایعنی ہے۔ فضول سے اعتقاد بنے ہوتے ہیں لیکن سمجھ نہیں آتا جب کوا بولتا ہے گھر کی منڈیر پر تو پھر مہمان کیوں آجاتے ہیں۔ ''زومبی'' صرف خوف اور دہشت کی علامت، جن کا ہمارے ہاں کوئی وجود ہی نہیں صرف فلموں کی حد تک ایک تفریح ہے۔ ''مقاماتِ خوف'' بھی عمدہ تحریر تھی ایسے مقامات تو ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ خود ہمارے ساتھ ایسے کئی واقعات ہوچکے ہیں، دلچسپی کے لیے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ میں اور چھوٹا بھائی شام کے وقت ریل کی پٹڑی پر بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ بہت دور سے ایک روشن نقطہ نظر آیا جو آہستہ آہستہ بڑا ہورہا تھا اور قریب آرہا تھا۔ وہ ایک ویران جگہ تھی اور تھوڑی دور ہماری فیکٹری کا گیٹ تھا جہاں ہم کام کرتے تھے، ہم نے سمجھا شاید ٹرین آرہی ہے لیکن وہ جس طرح قریب آرہا تھا اور بڑا ہورہا تھا اس

نے ہمارے رونگٹے کھڑے کردیے کیونکہ وہ ایک بڑے شعلے کا روپ دھار چکا تھا اور سیدھا ہماری طرف آرہا تھا۔ بس پھر ہمارے تو پسینے چھوٹ گئے اور بھاگم بھاگ فیکٹری گیٹ پر جاکے دم لیا اور پیچھے مڑ کے دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سرگزشت کا یہ پُراسرار نمبر پڑھا بہت ہی اچھا لگا جو مدتوں یاد رہے گا۔ منظر امام کے مطابق ایسے دلچسپ اور پُراسرار مقام تو تقریباً ہر جگہ ہی ہوتے ہیں اگر سنی سنائی باتوں پر جانے کی بجائے ہم خود بھی اس پر غور و فکر اور تحقیق کریں تو بہت سے غیر معمولی انکشافات ہم پر وا ہو سکتے ہیں اور کسی بھی چیز کی کھوج کرنا ایک دلچسپ عمل ہے اور ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی ملتی ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔''

☆اعجاز حسین سٹھار کی آمد نور پور تھل سے۔ ''پُراسرار نمبر دیکھ اور پڑھ کر اس کے مضامین اور کہانیوں کا حصہ بن گئے۔ ہر سلسلہ تحیر میں ڈوبا ہوا۔ کچھ دنوں تک شاید یہ کیفیت ہر قاری پر طاری رہے۔ بہت ہی عمدہ رہا۔ حسبِ روایت ''جنوری کی شخصیات'' خاصے کی چیز رہی۔ اس بار منٹو، ذوالفقار علی بھٹو، خان عبدالغفار، چوہدری شجاعت، سلطان راہی، ظفر اللہ جمالی، ایدھی، واصف علی، پیر پگارا اور قرۃ العین حیدر کے متعلق پڑھ کر کئی نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' یہ سلسلہ بڑا مزہ دے رہا ہے۔ ''سراب'' کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے کہ اسے تسلسل اور روانی سے جاری رکھا جائے تو اعتراضات خود بخود دم توڑ جائیں گے اور کہانی کی مقبولیت بڑھے گی۔ اب سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''چھوٹا سا کام'' ایک بڑے کام کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور رابعہ کی زندگی کی مشکل آسان ہوئی اور اسے گویا منزل مل گئی وگرنہ ارشاد ایک نادیدہ بلا کی طرح اس کے وجود سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ ''سرسراہٹ'' جیسی کیفیت زندگی کے کسی لمحے ہر انسان کی ہو جاتی ہے۔ وہم کے ساتھ حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کیونکہ یہ حالت عارضی اور لمحوں پر محیط ہوتی ہے اس سے نکلنے کے لیے کلام الٰہی کی جو آیت یاد ہو یا درود اور کلمہ شریف کا ورد شروع کردیا جائے تو میں یقین سے کہتا ہوں، دلی سکون حاصل ہوگا۔ ''خواب یا سچائی'' میں اس بحث میں نہیں جاتے کہ حقیقت کیا ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ندیم کسی بڑے نقصان سے بچ گئے۔ ''خانہ خالی'' خوشگوار احساس پیدا کرنے والی کہانی ہے۔ ''دہشت کدہ'' طویل، دہشت ناک ہونے کے ساتھ دلچسپ روداد ہے۔ تسلسل اور روانی انتہا کو چھو رہی ہے۔ انسان کبھی ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے کہ بے بسی اور لاچارگی میں اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں لوگوں کے لیے تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ سب دوستوں کو سلام اور نیا سال مبارک ہو۔ عمران خان ڈھیلی نامدار ضلع بھکر سے التماس ہے کہ وہ اپنی حاضری یقینی بنائیں۔ یوسف سانول کہاں کھو گئے ہو۔''

☆محمد سلیم قیصر نے سینٹرل جیل ملتان سے لکھا ہے۔ ''معراج رسول صاحب آپ کی باتیں ہر پڑھنے والے کو افسردہ کرتی ہیں۔ آپ نے درست فرمایا شاید اسی سلسلے کی کڑی ہو، ہر تیسرے چوتھے روز خبر پڑھنے کو ملتی ہے کہ فلاں شہر میں فلاں جگہ زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے۔ اللہ امت مسلمہ کو کامل ہدایت بخشے، ہماری غلطیوں کو درگزر فرمائے۔ اللہ ہم سے راضی ہو۔ ''شہنشاہ اسرار'' بہت خوبصورت لگی۔ ''معبرِ خیال'' میں کرسیٔ صدارت پر براجمان ناصر حسین رند کا انداز خوب بھایا۔ مبارک ہو جناب۔ تبصروں میں بشمول ناصر حسین رند، فلک شیر ملک، ایم عمران جونانی، صائمہ نور، اویس شیخ، مرزا طاہر الدین بیگ، نذیر احمد راجپوت، بہن سدرہ بانو ناگوری، عبدالحکیم ثمر، آفتاب احمد نصیر اشرفی، احمد خان توحیدی، شاہد جہانگیر، بہن سلمیٰ اعوان، نزاہت افشاں، بہن نجمی رحمٰن، وکیل الرحمٰن، عامر کریم، انور عباس شاہ، خالد محمود، عبدالباسط سومرو، عارف شیخ اور اکبر بخاری کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ محترمہ سمیرا ساجد کا تبصرہ اور باتیں بہت پسند آئیں۔ محترمہ نجمی رحمٰن آپ نے پردیس میں بیٹھ کر ہمارے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا بہت شکریہ۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے بھاگتے بھاگتے حاضری لگوائی کچھ تو اور بھی لکھا ہوتا۔ پہلی بار ''معبرِ خیال'' کا حصہ بننے والے معزز بھائیوں، بہنوں اور بڑوں سے اپیل کروں گا کہ لکھتے رہا کریں کیونکہ آپ سب قارئین بہت اچھے ہیں، اچھے خیالات کے مالک ہیں اور اچھا لکھتے ہیں۔ محترمہ سمیرا ساجد کے تبصرے میں ایک لفظ مجھے ایسا اچھا لگا کہ مجھے میرا ماضی یاد آگیا۔ اس بار جناب منشی عزیز اور قابلِ عزت باجی گل اور بہن بشریٰ افضل غیر حاضر ہیں اللہ کرے سب خیر ہو۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ لگتا ہے روٹھ چکی ہیں انہیں منانے کا Task باجی گل کے سپرد۔''

☆فلک شیر ملک کی آمد شاہ گڑھ رحیم یار خان سے۔ ''جاسوسی پبلی کیشنز سے میرا ایسا رشتہ ہے جیسے جسم و روح کا۔ عرصہ تیس سال سے رسائل پڑھ رہا ہوں اور اب خط اور تحریریں لکھنی شروع کی ہیں مجھے تو اپنے خط میں کوئی خاص کمی نظر نہیں آئی۔ شمارے کی ہر تحریر کی ایک ایک سطر پڑھ کر تبصرہ لکھتا ہوں مگر جانے کیوں کرسیٔ صدارت پر جگہ نہیں ملی اور نہ کوئی تحریر چھپی۔ (ہر بار کے پہلے خط کو بہ نظر غور پڑھیں، اہم بات ضرور نظر آجائے گی۔ پہلا خط نسبتاً مختصر مگر جامع الفاظ کی ندرت کا حامل ہوتا ہے)۔ دسمبر کے سرگزشت میں میرے خط کے جواب میں کہا گیا تھا کہ میری دو تحریریں چھپی ہیں مگر نظر تو کہیں نہیں آئیں۔ کس رسالے میں شائع ہوئی ہیں اور کون سی

ہیں پلیز وضاحت کردیجیے گا (سہواً ڈاکٹر مبشر ملک کا جواب آپ کے خط میں شامل ہوگیا)۔ پُراسرار نمبر تقریباً بہتر ہی رہا۔ معلومات کے لحاظ سے زبردست تھا۔ باقی رہی بات پراسرار کہانیوں کی تو وہ کچھ ماٹھی تھیں۔ ماسوائے سچ بیانیوں کے آخر دونوں سچ بیانیاں خوب تھیں۔ صائمہ نور بہاول پور کی ہیں یا ملتان کی پتا نہیں چلا کیونکہ ان کے نام کے ساتھ بہاول پور ملتان لکھا ہوا تھا۔ (بہاولپور روڈ ملتان، روڈ رہ گیا) موصوفہ نے لکھا ہے۔ ''میں کون ہوں'' تو صائمہ صاحبہ مجھے پتا ہے کہ آپ کون ہیں جس طرح میرے اور ڈاکٹر کاشف کے خیالات مماثلت رکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی اور جائی کی تحریروں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس دفعہ بائیس تیئیس حضرات نے اس محفل میں شرکت کی، بڑی خوش آیند بات ہے۔ زیادہ تر نئے چہرے تھے، انہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ کمال احمد رضوی کی وفات دل چیر گئی۔ تاریک بین، پردۂ اسرار، توہم پرستی، جنوری کی شخصیات، خبردار اور مقامات خوف بڑی اچھی معلوماتی تحریریں تھیں۔ ''ہارر فلمیں ڈرامے'' انور فرہاد نے پُراسرار اور ہارر فلموں اور ڈراموں کے متعلق بہت سی معلومات دیں۔ مریم کے خان کی ''نادیدہ عفریت'' میں جس پُراسرار مخلوق کا تذکرہ ہوا ہے حیرت انگیز ہے۔ اتنا بڑا اور چوڑا پاؤں کسی انسان کا ہو بھی سکتا ہے کیونکہ کچھ لوگوں کے قد اور ہاتھ پاؤں بڑے بھی ہوتے ہیں (ایک ڈیڑھ فٹ لمبے پاؤں؟) پانچوں سچ بیانیاں اچھے انداز میں تحریر کی گئی تھیں مگر ''خانہ خالی'' اور ''دہشت کدہ'' ٹاپ پر رہیں کیونکہ ''خانہ خالی'' میں دونوں لڑکیاں پُراسرار تھیں اور سنسان حویلی میں جو واقعہ بیان ہوا زبردست تھا اور ''دہشت کدہ'' میں قرآن کریم یعنی سورۂ بقرہ کی فضیلت سے وہ جن نما درندہ معصوم بچی مریم کی جان چھوڑ گیا۔ نیازی صاحب جیسے مسیحا آج بھی موجود ہیں مگر ملتے کم کم ہیں کیونکہ ڈبہ پیروں اور جعلی لٹیروں نے لوگوں کو گمراہ کردیا ہے۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا تجزیہ کراچی سے۔ ''سال نو کا نیا شمارہ ذرا لیٹ ملا۔ سرورق مناسب تھا۔ اداریہ پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ پیارے نبیؐ نے بیٹیوں کو رحمت کہا تھا لیکن آج اسی رحمت کو ظلم زیادتی اور ہوس کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں تو صرف اسے زندہ دفن کیا جاتا تھا لیکن آج کے جدید دور کے شریف زادوں نے اس کا تماشا بنا کر رکھ دیا۔ ''شہنشاہ اسرار'' میں شیخ سعدی کی سعادت مندی کے کیا کہنے۔ ''عکسِ خیال'' میں ناصر حسین نے ہمارے خطوط کو سراہا، بہت شکریہ جی۔ شاہد جہانگیر ہم نے تو سنا تھا کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، آپ نے وہ گانا نہیں سنا ''دل تو بچہ ہے جی تھوڑا کچا ہے جی'' سلیم قیصر مایوس نہ ہوا کریں آپ کے لفظوں سے تو ہمیں حوصلہ ملتا ہے۔ مجی رحمٰن ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ کمال احمد رضوی کو دیکھ کر ہمیں علی سفیان آفاقی کی شدت سے یاد آئی۔ 27 جنوری 2015ء سے 27 جنوری 2016ء تک کوئی شمارہ ایسا نہیں تھا جب ہم نے ان کو یاد نہ کیا ہو۔ ''پردۂ اسرار'' پڑھ کر روح اندر تک سرشار ہوگئی۔ ''جنوری کی شخصیات'' میں واصف علی واصف ہماری پسندیدہ شخصیت ہیں۔ تین چار سال پہلے ہم نے فرمائش کی تھی کہ ان پر مکمل زندگی نامہ لکھا جائے۔ ''ننھے شیطان'' دلچسپ سروے ہے۔ شکوک و شبہات کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ بچے من کے سچے ہوتے ہیں۔ منظر امام نے کراچی کے خوفناک مقامات سے خبردار کرکے ڈرا ہی دیا۔ ''خوفناک فلموں'' کا تذکرہ بھی خوب تھا گو کہ فلمیں بہت پسند کی جاتی ہیں مگر کچے ذہنوں میں ان ڈراموں اور فلموں کے ذریعے جو ڈر اور خوف بٹھایا جارہا ہے ان کا مداوا کون کرے گا؟ ''خون آشام'' ناقابل فراموش حقیقت ہے۔ عقل حیران ہے کہ واقعی یہ سب ممکن ہے ''توہم پرستی'' دلچسپ انداز میں لکھی گئی، یہ وراثت کی طرح لگتی ہے جو نسل در نسل چلتی جارہی ہے۔ ہمارے ہاں تو توہم پرستی عام ہے لیکن تعلیم یافتہ اور مہذب مغربی بھی اس سے اپنا دامن بچا نہ پائے۔ ابن کبیر کے ''مقامات خوف'' کسی بھی کمزور دل شخص کو خوف زدہ کردینے کے لیے کافی ہیں۔ خوف ایک فطری عمل ہے لیکن کیسا عجیب بھی ہے کہ پیدا ہونے والی چیزوں کا خوف تو دلوں میں ہے مگر پیدا کرنے والی ذات کا کوئی خوف نہیں۔ ''نانگا پربت'' کی دلکشی میں ایسا کھوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوسکا اور جاری ہے کے چمکتے لفظوں نے حقیقت کی دنیا میں واپس لا پٹخا۔ پہلی سچ بیانی ''چھوٹا سا کام'' میں مصنفہ بہت بڑا کام کرگئی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ اس کی یہ نیکی آسانیوں کے دریوں اچانک وا کر جائے گی۔ ''سرسراہٹ'' سنسنی خیز رہی ایک ذرا سی غفلت نے اتنی بڑی مصیبت پیدا کردی۔ آخری سچ بیانی میں کیا کچھ نہیں تھا۔ دکھ، اذیت، تکلیف، ڈر کہ پڑھ کر دل دہل گیا۔ مریم پر جو کچھ گزری ان اذیت ناک لمحوں کا تصور ہی پلکیں بھگو گیا۔ آخر میں آپ کا آپ کی پوری ٹیم اور تمام لکھنے والوں کا بے حد شکریہ کہ ہمارے لیے اتنا مکمل اور بہترین نمبر ترتیب دیا۔''

☆ صائمہ نور نے ملتان سے لکھا ہے۔ ''سال نو کا سرگزشت ملا۔ ٹائٹل نے گرویدہ بنالیا۔ پُراسراریت ہی پُراسراریت، سال نو کی مبارک باد وصول کرتی اور اداریہ میں قدم جمائے۔ معراج رسول صاحب نے فعل قبیح کی سزا سنائی بتائی ہے۔ اب تو مسلمان کا لفظ بھی شرمندہ کردیتا ہے۔ مغرب کی تمام برائیاں مشرق والوں نے اپنالی ہیں۔ آزاد خیالی نے فحاشی، عریانی کو طول دیا ہے۔ بے پردگی اور غیر اخلاقی فلموں کا سرعام چل جانا، برائیوں کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مقام عبرت ہے۔ مسلمان بڑی بڑی کتب کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن عمل نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ اخبارات اور بے تحاشا چینلز نے بے حیائی کو عام کیا ہے۔ ''شہنشاہ اسرار'' شیخ سعدی کمال

شخصیت کے مالک ہیں۔ مجھے ان کی شخصیت پر لکھی کتابیں پسند ہیں۔ ''مشہرِ خیال'' میں ناصر حسین رند کا معلوماتی خط جامع اور جاندار تھا۔ فلک شیر ملک کبھی رحیم یار خان سے کبھی شاہ گڑھ سے آتے ہیں۔ اصل مقام کون سا ہے؟ تبصرہ جاندار تھا۔ محمد سلیم قیصر اللہ تعالیٰ آپ کو رہائی عطا فرمائے آمین۔ ایم عمران جونانی، اویس شیخ، مرزا طاہر الدین، نذیر احمد راجپوت، سدرہ بانو ناگوری، عبدالحکیم شمر، آفتاب احمد نصیر اشرفی، احمد خان توحید کو سلام، شاہد جہانگیر شاہد، اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے، آمین۔ وکیل الرحمٰن، انور عباس شاہ، خالد محمود، عبدالباسط سومرو، عارف شیخ، اکبر بخاری، ''مشہرِ خیال'' میں تبصرے سے سرگزشت کو رونق بخشے ہوئے تھے۔ کمال احمد رضوی کے بارے میں تذکرہ خوب رہا۔ ''خون آشام'' صداقت حسین ساجد نے خوب صورت جملوں میں تحریر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ سچ بیانیوں میں ''سرسراہٹ'' اپنے سحر میں قید نہ کر سکی البتہ ''خواب یا سچائی'' نے اپنے سحر میں قید کر لیا۔ سادھو کو ٹھیک سزا ملی تھی۔ سرورق کہانی خوب رہی۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' کمال کا تھا۔ ''ننھے شیطان'' پڑھ کر مزہ آگیا۔ ''جنوری کی شخصیات'' سے تعارف اچھا رہا۔ خبردار نے خبردار ہی کر دیا۔ مقامات خوف، زومبی، توہم پرستی، پردۂ اسرار، تاریک جن، انسان نما، نادیدہ عفریت نے پُراسراریت سے نکلنے نہیں دیا اور اگر پورے سرگزشت کی بات کی جائے تو پُراسرار نمبر، شاندار، جاندار اور معلوماتی مواد کے ساتھ بہت پسند آیا۔ میری طرف سے مبارک باد۔''

☆انور عباس شاہ کا خلوص نامہ بھکر سے۔ ''نئے سال کا پہلا شمارہ پُراسرار نمبر کی صورت میں ہم تک پہنچ چکا ہے۔ یہ شمارہ بھی پہلے والے نمبروں کی طرح لاجواب تھا۔ تمام بہن بھائیوں کے خطوط بے حد شاندار تھے نئے آنے والوں کو خوش آمدید اور آتے رہنے کی تاکید۔ منظر امام کا مضمون ''خبردار'' ہمارے حساب سے اس شمارے کی نمبر ون تحریر تھی۔ اس میں شامل عمارتوں کے متعلق معلومات اور پیش آنے والے واقعات نے ہمارے بھی رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ابن کبیر کی تحریر ''مقامات خوف'' کی تعریف کے لیے نہ تو ہمارے پاس الفاظ ہیں اور نہ ہی کوئی فیصلہ کیونکہ اس تحریر نے ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی منجمد کر دی۔ اس میں شامل شیطانی شگون کے متعلق مضمون، ہم پچھلے پُراسرار نمبروں میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں نہ جانے کیوں اس مضمون کو بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ تصویروں نے دلکشی میں اضافہ کر دیا کیا یہ تصویریں اصلی تھیں یا فرضی (مضمون کے ساتھ اصل تصویر ہی دی جاتی ہے) اب پُراسرار نمبر کی تشنگی تو کسی حد تک ہماری دور ہو چکی ہے اگر ہو سکے تو اگست 2016ء کا شمارہ بطور آزادی نمبر نکالیں تو مہربانی ہوگی اسی نمبر میں ان حالات و واقعات کو اجاگر کریں جو کہ 1947ء میں آزادی کے وقت ہمارے بزرگوں کے ساتھ پیش آئے تھے۔ ایک مشورہ اور کہ علمی آزمائش کا جواب دیتے وقت آپ اس شمارے کا حوالہ بھی دے دیا کریں جس میں اس شخصیت کا تذکرہ شائع ہوا تھا (نمبر شمار جواب کے ساتھ درج ہوتے ہیں)۔''

☆اویس شیخ کی خیال آفرینی اس بار رحیم یار خان سے۔ ''سمیرا ساجد کا نام ہی کافی ہے۔ انہوں نے جس طرح اپنا دکھ، کرب اور مستقبل کے اندیشے ظاہر کیے۔ حب الوطنی کا بہترین مظاہرہ تھا۔ ہمارے معاشرے میں حقیقی معنوں میں عورت کے احترام کو اہمیت ہی نہیں دی جاتی جب کہ ہمارے مذہب میں عورتوں کے تقدس کو کس قدر اہمیت دی جاتی ہے، اس کا اندازہ ایک سکھ رہنما کے بیان سے لگانا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں جب میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے ایسا لگا جیسے اسلام صرف عورتوں اور مظلوموں کے لیے بنا ہے۔ جب رات کے آخری پہروں میں فکری اور اخلاقی تربیت کا دامن نہ چھوٹے تو پھر ''شہنشاہ اسرار'' جیسے ہی پیدا ہوں گے۔ تحریر کا انداز بیان خوب تھا۔ ''مشہرِ خیال'' میں انٹری دی۔ آغاز میں ہی خط کی چوتھی سطر میں آپ نے لکھا۔ ''سرگزشت کا ہر شمارہ خاص ہوتا ہے۔'' نہیں! بالکل نہیں۔ بلکہ اویس شیخ کے لیے ہر شمارہ ایک دستاویز ہے۔ اس دستاویز کا ایک شاہکار ''پینا ناپینا نمبر'' تھا۔ اب تک پتا نہیں کتنی بار پڑھ چکا ہوں مگر تشنگی ابھی باقی ہے۔ عمران جونانی میرے روبرو حاضر تھے۔ اچھا لگا۔ سدرہ صاحبہ کے خطوں میں میچورٹی کے آثار نظر آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ عبدالحکیم شمر کے خیالات سے سوفی صد متفق ہوں کہ انسان جس شخص کو دھوکا دے کر ایسی بے ہودہ حرکات کا ارتکاب کرتا ہے اعتراف بھی اسی کے سامنے کرنا چاہیے۔ شاہد جہانگیر صاحب صحت اچھی ہو، زندگی میں سکون ہو تو میرا خیال ہے اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ نجمی رحمٰن کی سات سمندر پار سے آمد سرگزشت سے والہانہ محبت کا ثبوت ہے۔ اس بار شمارے میں صرف پانچ سچ بیانیاں تھیں۔ اتنی کم کیوں تھیں؟ حالانکہ خاص نمبر تھا (خاص نمبر میں سچ بیانیاں کم رکھ کر معلوماتی تحریر زیادہ دی جاتی ہے۔ سرگزشت معلومات کو اہمیت دیتا ہے)۔ پہلی سچ بیانی ''چھوٹا سا کام'' جس طرح پہاڑ کو چکنا چور کرنے کے لیے ذروں کو سرکانا ضروری ہوتا ہے اس طرح بڑے کاموں کی تکمیل کے لیے چھوٹے چھوٹے کام نمٹانا ضروری ہوتے ہیں۔ ''سرسراہٹ'' پسند نہیں آئی۔ ''خواب یا سچائی'' کو حقیقت میں پرکھا جا سکتا ہے۔ ''خالی خانہ'' بھی کسی معجزے یا عجوبے سے خالی کہانی نہیں تھی۔ اظہارِ محبت کا معاملہ دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔ ''دہشت کدہ'' تو کسی ہارر مووی کا اسکرپٹ لگ رہی تھی مگر اس کہانی کے صفحہ 289 پر ایک جملہ تھا'' بے

پناہ غصہ اور جنون میں انہوں نے یہ کام کر دکھایا'' مگر ایسی صورتِ حال کے لیے ایک دانشور نے لکھا ولوں کے جہاں میں منٹوں اور لمحوں کے اندر انقلاب آجاتا ہے۔ بس اسے جوش دلانے اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس انقلاب کی چنگاری سے فرد، معاشرہ اور قوم کے انقلاب وابستہ ہیں۔''

☆ بشریٰ افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ''ناٹیکل واقعی پُراسرار ہی تھا۔ خوف و دہشت کی علامت۔ انکل کا تجزیہ پڑھا ان کی باتوں میں واقعی وزن ہے اس کے بعد ''شہنشاہ اسرار'' پڑھا۔ ایک ہی صفحہ میں معلومات کا ذخیرہ موجود تھا۔ ''مشہر خیال'' میں داخل ہوئے ناصر حسین رند، سالانہ رپورٹ کے ساتھ موجود تھے۔ پرانے لکھنے والے ساتھی کہاں غائب ہوگئے اب تو نئے لوگ بھی آرہے ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ مرزا طاہر الدین، سدرہ بانو ناگوری، آفتاب احمد نصیر اشرفی کے تجزیے پسند آئے۔ مابدولت کو تو ساتھیوں نے بھلا ہی دیا۔ ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کریں گے اس ''مشہر خیال'' کے باسی! کمال احمد رضوی کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا ان کے بارے میں مختلف آرا لوگوں کی سنیں ''خواب یا سچائی'' پڑھا مجھے تو خواب ہی لگ رہا تھا انہونیاں بھی تو دنیا ہی میں ہوتی ہیں نا۔ ''سرسراہٹ'' میں سویرا اگر ڈراؤنی اور خوف ناک کہانیاں اور فلمیں نہ دیکھتی تو کیوں ڈرتی۔ اسی وجہ سے خوف اس پر غالب پا گیا۔ ''جنوری کی شخصیات'' سے مکمل اور جامع معلومات حاصل ہوئیں۔ ''توہم پرستی'' بھی تحریر پسند آئی۔ ''خون آشام'' کہانی کا ٹیمپو تیز تھا اس کہانی نے تو رونگٹے کھڑے کر دیئے جانوروں میں بھی ممتا کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' بہت پسند آئی۔''

☆ خالد محمود ملتان کینٹ سے لکھتے ہیں۔ ''محترم معراج رسول السلام علیکم! اس دفعہ رسالہ 4 جنوری 2016ء کو ملا۔ کافی انتظار کرنا پڑا۔ ایک وجہ تو اپنے خط کا انتظار تھا۔ دوسرا خیال تھا کہ سالنامہ ہوگا اور تیسرا خیال تھا ''سراب'' کی جگہ کسی نئی داستان کا۔ رسالہ پڑھنا شروع کیا اور تین روز بعد رسالہ ختم۔ اس میں ماسوائے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر کے تمام رسالہ کی ورق گردانی میں گزر گیا۔ تھوڑا سا مسالہ جنوری کی شخصیات نے مہیا کیا اور باقی سب کچھ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیابی ندارد، بے حد مایوسی ہوئی۔ جتنی خوشی پچھلے ماہ ہوئی تھی اتنی ہی بے زاری اور افسوس جنوری 2016ء کا پرچہ دیکھ کر ہوئی (جب کہ مارکیٹ رپورٹ بہت زیادہ اچھی آئی۔ وقت سے بہت پہلے اضافی پرچے بھی کم پڑ گئے دراصل ہر ایک کی پسند جدا بھی تو ہوتی ہے)۔ خدا کے لیے اپنے رسالہ سرگزشت میں نئے تجربے نہ کریں اور اس کو اس کی اصل اور بنیادی شکل میں ہی رہنے دیں (سرگزشت کا خاصہ یہی ہے کہ یہ اپنے بنیادی ڈھانچے، معلومات کی ترسیل پر ہنوز قائم ہے۔ اس کا ہر خاص نمبر اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن معلومات کو فوقیت دی جاتی ہے)۔''

☆ فرزانہ نگہت کا خلوص نامہ اسلام آباد سے۔ ''میرا نام شاید آپ کے لیے اجنبی نہ ہو۔ ایک افسانہ اور دو خط پاکیزہ میں چھپے تھے۔ میں جس طرح پاکیزہ کی پُرجوش قاری چلی آرہی ہوں اسی طرح سرگزشت کی بھی ہوں۔ یہ ہمہ صفت رسالہ اپنے پہلے شمارے سے ہی دل میں ایسا گھر کیے ہوئے ہے کہ کوئی اس کا مدمقابل نہیں دکھائی دیتا، نہ اس کی طرح میری طرف سے پسندیدگی اور محبوبیت کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔ اس کی ہر چیز اپنی جگہ بے مثال ہے۔ معلوماتی مضامین، پُروقار تراجم، تحقیقاتی کام، اعلیٰ ترین اور دلچسپ ترین سلسلہ وار کہانیاں، انتہائی متاثر کن سچی داستانیں، مذہبی شخصیات تک پر مضامین۔ تعریف کے الفاظ نہیں دل جو کچھ محسوس کرتا ہے وہ زبان قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔ عرصہ سے تمنا تھی کہ میں بھی اس انتہائی پُروقار رسالے میں جگہ پا لوں۔ اس کے مزاج، نہج اور رویے کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ دو تحریریں تیار کی ہیں۔ آپ پڑھیے، رائے دیجیے (جلد پڑھ کر مطلع کر دیا جائے گا)''

☆ احسان سحر کا میانوالی سے نامۂ خاص۔ ''ہر کسی کے دل میں ایک خاص چیز کا مقام ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے دل میں بھی ہے جسے سرگزشت کہتے ہیں جو ہر ماہ ہم سے ضرور ملتا ہے۔ یہ ہمارے دل میں ایسے بسا ہے جیسے رات کے دل میں چاند ہے اور جیسے پھول کے وجود میں خوشبو۔ خاص انسان ہو یا خاص چیز اس کا سبھی کو انتظار رہتا ہے۔ بعد انتظار سرگزشت کا خاص شمارہ آیا۔ معراج انکل سے آغاز کیا۔ ایسے واقعات اب روز کا معمول بننے لگے ہیں معاشرے کے بے حس اور تلخ انسانوں کے بیچ ایسے قبیح واقعات جاری وساری رہیں گے کیونکہ ہوس روپے کی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ ''شاہِ اسرار'' میں شیخ سعدی کے حوالے سے مضمون بہت پسند آیا۔ انسان چاہے تو کیا نہیں کر سکتا بس بات چاہنے کی ہے۔ اپنے دوستوں کے درمیان پہنچے تو پہلی ملاقات ناصر حسین سے ہوئی۔ چیدہ چیدہ مرزا ادبیت کے حوالے سے مضامین کی یاد آوری کرتے نظر آئے۔ ایم عمران جونانی آپ کے نانا جان کا سن کر بے حد افسوس

ہوا۔ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ سدرہ بانو بہت اچھا لگا کہ آپ نے طاہرہ گلزار کی باتوں کو دل پر نہیں لیا۔ اچھے انسانوں کی یہی خوبیاں انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ منشی عزیز مئے آپ نے ہمیں دل سے یاد کیا اور ہم حاضر ہیں۔ باقی سب دوستوں کے محبت نامے بھی اچھے تھے۔ باقی دوستوں جن میں رضوان تنولی، طاہرہ گلزار، مرزا طاہر الدین بیگ، انور عباس شاہ، شاہد جہانگیر آپ کے لیے دل سے دعائیں ہیں، اللہ پاک آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ ڈاکٹر قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری سب کو سلام۔ آپ سب میرے دل میں دھڑکن کی طرح ہو پہلا مضمون تاریک بین اور ایک سیاہ اور بدکار انسان کا احوال ملاحظہ کیا۔ شروع میں اپنے بھائی کی موت پر جذباتی ہونے والا آگے جا کر ابلیس صفت نکلا۔ توہم پرستی کے حوالے سے اسماء صدیقی مختصر مگر معلوماتی مضمون لائیں مگر حیرت مجھے اس وقت ہوتی ہے جب پرندوں کے علاوہ ہم انسان اپنے جیسے انسانوں کو بھی منحوس قرار دیتے ہیں۔ فلاں شخص سے راستے میں سامنا ہوا اب تو سفر اچھا نہیں گزرے گا۔ کیسی کیسی سوچیں ہمیں اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ ''جنوری کی شخصیات'' بہت ہی خوب صورت سلسلہ ہے۔ سعادت حسن منٹو، احمد فراز، عبدالستار ایدھی، سلطان راہی، احمد حسن دانی، ضیاء سرحدی، قرۃ العین حیدر، حکیم سعید، عارفہ کریم، اصغر خان، جی ایم سید جیسے نایاب لوگ ہمارا سرمایہ ہیں اور رہیں گے۔ ''زومبی'' ایک فضول بے ہودہ خیال پر مبنی مضمون تھا۔ پسند نہیں آیا۔ ''ننھے شیطان'' مضمون کے حوالے سے مضمون کا نام جچ نہیں پایا۔ شیطانوں والی بات یہاں نظر تو نہیں آئی۔ قدرت کی طرف سے چھوٹے بچوں کو جو صلاحیت اور معصومیت دی گئی ہے اسے شیطانیت سے منسوب کرنا غلط ہے۔ ''خبردار'' خاص خاص مقامات کے حوالوں سے مضمون اچھا لگا۔ جہاں کہیں کسی کے دیکھے جانے اور آوازوں کا سلسلہ جڑا رہا ایک دو مقامات پر خود مصنف کی گواہی دینا اچھا لگا۔ ''مقاماتِ خوف'' خوب صورت اور معلوماتی مضمون رہا۔ ہارر فلموں اور ڈراموں کے حوالے سے معاف کیجیے گا لگتا ہے انور فرہاد نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ کچھ بھی تفصیل سے نہیں لکھا جلدی جلدی ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ نہ کچھ تفصیل تو لکھنی چاہیے تھی۔ نادیدہ عفریت کے حوالے سے محض پیش گوئیاں کی جارہی ہیں کوئی قابلِ ذکر بات سامنے نہیں آئی۔ اسرار کے پردے میں گم ہے یہ حادثہ ابھی تک۔ ''انسان نما'' بھی نادیدہ عفریت سے کافی حد تک ملتا جلتا مضمون رہا۔ فرق صرف پائے جانے میں ہے۔ غیر ممالک کے سیاحوں اور دوسرے شوقین حضرات کی کتابوں سے پیش گوئیاں معلوماتی رہیں۔ دوسروں کو بھی محض اس لیے رد کر دیا گیا کہ انہوں نے ذکر تو کیا پر ثبوت نہ دے پائے یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ ''سراب'' اختتام کی جانب گامزن ہے۔ سیدھی پوچھیں تو اب بوریت ہونے لگی ہے ہر قسط میں جنگ کا پڑھ پڑھ کر۔ پہلی سچ بیانی سے آغاز کیا۔ پر اس بات سے میں متفق ہوں کہ زندگی میں انسان کو اگر کامیاب ہونا ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دے جو دیکھنے میں بہت پیچیدہ نظر آتے ہوں۔ آسانی سے چل کر منزل کی جانب پہنچنے والوں کو منزل کی صحیح طرح سے قدر کا احساس نہیں ہوتا۔ ''سرسراہٹ'' دوسری سچ بیانی جو حقیقت کے قریب لگی۔ واقعی باہر سے زیادہ ڈر انسان کے اپنے اندر موجود ہوتا ہے جو کبھی چھوٹی سی چیزوں اور کبھی بڑی چیزوں یا واقعات کے وقوع پذیر ہونے پر ہمارے اندر اچھل اچھل کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ ''خواب یا سچائی'' سبق اور آگاہی دلاتا واقعہ تھا۔ سلیمان قوم جنات اتنی بھی ظالم نہیں ہوتی انسانوں کی طرح ان میں بھی اچھے اور بڑے جنات ہوتے ہیں لیکن اپنے اصولوں کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے۔ ''خانہ خالی'' ہم نے بھی پڑھتے وقت نہ اس میں دلچسپی کو مدِنظر رکھا اور نہ ہی کسی اچھے سبق کی توقع، بس عام سے انداز میں اس کو لیا جیسے دو تین دوستوں کے درمیان مکالمے بازی شروع ہو اور واقعی ایسا ہی ہوا اور اینڈ تک کوئی قابلِ ذکر بات دیکھنے کو اور پڑھنے کو نہ ملی۔ ''پردۂ اسرار'' زبردست رہا۔ سید محمد اعظم کے حوالے سے مضمون نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' بہت ہی خوب صورت سلسلہ ہے۔ صحیح معنوں میں اپنے ملک کی خوب صورتی اور کچھ جاننے کا موقع۔ وہ بھی اتنے خوب صورت الفاظ، شیریں لہجے کے ساتھ پہلی دفعہ پڑھنے کو مل رہا ہے۔ اللہ کرے یہ سلسلہ خاصا طویل ہو اور اگر طویل نہ ہو تو موصوف کے سفرنامے وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہیں۔ اُمید کرتا ہوں مجھے بلکہ قارئین سرگزشت کو مایوس نہیں کیا جائے گا۔ لیجنڈ اداکار کمال احمد رضوی کے حوالے سے مختصر مضمون آگاہی کے لیے کافی تھا۔ ایسے لوگ ہمارے ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ پر افسوس یہاں پر سرمایوں کی قدر نہیں کی جاتی۔''

☆ سعید احمد چاند کا نامہ خلوص کراچی سے۔ ''چار پانچ ماہ کے وقفے سے ''معمرِ خیال'' میں داخل ہو رہا ہوں۔ کیا خبر داخلہ نہ ملے۔ ایک دو باتوں کی معلومات چاہتا ہوں رسالہ کس تاریخ کو مارکیٹ میں آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''معمرِ خیال'' میں داخلہ کی آخری تاریخ کیا ہے تاکہ ہم ان باتوں کو ذہن میں رکھیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں ''معمرِ خیال'' میں لکھنے کی یا تو میں تاریخ سے لیٹ ہو جاتا ہوں یا محکمہ ڈاک والے کی کوئی شرارت ہے (اب یہی دیکھیں 3 دسمبر کا خط آج 19 جنوری کو ملا) میں رسالہ باقاعدگی سے پڑھتا ہوں اب تو دو تین سال سے سسپنس بھی باقاعدگی سے خریدتا ہوں۔ اس دفعہ رسالہ کا سرورق بہت شاندار تھا۔

سوچ میں ڈوبی حسینہ اچھی لگی۔ معراج رسول کا اداریہ پڑھا جو موقع محل کے لحاظ سے ٹھیک تھا۔ انور فرہاد نے بابا عالم سیاہ پوش پر اچھا مضمون لکھا تھا۔ ان کو میری طرف سے مبارک باد پہنچا دیں۔ ممتاز شانتی اور منور سلطانہ پر بھی محنت کریں اور ان کی زندگی کے بارے میں لکھیں (ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آخری کاپی پریس میں جانے تک آنے والے خطوط شامل کرلیے جائیں یعنی 18،17 تک خط موصول ہوجائے)۔

☆ محمد خلیل چودھری دینہ ضلع جہلم سے رقمطراز ہیں۔ ''اپنے پیارے سرگزشت سے رشتہ تو پیار کا ہے جب سے اس نے جنم لیا ہے مفت میں پڑھ رہا ہوں آپ حیران ہوں گے کہ یہ صاحب مفت میں پڑھ رہے ہیں۔ ابتداء سے اب تک جتنے سرگزشت کے شمارے شائع ہوئے ہیں تقریباً 300 سے زائد ہوچکے ہیں۔ میرے پاس اس وقت 222 شمارے جمع ہوچکے ہیں۔ مجھ سے بڑے بھائی محمد جمیل چودھری کو راولپنڈی میں رہتے ہوئے سرگزشت کا ابتدائی شمارہ ہاتھ لگ گیا۔ انہیں یہ بے حد پسند آیا پھر کیا تھا۔ راولپنڈی اسلام آباد کے اولڈ بک شاپ سے اور اتوار کو راولپنڈی صدر میں کتابوں کے جمعہ بازار سے سرگزشت خریدنے شروع کردیے۔ مہینے ڈیڑھ بعد جب گھر آتے تو سرگزشت کے نئے پرانے لے آتے۔ جنہیں میں پڑھتا پھر ذاتی لائبریری میں رکھ دیتا۔ اکتوبر 1999ء میں ان کی شادی ہوئی تو معلوم ہوا کہ بھابی بھی سرگزشت کی قاری رہی ہیں۔ پھر کیا تھا بھائی جان ہر ماہ سرگزشت خریدتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اب ان کی تعداد 222 ہوچکی ہے۔ جنوری کا شمارہ پُراسرار نمبر ابھی سرسری دیکھا ہے۔ جس چیز نے سرگزشت خریدنے اور پہلی دفعہ خط لکھنے پر مجبور کیا وہ محترمہ صائمہ اقبال کا بے حد معلومات افزا اور تحقیقی مضمون یعنی سلسلہ ہر ماہ کی شخصیات ہے۔ سرگزشت مارکیٹ میں دستیاب ماہناموں سے امتیاز کیوں ہے اس کا منفرد انداز، تحقیقی مضامین اور شخصیات کی سوانحی حالات آپ بیتیاں اور جگ آپ بیتیاں جو کسی اور رسالے میں اکٹھی نہیں ملتیں۔ مجھے خود شخصیات کے حالات زندگی پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق بھی ہے۔ کتب بینی کا شوق تو بچپن سے ہے مگر باقاعدہ خرید کردہ کتب کا ریکارڈ دسمبر جنوری 1997ء سے ہے۔ میرے پاس سرگزشت کا پہلا شمارہ جلد نمبر 1 شمارہ نمبر 5 مارچ 1991ء کا صدام حسین نمبر ہے۔ دوسری شادی نمبر (اگست 1991ء)، خودکشی نمبر (نومبر 1991ء)، جیل نمبر (مارچ 1993ء)، سالگرہ نمبر (جنوری 1996ء)، ورلڈ کپ مارچ (1996ء)۔ ایک ڈائجسٹ میں، میں نے جنوری 2013ء میں ماہ رواں کی شخصیات (پیدائش و وفات) کا ایک سلسلہ مرتب کیا تھا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر 2012ء پھر جولائی 2013ء تک 9 ماہ کی شخصیات مرتب کی تھیں۔ نمونے کے لیے فوٹو کاپی ارسال ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو اس سلسلے کو سرگزشت میں شائع کیا جاسکتا ہے (کوئی اور سلسلہ بتائیں یا پھر الگ مضمون بھیجیں)۔ ایک مضمون موسمیات سے متعلق ''موسم کا طلسم'' ارسال خدمت ہے۔ اگر سرگزشت کے معیار پر پورا اترے تو شائع فرما کر مشکور فرمائیے گا۔ ایک درخواست عرصہ سے کرنا چاہ رہا تھا کہ ''معبر خیال'' سے قبل ایک بھی شخصیات والا سلسلہ اگر ممکن ہو تو کتابی شکل میں شائع فرمائیں۔ آپ کا عظیم احسان ہوگا۔ یہ سرگزشت کا کمال ہے کہ ایک صفحہ پر کسی شخصیت کی تمام زندگی کا احاطہ کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اگر شائع شدہ شماروں سے مرتب کرکے شائع کردیا جائے تو بے حد پسند کیا جائے گا۔ ایک اور خیال ذہن میں آیا ہے اگر آپ کتابی شکل میں شائع نہیں کرنا چاہتے تو پھر آپ ماہنامہ سرگزشت کا خاص نمبر بعنوان ''شخصیات نمبر'' جس میں ایک سو شخصیات یعنی سو صفحات شائع کرکے خاص نمبر مرتب کرکے شائع کرسکتے ہیں۔ ''معبر خیال'' میں شامل ہونے والے سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔ نوک جھوک مزیدار ہوتی ہے۔ بعض حضرات تو بہت معلوماتی اور تحقیقی باتیں لکھتے ہیں جو بے حد پسند آتی ہیں۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''4 جنوری کی شام اپنا محبوب سویٹ سا سرگزشت ملا کیوں کہ پُراسرار نمبر کا کب سے انتظار تھا۔ نیا سال کا پہلا مہینا ہی ہمارے پسندیدہ رائٹرز کی پیدائش کا مہینا 2 جنوری محمد فاروق انجم اور تین جنوری کاشف زبیر کی پیدائش کا ہے۔ اللہ دونوں کو بہت خوشیاں اور کامیابیاں عطا کرے، آمین ثم آمین۔ معراج رسول انکل آپ کی دل سوز باتیں سر آنکھوں پر لیکن عورت ذات تو ازل سے ظلم سہتی آرہی ہے مرد کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہورہی ہے۔ یک صفحی میں شہنشاہ اسرار شیخ سعدی کے بارے میں اتنی مختصر لیکن اتنی مکمل تحریر پڑھنے کو ملی کہ محاورہ ''سمندر کو کوزے میں بند کرنا حقیقت نظر آیا۔ ''معبر خیال'' میں کہ کس کس نے اس ناچیز کو یاد رکھا ہے۔ واہ پہلے نمبر پر ناصر حسین آئے ہیں مبارکاں واقعی بھائی آپ کا یہ خط تو ریکارڈ میں رکھنے کے قابل ہے۔ ناصر بھائی میں نے ہمیشہ 20 فیصد مردوں کی تعریف کی ہے لیکن وہ آپ لوگوں کو نظر نہیں آتا۔ فلک شیر ملک بھائی کا خط بھی لاجواب رہا مبارک ہو۔ سمیرا ساجد ماضی کی سمیرا انجم اس بار حاضر تھی لیکن بڑے سوز دل کے ساتھ۔ سمیرا ڈیئر اگر ہم مسلمان خاص کر پاکستانی اگر اس مٹی کے ساتھ پُرخلوص ہوجائیں تو یہ ملک پاکستان پہلا اسلامی سپر پاور ملک بن جائے لیکن صد افسوس ویسے سمیرا ڈیئر ملک کے خواب سورۃ آنکھوں میں پھرنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ کبھی اسد بھائی کے ساتھ کے پی کے آئی ہو؟ محمد سلیم قیصر بھائی میری اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنے

محبوب کے صدقے آپ کو رہائی دے۔ عمران جونانی بھی اپنے لاجواب اور مخصوص انداز تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ صائمہ نور بھی اپنے خوب صورت خط کے ساتھ حاضر تھیں یاد رکھنے کا شکریہ نوازش۔ اویس شیخ مجھے اور جونانی بھائی کو یاد کرنے کا شکریہ خط اچھا رہا۔ مرزا طاہر الدین بیگ اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر تھے بھائی یاد رکھنے کا شکریہ۔ نذیر احمد راجپوت بہت خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ پہلی کاوش زبردست رہی۔ ڈیئر سسٹر سدرہ بانو بھی زبردست تبصرہ کے ساتھ حاضر تھی۔ خط کے شروع میں وطن عزیز کے دکھ پر دکھی نظر آئی۔ سات خوب صورت چیزوں کے مرکب سے بنی ہوئی عورت ہوں عام جذباتی انسان ہوں مجھے 90 فیصد لوگوں نے دکھ دے دے کر نفرت اور درگزر نہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔''

☆ عبداللہ شجاع سندھی لاڑکانہ سے لکھتے ہیں۔ ''آپ حسب معمول وطن عزیز میں ہونے والی انسانیت سوز سماجی ناہمواریوں اور ناسازیوں کی ناپسندیدہ روایات کا ناقدانہ جائزہ پیش کرتے ہوئے ان خرابیوں سے معتمدانہ خطوط پر نجات کا راستہ بھی دکھا رہے تھے۔ اس ابتدائی گفتگو میں آپ جس زاویے سے ہمارے بیمار معاشرے کی نبض پر شفا بخش ہاتھ رکھ کر جو علاج تجویز کرتے ہیں وہ ایک ایسی خیر مندانہ صلاحیت ہے جو آپ کو سماجی حاذق وحکیم کے ارفع درجے پر استوار کرتی ہے۔ جب سرگزشت کے پُراسرار نمبر کا عندیہ دیا گیا تھا اس وقت سے مذکورہ نمبر کے متعلق خوشگوار توقعات لگائے بیٹھے تھے کہ اس کے صفحات روایت کے برعکس بڑھا دیے جائیں گے لیکن جب وہ نمبر اشاعت پذیر ہوا تو اس کے صفحات وہیں کے وہیں دیکھ کر ہماری توقعات کی چینی کے اوپر پانی پڑ گیا۔ چینی اپنا وجود کھو کر اس پانی میں تحلیل ہو گئی لیکن اس حالت میں بھی ہماری پُر تجسس اور پُراسرار معلومات کی مطالعاتی توقعات بڑی حد تک ضرور پوری ہو گئیں۔ وہ اس لیے کہ چینی جب پانی میں تحلیل ہو جاتی ہے تو پانی میں اپنی مٹھاس والی خاصیت چھوڑ جاتی ہے اور یہی خاصیت ہمارے اسرار پسند ذوق علم کی تسکین کشائی میں مددگار ثابت ہوئی۔ اس مرتبہ علم و حکمت پرور شخصیت ڈاکٹر ساجد امجد، پُراسرار قوتوں کو غیر تعمیری اور منفی طور پر استعمال کرنے والی روسی نژاد شخصیت گریگوری راسپوٹین کی سیاہ سرگزشت کو محنت سے قلمبند کر کے آشکار ہوئے۔ علم و ادب کی باریکیوں کے شارح محترم کاشف زبیر ''پردۂ اسرار'' کے عنوان سے عروس البلاد کراچی سے وابستہ روحانی اسرار کی مظہر شخصیت حضرت محمد عظیم بلقب قلندر بابا اولیاؒ کا روح افزا مفصل ذکر خاص حاضر سرگزشت ہوئے جسے پڑھ کر علم پرور انکشاف ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی دوسری مجموعی مخلوقات کے مقابلے میں حضرت انسان کو بے شمار ظاہری اور باطنی صلاحیتوں سے معمور و مشرف کیا ہے لیکن مذکورہ صلاحیتیں ذہنی ہوں یا جسمانی تحقیق جستجو ریاضت و انکشاف پسندی کے میلانات کے سوا حاصل نہیں ہو سکتیں۔ مذکورہ سرگزشت سے معلوم ہوا کہ قلندر باباؒ نے دینی احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے دین و دنیا دونوں میں ربانی سرخروئی کو حاصل کرنا ضروری سمجھا اور وہ بفضل خدا اس مقصد سعید کو حاصل کرنے میں کامیاب و کامران ہو گئے۔ اسماء صدیقی کی کاوش ''توہم پرستی'' منطقی انداز فکر کو اجاگر کرنے والی اصلاح پسند تنقیدی تحریر تھی۔ فیصل ظفر کی تحریر ''زومبی'' جس کا نکتہ ماسکہ یہ تھا کہ یورپ و امریکا کا اس بات پر پختہ اعتقاد ہے کہ مستقبل میں انسانی زندہ لاشیں، عجیب بات ہے لاشیں اور وہ بھی زندہ! انسانی آبادیوں پر حملہ کریں گی اور اس حملے سے نمٹنے کے لیے ان لوگوں نے پیشگی دفاعی تیاریاں کر رکھی ہیں۔ دانیہ کی تحریر ''ننھے شیطان'' میں چھوٹے بچوں کی مستقبل میں جھانک لینے کی حسیات کو جس عبرتناک پیرائے میں بیان کیا گیا ہے انہیں اتفاقی یا حادثاتی نظر سے تو دیکھا جا سکتا ہے لیکن ایسے بچوں کی مافوق الفطرت گفتگو جو مستقبل میں ہونے والے واقعات اور حوادث کا عملی ثبوت منظر عام پر مشہور کر دے تو ایسے بچوں کی مستقبل بین پُراسرار صلاحیت کو سمجھنے کے لیے دو نظریات پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی مستقبل شناس گفتگو سے مطابقت رکھنے والے واقعات و حوادث کو صرف اتفاقی سمجھا جائے جب کہ اس ضمن میں دوسرا نظریہ یہ اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اسے خصوصی بچے اپنے وجود میں پُراسرار حقیقت، بدوش اور مستقبل بین اوصاف لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' کا سلسلہ بے حد دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ہمارا اپنا وطن کتنا خوب صورت اور نیچرل ہے اس کی تصویر کشی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سیر کی جائے۔ مذکورہ سلسلہ سفرنامے کی ضرورت بھی پوری کر دیتا ہے۔ آصف ملک کی ''انسان نما'' اور مریم کے خان کی ''نادیدہ عفریت'' دونوں تحاریر دنیا کے اسرار و رموز سے مؤثر طور پر آشنا کر رہی تھیں۔ سرگزشت کے پُراسرار نمبر کے لیے مزید اسرار بیانی کی ضرورت پھر بھی تشنہ رہی۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

ارشد نیاز، چیچہ وطنی۔ نغمہ یاسین، دینہ جہلم۔ فروہ حسن، لاہور۔ ابرار علی سید، مہوش ممتاز، فہد حسن صدیقی، اسلام آباد۔ کلیم اللہ، پشاور۔ نعمان بشیر، ٹیکسلا۔ کاظم علی کاظمی کوئٹہ۔ نیاز احمد، ڈی آئی خان۔ انیس حیدر، پیواڑ پارہ چنار۔ زاہد فاروقی، حیدرآباد۔ نگار محسن، ایبٹ آباد۔ سلیم نیازی، شیخوپورہ۔ انیس نیاز دوٹو، میرپور آزاد کشمیر۔

تجزیاتی جائزہ برائے سال 2015ء

وحید ریاست بھٹی

"ادارتی جائزہ"

معراج رسول نے گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی سوئی قوم کے نصیب پہ مسلسل بارہ ماہ تک دستک دی اور اپنے جادو اثر قلم سے "بارہ" عدد نہایت فکر انگیز اداریے مرقوم فرمائے اور حسبِ حال بہترین اشعار کا انتخاب سونے پہ سہاگا کا کام کر گیا۔

"یک صفحی سرگزشت۔"

یک صفحی سرگزشت قارئین سرگزشت کے لیے "کوزے میں دریا" کا درجہ رکھتی ہے، اور قارئین کی معلومات میں ایک خوبصورت اضافہ کا باعث ہوتی ہے، ایک صفحہ میں ایک شخصیت کے حالات زندگی کو بیان کرنا سرگزشت کا ہی خاصہ ہے۔ سال 2015ء میں کچھ اس ترتیب سے "یک صفحی سرگزشت" کی کہکشاں سجائی گئی۔

1- "سائنسدان پاکستان" (سرفراز خان نیازی) 2- "بابائے فارسی" (پروفیسر سید سبط حسن رضوی) 3- "تربیت کار" (سید احمد حسن) 4- "خوب آدمی" (شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی) 5- "استاد اردو" (عندلیب شادانی) 6- "شکار طبیب" (والس میتھائس) 7- "باکمال" (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی) 8- "شہسوار مشق سخن" (سیماب اکبر آبادی) 9- "ہمارا ہیرو" (میرون لیزلی مڈلکوٹ) 10- "فلمکار" (خواجہ احمد عباس) 11- "باکمال کرکٹر" (عبدالحفیظ کاردار) 12- "نامور مدیر" (شاہد احمد دہلوی)۔

"شہر خیال"

جنوری 2015ء سے دسمبر 2015ء تک "شہر خیال" میں بسنے والوں کے شائع شدہ خطوط و ای میلو کی تعداد "236" رہی، جن میں "203" مرد حضرات اور "33" محترم خواتین شامل تھیں، سب سے زیادہ محترمی "انور عباس شاہ" کے "11" خطوط شاملِ اشاعت ہوئے، دوسرے نمبر پہ "10" خطوط کے ساتھ مشترکہ طور پہ محترمہ "سدرہ بانو ناگوری" اور محترم "منشی عزیز مئے" رہے، جبکہ تیسرے نمبر پہ "9" خطوط کے ساتھ محترم "شاہد جہانگیر شاہد" رہے، ہر ماہ اوسطاً "20" خطوط شائع ہوئے۔ "158" خطوط ایسے تھے جو دیر سے موصول ہونے کی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

کرسی صدارت پر فائز ہونے والوں کا احوال کچھ اس طرح رہا۔ 01- "شاہد جہانگیر شاہد" (پشاور۔ جنوری، اکتوبر) 02- "رانا محمد سجاد" (مظفر گڑھ) 03- "شوکت رحمان خٹک" (پشاور) 04- "سدرہ بانو ناگوری" (کراچی۔ اپریل، دسمبر) 05- "اویس شیخ" (ٹوبہ ٹیک سنگھ) 06- "اعجاز حسین سٹھار" (نور پور تھل) 07- "مجید احمد جائی" (ملتان) 08- "بشریٰ افضل" (بہاولپور) 09- "مظفر علی خان" (لاہور) 10- "شاہد جہانگیر شاہد" (پشاور۔ اکتوبر) 11- "منشی عزیز مئے" (لڈن وہاڑی)۔

دلچسپ بات یہ کہ اس سال کوئی بھی پورا سال شہر خیال کو رونق نہ بخش سکا، کل آٹھ مرد اور دو خواتین یہ اعلیٰ ترین اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب رہیں، مخدومی شاہد جہانگیر شاہد اور سدرہ بانو ناگوری وہ خوش بخت ہیں جنھیں یہ اعزاز دو مرتبہ حاصل ہوا، جبکہ سال کا سب سے بہترین خط شوکت رحمان خٹک صاحب (مارچ) کا رہا، جو مرحوم "علی سفیان آفاقی" کی خوبصورت یادوں کو تازہ کرنے کے حوالے سے تھا۔

"علمی وادبی جائزہ"

"ڈاکٹر ساجد امجد صاحب۔ بارہ شہ پارے"

ڈاکٹر ساجد امجد کے سحر قلم سے لکھے گئے مقالات ایک دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں، گزشتہ ڈھائی عشروں سے ماہنامہ سرگزشت کے لیے ساڑھے تین سو سے زائد نہایت اعلیٰ پائے کے مقالات ضبط تحریر میں لا چکے ہیں، سال 2015ء کے لیے بھی انہوں نے بہت خوبصورت پیرائے میں بارہ عدد شہ پارے تحریر فرمائے جس پر انہیں جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔

1- "شکوہ سخن (منیر شکوہ آبادی) 2- "باکمال" (آئن اسٹائن) 3- "استاد ادب (ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

4- ''خلاشناس'' (آئزک نیوٹن) 5- ''فلسفی'' (افلاطون) 6- ''امیر ملت'' (حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) 7- ''بلند اقبال'' (پروفیسر سید اقبال عظیم) 08- ''شاطر دماغ'' (لارڈ کلائیو) 9- ''احسن الکلام'' (احسن مارہروی) 10- ''محسن الملک'' (نواب محسن الملک) 11- ''انقلابی'' (لیون ٹراٹسکی) 12- ''جہد برق'' (ڈاکٹر غلام جیلانی برق)۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب کا ہر ایک مقالہ امر مسلم کا درجہ رکھتا ہے، مگر مجھ ناچیز کی دانست میں ماہ جون کا مقالہ جو کہ چشتیہ صابریہ سلسلے کے معروف بزرگ ''حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ'' کے متعلق تھا، تمام مقالات پر برتری لیے ہوئے نظر آیا۔

''انور فرہاد۔ دس شہ پارے''

معروف فلمی صحافی علی سفیان آفاقی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مشہور شاعر و فلمی صحافی جناب انور فرہاد نے شعبہ قلم کے حوالے سے قارئین سرگزشت کو چند یادگار تحاریر سے مستفید فرمایا۔

1- ''خون کے آنسو'' (تاثرات) 2- ''مینا کمال'' (داستان مینا کماری و کمال امروہوی) 3- ''سدا بہار'' (شمشاد بیگم) 4- ''ایور گرین'' (دیو آنند) 5- ''پرفیکٹ حسینہ'' (روزینہ) 6- ''گولڈن وائس'' (طلعت محمود) 7- ''مولا جٹ'' (احوال فلم) 8- ''عجیب شخص'' (اسلم ڈار) 9- ''بہو'' (عشرت سلطانہ) 10- ''مس فٹ'' (بابا عالم سیاہ پوش)۔

مخدومی انور فرہاد صاحب کی ہر تحریر قلب و روح میں سمانے کے قابل تھی، مگر ان کی تحریر ''سدا بہار'' جو کہ سنہری آواز ''شمشاد بیگم'' کے متعلق تھی، کو قارئین کی ایک بڑی تعداد نے نہایت دلچسپی سے پڑھا۔

''منظر امام۔ سات شہ پارے''

وطن عزیز کے نامور ڈراما نگار اور مصنف جناب منظر امام صاحب ماہنامہ سرگزشت کے لیے لازم و ملزوم ہیں، وہ کئی پُر مغز مضامین سے شائقینِ سرگزشت کے دل جیتنے میں کامیاب ٹھہرے۔

01- ''کیسے کیسے لوگ'' (تذکرہ شخصیات) 02- ''پڑھنا منع ہے'' (تذکرہ کتب) 03- ''خزانہ'' (مدفون خزانے) 04- ''دیواریں'' (مشہور دیواریں) 05- ''کھیل'' (عجیب و غریب کھیل) 06- ''پودے'' (معلومات) 07- ''تاریخ عالم'' (تاریخِ عالم کا جائزہ چھ حصے۔ جولائی تا دسمبر)

محترمی منظر صاحب کا کمال یہ ہے کہ قاری کو ساتھ ساتھ لے کر چلنے میں خصوصیت رکھتے ہیں، ان کی ہر تحریر قابلِ تعریف و تحسین تھی، مگر میرے خیال میں ان کی تحریر ''پڑھنا منع ہے'' قارئین کی بھرپور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

''شیراز خان۔ چھ شہ پارے''

گزشتہ سال ''تلاش'' جیسی لازوال تحریر سے شہرت حاصل کرنے والے جناب شیراز خان صاحب کا قلم پورے جوبن پہ نظر آیا۔ 01- ''آب حیات'' (معجزاتی پانی) 02- ''شہر ستم گراں'' (خطرناک شہر) 03- ''خواب'' (انوکھے خواب) 04- ''اسرار'' (تذکرہ مردان غیب) 05- ''کیسے کیسے لوگ'' (معروف افراد کا تذکرہ) 06- ''پرندے'' (معلومات)

شیراز خان کی ہر تحریر پڑھنے لائق تھی مگر جس تحریر کو قارئین نے سند قبولیت بخشی وہ ''خواب'' تھی، مشہور عالم افراد کے خوابوں اور ان کی تعبیرات پر مبنی یہ تحریر ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

''مریم کے خان۔ چھ شہ پارے''

محترمہ مریم کے خان فن حسن تحریر سے بخوبی آگاہ ہیں، اور اس بات کو بہت اہمیت دیتی ہیں کہ قاری کو کیسے الفاظ کے اڑن کھٹولے پر بٹھا کر منزل مقصود تک پہنچانا ہے۔ 01- ''درست فیصلہ'' (تاریخ) 02- ''پُراسرار فلکار'' (زندگی نامہ) 03- ''پھندا'' (مہم جوئی) 04- ''انقلابی'' (زندگی نامہ) 05- ''تسمیہ نام'' (امریکی روداد) 06- ''بگ تھری'' (کرکٹ)۔

یوں تو مریم صاحبہ کی تمام تحاریر داد وصول کر چکی ہیں، مگر ان کی سال بھر کا حاصل تحریر ''بگ تھری'' تھی۔

''حسن رزاقی۔ چھ شہ پارے''

ماہر ہوا پیما جناب حسن رزاقی صاحب دورانِ پرواز جن جن ممالک کے لیے عازم سفر ہوئے، اور اس سفر میں انہیں جو جو مشاہدات و تجربات حاصل ہوئے انہوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کو ایک دلچسپ سفرنامے کی شکل دے کر قارئین کے لیے یادگار بنا دیا، جو کہ ''الوداع'' کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے، مگر اس کے علاوہ بھی رزاقی صاحب نے کچھ تحاریر نذر قارئین کی ہیں۔ 01- ''الوداع'' (سفر نامہ۔ اگست 2014ء سے مارچ 2015ء تک) 02- ''اموشنل انٹیلی جینس'' (علم جدید) 03- ''کمپیوٹر کا سفر'' (سائنسی معلومات) 04- ''کالا چھپرا'' (تاریخ) ''بھکارن''۔ میں

کون ہوں"

حسن رزاقی صاحب کی ہر تحریر جاذبِ نظر تھی، مگر ان کی سائنسی نقطہ نظر سے لکھی ہوئی تحریر "کمپیوٹر کا سفر" کو نوجوان نسل اور علم دوست قارئین نے بہت پسند فرمایا۔

"ابن کبیر۔ پانچ شہ پارے"

ابن کبیر ماہنامہ سرگزشت کے ان معزز لکھاریوں میں سے ایک ہیں، جن کی تحریر پڑھنے کے لیے قارئین پورا مہینا بڑی بے تابی سے منتظر رہتے ہیں، ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک حرف، اپنی جگہ سند کی حیثیت رکھتا ہے، گزشتہ برس ابن کبیر کی بارہ عدد تحاریر زینت سرگزشت بنیں، اب کی بار گو انہوں نے کم لکھا مگر جس موضوع پر لکھا اسے الم نشرح کر دیا۔ 01- "پُراسرار گمشدگی" (روداد گمشدگی) 02- "خلا میں نماز" (ایمان افروز تذکرہ) 03- "شمس العلماء" (زندگی نامہ) 04- "صوفی" (خراجِ تحسین) 05- "خدمتگار" (خراج تحسین)۔

ان کی جس تحریر نے قلب وروح پر گہرے نقوش مرتب فرمائے، وہ "خلا میں آواز" تھی۔

"محمد ایاز راہی۔ پانچ شہ پارے"

محمد ایاز راہی صاحب ملک کے بہترین محققین میں شمار ہوتے ہیں، گزشتہ سال کی مانند اس سال بھی ان کی خامہ فرسائی نے خوب جوہر دکھائے، راہی صاحب کی ماہنامہ سرگزشت کے لیے راہنما تحاریر مندرجہ ذیل ہیں۔

01- "سن سکرت" (علم وادب) 02- "شک" (سبق آموز کتھا) 03- "ساہیوال" (سیر پاکستان) 04- "شاعرات" (اردو ادب) 05- "سخنور" (قدیم ادب عالیہ)۔

ایاز راہی کی ہر تحریر آسمان پہ چمکتے ستاروں کی مانند تھی مگر جس تحریر نے بازی سر کی وہ "سخنور" تھی۔

"سلیم الحق فاروقی۔ پانچ شہ پارے"

قابلِ احترام مصنف سلیم الحق فاروقی نے ماہنامہ سرگزشت کو سال 2015ء میں چند یادگار تحریروں سے یادگار بنا دیا، پانچ تحریریں ان کے نوک قلم کا نتیجہ تھیں۔ 01- "ماہ موسم بہار" (شخصیات عالم) 02 "ماہ مئی" 03- "ماہ جون" 04- "جولائی" 05- "اگست کی شخصیات"۔

محترم سلیم الحق فاروقی نے ایک ہی موضوع پر قابلِ قدر تحاریر کی، قارئین سرگزشت کے قلوب واذہان میں نقش

فرمائی، اس لیے ان کی کسی بھی تحریر کو دوسری پر فوقیت دینا مناسب نہیں۔

"صائمہ اقبال۔ پانچ شہ پارے"

محترمہ صائمہ اقبال صاحبہ جس موضوع پر بھی لکھتی ہیں، "حق تحریر" ادا کر دیتی ہیں، سال 2015ء کی مانند اس سال بھی ان کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بولا، ان کی تحریریں علمی وفکری پیاس بجھاتی ہوئی کچھ اس ترتیب سے نظر نواز ہوئیں۔

01- "احسان" (سبق آموز کتھا) 02- "ستمبر کی شخصیات" (شخصیات عالم) 03- "اکتوبر کی شخصیات" 04- "نومبر کی شخصیات" 05- "دسمبر کی شخصیات"۔

محترمہ صائمہ صاحبہ نے ایک بہت معلوماتی سلسلے کو جاری وساری رکھا ہوا ہے، مگر ان کی تحریر "احسان" مدتوں یاد رہ جانے والی تحریر ہے۔

"طارق عزیز خان۔ پانچ شہ پارے"

مخدومی طارق عزیز خان نے گزشتہ برس کی نسبت اس برس گو کم لکھا، مگر جتنا لکھا خوب لکھا۔

01- "نئی دنیا" (معلومات عالم) 02- "ڈارون کا سفر" (سائنسی معلومات) 03- "صحرائے اعظم" (تذکرۂ صحرا) 04- "سلطنت انکا" (جام جہاں نما) 05- "کے ٹو" (تحقیق)۔

محترم طارق صاحب کی تمام تحاریر ذوق مطالعہ کا باعث تھیں، مگر جس تحریر پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہا، وہ "صحرائے اعظم" تھی۔

"کشمالہ حسن۔ چار شہ پارے"

یہ ماہنامہ سرگزشت کا اعزاز ہے کہ جہاں اسے محترم خواتین کی ایک بڑی تعداد زیرِ مطالعہ رکھتی ہے، وہیں اس ماہنامہ کے معززین لکھاریوں میں اچھی خاصی تعداد خواتین کی بھی ہے، ان محترم خواتین میں سے ایک نام "کشمالہ حسن" کا بھی ہے۔

01- "عزیز جہاں" (خراجِ تحسین) 02- "پُراسرار کتب" (جام جہاں نما) 03- "داستان کرب۔ از۔ کشمالہ حسن ودانیہ صدیقی" (اذیت کوشی) 04- "جنگجو" (دہشت پسندی)۔

یوں تو محترمہ کشمالہ صاحبہ کی ہر تحریر ہی جاذبِ نظر تھی،

مگر ان کی سال کے آخری ماہ میں لکھی گئی تحریر ''جنگجو'' قارئین کو یقیناً پسند آئے گی۔

''اے، آر، راجپوت۔ تین شہ پارے''

01- ''الموڑا کا آدم خور'' (شکار کتھا) 02- ''تلگار تھی کا آدم خور'' (شکار کتھا) 03- ''چالاک چیتا'' (شکار کتھا)

جناب اے آر راجپوت صاحب کی تحریر ''چالاک چیتا'' نمایاں ترین تحریر تھی۔

''ڈاکٹر عبدالرب بھٹی۔ تین شہ پارے''

محترمی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے اس سال بہت کم خامہ فرسائی فرمائی، صرف تین تحریریں ان کی نمائندگی نہیں کرسکتیں۔

01- ''پُراسرار قتل'' (تاریخی قتل) 02- ''گمنام جاسوس'' (جاسوسی کتھا) 03- ''انوکھا گھر'' (تعمیری معلومات)

ڈاکٹر صاحب کی تینوں تحریریں جاندار اور شاندار کے زمرے میں آتی ہیں، مگر ترک خلیفہ کے قتل پر ان کی تحریر ''پُراسرار قتل'' ایک قابلِ تعریف تحریر تھی، جسے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے توشۂ خاص کہا جاسکتا ہے۔

''سلمیٰ اعوان۔ تین شہ پارے''

محترمہ سلمیٰ اعوان صاحبہ نے بھی اپنے قلم سے صفحات سرگزشت کو رعنائی بخشی۔

01- ''کیلاشی کہانی'' (دلچسپ کتھا) 02- ''عیار ساحرہ'' (زندگی نامہ) 03- ''شمعِ اُمید جلا'' (عزم وحوصلہ)۔

محترمہ سلمیٰ اعوان صاحبہ کی تحریر ''عیار ساحرہ'' قارئین سرگزشت کی بھرپور توجہ حاصل کرنے میں زیادہ کامیاب رہی۔

''سیدزین مہدی۔ دوشہ پارے''

سیدزین مہدی کا شمار ان لکھاریوں میں ہوتا ہے جو لفظوں سے کھیلنے کا فن بخوبی جانتے ہیں، اس سال ان کی صرف دوتحریریں اشاعت پذیر ہوسکیں۔

01- ''فن سے بڑا'' (شہنشاہِ موسیقی) 02- ''شاعرِ خوش نوا'' (اردو ادب)۔

سیدزین مہدی صاحب کی تحریر ''فن سے بڑا'' جو کہ شہنشاہِ موسیقی استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے حوالے سے تھی، شائقین سرگزشت کو مدتوں یاد رہے گی۔

''خالد قریشی۔ دوشہ پارے''

محترمی خالد قریشی صاحب کو کم لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی درج بالا دو تحریریں اس سال شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

01- ''آکٹوپس'' (حادثاتی کتھا) 02- ''مدھیہ پور کا چیتا'' (شکاریات)

''انجم فاروق ساحلی۔ دوشہ پارے''

انجم فاروق ساحلی، مشہور قلم رائٹر مرحوم سعید ساحلی کے ہونہار فرزند ارجمند ہیں۔ گزشتہ سال کی نسبت گوانہوں نے کم لکھا، مگر جس قدر لکھا خوب لکھا، ان کی یہ دو تحریریں سند پسندیدگی پانے میں سرخرو ٹھہریں۔

01- ''لباس'' (معاشرتی معلومات) 02- ''آدم خور'' (شکاریات)

جناب ساحلی صاحب کی آخرالذکر تحریر ''آدم خور'' اعلیٰ پائے کی تحریر تھی۔

''امجد رئیس۔ دوشہ پارے''

امجد رئیس گاہے بگاہے آسمان سرگزشت کی زینت بنتے رہتے ہیں، اس سال 2015ء میں ان کی یہ دو تحریریں نمایاں رہیں۔

01- ''لی مان'' (کھیل کھلاڑی) 02- ''شقی القلب'' (جرم وسزا)

''ثنا ثاقب۔ دوشہ پارے''

ثنا ثاقب نے اس سال قارئین سرگزشت کی مطالعاتی ضیافت کو مدنظر رکھتے ہوئے، اپنی دو تحریروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا، جن کی ترتیب کچھ یوں تھی۔

01- ''وہم'' (نفسیات) 02- ''مسلمانانِ ہند'' (معاشرتی تحقیق)

''شکیل صدیقی۔ دوشہ پارے''

مخدومی شکیل صدیقی صاحب اس سال کچھ زیادہ جوہر قلم نہ دکھا پائے۔

01- ''چار روحوں والا'' (زندگی نامہ) 02- ''رہنمائے سیاست'' (سیاسی کتھا)۔

''عقیل عباس جعفری۔ دوشہ پارے''

ملکِ عزیز کے نامور ترین محقق مخدومی عقیل عباس جعفری صاحب نے ذوق مطالعہ و ذوق تحقیق کے حامل قارئین کے لیے اس سال مندرجہ ذیل دو سدابہار تحریریں یادگار چھوڑیں۔

01- "لفظ پاکستان" (تحریک پاکستان) 02- "مشرقی پاکستانی فلمیں" (فلمی تحقیق)۔

قابلِ صد احترام جناب عقیل عباس جعفری کی دونوں تحریریں اپنے دامن میں "سمندرِ تحقیق" سموئے ہوئے تھیں، یہ فیصلہ کرنا خاصہ دشوار ہے کہ زیادہ بہتر تحریر کسے قرار دیا جائے؟ میری دانست میں ان کی اوّل الذکر تحریر "لفظ پاکستان" ہر محبِ وطن قاری کے لیے توشۂ خاص تھی۔

"ایک مصنف ایک تحریر"

اب ہم ان معزز قلمکاروں کی دلفریب تحاریر کا جائزہ لیتے ہیں، جنہوں نے اپنی ایک تحریر سے "آسمان سرگزشت" کو ستاروں جیسی ضیاء بخشی۔

01- "اے رئیس" (اشتہار اجل۔ جنوری) 02- "شکیل ادریس" (ہم پلہ۔ جنوری) 03- "مشتاق عطاری" (سمندری بھیڑیے۔ فروری) 04- "سید احتشام" (عیار اعظم۔ فروری) 05- "عائشہ جونیجو" (سمندر کے بھید۔ فروری) 06- "منیر خان" (چندا ماموں۔ اپریل) 07- "غلام حسین میمن" (سالگرہ کے دن۔ مئی) 08- "محمد ساجد" (سامری۔ مئی) 09- "زویا اعجاز" (تین کھلاڑی۔ مئی) 10- "شبیر بلوچ" (مست توکلی۔ جون) 11- "ابن عنقا" (رنگوں کا سفر۔ جون) 12- "الطاف شیخ" (ہانگ کانگ۔ جولائی) 13- "رئیسہ خالد" (مضبوط قوت ارادی۔ جولائی) 14- "آصف ملک" (سایۂ اجل۔ جولائی) 15- "اختر بلوچ" (منی نہیں گیتا۔ ستمبر) 16- "ذرہ حیدر آبادی" (شاعر کوئی اور ہے۔ ستمبر) 17- "امین بھایانی" (نیند اور خواب۔ اکتوبر) 18- "حسن" (سگی۔ اکتوبر) 19- "عبداللہ احمد حسن" (کراچی کراچی۔ اکتوبر)۔

سال 2015ء میں معزز مصنفین نے انتہائی عرق ریزی اور انتھک محنت و تحقیق کے بعد جو تحاریر نذر قارئین سرگزشت کیں، وہ اپنی جگہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں، ہر تحریر، ہر سطر، ہر لفظ اور ہر حرف کو قارئین نے موتی سمجھ کر چنا اور اپنے دامن علم و آگہی کو مزین فرمایا، ان تمام تحاریر میں سے کسی ایک کا انتخاب، بہت مشکل مرحلہ ہے، مگر یہ مرحلہ طے کیے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں، سال 2015ء میں دو تحریریں ایسی ہیں جن پر قارئین بے اختیار داد دیتے ہوئے نظر آئے، پہلی تحریر جسے بے حد سراہا گیا وہ غلام حسین میمن کی "سالگرہ کے دن" اور دوسری پسند کی جانے والی تحریر محقق علم و ادب جناب "ذرہ حیدر آبادی" کی "شاعر کوئی اور ہے" ہے، ہر دو مصنفین اپنے تحقیقی میدان میں عروج پہ نظر آئے مگر وہی آخری بات کہ بازی کس کے سر رہی؟ تو قارئین کرامی قدر بازی سر کی مخدومی و محترمی جناب "ذرہ حیدر آبادی" نے، وہ اشعار کے حوالے سے ایک اہم ترین تحقیق سے یہ بات ٹھوس شواہد کے ساتھ ثابت کرنے میں کامیاب رہے کہ اصل شعر کس شاعر کا ہے؟

"مستقل سلسلے"

ہمارے محبوب سرگزشت میں جہاں قارئین کے لیے رنگا رنگ موضوعات کے متعلق بہت سا مواد مہیا کیا جاتا ہے، وہیں ان کی دلچسپی کو دوام بخشنے کے لیے "مستقل سلسلے" بھی بڑی شدومد سے نذر قارئین کیے جاتے ہیں۔

"فلمی الف لیلہ۔ علی سفیان آفاقی مرحوم" ملک کی معروف فلمی و علمی شخصیت جناب علی سفیان آفاقی نے ابتدائی شمارے سے جس فلمی داستان کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا، بالآخر اس کا اختتام مارچ 2015ء کو ان کی وفات کی وجہ سے ہوا، دو سو سینتیس ماہ تک جاری رہنے والا یہ سلسلہ نہ صرف ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھا جاتا تھا، اس سال جنوری تا مارچ جن موضوعات و شخصیات پر لکھا گیا وہ یہ تھے حبیب جالب، ذوالفقار علی بھٹو، قبرستان، باغ، لاہور کے مختلف گلی کوچے، قسم اس وقت کی، ظہور راجا، عبدالحفیظ کاردار، مشرقی پاکستان میں فلمسازی، لسانی و تمدنی معلومات، شیکسپیر، کرکٹر فضل محمود، پروڈیوسر ریڈیو اور کلاسیکل استادان موسیقی ۔

"الوداع از حسن رزاقی" ملک کے مشہور ہوا باز جناب حسن رزاقی نے دوران پرواز اپنے مشاہدات و تجربات کو سفر نامے کی صورت میں تحریر فرمایا ہے، انکے تجربات و مشاہدات جو کہ "الوداع" کے نام سے اگست 2014ء سے جاری و ساری تھے، ان کا اختتام مارچ 2015ء میں ہوا، جن کو قارئین کی اچھی خاصی تعداد نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ کرتی نظر آئی۔

"سفر امریکا از علیم شاہد" اس سال ایک نئے لکھاری میدان سرگزشت میں وارد ہوئے اور وہ بھی ایک مستقل سلسلے کی کڑی سفرنامے کے ساتھ، جس کا نام "سفر امریکا" ہے، قابل قدر مصنف نے بڑی جانفشانی اور محنت سے ترقی یافتہ ملک کی تعمیر و ترقی، رہن سہن اور ان کی اعلیٰ اقدار پر بہت خوبصورت پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔

"نانگا پربت کا عقاب۔ ندیم اقبال" دیار غیر سے محترمی ندیم اقبال کا یہ سفر قارئین سرگزشت کی علمی و تفریحی توجہ

حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے، مصنف کا انداز تحریر سامان دلچسپی سے بھرپور نظر آتا ہے۔

''سراب از کاشف زبیر'' ماہنامہ سرگزشت کے مستقل سلسلوں میں سب سے مقبول سلسلہ جسے محترمی کاشف زبیر تحریر کرتے ہیں، زندگی کی مشکل ترین راہوں پر سفر کرتا یہ سلسلہ اپنے طویل سفر پر نہایت کامیابی سے جاری وساری ہے، اس سال اس کی 93 سے 104 تک بارہ اقساط بلا ناغہ پیش کی گئیں، جسے قارئین سرگزشت نے بہت پسند کیا، اور اس حوالے سے محترم کاشف زبیر کی تعریف نہ کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔

ماہنامہ ''سرگزشت'' کے مقبول شعری سلسلے ''بیت بازی'' پہ اک نگاہ ڈال لیجیے، آپ کو ماننا پڑے گا کہ قارئین سرگزشت کا شعری مذاق کس سطح کا ہے؟ ہر ماہ انتخاب شعر میں ہر قاری ایک سے بڑھ کر ایک شعر پیش کرتا ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ جوابی شعر لطف شاعری کو دو آتشہ بنا دیتا ہے، گزشتہ سال کی مانند اس سال بھی قارئین سرگزشت کی ایک اچھی خاصی تعداد نے ''بیت بازی'' کی محفل کو گرمانے کے لیے ''445'' اشعار ترتیب دیے، جن کو صاحبین شعروشاعری نے بے حد سراہا۔

''علمی آزمائش۔ ایک جائزہ'' منتظمین سرگزشت نے اپنے قارئین کی علمی جانچ کرنے کے لیے مدت سے ایک سلسلہ ''علمی آزمائش'' کے نام سے شروع کر رکھا ہے، جس میں اندرونِ ملک اور بیرون ملک سے بہت بڑی تعداد میں قارئین شریک ہوتے ہیں۔ اس سال علمی آزمائش کی 110 سے 121 تک بارہ اقساط پیش کی گئیں، درست جواب دینے والوں کی تعداد ''3351'' رہی، اندرون ملک سے درست جواب ارسال کرنے والوں کی تعداد ''3259'' اور بیرون ملک سے درست جواب دینے والوں کی تعداد ''92'' رہی، ہر ماہ اوسطاً ''279'' قارئین نے درست جواب ارسال فرمائے۔

''سچ بیانیاں۔ ایک جائزہ'' ماہنامہ سرگزشت نے ہر ماہ معاشرے کی اونچ نیچ اور اچھی بری رسومات کی نشاندہی کرنے کے لیے ''سچ بیانیاں'' کے نام سے ایک دلچسپ اور سبق آموز سلسلہ شروع کر رکھا ہے، جس میں معاشرے کا عام سے خاص، اور ہر شعبے کا فرد حصہ لے سکتا ہے، ماہنامہ سرگزشت کے ماہر ترین لکھاری کسی بھی سچ بیانی کو اعلیٰ ترین معاشرتی رنگ میں کہانی کو تحریر کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں، جنہیں پڑھ کر ہر صاحب دل عبرت حاصل کرسکتا ہے، گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی ایک سو آٹھ (108) سچ بیانیاں سرگزشت کے صفحات کی زینت بنیں۔ میری دانست میں سال 2015ء کی سب سے زیادہ پسند کی جانے والی سچ بیانی ''بن باس'' (سائرہ۔ کراچی۔ اگست) تھی، دوسرے نمبر پر آنے والی سچ بیانی ''بکھیل عشق'' (دانیہ صدیقی۔ کراچی۔ نومبر) تھی، اور تیسرے نمبر پر آنے والی سچ بیانی ''فاصلوں کا کرب'' (زویا اعجاز۔ لاہور۔ جنوری) تھی، دلچسپ ترین بات یہ کہ یہ تینوں سچ بیانیاں محترم خواتین کی بیان اور تحریر کردہ تھیں، جنھیں قارئین کی ایک بڑی تعداد نے بے حد پسند فرمایا۔

''پارچہ جاتی جائزہ'' سال 2015ء کے لیے قارئین سرگزشت نے ''183'' نہایت اعلیٰ پائے کے پارچے ارسال فرمائے، جو مختلف موضوعات کے متعلق تھے، ان پارچہ جات سے قارئین کی ترجیحات جانچنے کا موقع بھی میسر آتا ہے، سال 2015ء کا سب سے بہترین پارچہ محترم جناب ''محمد ایاز راہی صاحب'' ماہ دسمبر (صفحہ نمبر 151۔150) کا تھا۔

سچ بیانیاں

سچ بیانیوں کے مصنفین کا مکمل جائزہ نہیں لیا گیا ہے کہ بہت کم مصنفین کی تحریر دوبارہ لگتی ہے۔

''مفید آراء، تنقید اور تجاویز'' ماہنامہ سرگزشت کا معیار بین الاقوامی سطح کا ہے مگر اب بھی بہتری کی گنجائش موجود ہے اس سال 2015ء میں ایک بات بڑے تسلسل کے ساتھ دیکھنے میں آئی کہ ایک ہی موضوع پر کئی محترم مصنفین طبع آزمائی فرماتے نظر آئے، مثال کے طور پر ''جناب منظر امام صاحب'' کا مضمون ''کیسے کیسے لوگ۔ جنوری'' محترمہ ''صائمہ اقبال صاحبہ'' کے مضامین ''ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کی شخصیات'' اور جناب ''سلیم الحق فاروقی صاحب'' کا مضمون ''اگست کی شخصیات'' اس سے یکسانیت پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، جو ایسے بین الاقوامی معیار کے ڈائجسٹ کے لیے کسی بھی صورت مناسب نہیں۔ ایک اور چیز کہ ''تکرار عنوان'' بھی کوئی اچھی روایت نہیں، مثال کے طور پر محترم جناب ''منظر امام صاحب'' کی تحریر ''کیسے کیسے لوگ۔ جنوری'' اور محترم جناب ''شیراز خان صاحب'' کی تحریر ''کیسے کیسے لوگ ۔ جون'' اور یک صفحی سرگزشت میں ''باکمال۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔ جولائی'' جبکہ اسی نام سے محترمی جناب ''ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا مضمون ''باکمال۔ آئن اسٹائن۔ فروری'' پیش کیے جاسکتے ہیں۔

فدائے اردو

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ ایک گیلے کاغذ کی طرح آتشِ غم میں خود ہی جلتا بجھتا رہا مگر سعی مسلسل سے کنارہ کش نہ ہوا۔ قدم قدم پر حاسدین عمیق کھائی بناتے رہے اور وہ چٹان بنا اپنی جگہ جما رہا کہ ہر سُر میں دھڑکنا ہے، ہر تال میں رہنا ہے۔ پھر اس نے جہدِ مسلسل و گہری تحقیق سے وہ وہ نکات سامنے لائے کہ اردو ادب کی تاریخ کا رخ ہی بدل گیا۔ جو لوگ کہتے نہیں تھکتے تھے کہ اردو دہلی میں پیدا ہوئی، ان کی زبان پر قفل لگ گیا جب اس نے ثابت کیا کہ اردو تو پنجاب میں جنمی ہے۔ ایک یہی نہیں تحقیق کے سمندر میں غوطے لگا لگا کر اس نے ایسے ایسے گہر آبدار دریافت کیے کہ اردو ادب کا خزینہ لبالب بھر گیا لیکن افسوس صد افسوس اس محسنِ ادب اردو کو ہم بھولتے جارہے ہیں۔

وہ محسنِ ادب اردو جسے وقت کی گرد چھپا رہی ہے

طغیانی رود موسیٰ نے انگڑائی لی اور کناروں کو توڑ کر اپنی جوانی کا زور آزمانے چل پڑی۔ کچھ دیر تو وہ زمین کے خالی سینے پر ٹہلتی رہی اور پھر شوقِ ملاقات میں بستی تک پہنچ گئی۔ اس کی آمد کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی جس کا جس طرف منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا لیکن کچھ لوگوں کو مہلت نہ مل سکی اور سیلاب کی نذر ہو گئے۔ اس میں صاحب مسند ارشاد حاجی سید شاہ عنایت اللہ حسینی بھی تھے۔ ان کے گھر کا کوئی فرد بھی سیلاب سے باہر قدم نہ نکال سکا۔ سب کے سب مع سید شاہ عنایت غرقِ آب ہو گئے۔

شاہ عنایت کے بیٹے سید غلام محمد شاہ قادری اہل و عیال کے ساتھ ''پربھنی'' گئے ہوئے تھے اس لیے وہ اس بڑی تباہی سے بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کو نسل قائم رکھنی تھی اس لیے غلام محمد شاہ کو بچالیا۔ غلام محمد شاہ قادری صحیح معنوں میں مشائخ خاندان کے فرد تھے۔ انہوں نے اپنے سلسلے کی پیری مریدی کی روایت کو بھی برقرار رکھا تھا اور تبلیغی مساعی میں بھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ مختلف محلوں میں اکثر ان کا وعظ ہوا کرتا تھا جس میں ان کے سیکڑوں معتقدین شرکت کرتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور زعم تخلص کیا کرتے تھے۔ دیہاتی عوام کی مذہبی اور اخلاقی اصلاح کو انہوں نے اپنا نصب العین بنالیا تھا۔

غلام محمد شاہ ''پربھنی'' سے واپس آئے تو رود موسیٰ کا غصہ کم ہو چکا تھا لیکن جو کچھ وہ اپنے ساتھ جا کر لے جاچکا تھا اس کا ازالہ نہیں ہوسکتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی گود میں دبے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور اس طرح دیکھا جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ تیز آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سرخ و سپید چہرہ۔ اپنے اجداد کی مجسم نشانی ہو بہو دادا کی تصویر۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بیوی سے مخاطب ہوئے۔

''ہمارا کارواں کہاں آ کر لٹا ہے۔''

''اللہ کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ میں تو یہ سوچ کر آبدیدہ ہو گیا تھا کہ اگر ''رود موسیٰ'' مجھے بھی نگل چکی ہوتی تو اس بچے کو کون بتاتا کہ یہ کس پاکیزہ خانوادے کا فرد ہے۔ اس کا سلسلہ نسب قطب الاقطاب سید کبیر احمد رفائی تک پہنچتا ہے۔

ہمارے جدِ اعلیٰ سید ابراہیم سپہ سالار عہد تغلق میں وارد دکن ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا سیلاب سلطان محمد تغلق کے دور میں اٹھا جس نے انتظامی امور پر نگرانی رکھنے کی غرض سے دیوگڑھ یا دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت بنانے کا ارادہ کیا اور عجب انداز سے یعنی شاہی فرمان جاری ہوا کہ تمام عمال، فوجی افسران اور متعلقین دلی سے دولت آباد (دکن) ہجرت کر جائیں۔ اہلِ دہلی نے رختِ سفر باندھا اور دکن کی راہ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دہلی ویران اور دکن کے گلی کوچے آباد ہو گئے۔ سید ابراہیم حضرت نظام الدین اولیا کے فیضِ محبت سے مستفید ہوئے تھے اور اسی دربار سے انہیں شیخ کا لقب عطا ہوا تھا۔ وہ بھی اس تہذیبی قافلے کے ساتھ دکن آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

محمد تغلق کا یہ منصوبہ ناکام رہا بعد میں تغلق نے واپسی کا حکم جاری کر دیا لیکن ان میں سے کئی ایک دہلی واپس لوٹنے کی بجائے وہیں آباد ہو گئے۔ سید ابراہیم بھی واپس نہیں گئے۔ یہیں انتقال کیا۔ آج بھی آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔

سید ابراہیم کی اولاد میں بہت سے صاحبان مسند و ارشاد گزرے ہیں۔ ان میں سید علی سانگڑے سلطان مشکل آسانؒ سید شاہ برہان الدین، شاہ جلال الدین رفاعی اور بدیع الدین رفاعی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان پاکیزہ ہستیوں میں ایک میرے والد شاہ عنایت بھی تھے جو اس سیلاب کی نذر ہو گئے۔ اب میں ہوں اور یہ بچہ محی الدین قادری، اللہ ہم دونوں کی حفاظت کرے۔

"آپ کیوں مایوس ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو میرا محی الدین آپ کا نام روشن کرے گا۔"

"مایوسی تو کفر ہے۔ میں مایوس کب ہوں۔ میرے پیر و مرشد نے اس بچے کا نام محی الدین رکھا ہے جس کے معنی دین کو زندگی بخشنے والا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس کے کارناموں سے پورا دکن گونج اٹھے گا۔ شاہ گنج (ایک محلہ) میں کون ہوگا جو اس کی برابری کر سکے گا۔"

غلام محمد شاہ کا صدمہ کچھ کم ہوا تو وہ محی الدین قادری کو لے کر اپنے پیر طریقت محدث عبدالوہاب نقش بندی کی خدمت میں پہنچے۔

"حضرت، محی الدین کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میرے خاندان پر کیا گزر گئی اس سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ اس کے حق میں دعا فرمائیں۔"

پیر صاحب نے ایک نظر اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ڈالی اور یوں گویا ہوئے۔ "اس لڑکے کی پیشانی پر علائم عظمت پائے جاتے ہیں۔ یہ لڑکا خاندان کا نام روشن کرے گا۔"

غلام محمد شاہ اس وقت یقیناً یہ سمجھے ہوں گے کہ ان کا بیٹا خاندانی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے مسندِ تصوف پر جلوہ فرما ہوگا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ بچہ بڑا ہو کر علم و ادب و تحقیق کا گوہر یکتا بنے گا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور کے نام سے مشہور ہوگا۔ یہ زندگی دے گا لیکن علم و ادب کے مردہ فن پاروں کو۔ اس کی جنبشِ قلم سے قدیم شاعروں اور ادیبوں کے فن پارے منظرِ عام پر آئیں گے۔ وہ تاریخ ادب کے ایک بڑے خلا کو پُر کرے گا۔ بہت سے ہیرے جو صدیوں کے گرد و غبار میں دب کر رہ گئے ہیں انہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ دکن کی ادبی تاریخ کو شمالی ہندوستان پر برتری دلائے گا۔ وہ محقق، ماہر لسانیات، ادیب اور شاعر بنے گا۔

محی الدین قادری ذرا بڑا ہوا تو اس پر یہ حقیقت بھی کھل گئی کہ اس کے ددھیال ہی نہیں ننھیال بھی قابلِ فخر ہے۔ اس کی والدہ بشیر النساء بیگم فضیلت جنگ کی رشتے دار تھیں۔ فضیلت جنگ، حیدر آباد کے چھٹے حکمران میر محبوب علی کے دور میں سر رشتہ امور مذہبی کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اس کے پرنانا بودھن (کاغذ نگر) ضلع نظام آباد کے نامور خطیب اور متقی بزرگ تھے۔ نانا محمد وقار الدین کا شمار اپنے وقت کے جید عالموں میں ہوتا تھا۔ محمد وقار الدین کے والد محمد محسن بھی ادیب و شاعر تھے۔

کئی پشتوں کے علم و ادب کے چرچوں نے جب اس گھر میں آنکھ کھولی تو محی الدین قادری کا بچپن اس جھولے میں جھولنے لگا۔ اس خاندان میں خدا پرستی، دینداری اور انسان دوستی کو مقصدِ حیات سمجھا جاتا تھا۔ محی الدین قادری کے لہو میں بھی یہی جذبہ جوش مارنے لگا۔

والد نے ابتدائی تعلیم کے لیے اس کے سامنے کتابیں کھول کر رکھیں تو اس کی ذہانت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ چند ابتدائی قاعدوں کے بعد ہی اسے "مدرسہ دارالعلوم" میں داخل کرا دیا گیا۔ بچے کی ذہانت یہاں بھی کسی سے چھپی نہ رہ سکی۔ اساتذہ نے اس کے والد کو بلایا اور اس کی آئندہ ترقی سے انہیں آگاہ کیا۔

"ہم نے بہت سے بچوں کو پڑھایا ہے لیکن ایسا بچہ ہم پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ حافظہ اس غضب کا ہے کہ سبق

سنتے ہی یاد کرلیتا ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں لیکن یہ تو اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتا ہے۔ لفظوں کے جوڑ توڑ پر سوالات اٹھاتا ہے۔ یہ باتیں ابھی اسے سمجھانے کی نہیں لیکن ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کرتی ہیں۔"

"یہ باتیں آپ مجھے کیا بتا رہے ہیں۔ میں پہلے ہی واقف ہوں۔"

"آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ اس بچے کی حفاظت کیجیے گا۔ یہ دکن کا سرمایہ ثابت ہوگا۔ اگر اسے صحیح تعلیم و تربیت میسر ہوگئی تو یہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دے گا۔"

والدہ فکر مند تھیں کہ والد کو کیوں بلایا ہے۔ اس کی کوئی شکایت تو سامنے نہیں آگئی ہے لیکن جب وہ گھر پہنچے اور والدہ کو بتایا کہ مدرسہ میں اس کی تعریفوں کے پل بندھے ہوئے ہیں۔ والدہ کا خوش ہونا لازمی تھا۔ وہ اس روز مدرسہ سے واپس آیا تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ماں نے بلائیں لیں اور بڑے چاؤ سے اسے کھانا کھلایا۔

مدرسہ کا سفر اس نے چند ماہ ہی میں طے کرلیا۔ اب اسے حیدرآباد کے سٹی ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کے لیے یہ دنیا ہی نئی تھی۔ اس کے شعور نے آنکھیں کھول لی تھیں۔ اب وہ اردو کے ابتدائی قاعدوں سے گزر کر نصاب میں شامل نظموں تک پہنچ گیا تھا۔ ان نظموں کا آہنگ اسے سخت متاثر کرتا تھا۔ وہ ابھی شعر گوئی پر قدرت نہیں رکھتا تھا لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بھی ایسی نظمیں لکھے۔

حیدرآباد شعر و سخن کا مرکز بنا ہوا تھا۔ نظم طباطبائی، جلیل مانک پوری، امجد حیدرآبادی، وحید الدین سلیم، علی اختر صدق جائسی اور فانی بدایونی جیسے شعرا یہاں موجود تھے۔ کثرت سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس ماحول میں شاعر بن جانا کوئی تعجب خیز نہیں تھا۔ اس نے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنا شروع کردیں۔ جب وہ اسکول سے نکل کر جامعہ عثمانیہ پہنچا تو یہاں کی علم پرور فضاؤں نے اس کی شاعری کو مزید جلا بخشی۔ اس نے اپنا تخلص "زور" تجویز کیا اور باقاعدگی سے شاعری کرنے لگا۔

حیدرآباد میں جہان آباد کا آخری شاعر داغ خاموش ہو چکا تھا۔ اب یہاں کی ادبی فضا میں جدید شاعری کے ترانے گونج رہے تھے اور ترقی کی تمنا دکن کے متوسط طبقے کے دل میں بھی پلنے لگی تھی اور اپنے وطن کی سرزمین کا عشق شعر و نغمہ میں ڈھلنے لگا تھا۔ اپنی ثقافت کے تحفظ کا خیال اور اس پر فخر کرنے کا جذبہ نوجوانوں کے دلوں میں گھر کرتا جا رہا

تھا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام انگریزی تعلیم اور انگریزوں کی علمی و تہذیبی برتری کے خلاف ایک مؤثر عملی اقدام بھی تھا۔ وہ بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنے مستقبل سے بڑا پُرامید تھا۔ اس نے اپنے جذبات کو ایک نظم میں سمو دیا۔

اس کے ہر ذرّے کو اشکِ آفتاب اب دیکھیے
عظمتِ ملکِ دکن کو بے نقاب اب دیکھیے
ہو چکا منت کشی کا سدباب اب دیکھیے
دیکھیے ہاں دیکھیے یہ انقلاب اب دیکھیے
داغ ہائے منتِ اغیار دھوتے جائیں گے
نونہالانِ چمن شاداب ہوتے جائیں گے

اس زمانے میں اس نے جتنی نظمیں کہیں ان میں ایک ابھرتے ہوئے شاعر کی ذہنی عکاسی تو ملتی ہے، داخلی جذبات کی ترجمانی تو ہے لیکن ندرتِ فکر اور رفعتِ تخیل نہیں۔ فطری طور پر عشقیہ جذبات کی فراوانی ہے۔

نہیں یاد ابھی وہ دن تھی تیری جبیں سادہ
عاری تھا جفا سے تو تھا جور سے بے گانہ
تھا دخل نہ غمزے کا عشوے سے نہ دلچسپی
انداز سے کچھ مطلب شوخی سے نہ یارانہ
وہ راحت جان بننا وہ روٹھ کے من جانا
وہ من کے بگڑ جانا وہ شوق کا اکسانا
وہ نور کی کرنوں کا چہرے پہ چمک جانا
وہ وقت خرام ان کے اعضا کا لچک جانا
مخمور سی آنکھیں وہ محجوب سی باتیں وہ
محبوب ادائیں وہ رفتار وہ مستانہ

اس وقت کے نوجوان شعرا میں رومانیت اور ماورائیت کے ملے جلے جذبات کا نفوذ بڑھتا جا رہا تھا۔ زور بھی اس اثر سے بچ نہ سکا۔ کسی بھی شاعر کا ابتدائی دور تقلیدی دور ہوتا ہے۔ وہ بھی ٹیگور کے انداز میں نظمیں لکھنے لگا۔ اس نے ایک نظم چاندنی لکھی۔

پھر ذکر رونقِ شبِ مہتاب آگیا
سامانِ وحشتِ دلِ بے تاب آگیا
موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی
اے کاش مل سکے نگہ یار بھی وہی
ہوگا یونہی فلک پہ صدا ماہ ضوفشاں
مل جائے میرا چاند ہے وہ چاندنی کہاں

وہ شاعری کی دنیا میں مست تھا۔ کہتے ہیں جوانی میں ہر آدمی شاعر ہوتا ہے اس کا حال بھی یہی تھا۔ اس نے بہت

جلد اتنا شعری سرمایہ جمع کرلیا کہ ایک دیوان شائع ہوسکتا تھا لیکن اس کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست سید محمد کے ساتھ ایک کتب خانے میں چلا گیا۔ فہرست دیکھی تو اس کی نظر چند قلمی نسخوں پر پڑی۔ اسے دلچسپی ہوئی کہ پرانے لوگوں کا ''خط'' دیکھے۔ اس زمانے کا کاغذ دیکھے۔ یہ دیکھے کہ آج کی اور برسوں پہلے کی زبان میں کیا فرق آگیا۔ کس لفظ کو وہ کس طرح لکھتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ایک ''مخطوطہ'' نکلوا لیا۔ بڑے شوق سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کاغذ کی کہنگی، زبان کی اجنبیت اور خط کی قدامت نے اسے لاجواب کردیا۔ اس نسخے کی کتابت بھی اس کے لیے اجنبی تھی۔ حروف ایک دوسرے میں اتنے گتھے ہوئے اور ایک لفظ دوسرے لفظ سے اتنے پیوست تھے کہ پڑھنا مشکل تھا۔ وہ بڑی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ چند الفاظ اندازے سے پڑھ لیے ورنہ سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ سید محمد نے بھی کوشش کی لیکن جلد ہی اکتا گیا اور کوئی مطبوعہ کتاب پڑھنے بیٹھ گیا لیکن محی الدین برابر کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح یہ ''معمے'' حل کرلے اور بالآخر تھک ہار کر دونوں باہر نکل آئے۔

''یہ کیا پاگل پن ہے۔'' سید محمد نے کہا۔

''کیسا پاگل پن۔''

''یہ کہ تم قلمی نسخے لے کر بیٹھ گئے اور ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا۔''

''یار یہ قلمی نسخے ہیرے کی کانوں کی طرح ہیں۔ محنت کے بغیر یہ ہیرے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ یہ ایسا گورستان ہے جس میں ہماری تہذیب دفن ہے۔ حیدرآبادی ہونے کے ناتے ہم پر یہ قرض ہے کہ ہم اس تہذیب کو دریافت کریں اور دنیا کے سامنے پیش کریں۔ شمالی ہندوستان آج اپنی برتری ثابت کررہا ہے۔ یہ قلمی نسخے انہیں جتا سکتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کے ادب میں بھی کیسے کیسے پھول کھلائے تھے۔ خاص طور پر قطب شاہوں نے ادب میں کیسے کیسے اضافے کیے تھے۔''

''یہ سب تو اس وقت ہوگا جب تم یہ نسخے پڑھ سکو گے۔''

''ہاں یار، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کا پڑھنا اتنا مشکل ہوگا لیکن مجھے امید ہے کہ مسلسل مشق کے بعد میں ان کو پڑھنے لگوں گا اور ان شعرا کو بازیاب کرلوں گا جنہیں زمانے کی دھول نے گم نام کررکھا ہے۔ جن کے ڈنکے بجتے ہوں گے۔ آج انہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ چھت پر چڑھنے کے لیے سیڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مطبوعات سیڑھیاں ہیں۔ ہم ان پر چڑھے بغیر چھت پر نہیں پہنچ سکتے۔ ان مخطوطات کو اگر نہیں پڑھا گیا تو ہماری تاریخ ادھوری رہ گئی۔ حیدرآبادی تاریخ کا اصل چہرہ ان نسخوں میں پوشیدہ ہے۔''

''میری جان! اگر یہ کام اتنا آسان ہوتا تو بہت سے محققین پہلے ہی کرچکے ہوتے۔''

''اگر کسی نے نہیں کیا تو کیا ہم بھی نہ کریں۔''

یہی باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

اب اس نے روز کا معمول بنالیا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ کسی ایسے کتب خانے میں چلا جاتا جہاں مخطوطات مل سکتے تھے اور انہیں پڑھنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہورہی تھی کہ اب وہ ان مخطوطات کی عبارت کو تھوڑا بہت پڑھنے لگا تھا۔

اسی زمانے میں مولوی عبدالحق نے بھی دکنی مخطوطات سے دلچسپی لی لیکن دکنیات سے انہیں وہ دلی وابستگی نہیں ہوسکی تھی جو محی الدین زور کو دکنی ہونے کی وجہ سے تھی۔ قطب شاہی دور وہ دور تھا جس میں اس کا تخیل سانس لیتا تھا۔ اس عہد پر کام کرنے کے لیے جس ہمدردانہ رویے کی ضرورت تھی وہ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

وہ ان مخطوطات میں ایسا منہمک ہوا کہ شاعری کی طرف سے تقریباً لاتعلق ہوگیا۔ حیدرآباد کے جن بزرگ شعرا نے اس سے توقعات وابستہ کرلی تھیں انہیں سخت مایوسی ہوئی کہ کیسا ابھرتا ہوا شاعر کس طرح ڈوب رہا ہے۔ تخلص جان سے لپٹا ہوا تھا لیکن شاعری ترک کردی تھی۔ یار دوست اس پر پھبتیاں کستے تھے۔ ''شاعر تخلص'' کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ قافیے جوڑنے میں ضائع کرتا رہے۔ اس کے استاد وحید الدین سلیم نے اس کا ذوق تحقیق دیکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔

''میاں حیدرآباد میں شاعروں کی کمی نہیں۔ تم تو کوئی ایسا کام کرڈالو کہ مادر جامعہ کا نام روشن ہو۔ تمہارے لیے تحقیق و تنقید کا میدان کھلا ہوا ہے۔''

محی الدین زور نے اس نصیحت پر پوری طرح عمل کیا اور شاعری سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس کے دوستوں کو مایوسی ضرور ہوئی لیکن زور کے لیے نئے آسمان کھلے ہوئے تھے۔

ایم اے کا امتحان ہوا۔ اس نے اس امتحان میں اعزازی کامیابی حاصل کی۔ اچانک اس کی صلاحیتیں حکومتِ حیدرآباد کی نظروں میں آگئیں۔ مقتدر اساتذہ کی سفارشات بھی اس کے حق میں تھیں۔ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر نے اسے حیدرآباد کا سرمایہ قرار دے کر سفارش کی کہ اسے بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا جائے۔

وہ ابھی اپنے لیے کسی راہ کی تلاش کر ہی رہا تھا کہ اس کے نام خط آگیا۔ اسے سرکاری وظیفے پر انگلستان بھیجا جارہا تھا۔ اس نے فوراً ہامی بھرلی اور تیاری کرنے لگا۔

اس نے والدین کی دعائیں سمیٹیں اور لندن روانگی کے لیے بمبئی پہنچ گیا جہاں اطالوی جہاز ''کرکویا'' اس کا منتظر تھا۔ یہ منظر اس کے لیے دلچسپ بھی تھا اور نیا بھی۔ ظاہر ہے اس سے پہلے اس نے بحری سفر نہیں کیا تھا۔

لندن پہنچنے کے بعد دوسرے دن وہ یونیورسٹی پہنچا اور داخلے کی کارروائی مکمل کی اور ان اساتذہ سے ملاقات کی جن کے مشوروں اور نگرانی میں اسے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کرنا تھا۔

کچھ دن کے آرام کے بعد جب وہ لندن کی سیر کو نکلا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان لوگوں نے کتنی ترقی کرلی ہے یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوتی تھی۔

جب مقالے کی تیاری کا کام شروع ہوا تو اس کا بیشتر وقت برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی لائبریری میں گزرنے لگا۔ برٹش میوزیم میں اس کا من پسند خزانہ مخطوطات کی شکل میں مل گیا۔ انڈیا آفس لائبریری کا ذخیرہ تو ایک خزانہ تھا جسے دیکھ کر محققین اور طلبہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں۔ اس نے کچھ دن بعد پرانی کتابوں کی ایک دکان تلاش کرلی جہاں سے وہ کتابیں خریدتا رہا۔

اس نے دو سال کی مدت میں اپنا مقالہ مکمل کرکے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس کا مقالہ اردو کے آغاز ارتقا سے متعلق تھا۔

تحقیق کے سلسلے میں اس کی ملاقات پروفیسر ٹرنر سے ہوئی۔ انہوں نے ہند آریا کی زبانوں کی تحقیق میں اپنی عمر گزاری تھی۔ یہ وہ استاد تھے جن کے سامنے آدمی کو اپنی حیثیت کا پتا چل جاتا تھا۔ اس نے ابتدائی سنسکرت اور لسانیات کی تعلیم پروفیسر ٹرنر سے اور صوتیات کی تعلیم لارڈ جیمس سے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن میں حاصل کی۔

اس وقت تک جدید لسانیات کی طرف بھارت اور پاکستان میں کوئی خاص توجہ یا دلچسپی نہیں تھی۔ ڈاکٹر زور غالباً پہلے آدمی تھے جو لسانیات کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

انگلستان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پیرس پہنچے اور صوتیات کی تحصیل کے لیے یونیورسٹی کالج میں پروفیسر ڈینیل جونس اور ای آرمسٹرانگ کے شاگرد رہے اور ہندوستانی فونیٹکس پر مقالہ مکمل کیا۔ تحصیلِ علم کی پیاس پھر بھی نہیں بجھی تو سوربون یونیورسٹی پیرس میں نگرانی پر پروفیسر جے بلوک کی نگرانی میں کام شروع کردیا۔

اب واپسی کا سفر شروع ہوگیا تھا۔ جنیوا سے روم اور پھر کولمبو پہنچے۔ کولمبو سے مدراس آئے اور یہاں سے اپنے وطن حیدرآباد پہنچ گئے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی بارعب اور سرخ و سفید چہرہ، بھاری بھرکم جسم، ہونٹوں پر پان کی سرخی۔ پاٹ دار آواز، پاؤں میں سلیم شاہی، چیک کے ڈیزائن کی شیروانی، ڈھیلا پاجامہ، سر پر شیروانی کے کپڑے سے تیار کی ہوئی ٹوپی۔

تقریباً پانچ سال کی طویل غیر حاضری کے بعد وہ اپنی مادرِ علمی جامعہ عثمانیہ پہنچے۔ اس کی ترقی دیکھ کر خوش تو ہوئے لیکن یورپ کی یونیورسٹیوں سے اس کا موازنہ کیا تو انہیں مایوسی بھی ہوئی اور دل میں تہیہ کرلیا کہ اگر موقع ملا تو اس جامعہ کے لیے بہت کچھ کریں گے۔

1884ء میں ریاست حیدرآباد نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت عطا کی تھی۔ سالار جنگ نے ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے شمال سے قابل اور باصلاحیت افراد کو دکن مدعو کیا اور انہیں ذمہ دار عہدوں پر فائز کرکے ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال سے جوق در جوق اہلِ علم حیدرآباد کا رخ کرنے لگے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں اپنے اہلِ زبان ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ دکنیوں کی بول چال پر اعتراض کرتے اور ان کے قدیم ادبی سرمائے کی حقیقی قدر و قیمت سے ناواقف تھے اس صورتِ حال نے حیدرآباد کو ایک طرح کے احساس کم تری میں مبتلا کردیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے اس صورتِ حال کو محسوس کیا اور ارادہ کرلیا کہ وہ اس احساس کم تری کو دور کریں گے اور ثابت کریں گے کہ اہلِ دکن بھی علم و ادب میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ دو قدم آگے ہیں۔ دکنی مخطوطات کو منظرِ عام پر لاکر اس کی قدامت ثابت کریں گے اور ثابت کریں گے کہ شمال میں جب کوئی اردو لکھتا بھی نہیں تھا اہلِ

دکن اردو میں دیوان مرتب کر رہے تھے، نثری ادب کا ذخیرہ جمع کر رہے تھے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی جگہ خالی تھی۔ ڈاکٹر زور کو ان کی علمی صلاحیتوں اور قابلیت کی بنا پر عثمانیہ یونیورسٹی نے ریڈر کی حیثیت سے مامور کر دیا۔

وہ ابتدا ہی سے اس بات پر زور دے رہے تھے کہ اردو کی ادبی شخصیات کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے تاکہ سب مل کر دکنی ادب کے فروغ کے لیے کوشاں ہو جائیں۔ یورپ جانے سے پہلے تو خیر ان کی آواز ایک طالب علم کی آواز تھی لیکن جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر ہو گئے تو ان کی آواز میں وزن پیدا ہو گیا۔ مواقع بھی فراہم تھے۔ انہوں نے متحدہ طور پر اردو زبان کی خدمت کرنے کے مقصد کے تحت ایک علمی انجمن کی بنیاد رکھی جس میں ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے۔ مختلف موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے، کلام سنائے جاتے اور مباحثے ہوتے۔

جب بھی اس قسم کی انجمنیں بنتی ہیں نوجوان سب سے پہلے آگے آتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ حیدرآباد کے خوش فکر نوجوان کثرت سے شرکت کرنے لگے۔ ہفتہ وار محفلیں سجنے لگیں۔ بزرگ شعراء بوجوہ اس سے دور دور رہے۔

جب اس انجمن کی شہرت ہونے لگی تو اس کے مخالفین بھی پیدا ہو گئے۔ انہوں نے وزیراعظم سر اکبر حیدری کو یہ باور کرایا کہ یہ انجمن ریاست دشمن ہے۔ یہاں جو نوجوان جمع ہوتے ہیں وہ ادب کے پردے میں سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ ریاست کے خلاف بغاوت کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ اس وقت اردو ادب میں ترقی پسندر جحانات تیزی سے فروغ پا رہے تھے۔ خود ڈاکٹر زور اس بارے میں کوئی تعصب نہیں برت رہے تھے۔ ترقی پسندی کے بارے میں ان کے نظریات نہایت متوازن تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

"اپنے خاندانی یا موروثی مزاج کے مطابق دونوں خوبیاں دیکھتا ہوں۔ رواداری اور مرنجا مرنج طرزِ زندگی میرے حصے میں آئی ہے۔ غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ پیرس میں دو سال بہت اعلیٰ پائے کے کمیونسٹ احباب کے ساتھ رہا ہوں اور اب بھی سجاد ظہیر جیسے ترقی پسند ادیبوں کا شمار میرے مخصوص دوستوں میں ہے۔ میں کام کی قدر و قیمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں دیکھتا کہ کس گروہ یا مذہب اور مسلک کے ادیب و شاعر کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمر ہے۔"

ڈاکٹر زور کی اتنی حوصلہ افزائی کے باعث بیشتر ترقی پسند نوجوان بھی اس انجمن میں شامل ہو گئے تھے۔ مخالفین کو اچھا موقع مل گیا اور انہوں نے سر اکبر حیدری کو یہ باور کرا دیا کہ کمیونسٹ خیالات رکھنے والے نوجوان یہاں جمع ہوتے ہیں اور حکومت کے خلاف باتیں ہوتی ہیں۔ ریاستی ماحول میں یہ شائبہ بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی ریاست کے خلاف باتیں کرے۔ سر اکبر حیدری نے انجمن میں شرکت کرنے والے نوجوانوں کو چائے پر مدعو کیا اور فرداً فرداً ان سے باز پرس کی۔ ان نوجوانوں نے ہر چند انکار کیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سیاست سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں اور اس انجمن میں ادبی موضوعات پر مباحث ہوتے ہیں لیکن سر اکبر حیدری کو اپنی معلومات پر اتنا یقین تھا کہ ان سے سچ اگلوانے پر مصر رہے۔ یہ ملاقات بدمزگی پر ختم ہوئی۔ نوجوانوں نے اس خوف سے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو اس انجمن کے جلسوں میں آنا چھوڑ دیا اور بالآخر اسے تحلیل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زور اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ یہ انجمن تو انہوں نے محض آغاز کے لیے بنائی تھی۔ ان کے عزائم تو اس سے بڑے تھے۔ وہ کوئی ایسا ٹھوس کام کرنا چاہتے تھے جس سے ادب کی خدمت ہو۔ انہوں نے نصیر الدین ہاشمی، عبدالقادر سروری اور عبدالمجید صدیقی کے تعاون سے "ادارہ ادبیات اردو" کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس ادارے کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

1۔ اردو زبان کے فروغ و اشاعت کے کام کو آگے بڑھانا۔

2۔ اردو شعر و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا۔

3۔ شعرا اور مصنفین کی حوصلہ افزائی کرنا اور تصنیف و تالیف کی سہولتیں بہم پہنچانا۔

4۔ ملک کی تاریخ سے دلچسپی پیدا کرنا، قدیم آثار اور تاریخ و ادب کے شہ پاروں کی حفاظت کرنا۔

5۔ ایک سہولت بخش کتب خانے کا انتظام۔

انہوں نے اعلان تو کر دیا تھا۔ اس کے قیام کے مقاصد بھی سب کو معلوم ہو گئے تھے لیکن آغاز ہی میں بڑے پیمانے پر اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ مخالفت بھی سربرآوردہ لوگوں کی طرف سے تھی۔ ایک ادبی گروہ نے اسے انجمن ترقی اردو کا مدمقابل سمجھ لیا تھا اور اس ادارے کو غیر ضروری

سمجھتے تھے۔ کافی دنوں یہ مخالفت جاری رہی اور پھر بالآخر دم توڑ گئی۔

ڈاکٹر زور نے مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ کام کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ انہوں نے ادارۂ ادبیات کی بارہ شاخیں بنائیں اور اپنے ذمہ دار احباب کو ان مختلف شاخوں کی دیکھ بھال پر مامور کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے شیدائیوں کو اپنے گرد اکٹھا کرلیا۔

''شعبہ زبان سے'' اس وقت کے نامور اہلِ قلم وابستہ تھے۔ قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر یوسف حسین، عبدالقادر سروری اور خود ڈاکٹر زور شعبہ زبان کے لیے کام کررہے تھے۔ ان ادیبوں نے زبان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ لفظوں کی تذکیر و تانیث، ان کے مخصوص محل استعمال، کہاوتوں اور پہیلیوں کو جمع کیا ایسی اصلاحات کا جائزہ لیا جو دفاتر میں استعمال کی جارہی تھی۔

ادارے نے اپنا ترجمانی پرچہ ''سب رس'' جاری کیا جس میں یہ اصلاحات شائع کی جاتی تھیں۔

شعبہ تنقید کے تحت یہ کام رکھا گیا کہ وہ مصنفین میں تنقیدی شعور پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ انگریزی ادب سے گہری واقفیت رکھنے والے اردو داں حضرات کو انگریزی تنقید کے اصولوں اور طریقہ عمل سے واقف کروائیں۔ اس کے لیے بھی ''سب رس'' کے صفحات استعمال کیے گئے اور تنقیدی مضامین شائع کرکے تنقیدی ذوق کی آبیاری کی۔

اس وقت بڑا ضروری تھا کہ غیر ملکی شہ پاروں کے تراجم شائع کیے جائیں تاکہ اردو داں طبقہ اعلیٰ ادب سے واقف ہو اور ان میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہو۔

اس شعبے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تاریخ داں حضرات سے ایسی کتابیں لکھوائی جائیں جو دکن کی تاریخ و ثقافت کا احاطہ کرسکیں۔

تاریخی تحفظ کے لیے اس شعبے نے بار بار رجوع کیا اور کتبات کے چربے ادارے میں محفوظ کردیے گئے۔ اس طرح دکن کے تاریخی آثار کو بچانے کی جدوجہد میں اس شعبے نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔

ادارے کے ایک شعبے نے کتابیں چھاپنے کا اہتمام کیا جس نے شعرا اور مصنفین کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ تاریخ ادب اردو کی تدوین کی گئی۔ اس میں شامل بیشتر مواد ڈاکٹر

زور کا مرہونِ منت تھا۔
ڈاکٹر زور کی آنکھیں دور تک دیکھ رہی تھیں۔ وہ صرف ادب و شعر تک محدود نہیں رہے۔ انہوں نے موجودہ ضرورتوں اور تقاضوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے شعبہ سائنس قائم کیا۔ اس وقت تک اردو میں طبعی علوم سے متعلق کتابوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس شعبے نے سائنسی علوم کی معلومات کو عام فہم انداز میں عوام تک پہنچایا۔ ان کتابوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کو اس سے بہت فائدہ پہنچا کیونکہ وہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھا۔

ادارہ ادبیات اردو ایسے مثبت اور ٹھوس کام کر رہا تھا کہ مخالفین لاجواب ہوگئے۔ آہستہ آہستہ مخالفت کا زور مدھم پڑ گیا۔ مخالفین بھی اس ادارے کے اشاعتی پروگرام کے تحت اپنی کتابیں شائع کرنے کے خواہاں ہوگئے۔ اب تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دکن کا ہر شاعر ہر ادیب ڈاکٹر زور کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھا ہے اور ان کی علمی و انتظامی صلاحیتوں کا معترف ہے۔ ڈاکٹر زور کی تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مخطوطات پڑھنے میں انہیں کمال حاصل ہوگیا تھا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے مشق فراہم ہوگئی تھی۔ یورپ جاکر لسانیات کی تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا ان مخطوطات کو وہ اتنی آسانی سے پڑھتے تھے جیسے کوئی عام کتاب پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے قدیم نسخوں کو تلاش کیا اور انہیں پڑھ کر اپنی ٹیم کو مواد فراہم کیا جس کے نتیجے میں کئی قدیم شعرا کے دواوین سامنے آئے۔ دکنی ادب کا دامن ادبی سرمائے سے بھرنے لگا۔

ان کا مقصد صرف قدیم ادب کو منظرِ عام پر لانا نہیں تھا بلکہ موجودہ دور کے لیے ترقی کی راہیں متعین کرنا بھی تھا۔ ان کا مشاہدہ بتا رہا تھا کہ دکن کی مستورات میں بھی علمی ذوق بھرپور ہے لیکن پردے کی مجبوری انہیں مردوں کے برابر لانے میں حائل ہے۔ وہ مردوں کی طرح مشاعروں میں آنے سے بھی معذور ہیں اگر انہیں پلیٹ فارم میسر آجائے تو ان کی صلاحیتیں دوگنی ہو جائیں۔ انہوں نے نہایت کدو کاوش کے بعد صاحبِ علم خواتین کی نشاندہی کی، ان سے رابطہ کیا اور اپنے ادارے کے تحت ان کی تصانیف شائع کیں۔ اس عمل سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انہوں نے اس مقصد کو مزید فعال بنانے کے لیے ادارہ ادبیات اردو کے تحت شعبہ خواتین قائم کیا۔ اس شعبے کا تمام کام خواتین کے ہاتھ میں تھا۔ باپردہ خواتین ان سے رجوع کرتی تھیں اور اپنی تخلیقات کی اشاعت کا بندوبست کرتی تھیں۔

ڈاکٹر زور نے ایک جامع انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ جو کام شروع کرتے تھے اسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاتے لیکن یہ منصوبہ آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ اتنا عظیم کام تھا کہ اسے پورا کرنے کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی۔ پھر بھی اسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاتے تھے لیکن یہ منصوبہ آگے نہ بڑھ سکا۔ حکومت کی امداد کے بغیر صرف ارکان کے عطیات ناکافی تھے لہٰذا یہ بھاری پتھر اٹھانے سے پہلے ہی ہاتھ کھینچ لیا اور پھر کبھی اتنی فرصت نہ ملی کہ اس اسکیم پر عمل ہوتا۔

ڈاکٹر زور کے ذہن میں کئی اور منصوبے بھی کروٹیں لے رہے تھے لیکن مالی دشواریاں ہر جگہ آڑے آ رہی تھیں۔ ادارے کی نہ کوئی عمارت تھی نہ ماہانہ آمدنی کا کوئی وسیلہ۔ ادارے کی کارروائیوں کے لیے اپنے گھر کا ایک حصہ وقف کردیا تھا۔ اردو کے بہی خواہ اس چھوٹے سے حصے میں جمع ہوتے تھے۔ علمی مجلس ہوتی تھیں۔ منصوبے بنتے تھے، چندہ جمع ہوتا تھا۔ تصنیفات شائع ہوتی تھیں۔

کام پھیلتا جارہا تھا۔ چادر چھوٹی پڑتی جارہی تھی۔ انہوں نے پھر ہمت کی اور اپنے بنگلے سے متصل چند چھوٹے کمرے تعمیر کروا کر مختلف شعبوں کے لیے مخصوص کردیے۔ ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں بڑے بڑے لوگ آتے تھے۔ ایک روز ایک حکومتی عہدے دار غلام محمد تشریف لائے۔ یہ صدر المہام فنانس کے ذمہ دار عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے اس دفتر کا معائنہ کیا اور اس کے تحت جو کام ہو رہے تھے ان کی روئیداد سنی تو ششدر رہ گئے۔

”حکومت پر بار ڈالے بغیر آپ اتنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔“ انہوں نے ڈاکٹر زور سے کہا۔

”افسوس تو یہی ہے کہ حکومت کوئی مدد نہیں کر رہی ہے۔“

”آپ تو وہ کام کر رہے ہیں جو حکومت کی سرخروئی کا باعث ہے، اسے تو آپ کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔“

”ہم حکومت سے کئی بار درخواست کر چکے ہیں مگر شنوائی نہیں ہوتی۔“

”میں جتنی کوشش کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

غلام محمد نے سرکاری عہدیداروں کی طرح محض وعدہ نہیں کیا بلکہ خصوصی دلچسپی لی اور حکومت نے اس ادارے کے لیے گرانٹ منظور کردی۔

بیگم زور نے اپنے کمپاؤنڈ میں ایک پلاٹ بطور عطیہ عنایت کر دیا۔

عرصہ دراز سے ادارے کے لیے علیحدہ بلڈنگ کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ حکومت کو درخواست بھی پیش کی گئی تھی جس پر حکومت نے یک مشت رقم دینے کی بجائے عمارت کے لیے سالانہ رقم منظور کر دی تھی۔ جب بیگم زور نے پلاٹ عنایت کر دیا تو حکومت سے یہ رقم حاصل کر لی گئی۔

یہ کوئی معمول کامیابی نہیں تھی۔ اسے غیر معمول بنانے کے لیے فیاض الدین آرکیٹیکٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ فیاض الدین بہزاد دکن کہلاتے تھے۔ انہوں نے بھی حق ادا کر دیا۔ نہایت خوب صورت نقشہ تیار کیا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں مغل اور قطب شاہی طرز تعمیر کا امتزاج قائم رکھا تھا۔

یہ عمارت پنجہ گٹہ روڈ پر تعمیر ہونا شروع ہوئی۔ حسن نظامی نے ایوانِ اردو نام تجویز کیا۔ یہ عمارت آج بھی اپنی دلکشی اور وقار کے ساتھ موجود ہے اور ڈاکٹر زور کی بے لوث خدمت گزاری کی داستان سناتی ہے۔

اب اس عمارت میں اتنی جگہ تھی کہ نایاب کتابیں سلیقے سے رکھی جاسکیں۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ نادر اشیاء، قدیم نقشہ جات ادیبوں کے خطوط، گرانمایہ مخطوطات اور قدیم فرامین و دستاویزات جمع ہونے لگے۔ اس عمارت میں موجود کتب خانہ ایک میوزیم بن گیا جس میں دکن کی ثقافت کو آنکھوں سے دیکھا جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر زور کو حیدر آبادی تہذیب سے جو عشق تھا اس عمارت کو انہوں نے اس کی یادگار بنا دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی معلوم ہوتا تھا ہم قطب شاہی دور میں داخل ہوگئے ہیں یا عادل شاہی دور کی سیر کو نکلے ہوئے ہیں یا بیجاپور ہمارے سامنے ہے۔

☆......☆

دکن کے عوام اپنی روایات کا تسلسل قطب شاہوں کے گولکنڈے میں تلاش کرتے تھے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کا سہرا ''ولی'' کے سر سجا ہوا تھا لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس سے بہت پہلے قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ دیوان مرتب کر چکا تھا۔ تہذیبی اور ادبی روایات کا سلسلہ گولکنڈہ تک جاتا تھا۔ قلی قطب کا دیوان ہی یہ بتانے والا تھا کہ گولکنڈہ کی تہذیب کیا تھی لیکن یہ دیوان دنیا کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔

دکنیوں کو قطب شاہی تہذیب سے اس لیے موالست اور عقیدت تھی کہ یہ تہذیب ان کی سماجی زندگی کا ایک جزو

بن چکی تھی اور اس کا نفسیاتی اثر۔ سال ہا سال سے یہاں برابر قائم تھا جس ثقافتی وحدت کو دکنی تہذیب کہا گیا ہے وہ دراصل مغل تہذیب سے دوری اور قطب شاہی تہذیب کی روایات کی پاسداری کے رجحانات کی ترجمانی تھی۔

ڈاکٹر زور کے ادبی شعور کی نشوونما بھی اسی دکنی تہذیب میں رہتے ہوئے ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فطری طور پر اس تہذیب کو جو قطب شاہی سرچشموں سے سیراب ہوئی تھی اور جس کی ترجمان دکنی زبان تھی اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔

اس تہذیب کا نمائندہ بن جانے کے بعد ان پر لازم آگیا تھا کہ وہ اردوئے قدیم کی بازیافت کریں اور وہ اس کوشش میں مصروف رہے۔

اس کا عقیدہ تھا کہ شمال میں جس زبان کو ''اک بات لچر'' کہا جارہا ہے وہ علم و ادب کے انمول خزانوں سے مالا مال ہے۔ اس زبان کے ایسے شاعروادیب پیدا ہوچکے ہیں جن کی تخلیقات نے اردو ادب کو سربلند و سرفراز کر دیا تھا لیکن زبانی کون مانتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ان ادب پاروں کو تلاش کیا جائے۔ ان شخصیات کی قبروں کو ڈھونڈا جائے، ماضی کا سینہ چاک کر کے فرامین شاہی کو نکالا جائے۔

ڈاکٹر زور نے اسی جذبے کے تحت تحقیق کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔

انہوں نے سختیاں جھیلیں اور راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے اورنگ آباد، بیدر، گلبرگ، بیجاپور اور حیدرآباد کے دوسرے مواضعات میں گھومتے پھرے اور بہت سے ہیرے جو خس و خاشاک میں دب گئے تھے ڈھونڈ نکالے۔ شعراء کے ادبی خواب گاہوں تک کو ڈھونڈ نکالا۔

کئی قبروں کی تلاش میں کامیابی ہوچکی تھی۔ دکن کے ایک مشہور شاعر میر شمس الدین فیض کا نام قدیم تذکروں میں پڑھ چکے تھے لیکن اس کے مدفن کا نشان نہیں مل رہا تھا۔ بڑی تلاش و تحقیق کے بعد لال دروازے کے پاس گورستان کا پتا چلا یا جہاں خیال تھا کہ فیض مدفون ہیں۔ وہ اکیلے اس گورستان میں پہنچ گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ شکستہ قبریں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ مٹی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کس کی قبر کو فیض کی قبر کہا جائے؟ انہوں نے چند مقامی لوگوں سے دریافت کیا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

وہ کئی روز برابر اس گورستان میں جاتے رہے اور مقامی لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ اس پوچھ گچھ کے دوران ان کی ملاقات ایک بوڑھے آدمی سے ہوئی جس کی عمر نوے سال سے اوپر ہوچکی تھی۔ انہوں نے فیض کی قبر کے بارے میں دریافت کیا۔ اس شخص کو حیران ہی تو ہونا تھا کہ اس شخص کو ایسی پرانی قبر کی کیا ضرورت پیش آگئی۔

''برخوردار، وہ کیا تمہارے عزیز تھے۔''

''میرے عزیز تو نہیں البتہ میری برادری کے ضرور تھے۔ وہ بھی شاعر تھے میں بھی شاعر ہوں۔''

''تمہیں ان کی قبر کی کیا ضرورت پیش آگئی۔''

''میں اس قبر پر روشنی کا انتظام کروں گا، تعمیر و مرمت کراؤں گا تاکہ وہ محفوظ ہوجائے۔''

''مگر کیوں؟''

''وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم حیدرآبادی اپنے محسن کی قدر کرتے ہیں۔''

''حضرت آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے شاعر تھے۔''

''میں نے ان کا دیوان دریافت کرلیا ہے۔''

''پھر تو آپ میرے بھی محسن ہوئے۔'' اس بوڑھے نے کہا۔ ''شمس الدین فیض ہمارے عزیز داروں میں تھے اس لیے میں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سن کر فیض کی قبر کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا ہے۔ آیئے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔'' ان بزرگ نے انہیں ایک صاف ستھری قبر کے نزدیک لے جا کر کھڑا کر دیا۔ انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ دوسری قبروں کے مقابلے میں یہ قبر صاف ستھری کیوں ہے۔ اس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔ اسے فیض ہی کا ایک مختصر شعر یاد آگیا۔

موجہء یاد بہار چمنستان بہشت
مشہد فیض پہ جاروب کشی کرتا ہے

انہوں نے اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ دکنی شعرا اور ادیبوں کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکالیں اور زیادہ سے زیادہ دکنی تخلیقات کو روشناس کرایا جائے اور دکنی ادب کی عظمت کا سکہ اردو داں طبقے کے دلوں پر بیٹھا دیا جائے۔ دکنی مخطوطات کی قرأت ان کے لیے مشکل نہیں تھی۔ ان کے گھر کی زبان دکنی کا جدید روپ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یورپ جا کر لسانیات کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اس لیے عہد بہ عہد تبدیلیوں اور لسانی تغیرات کو سمجھنا دشوار نہیں تھا۔ انہوں نے قدیم نسخوں کا مطالعہ کیا اور اردو کی ادبی و لسانی روایات کو نثر میں مربوط کر دیا۔ ٹوٹی ہوئی کڑیوں

کو جوڑ دیا۔

"تم گولکنڈہ کے ہیرے" اور "سیر گولکنڈہ" جیسی تصانیف پیش کر کے انہوں نے وہ مخصوص فضا پیدا کر دی جس میں رہتے ہوئے دوسرے لوگ بھی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی کوششوں سے یوم ولی منایا گیا اور اس سلسلے میں مخطوطات کی ایک نمائش بھی مقرر کی۔ اس تقریب میں نواب سالار جنگ نے خطبۂ صدارت میں کہا۔

"اس اہم اور دلچسپ کام کو اس تقریب کے ساتھ ختم نہ ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی کام نہیں کہ ولی کے معاصرین اور اس سے پہلے کے شاعروں اور صاحبان تصانیف کی اردو کتابیں مرتب اور شائع کی جائیں۔ اس اہم کام کی تکمیل کے لیے ایک جماعت منتخب کر لینی چاہیے۔"

اس تجویز پر عمل کیا گیا اور ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ ڈاکٹر زور اس کمیٹی کے نائب صدر مقرر ہوئے۔ قدیم ادب پاروں کی تدوین کے لیے قابل ترین افراد کا تعاون حاصل کر کے تحقیق و تدوین کا کام شروع کر دیا گیا۔

کلیات قلی قطب شاہ کی ایڈیٹنگ کا کام ڈاکٹر زور کے سپرد ہوا۔ ڈاکٹر زور "سلسلہ یوسفیہ" کی دوسری تصانیف کی ترتیب و تدوین میں محققین کی رہنمائی کرتے رہے۔ انہی کی کوششوں سے کئی قدیم دکنی شہ پارے شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔

کلیات قلی قطب شاہ، تذکرہ مخطوطات، گلزار ابراہیم، سرگزشت حاتم وغیرہ تحقیق میں ڈاکٹر زور کی تحقیق و نکتہ رسی کی شاندار مثالیں ثابت ہوئیں۔

"اردو شہ پارے" ان کی ایسی تصنیف تھی جس نے محققین کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔ قدیم ادب کے بارے میں لوگوں کی معلومات محدود تھیں۔ ڈاکٹر زور نے نہ صرف ہندوستان میں موجود قدیم مخطوطات کی مدد سے اس کتاب کا مواد اکٹھا کیا بلکہ یورپ اور لندن کے کتب خانوں میں دکنی ادب کے جو گوہر بے بہا بکھرے پڑے تھے انہیں بھی اس کتاب کی زینت بنایا اور دوسرے محققین کو ایسے اشارے فراہم کر دیے جن کے ذریعے وہ اس میں مزید اضافے کر سکیں۔ اپنی تحقیق کے ذریعے انہوں نے بہت سی رائج غلط فہمیوں کو دور کیا اور تاریخ ادب کا قبلہ درست کیا۔

امیر خسرو کو اردو کا پہلا شاعر اور خواجہ بندہ کو پہلے مصنف کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کے مطابق نہ امیر خسرو اردو کے پہلے شاعر تھے نہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اردو کے پہلے مصنف۔

ڈاکٹر زور نے مسعود نامی شاعر کو تلاش کیا۔ ڈاکٹر زور نے مسعود کا زمانہ پانچویں صدی بتایا اور یہ بتایا کہ وہ شاہ ارسلان بن مسعود حاکم لاہور اور سلطان ابراہیم کے زمانے کا شاعر تھا اور محمد عوفی کے تذکرے "لباب الالباب" کے حوالے سے لکھا کہ اس نے تین دیوان مرتب کیے تھے جن میں سے ایک ہندی میں بھی تھا۔ وہ اس کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرنے پر مجبور ہوئے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہوگا وہ یقیناً اس زبان میں ہوگا جو پنجاب میں بولی جاتی تھی اور وہ زبان ممکن ہے کہ اردو کی بالکل ابتدائی صورت میں رہی ہو گی۔

مسعود سعد سلمان کا دیوان دریافت نہ ہو سکا ورنہ ڈاکٹر زور کی بات میں مزید وزن پیدا ہو جاتا۔ ڈاکٹر زور کو خود بھی یہ احساس تھا کہ مسعود کی زبان کے بارے میں قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا۔ یہی حکم انہوں نے امیر خسرو پر بھی صادر کیا۔

"مسعود کی طرح خسرو کی زبان بھی مشتبہ ہے۔ اس کے بعض شعر اس وقت موجود ہیں مگر یہ کچھ زیادہ معتبر نہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر زور نے لکھا کہ امیر خسرو کو "خالق باری" کا مصنف سمجھا جاتا ہے لیکن محمود شیرانی کی تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ بہت بعد کے زمانے کی کتاب ہے اور زمانہ حال کے مصنفین نے اس کو خسرو سے منسوب کر دیا ہے۔

اس کتاب کے باب اوّل میں اردو ادب کے ابتدائی نمونوں پر تبصرہ کیا جو شمال ہند، گجرات اور دکن کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس دور کے مصنفین کے حالات زندگی بھی بیان کیے تھے۔

دوسرے باب میں بیجاپور سے تعلق رکھنے والے شعرا اور ادیبوں کے نام گنائے اور ان کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا۔ باب سوم گولکنڈہ کے اہل ادب سے تعلق رکھتا تھا۔ باب چہارم مغل دور کے دکنی شعرا سے تعلق رکھتا تھا۔ دکن اور گجرات میں اس وقت جو شعرا موجود تھے ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی اور اہل ادب پر یہ بھی انکشاف کیا کہ یورپ اور انگلستان کے مختلف کتب خانوں میں ان کی یادگاریں محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر زور کی یہ تصنیف "اردو شہ پارے" اردو زبان کی ادبی تاریخ کو طوالت بخشنے اور اردو کی قدامت اور

بزرگی قائم کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیق سے ان شعرا کے نام اور کلام ڈھونڈ نکالے جن سے دنیا ابھی واقف نہیں تھی یا محض نام سے واقف تھی حالات سے بے خبر تھی۔ ڈاکٹر زور نے ان کے نام اور حالات سامنے لاکر اہلِ علم کو دعوت دی کہ وہ ان ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں مزید تحقیق کر کے اس کام کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔

وہ جب بیرونِ ملک تعلیم کے لیے گئے تھے تو آکسفورڈ اور کیمبرج میں برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں بہت سی قلمی کتابیں ان کی نظر سے گزری تھیں۔ ان میں سے بعض ایسی نایاب تھیں کہ خود ہندوستان میں ان کے نسخے موجود نہیں تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں اردوداں طبقے کو ان نادر مخطوطات سے واقف کرانے کا منصوبہ بنالیا تھا چنانچہ واپسی میں انہوں نے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جو اردو شہ پارے میں ظاہر ہوا۔

انہوں نے صرف اردو شہ پارے ہی تصنیف نہیں کی بلکہ تحقیق کی دنیا میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ جو معلومات انہیں کہیں سے فراہم ہوئیں اس کی تفصیل کی چھان بین میں لگ گئے۔ اصل کتاب تک پہنچے۔ اسے تنقیدی نظر سے دیکھا اور ایڈٹ کر کے دنیا کے سامنے پیش کردیا۔ ان کی ایسی ہی ایک کاوش ”تذکرہ گلزار ابراہیم“ تھا۔ انہوں نے کہیں اس تذکرے کا نام پڑھا تھا۔ پھر وہ اس کی تلاش میں مشغول ہو گئے اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ اس تذکرے کو اپنے تبصرے کے ساتھ شائع کیا۔

”بالعموم تذکرہ نویس کلام کے نمونوں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور شاعر کے حالاتِ زندگی کی تحقیق پر کم توجہ دیتے ہیں لیکن علی ابراہیم کا تذکرہ ان معدودے چند تذکروں میں سے ہے جن میں شعرا کے واقعاتِ حیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔“

مزید لکھا: ”یہ واقعی اردو شاعروں کی بدقسمتی ہے کہ کسی نے بھی ایک ٹھیٹ مورخ بن کر ان کے حالات کو قلم بند نہیں کیا لیکن اگر اس طرح کی کوشش ملتی ہے تو وہ صرف علی ابراہیم کا زیرِ بحث تذکرہ ہے جو اگرچہ ٹھیٹ تاریخی نقطۂ نظر سے نہیں لکھا گیا تاہم اس لحاظ سے اردو کے سب تذکروں سے بہتر ہے۔“

تذکرہ نگاری کی بھیڑ میں ادبی تاریخیں مرتب کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ڈاکٹر زور کے عہد میں مخصوص موضوعات پر ادبی تاریخیں لکھی جارہی تھیں جیسے پنجاب میں اردو، مدارس میں اردو وغیرہ۔ ڈاکٹر زور نے اس دائرے کو وسیع کیا اور اردو کی بجائے اردو ادب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے دکنی ادب کی تاریخ رقم کی جس میں اردو کے قدیم مرکزوں گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ اور اورنگ آباد کے شاعروں، نثر نگاروں کی ادبی خدمات کی تاریخ پیش کی۔ یہ تاریخ کم و بیش چار سو سال کے عرصے پر محیط تھی۔ انہوں نے اس تصنیف کو چھ ابواب میں تقسیم کر کے دکن کے مختلف ادبی مرکزوں کا جائزہ لیا لیکن تفصیل کی بجائے اجمال سے کام لیا۔ دکن کی پانچ سلطنتوں کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے ہر سلطنت کے شعرا اور نثر نگاروں کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اس تاریخ سے کم از کم اتنا ہی ہوا کہ ہر سلطنت سے وابستہ شعرا کے نام یکجا ہو گئے اور ان کی تصنیفات سے واقفیت ہو گئی۔

انہیں سرزمین دکن سے والہانہ وابستگی تھی۔ اس وابستگی نے انہیں قدیم مراکز کے ادب پاروں کی بازیافت کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے یوں تو بہمنی اور عادل شاہی دور کی ادبی شخصیتوں کو بھی گوشہ گم نامی سے باہر نکالا لیکن ڈاکٹر زور کی بہترین تحقیقی صلاحیتیں ان ادبی تحقیقات میں نظر آئیں جو قطب شاہی دور سے متعلق تھیں۔ اس لیے وہ اپنی تہذیبی روایات گولکنڈہ میں تلاش کرتے تھے۔ انہوں نے اس تصنیف میں بھی اس کا اظہار کیا۔

”بہمنی بادشاہوں کے جانشینوں میں شاہانِ قطبیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کی شہرۂ آفاق دولت و ثروت تعمیر کاری اور علم و ادب کی سرپرستی ہمیشہ یاد رہے گی اور اردو زبان اور ادب نے بھی ان کے عہد میں غیر معمولی ترقی کی۔“

انہوں نے قطب شاہی دور کو تین ادوار میں تقسیم کیا۔ زوالِ سلطنت اور سقوطِ گولکنڈہ تک کی ادبی شخصیات کا حال بیان کیا۔ جو شعرا اس دور میں موجود تھے ان کے ناموں اور کارناموں کو جمع کیا۔

دکنی ادب کی تاریخ کا آخری باب سب سے اہم ہے جس میں انہوں نے درج کیا کہ دکنی ادب شمالی ہند کا محسن ہے۔ اورنگ زیب کے فتحِ دکن کے بعد جب یہ علاقہ مغلیہ سلطنت میں ضم ہوگیا تو دکن اور شمال کی راہیں کھل گئیں۔ شعرا اور اہلِ علم کو زبانوں کے اختلاف کا احساس ہوا۔ وہ دکن کے اس ادبی سرمائے سے روشناس ہوئے جو ہر صنف

سخن کے قابلِ فخر نمونوں پر مشتمل تھا۔ اس کے برخلاف شمال میں ریختہ بول چال کی زبان تھی۔ اسے علمی و ادبی زبان کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ اردو شاعری کی ابتدا کا محرک ولی کا کلام اور دکن کے ادبی ورثے سے اثر پذیری کا نتیجہ تھا۔

انہوں نے حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے نامور شعرا کے کلام اور تعارف کی ایک سیریز مرتب اور شائع کر کے ادب کی گرانقدر خدمت کی۔ کیف سخن، رمز سخن، فیض سخن، بادۂ سخن اور متاعِ سخن اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ کیف سخن میں رضی الدین حسن کیفی کا تعارف اور کلام شائع کیا گیا تھا۔ بادۂ سخن میں احمد حسین مائل کا انتخاب پیش کیا گیا تھا۔ اس میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ رمز سخن کا مقصد بھی دکن کے ایک خوش گو شاعر کے کلام کو عوام میں متعارف کرانا مقصود تھا۔

انہوں نے محسوس کیا کہ قطب شاہی عہد سے تعلق رکھنے والے شعرا کے حالات پر بعض تذکرے اور تصانیف موجود ہیں لیکن عہد آصف جاہی کے فن پاروں پر کوئی مستقل اور مبسوط کتاب موجود نہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے مرقعِ سخن دو جلدوں میں مرتب کی۔

اس کتاب کی انفرادیت یہ تھی کہ اس میں مختلف شعرا کا حال مختلف مصنفین سے لکھوایا گیا تھا اور یہ تمام مصنفین جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے۔

اس کتاب کے ذریعے ڈاکٹر زور نے ان نقادوں اور محققین کے لیے اہم مواد فراہم کر دیا جو حیدرآباد میں اردو ادب کی نشوونما کا غائر مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔

"متاعِ سخن" نواب عزیز جنگ عزیز کے کلام کا انتخاب تھا۔ عزیز داغ کے شاگرد اور حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔

آصف جاہی شعرا پر ان تبصروں کے بعد دکن کے حکمراں میر عثمان علی خان کی ادب دوستی نے ان کے دامن توجہ کو اپنی جانب کھینچا۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے قطب شاہی سلاطین اور لکھنو کے علم دوست حکمرانوں کے عہد میں بھی اردو کی ہمہ جہتی ایسی نہیں ہوئی تھی جیسی کہ میر عثمان علی خان کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے ان کے عہد میں ہوئی۔ ان کی فیاضانہ سرپرستی کی وجہ سے ایک قلیل عرصے میں چار ہزار سے زیادہ کتابیں طبع ہو کر منظرِ عام پر آئیں۔

ان کی اس فیاضانہ سرپرستی کی داستان سنانے کے لیے انہوں نے "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" نامی کتاب لکھی۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں انہوں نے میر عثمان علی خان کی اردو دوستی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ریاست کی مختلف انجمنوں اور اداروں کی انہوں نے کس طرح اور کس قدر حوصلہ افزائی کی۔ رسائل و اخبارات کی امداد ہو یا جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کا قیام، سب ان کی علم دوستی کی زندہ مثالیں ہیں۔

اس کتاب میں انہوں نے اردو زبان کے آغاز و ابتدا کے بارے میں چند غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ولی کو اردو شاعری کا باوا آدم سمجھا جاتا تھا اور ولی سے قبل ادبی مساعی کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے ایک محقق کا حق ادا کیا اور تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ نظریہ غلط ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی۔ اسی کتاب میں انہوں نے اپنا مشہور نظریہ پیش کیا کہ اردو ہیولا مسلمانوں کے فتح دہلی سے پیشتر پنجاب میں تیار ہو رہا تھا۔ یہ برج بھاشا سے اخذ نہیں کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شاہ جہاں سے پہلے اردو زبان موجود تھی اور اس میں بیسیوں شاعر پیدا ہو چکے تھے۔

اس اکیلے آدمی نے "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" لکھ کر ریاست حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی مفصل تاریخ رقم کر دی۔

محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا جلیل القدر بادشاہ ضرور تھا لیکن ادب میں اس کی بادشاہت کو ڈاکٹر زور کی کوششوں سے تسلیم کیا گیا۔

کلیات قلی قطب شاہ تو شائع ہو جاتی لیکن ڈاکٹر زور اگر اس کا مقدمہ تحریر نہ کرتے تو قلی قطب شاہ کو بادشاہِ سخن کوئی بھی تسلیم نہ کرتا۔ انہوں نے اس مقدمے میں صرف قطب شاہ کے حالات اور اس کے کلام پر روشنی نہیں ڈالی۔ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا تھا۔ انہوں نے اس دور کی تاریخ، تہذیب، رسم و رواج، طرز معاشرت، عمارات، کھیل کود اور تقاریب کو زندہ کر دیا۔ چلتی پھرتی تصویر تحریر کر دی۔

ڈاکٹر زور کی تحریر سے پہلے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد، تمدن اور اس کی ذاتی تفریحات کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ ولی کو اردو کا پہلا شاعر سمجھا جاتا تھا (صاحب دیوان شاعر) مولوی عبدالحق نے قلی قطب شاہ کے بارے میں ایک مضمون لکھا ضرور تھا لیکن اس اوّلین شاعر کے مفصل حالاتِ زندگی تحریر کر کے عوام سے روشناس کرانے کا اہم کام ڈاکٹر زور نے انجام دیا۔

کتب خانہ سالار جنگ میں ''کلیات قلی قطب شاہ'' کے دو نسخے موجود تھے۔ ڈاکٹر زور نے دونوں نسخوں کو سامنے رکھا اور نہایت جانفشانی سے داخلی و خارجی شہادتوں کی مدد سے صرف مستند اشعار کو شامل کلیات کیا۔ مختلف موضوعات پر لکھی گئی نظموں کو جو مخطوطے میں بے ترتیبی سے ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں یکجا کر کے انہیں سرخیوں سے مزین کیا۔ اس ترتیب نے پڑھنے والوں کے لیے بہت سہولت پیدا کر دی۔ مثلاً کھیل کود سے متعلق نظمیں ایک جگہ کر دیں۔ مذہبی تقاریب، تہذیب سے متعلق، تفریحات ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پائی۔

قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں بہت مشہور تھیں۔ ان پر اس نے نظمیں بھی لکھی تھیں۔ ڈاکٹر زور نے انہیں ایک جگہ لکھ کر اس کی حیات معاشقہ کی زندہ تصویریں کھینچ دیں۔

اس سب سے قطع نظر اس پر جو مقدمہ لکھا گیا وہ ڈاکٹر زور کا ایک عظیم تحقیقی کارنامہ تھا۔ یہ کام آسان بھی ہو سکتا تھا لیکن ڈاکٹر زور آسانی کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے تحقیق کا حق ادا کیا۔ انہوں نے یہ مقدمہ لکھنے کے لیے نو قلمی اور ستره مطبوعہ تواریخ سے معلومات حاصل کیں۔

اس کے مقدمے میں ڈاکٹر زور نے نہ صرف شاعر کے حالاتِ زندگی کے تمام گوشوں پر بخوبی روشنی ڈالی بلکہ حیدر آباد کی قدیم ثقافت کا بھی ایک پُر اثر مرقع کھینچا۔

انہوں نے ایک اور اہم تحقیقی کام سرانجام دیا۔ انہوں نے قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی قلمبند کر دی۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قلی قطب شاہ کی زبان چار سو سال سے زیادہ قدیم تھی۔ بڑی تعداد ان الفاظ کی تھی جو سن سکرت سے ماخوذ تھی۔ قاری کا ان الفاظ کے معنی معلوم ہوئے بغیر کلام سے لطف اندوز ہونا مشکل تھا۔ ہر ایک میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ ان الفاظ کے معنی تلاش کرے۔ ڈاکٹر زور نے ایسے الفاظ کے معنی لکھ کر یہ سہولت پیدا کر دی۔

ڈاکٹر زور نے کلیات قلی قطب شاہ کے مقدمے کے علاوہ اس اہم شاعر کے حالاتِ زندگی پر ایک الگ کتاب بھی تصنیف کی ''حیات محمد قلی قطب شاہ''۔

قلی قطب شاہ کے حالاتِ زندگی کی چھان بین کرتے ہوئے ان کی نظر ایک اور شاعر میر محمد مومن پر پڑی۔ یہ شاعر پیشوائے سلطنت قطب شاہیہ تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے وزیراعظم کی حیثیت سے اس نے شہر حیدر آباد کی تعمیر اور شہری منصوبہ بندی کا کام انجام دیا تھا۔ یہ شخص عالم بھی تھا۔ آرکیٹکٹ بھی اور سیاست داں بھی۔

ڈاکٹر زور نے حیات قلی قطب شاہ کے مطالعے کے دوران میر محمد مومن کا نام تلاش کیا جیسے جیسے وہ اس شخص کے بارے میں مواد اکٹھا کرتے گئے ان کی حیرت بڑھتی گئی اور اسے حیدر آباد کے محسن کی حیثیت سے یاد کرنے لگے۔ ان کا بیشتر وقت یا تو ادارہ ادبیات کے دفتر میں گزر رہا تھا یا سالار جنگ کے کتب خانے میں۔ انہوں نے حیدر آباد کے کتب خانوں میں جتنے مخطوطات تھے سب پڑھ ڈالے۔ تاریخی کتب کے جتنے ماخذ تھے سب ڈھونڈ لیے۔

چار سو سال پیچھے چھلانگ لگانا آسان نہیں تھا۔ یہ اگر ممکن تھا تو ڈاکٹر زور جیسے محقق ہی سے ممکن تھا۔ وہ کام کرتے رہے اور بالآخر سیپ سے موتی نکال لیے اور میر مومن کے خاندانی حالات ان کے نام ونسب، ولادت، تعلیم و تربیت، ایران سے ہجرت، دکن میں آمد اور قیام، خدمت پیشوائی، حیدر آباد کی تعمیر وغیرہ سے متعلق مواد اکٹھا کر لیا اور اسے لکھنے بیٹھ گئے۔ جیسے جیسے لکھتے جاتے تھے پیاز کے چھلکوں کی طرح واقعات سامنے آتے جاتے تھے۔ میر محمد مومن ہشت پہلو شخصیت ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی تعمیرات کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ مساجد، سرائے، عاشور خانے، تالاب، رفاہِ عام کے لیے کثرت سے بنوائے تھے۔ ان سب کی تفصیل بیان کی۔

میر مومن ہی کی کوششوں سے قلی قطب شاہ کے تعلقات شاہ ایران سے ہوئے۔

ڈاکٹر زور نے اس تحقیق کو اس حد تک آگے بڑھایا کہ میر مومن کی خانگی اور نجی زندگی کے بارے میں بھی حالات اکٹھا کیے۔

جب وہ ان تاریخی واقعات تک پہنچ گئے تو وہ ان کا فارسی دیوان ڈھونڈنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔ اب وہ اس قابل تھے کہ وہ ان واقعات کو سپرد کتاب کر سکتے تھے۔ انہوں نے دس ابواب پر مشتمل ایک ضخیم کتاب تیار کر لی جو ''حیات میر محمد مومن'' کے نام سے ان کے کارناموں میں ایک اور کارنامے کا اضافہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر زور کو ہر اس چیز سے پیار تھا جو حیدر آباد سے تعلق رکھتی تھی۔ ہر وہ شخص اچھا لگتا تھا جو حیدر آباد کو اچھا سمجھتا ہو یا حیدر آباد سے تھوڑا سا بھی تعلق رکھتا ہو۔ اسی لیے وہ شاہ ظہور الدین حاتم کی طرف متوجہ ہوئے۔

ڈاکٹر زور کو لندن میں حاتم کے دیوان ''دیوان

زادہ'' کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ نسخہ شاعر نے 1179ء میں خود تحریر کیا تھا۔ اس دیوان کے مطالعے کے دوران انہیں یاد آیا کہ محمد حسین آزاد نے حاتم کے حالاتِ زندگی اور نمونہ کلام کو پیش کیا تھا اور اس کے بعد حسرت موہانی نے ''اردوئے معلیٰ'' میں حاتم کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی غزلوں کا انتخاب کیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے محسوس کیا کہ حاتم پر اب تک جو کام ہوا ہے وہ تحقیق سے خالی اور ناکافی ہے۔

وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ حاتم شمالی ہند کے وہ اوّلین شاعر ہیں جنہوں نے دیوان ولی کے مطالعے کے بعد فارسی گوئی ترک کر کے اردو زبان میں طبع آزمائی کی تھی اور اس کے بعد وہ تمام زندگی اردو میں شعر کہتے رہے۔

ڈاکٹر زور کو حاتم کے حالاتِ زندگی سے متعلق مواد بھی یورپ ہی میں دستیاب ہوا۔ لندن اور پیرس کے قیام کے دوران انہوں نے ان کوائف پر مشتمل ایک مضمون لکھا اور ہندوستان آنے کے بعد اس مضمون کو رسالہ ''ہندوستان'' میں شائع کرا دیا۔ اس میں کچھ ایسی نئی اور مفید معلومات تھیں کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس کی تعریف کی اور ان سے فرمائش کی کہ وہ دیوان زاہ مرتب کر کے شائع کریں اور اس کا ''مقدمہ'' تحریر کریں۔ ڈاکٹر تارا چند اور اصغر گونڈوی کے اصرار پر انہوں نے اس کی ہامی بھر لی اور دیباچہ لکھنے بیٹھ گئے۔ انہیں حاتم کے حالاتِ زندگی سے مواد یورپ ہی میں دستیاب ہو گیا تھا لہٰذا اس مواد کو بنیاد بنایا اور بتایا کہ ولی کے دہلی پہنچنے سے پہلے ہی وہاں ان کی غزلوں کا چرچا عام ہو گیا تھا۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے دیوان زادہ کی ایک ایسی غزل پیش کی جو ولی کی زمین پر کہی گئی تھی۔ ''دیوان زادہ'' کے دیباچے میں حاتم نے اپنے قلم سے لکھا تھا۔

''در شعر فارسی بطرز مرزا صائب و در ریختہ بطور ولی اوقات بسری کردہ ہر دو را استادی داند'' حاتم ولی کو اپنا استاد تصور کرتے تھے۔

حاتم کا ولی کی زمینوں میں تیرہ غزلیں کہنا ولی سے اثر پذیری کا غماز ہے۔ ڈاکٹر زور نے حاتم کی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے مختلف تذکروں کی تائید و تردید میں مدلل ثبوت فراہم کیے اور تحقیق کا حق ادا کیا۔ انہوں نے تو یہ تک دعویٰ کیا ''آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزاد کی نظر سے حاتم کا دیوان زادہ تو کیا کوئی اور دیوان بھی نہیں

گزرا تھا۔"

☆......☆

ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے ساتھ ہی اور پھر اس ادارے کی اپنی عمارت قائم ہو جانے کے بعد یہ ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تھی کہ مخطوطات اور کتابیں بڑے پیمانے پر جمع ہوں۔ ڈاکٹر زور کی انتظامی صلاحیتیں یہاں بھی بارآور ثابت ہوئیں۔ ان کی مقبولیت بھی مددگار ثابت ہوئی۔ لوگوں کو ان کے خلوص پر اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے جب ذی علم شخصیات سے رابطہ کیا تو انہیں مایوسی نہیں ہوئی۔ حیدرآباد میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جن کے ذاتی کتب خانوں میں نادر مخطوطات موجود تھے۔ انہوں نے قدیم مخطوطات اس ادارے کے حوالے کر دیے اور ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

یہ اقدام بھی ڈاکٹر زور کی علمی خدمات میں ایک اہم قدم تھا۔ جو بیاض اور قلمی کتابیں ذاتی کتب خانوں میں پڑی پڑی خراب ہو جاتیں یا اہلِ علم و تحقیق کو ان تک پہنچنے میں مشکل ہوتی۔ انہوں نے انہیں محفوظ و یکجا کر دیا۔ یہاں ان کے ضائع ہونے کا خدشہ نہیں تھا۔

جب ان کی قابلِ ذکر تعداد جمع ہو گئی تو ضرورت پیش آئی کہ ان کی وضاحتی فہرست تیار کی جائے۔ فہرست ایسی ہو کہ کسی قلمی نسخے تک جائے بغیر محض فہرست کے ذریعے صحیح معلومات اور اس کے شاعر یا مصنف اور نفس موضوع وغیرہ سے بخوبی واقفیت ہو جائے تاکہ بار بار نسخہ نکالنا نہ پڑے۔ یہ کام بھی ڈاکٹر زور کی بجائے ادارے کا کوئی اور فرد نہیں کر سکتا تھا۔ ہر مخطوطے کی خصوصیات، اس کے عہد کے تعین، شاعر و مصنف کے نام و تخلص اور موضوع کی وضاحت بغیر تحقیقی شعور اور ہمہ گیر ادبی معلومات یہ فہرست مرتب نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر زور نے شب و روز کی محنت کے بعد پانچ جلدوں میں مخطوطات کی فہرستیں مرتب کر کے اردو میں تحقیقی کام کرنے والوں کی راہ میں مشعلیں روشن کر دیں۔ دکنی ادب پر کام کرنے والا کوئی محقق ان فہرستوں سے استفادہ کیے بغیر کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ فہرست تحقیق کی راہ میں رہبر کا کردار ادا کرتی ہیں۔

ان فہرستوں سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا مخطوطہ نادر ہے اور کس مخطوطے کی نقلیں دوسرے کتب خانوں میں موجود ہیں اور ہیں تو کہاں کہاں ہیں۔ یہ نشاندہی بھی کر دی گئی ہے کہ کس مخطوطے کو مصنف یا شاعر نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہے یا کس پر اس کے دستخط موجود ہیں کتابت کسی اور نے کی ہے۔ فہرست میں یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے مصنف یا شاعر کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے اگر وہ جنوبی ہند سے تعلق نہیں رکھتا کسی دور دراز مقام مثلاً لکھنؤ، آگرہ یا رام پور سے متعلق ہے تو فہرست میں بھی بتایا گیا ہے کہ اس کا نسخہ یہاں تک کیسے پہنچا۔ فہرست میں عطیہ دہندگان کے ناموں کی فہرستوں کو شائع کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

☆......☆

ڈاکٹر زور نے نہ صرف قدیم ادب کو دنیا سے روشناس کرایا بلکہ حیدرآباد کے تمدن کی بھی تحقیق کی اور عمارات و باغات کا شجرۂ نسب دریافت کر کے "فرخندہ بنیاد حیدرآباد" نامی کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں انہوں نے شہر حیدرآباد کی تعمیر اور اس کی آبادکاری پر روشنی ڈالی اور اس عہد کی قدیم عمارات مثلاً چار مینار، دولت خانہ عالی، چندن محل، بجن محل، اعلیٰ محل۔ خط محل، ندی محل اور محل طور دیدۂ کے طرز تعمیر اور ان کی تاریخی و ثقافتی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ حیدرآباد کی نہروں، یہاں کے محلوں اور باغات وغیرہ کے بارے میں تحقیق کر کے مفید معلومات فراہم کیں۔

حیدرآباد کے عوام ان محلات کو ان محلوں اور باغات کو دیکھ ضرور رہے تھے لیکن ان کے بارے میں تاریخی طور پر زیادہ نہیں جانتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے عوام الناس کو ان کی تاریخی و ثقافتی اہمیت سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر زور نے اس کتاب کے بارے میں خود تحریر کیا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدرآباد بادشاہت اور مطلق العنان حکمرانی کے معائب اور محاسن دونوں کا مکمل مرقع رہا ہے۔ علم و ہنر، فضل و کمال اور فنون لطیفہ کی قدردانی اور نشوونما کے لیے گزشتہ ایک صدی میں راجاؤں اور نوابوں نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کو ہندوستان کبھی نہ بھلا سکے گا۔ اگر ازمنہ وسطیٰ کی یادگار یہ شخصی حکومتیں نہ ہوتیں اور صاحبان کمال کی قدر افزائی نہ کرتیں تو گزشتہ سو دو سال کے مغربی تسلط میں مشرق کے بچے کھچے فنون لطیفہ بھی بالکل ناپید ہو جاتے۔

فرخندہ بنیاد حیدرآباد جیسی کتابوں کی وجہ سے آنے والی نسلیں حیدرآباد کے قدیم کلچر سے روشناس ہو سکیں گی۔"

☆......☆

اس روز ڈاکٹر زور رات کو دیر گئے تک ادارہ ادبیات

کے دفتر میں کام کرتے رہے تھے۔ مخطوطات کی فہرست پر کام کرتے ہوئے انہیں وقت کا اندازہ ہی نہ ہوسکا۔ ہوا بھی تو اس وقت جب ان کے ہاتھ میں تینوں ''طالب و موہنی'' کا قلمی نسخہ آیا۔ انہیں یاد آیا کہ ایسا ہی ایک نسخہ انہوں نے انڈیا آفس کی لائبریری میں بھی دیکھا تھا۔ اس وقت طالب علمی کا دور تھا۔ لہٰذا اہمیت کا اندازہ نہیں ہوا تھا لیکن اب جو اسے دیکھا اور تذکروں میں اس مثنوی کے شاعر سید محمد والہ کے حالات پڑھے تو انہیں اس شاعر سے دلچسپی ہوئی۔ انہوں نے اس شہ پارے کو صدیوں کے غبار سے نکال کر اردو داں طبقے سے متعارف کرانے کا بیڑہ اٹھایا جو حالات جمع کیے اس کا خلاصہ یہ تھا۔

سید محمد والہ، سید محمد باقر موسوی کے فرزند تھے۔ والد کی وفات کے بعد اپنے وطن ''قم'' کو خیر باد کہا اور لاہور سے ہوتے ہوئے دلی پہنچے۔ اس وقت یہاں شاہ عالم سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے والہ کے علم و فضل سے متاثر ہو کر انہیں شاہی منصب داروں میں شامل کرلیا۔ جب نظام الملک آصف جاہ سے ان کا ربط بڑھا تو انہوں نے والہ کو اپنا رفیق بنالیا اور اپنے ساتھ دکن لے آئے جب نور الدین خاں شہامت جنگ کو آصف جاہ نے حیدر آباد کا ناظم مقرر کیا تو والہ کو ان کا رفیق متعین کردیا اور جاگیر بھی عطا کی اور جب محمد علی خاں والا جاہ کو ان کے والد نے ترچناپلی کی حکومت تفویض کی تو والہ ان کے نائب مقرر کردیے گئے اور ترچناپلی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

طالب و موہنی کا قصہ سید محمد والہ نے مہاراشٹر کے تاریخی شہر ''پرنڈہ'' میں سنا تھا اور اس داستانِ عشق سے متاثر ہو کر انہوں نے اسے دکنی میں نظم کیا تھا۔

نصیر الدین ہاشمی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ میر تقی میر نے والہ کی اس مثنوی سے متاثر ہو کر مثنوی دریائے عشق لکھی تھی۔

شمالی ہند کے قیام کے دوران والہ نے اردو سیکھ لی تھی اور دکن آکر دکنی زبان سے بھی واقفیت حاصل کرلی تھی لیکن دکنی محاورے ان کے فارسی لب و لہجے پر پوری طرح غالب نہ آسکے تھے۔ بہر حال انہوں نے اردو فارسی اور دکنی کو ملا کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا اور قصہ طالب و موہنی نظم کردیا۔ یہی اس مثنوی کی تاریخی اور لسانی اہمیت ہے۔

☆......☆

محقق کوئی بھی ہو اس کا ناقد ہونا ضروری ہے۔ جب وہ کوئی چیز تحقیق کرتا ہے تو سب سے پہلے اسے تنقیدی اصولوں پر پرکھتا ہے۔ وہ کوئی تنقیدی کتاب لکھے یا نہ لکھے اس کے اندر ایک ناقد چھپا ضرور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور ایک محقق کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے لیکن وہ تنقید نگار پہلے تھے۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے تنقیدی اصولوں پر مبنی کتاب ''روح تنقید'' اس وقت لکھی تھی جب وہ طالب علم تھے اور یورپ میں تھے۔

روح تنقید اردو کی ان اوّلین کتابوں میں سے ہے جن کی بدولت اردو داں طبقہ مغربی اصول تنقید سے آشنا ہوا۔ ان کے ایک ہم عصر ادیب و نقاد حامد اللہ افسر نے اپنی کتاب ''نقد الادب'' میں لکھا تھا۔

ہماری زبان میں اصول تنقید پر کوئی کتاب نہیں تھی اس خدمت کو غلام قادری زور نے انجام دیا جس میں یورپ کے علمائے تنقید کے افکار و خیالات درج کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر زور اپنے قیام یورپ کے زمانے میں مغربی مصنفین کے ادبی تصورات و نظریات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ روح تنقید میں انہوں نے انہی مغربی مصنفین کے تصورات کی خوشہ چینی کی۔ تنقید کی تعریف اور اس کے اصولوں کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اکثر جگہ مغربی مصنفین کے حوالے دیے۔ اس لیے ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ان کی تنقیدوں میں استفادی عنصر زیادہ ہے اور اپج کی کمی پائی جاتی ہے۔

تنقید نگار کے فرائض کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ خاصے خیال انگیز تھے اور اردو میں پہلی بار اتنی صراحت و وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے تھے لیکن ان سب پر مغربی رنگ غالب تھا۔ اپنے خیالات کو ثابت کرنے کے لیے مغرب کے نقادوں کے بیانات کو سہارا بنا کر آگے بڑھ رہے تھے۔ دراصل وہ چاہتے یہ تھے کہ اردو تنقید انگریزی کے تنقیدی اصولوں کے مطابق پروان چڑھے۔

جس زمانے میں ''روح تنقید'' لکھی گئی اردو میں تنقید نگاری کا فن اپنے عہد طفولیت میں تھا اور اردو والوں کو اس قسم کی تصانیف کی ضرورت تھی جن میں تنقید سے متعلق مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خامیوں کے باوجود اس کتاب کی پذیرائی ہوئی۔

روح تنقید ان اوّلین کتابوں میں سے تھی جنہوں نے بعد کی نسل کے نقادوں کو راستہ دکھایا اور مغربی تنقید کے اصولوں سے انہیں روشناس کیا۔ روح تنقید میں غور و فکر کی کمی

ہوسکتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اصول تنقید پر یہ پہلی کتاب تھی۔
ڈاکٹر زور کا اس اچھوتے موضوع پر اظہارِ خیال کرنا ایک چونکا دینے والی بات تھی۔
اس کتاب کے بعد اپنے قائم کردہ اصولوں کے مطابق عملی تنقید پر مبنی انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اور شاعروں کو ایک جدید اور ترقی یافتہ تنقیدی اصولوں کے ترازو میں تولا۔ روح غالب، تین شاعر، جواہر سخن، ادبی تاثرات، ادبی تحریریں ایسی ہی کتابیں ہیں۔

☆......☆

سرزمین دکن کو یہ فخر حاصل تھا کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ اس خاک سے اٹھا تھا۔ ڈاکٹر زور نے اردو کا پہلا ماہر لسانیات ہونے کا امتیاز بھی اس خاک کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ اعزاز خود ان سے منسوب تھا۔ وہ اردو کے پہلے ماہر لسانیات ادیب تھے۔
لندن یونیورسٹی سے اپنا کام مکمل کر کے وہ فرانس چلے گئے تھے اور اساریوں یونیورسٹی میں ہند گورپائی کی مشہور شخصیت پروفیسر جیولس بکوں سے وابستہ ہو گئے تھے اور اردو زبان کے صوتیاتی پہلو پر تحقیقاتی کام شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اردو کے دکنی تلفظ اور لب و لہجے پر توجہ مرکوز کی۔ انہوں نے صوتی آلات کی مدد سے "اصوات" کا مطالعہ کر کے جو نتائج مرتب کیے اسے "ہندوستانی فونیٹکس" کے نام سے موسوم کر کے ایک کتاب کی شکل دے دی۔ اس زمانے سے لے کر اب تک اس کی مقبولیت کم نہیں ہوئی اور ماہرین لسانیات اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کتاب نے اردو کے صوتیاتی پہلو پر تحقیقی کام کرنے والوں میں ڈاکٹر زور کی اوّلیت مسلمہ کر دی۔
اس کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر جیولس نے لکھا تھا۔
"ایسی کتابیں بہت کم تعداد میں ہیں جن میں ہندوستانی زبانوں کا صوتیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔"
ڈاکٹر زور کی ناقابلِ فراموش تصنیف "ہندوستانی لسانیات" میں دنیا کی مختلف زبانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے ان کے اہم خدوخال پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ اس کتاب میں انہوں نے اردو کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے اس وقت تک اس کے بارے میں ماہرین لسانیات جو نظریات پیش کیے تھے ان کا تجزیہ کر کے اردو کے آغاز کے بارے میں مفصل معلومات بہم پہنچائی تھیں اور اپنا ایک نظریہ قائم کیا تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا۔
"اردو نہ تو پنجابی سے مشتق ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے ہے جو ان دونوں کا سرچشمہ تھی۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو بالعموم نئے ہند آریائی دور میں اس حصہ ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔"
ڈاکٹر زور کے اس نظریے سے تمام عالم متفق نہ ہو سکے۔ سلیمان ندوی نے سندھ کو اردو کی جنم بھومی قرار دیا۔ انہوں نے تاریخی شواہد پیش کیے لیکن لسانی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ محمود شیرانی نے پنجاب کو اردو کا گہوارہ بتایا۔ گراہم بیل بھی اس خیال سے متفق ہیں۔ کچھ اور لوگوں نے یہ کہا اردو مغربی ہندی کی ایک بولی ہے اور اس کا حلقہ اثر دہلی سے میرٹھ تک پھیلا ہوا ہے۔
ان نظریات میں ڈاکٹر زور کا یہ نظریہ خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کے فتح دہلی سے بہت پہلے رکھا جا چکا تھا۔
اس کتاب کے دوسرے حصے میں ادبی بولیوں گجراتی، دکنی اور شمالی ہند کی بعض بولیوں کی تفصیل پیش کی گئی تھی اور ان کا تقابلی مطالعہ کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ صوتی اختلافات کی وضاحت بھی کر دی گئی تھی۔ بعد کے ابواب میں ڈاکٹر زور نے شمالی ہند میں اردو کی نشوونما کا حال قلم بند کرتے ہوئے مظہر جان جاناں کی لسانی خدمات، دکنی عنصر کے زائل ہونے اور اس کی جگہ فارسی لفظیات اور اسالیب کے رونما ہونے کے اسباب پر روشنی ڈالی تھی۔
عرصہ دراز تک گجراتی اور دکنی کو ایک ہی بولی تصور کیا جاتا تھا ڈاکٹر زور نے ان میں صوتی اور لسانی بنیادوں پر امتیاز قائم کیا اور ان کی منفرد حیثیت کی تشریح کی۔

☆......☆

ڈاکٹر زور عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ تھے کہ 1950ء میں دارالعلوم اور چادر گھاٹ کالج کا انضمام عمل میں آیا۔ اس وقت تک ڈاکٹر زور کی قابلیت کا سکہ دلوں کو خرید چکا تھا۔ ہر طرف ان کے کارناموں کی دھوم تھی لہٰذا ان کے سوا کسی اور کا نام سامنے آ ہی نہیں سکتا تھا لہٰذا انہیں اس نئے کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔
یہ ان کے لیے نہیں اس کالج کے لیے اعزاز تھا کہ ڈاکٹر زور اس کے پرنسپل بنا دیے گئے۔

ادارہ ادبیات ان کی نگرانی میں کام کر رہا تھا۔ سیکڑوں کتابیں شائع کر چکا تھا۔ ایوانِ اردو کی عمارت ڈاکٹر زور کی فتوحات کی داستانیں سنا رہی تھیں کہ انہوں نے ایک اور کام کا بیڑہ اٹھایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد انہیں خیال آیا کہ اس عظیم شخصیت کی یادگار قائم کی جائے۔ یادگار کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی مجسمہ کھڑا کر دیا جائے بلکہ کوئی ایسا ادارہ ہو جس کے تحت ریسرچ اسکالروں سے تحقیقی کام کروایا جائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اس کی تکمیل کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جتنے علم دوست حضرات تھے ان کی خدمت میں یہ منصوبہ رکھا۔ اس کے لیے انہوں نے کئی سفر کیے ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر تاراچند، کرشنا پلائی، مہدی نواز جنگ وغیرہ کو اس ادارے کا فاؤنڈر ممبر بنایا۔ ان کوششوں کے نتیجے میں ''ابوالکلام آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' کا قیام عمل میں آگیا۔

اس ادارے کا مقصد ہی یہ تھا کہ فلسفہ ثقافت اور مختلف زبانوں میں تحقیق کے کام کی رفتار کو تیز کیا جائے۔

ابتدا میں اس کا دفتر ایوانِ اردو کی عمارت کے ایک حصے میں قائم کیا گیا بعد میں اسے ''باغِ عامہ'' کی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زور چادر گھاٹ کالج سے 1960ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اس عرصے میں انہوں نے کئی تکلیف دہ نشیب و فراز دیکھ لیے تھے۔ تقسیم ہند کا مرحلہ دیکھا تھا۔ ہندو مسلم فسادات کا منظر دیکھا تھا۔ جس ہندو مسلم اتحاد کا مظہر زبانوں میں تلاش کیا تھا اسے بکھرتے دیکھا تھا۔ سقوطِ ریاست کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جس وطن کے ترانے گائے تھے اسے غیروں کے قبضے میں جاتے دیکھا تھا۔ جس کلچر کی حفاظت کی تھی اس پر مغربی رنگ چڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ جس زبان پر ناز تھا اب اس میں انگریزی کی آمیزش ہو رہی تھی۔ نوابی ختم ہو گئی تھی بھارتی قابض تھے۔ اب وطن میں وہ دلکشی نہیں رہی تھی جس کے سامنے لندن اور پیرس میں بھی ان کا دل نہیں لگا تھا لہٰذا جب ان کا بلاوا کشمیر یونیورسٹی سے آیا تو اس پیشکش کو انہوں نے فوراً قبول کر لیا اور کشمیر روانہ ہو گئے۔ ڈاکٹر زور کشمیر کیوں چلے گئے؟ وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے ان کو اس دوراہے پر کھڑا کر دیا؟ دوست، احباب، عزیز و اقارب کا خیال بھی نہیں آیا؟ وطن چھوڑ دیا جس کی تعمیر میں ان کا خونِ جگر صرف ہوا تھا مگر کیوں؟ اردو زبان کی خدمت کا جذبہ ہے یا کچھ اور؟ بہت سے سوالات تھے جو ان کے جانے کے بعد عرصے تک گونجتے رہے۔ ان سوالوں کا جواب نہ ان کے پاس تھا نہ کوئی اور تلاش کر سکا بس ایک جواب آیا جس سے ان کے کرب کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ کشمیر پہنچ کر ان کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہو گیا۔ سب جانتے ہیں شاعری کسی جذباتی کرب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غالباً یہ وطن سے دوری کا احساس تھا جس نے شاعری کا روپ دھار لیا۔ دکن کے دیوانے کو وطن کی یاد ستائی اور اس کا سویا ہوا شاعر جاگ اٹھا۔

انہوں نے شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی میں کیا تھا۔ پھر یہ شاعری تحقیقی سرگرمیوں کی نذر ہو گئی تھی۔ انہوں نے شاعری ترک کر دی تھی صرف تخلص رہ گیا تھا جو ابھی تک ساتھ چلا آ رہا تھا۔ شاید یہ تخلص کشمیر کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ وطن سے دوری تھی کہ شعروں میں ڈھلنے لگی تھی۔

وہ رومان خیز فضاؤں کے آدمی نہیں تھے اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ سرزمین کشمیر کے دلفریب نظاروں نے انہیں شعر گوئی پر اکسایا۔ اسی لیے ان کے اشعار میں شگفتگی نہیں ایک میٹھی کسک کا احساس ہوتا ہے۔

ہم اپنی گرمی سوز دروں سے چیخ اٹھے
خوشا کہ مستی فیضِ جنوں سے چیخ اٹھے
یہ ناز طبع بلند و یہ زعم خود نگہی
زمانہ سازی دنیائے دوں سے چیخ اٹھے

☆

ہنوز ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں
کبھی سحر کے کبھی شب کے انتظار میں ہیں
یہ راہ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کریں
وہ سوئے دار چلے ہیں جو کوئے یار میں ہیں
کچھ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید
فریب خوردہ خزاں میں نہ خوش بہار میں ہیں
یہ فیض سوزدروں اور بطرز اہلِ جنوں
وہی ہے منزل لیلیٰ کہ جس دیار میں ہیں

☆

فردوسِ آب و گل کے نظاروں کا شوق ہے
چشموں کا رنگ و بو کا بہاروں کا شوق ہے
انسانیت کے رستے ہوئے زخم چھوڑ کر
دانش وروں کو چاند ستاروں کا شوق ہے
ہستی کی تلخیاں جو گوارا نہ ہو سکیں

زندوں سے ہے نفور مزاروں کا شوق ہے

☆

سوچتا ہوں کہ کہیں تم تو نہیں آ نکلے
ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے جب دل کے قریب
اپنی کوتاہی دانش کا گلہ کیا کیجیے
بارہا ہم بھی گئے تھے درِ زنداں کے قریب

☆

زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی
زندہ دل ہنستے ہنستے گزر جائیں گے

کشمیر یونیورسٹی میں ان کا تقرر بطور صدر شعبہ اردو اور ڈین عمل میں آیا۔ یہاں آتے ہی ان کی جبلت لوٹ آئی۔ کچھ دن وطن سے دوری کی افسردگی میں نظر بند رہنے کے بعد انہوں نے وادی کشمیر کو بہ نظر غور دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کشمیر میں اردو کی ترقی کے وسائل ناکافی ہیں لیکن کوشش کی جائے تو مستقبل میں یہاں اردو کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔

گولکنڈہ، بیجاپور اور اورنگ آباد کا فاتح اب کشمیر کی فتح کی تیاری کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنی فتوحات کی تکمیل کے لیے اہل کشمیر کے علمی کارناموں اور فنونِ لطیفہ کے نادر نمونوں کو نا ئر نظر سے دیکھنے کے لیے تحقیق کا آغاز کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اتنا مواد اکٹھا ہو گیا کہ انہوں نے ”داستان ادب کشمیر“ کے عنوان سے کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کشمیری زبان سے واقفیت حاصل کریں۔ اس کے لیے انہوں نے باضابطہ کوشش شروع کر دی۔ کشمیری زبان سے واقفیت ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھی کیونکہ ان کی یار باش طبیعت نے کشمیر پہنچتے ہی اہل علم طبقے کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنالی تھی۔ کشمیر کے شعرا، ادباء اور افسانہ نگار ان کی کوٹھی پر جمع رہتے اور ڈاکٹر صاحب کے مشوروں سے فیض یاب ہوتے۔ ان کشمیری احباب سے وہ کشمیری زبان کے فقرے بھی سیکھتے رہے۔

کشمیر کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی تھی اس لیے ڈاکٹر زور کی تمنا تھی کہ یہاں کے اہلِ قلم حضرات زبان کی اس حیثیت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔ ان کی تمنا یہ بھی تھی کہ کشمیر کے ادیبوں کی کتابیں شائع ہوں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں تک پہنچیں چنانچہ کشمیری افسانہ نگار محمود حسین کا مجموعہ ”نیل کمل مسکائے“ انہوں نے ادارہ ادبیات حیدرآباد کے تحت شائع کروایا اور اس پر دیباچہ تحریر کیا۔

انہوں نے کشمیری شعرا اور ادباء کی حوصلہ افزائی کے لیے ادارہ ادبیات حیدرآباد میں ایک شعبہ مطبوعات کشمیر قائم کیا جس کے تحت کشمیری نوجوانوں کی کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

یونیورسٹی کی سطح پر بھی انہوں نے کئی انقلابی تبدیلیاں کیں۔ انہی کی بدولت ایم اے کے طلبہ کے لیے فارسی اور سنسکرت پڑھانے کا بندوبست ہوا۔ نصاب میں بھی انہوں نے کئی خوشگوار تبدیلیاں کیں۔ وہ کشمیر یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کا نصاب شروع کروانا چاہتے تھے۔

سری نگر کے قیام کے دوران انہوں نے یہاں کے علم وادب کی اشاعت و ترقی کے لیے ایک ہمہ گیر اسکیم تیار کر لی تھی اور اسے اردو اکادمی سے موسوم کیا تھا۔ اس ادارے کے تحت وہ کشمیر کے قدیم فنکاروں اور ان کے ادبی اکتسابات پر تحقیقی کام کا سلسلہ شروع کرنے کے خواہش مند تھے لیکن اس اسکیم کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ کشمیر میں پہلے ہی ”کلچر اکیڈمی“ موجود تھی جس کا دائرہ عمل وسیع تھا۔

حیدرآباد میں جب ادارہ ادبیات اردو کا قیام عمل میں آیا تھا تو اس کی مخالفت بھی اس لیے کی گئی تھی کہ انجمن ترقی اردو پہلے سے موجود تھی لیکن وہ حیدرآباد تھا اور ڈاکٹر زور کی نوجوانی تھی۔ وہ مخالفت کے باوجود اپنا ادارہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن یہ کشمیر تھا اور وہ بڑھاپے کی منزل میں تھے۔ ممکن ہے وقت ملتا تو وہ یہاں بھی مشکلات پر غالب آجاتے لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔

کشمیر آئے ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے کہ 23 ستمبر 1962ء کو ان کے قلب پر حملہ ہوا۔ یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ ماہر ڈاکٹر بروقت پہنچ گئے تھے لیکن ان کی کوششیں بے سود گئیں اور 24 ستمبر کی رات کو اپنے کئی منصوبے ادھورے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انہوں نے خانقاہ عنایت الٰہی حیدرآباد میں اپنے لیے قبر یار کروالی تھی لیکن یہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا۔

عاشق حیدرآباد، وادی کشمیر میں دفن ہوا۔

موت سے بھی مریں گے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کام کر جائیں گے

ماخذ: ڈاکٹر زور
پروفیسر سیدہ جعفر

پت جھڑ کے رنگ

محمد ابراهیم جمالی

لوگ ملکوں ملکوں گھومتے ہیں۔ وہاں کے رنگ روپ کو اپنے اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مصنف نے بھی ایک خط کے ذریعے دلچسپ انداز میں شہر کی سیر کرائی ہے۔ اتنے دلچسپ انداز میں احوالِ شہر بیان کیا ہے کہ تعریف کرنے کو دل چاہنے لگا۔

ادب کی چاشنی میں ڈوبا ایک دلچسپ خط

لندن میں مقیم پنجابی شاعر امرجیت چندن!

کیا تم نے قسم کھا رکھی ہے کہ تم جو خط لکھو گے وہ تمہاری نظم سے بڑا ہرگز نہ ہوگا۔ ادھر کچھ بدمعاشوں نے ''پکچر پوسٹ کارڈ'' بنا کر گویا تمہاری اس کوشش میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ مطلب یہ کہ تمہارا پکچر پوسٹ کارڈ ملا، پڑھ کر دل کباب ہوگیا۔

خدا کے بندے! دوستوں کو خط لکھا کرو تو پکچر پوسٹ کارڈ کے وجود کو بھول جایا کرو اور میری طرح سفید کاغذ کے

کئی صفحات سیاہ کر دیا کرو۔ اب تم وقت کا رونا رونے لگو گے ......تو وقت پر ایک شعر سنو

وقت کی ڈور کو تھامے رہو مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اس کا نہ ہوا

سو وقت کے بارے میں کچھ بے مہر سے ہو جاؤ۔ اگر وقت کو حد سے زیادہ اہمیت دو گے تو یہ تمہارے سر پر سوار ہو جائے گا طبلہ بجائے گا، تب تم کیا کر لو گے؟ جہاں تک تمہارے یہاں آنے کی بات ہے، جب چاہو آ جاؤ۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ویسے اگر تم میرا پروگرام جاننا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ شاید مئی میں جانا پڑے۔ فی الحال کنفرم نہیں ہے۔ بہر حال تم اپریل تک آ سکتے ہو۔ تب یہاں رنگوں کی بہار ہو گی۔ پچھلی بار تم آئے تھے تو سردیاں تھیں اور صرف دو ہی رنگ تھے۔ کالا اور سفید۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف دو رنگ خوب صورت نہیں ہو سکتے لیکن اگر رنگ ہی دیکھنے ہیں تو یہاں پت جھڑ کے موسم میں آؤ۔ جب طویل جاڑوں کے بعد پیڑوں میں نئے پھول اور پتے نکلتے ہیں۔

تم نے تو دیکھا ہی ہے کہ بڈاپسٹ شاید یورپ کا واحد دارالسلطنت ہے جو اپنے پہاڑوں کے دامن میں جنگلوں کے وسیع و عریض ٹکڑے چھپائے ہوئے ہے۔ شاید یہ بھی قدیم تہذیب کی ہی دین ہے۔ ورنہ بڈاپسٹ بھی لندن ہوتا۔ حالت یہ ہوتی کہ پارکوں کے علاوہ جہاں کہیں بھی سطح قطعہ زمین ہوتا، وہاں عمارتیں کھڑی ہو چکی ہوتیں۔

میں نے پچھلے پت جھڑ کے موسم میں خاصا وقت بڈاپسٹ اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے جنگلوں میں گزارا تھا۔ تم زیادہ بے چین نہ ہو جاؤ، اس لیے یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تمام وقت میں نے تنہا ہی گزارا تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پت جھڑ کا موسم اداسی بھرا ہوتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی نظر نہ آنے والا فنکار ہے......شاید ہوا، جو اپنے ہاتھوں میں رنگوں کا طشت اٹھائے ایک ایک پتی اور ایک ایک پھول کو ایسے رنگوں سے سجا رہی ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ ایک ایک پتی پر رنگوں کی ایسی گھٹا دیکھنے کو ملی کہ بیان سے باہر ہے۔ جنگل میں پیڑوں کے بدلتے ہوئے رنگ۔ دور یا پہاڑ کے اوپر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہو جیسے حیرت انگیز اور دلکش رنگوں کا بہت بڑا کینوس ہو۔ رنگوں، ان کے شیڈ اور بدلتے ہوئے تاثر کو کاغذ پر لکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

ہمارے سفارت خانہ کے سیکنڈ سیکریٹری کے بھائی ان دنوں یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس قدرتی حسن کو اظہار دینے کا ایک طریقہ کھوج نکالا تھا۔ وہ رنگوں کی گھٹا کو دیکھ کر کہتے تھے۔

''ارے یہاں گلزار جی ہوتے تو دسیوں اشعار لکھ دیتے۔ یہاں نرالہ ہوتے تو نہ جانے کتنی حسیناؤں کی داستان تخلیق ہو جاتی۔''

ببلو کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی تھی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شہر کے اتنا اندر فطرت کا یہ حسین امتزاج کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ پیڑوں کے رنگ کالے، اودے، نیلے، کتھئی، گہرے سبز، پیلے، نارنجی، سرخ، کاہی، گلابی ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایک ہی درخت کی پتیاں نیچے کی ڈالیوں پر اودی دکھائی دیتی ہیں اور بالائی حصے میں لال۔ کچھ پیڑوں میں تو ایک ہی پتے پر تین تین، چار چار طرح کے رنگ آپس میں ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی تو ایک شجر میں ہوا کے رخ پر ایک رنگ دکھائی پڑتا ہے اور اس کے مخالف سمت میں کوئی اور رنگ ہوتا ہے۔ پھول عام طور پر نہیں رہتے لیکن پتیاں پھولوں سے زیادہ خوب صورت ہو جاتی ہیں۔ پیڑوں اور پتوں کے ان بدلتے ہوئے رنگوں کو مدنظر رکھ کر ہی شاید جنگلوں میں ایسی شجر کاری کی جاتی ہے جو طرح طرح کا رنگین منظر پیش کرتے ہوں۔ بہار کے موسم میں جو رنگ اترتے ہیں انہیں اگر ''کنوینشنل'' کہا جا سکتا ہے تو پت جھڑ کے رنگ ''نان کنوینشنل'' ہوتے ہیں۔ ایسے رنگ جو شاید تخلیق کار اور فن کاروں کے تخیل میں ہوں تو ہوں، کہیں اور نہیں دیکھے جا سکتے۔ جنگل کے ان رنگوں میں پیلا رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب تم جنگل کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہو تو دور تک پیلے رنگ کا گویا فرش بچھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پیلے پتوں والے پیڑوں کے جنگل کے نیچے دھوپ اس طرح اترتی ہے کہ وہ پیلے پتے کچھ نارنجی ہو جاتے ہیں، چمکنے لگتے ہیں اور دھوپ کی آڑھی ترچھی کرنیں پتوں کے جھرمٹ کو چیرتی ہوئی نیچے تک آ جاتی ہے۔ تب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم سریت میں لپٹے ہوئے کسی پیلے غار میں چلے جا رہے ہو۔ پت جھڑ کے موسم میں اس طرح کے بے شمار چمتکار ہوتے ہیں۔ پیڑوں کے پتوں کا

رنگ گہرا سبز اور کتھئی ہے، اچانک کسی موڑ پر ایک ایسا درخت مل جاتا ہے جس کے پتوں کا رنگ بالکل سرخ ہے۔ آتشی سرخ!

جہاں تک شہر کا سوال ہے، تم خود دیکھ چکے ہو لیکن میری آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں لگ بھگ تین سال سے اس شہر میں ہوں۔ اس دوران لندن، پیرس، ویانا وغیرہ گھومنے اور دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر یورپ میں شہر ہیں تو بڈاپسٹ اور پراگ!

پراگ دیکھنے سے قبل میری ایک دوست سے بات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔ ”پراگ ضرور آؤ یہ شہر نہیں جادو ہے۔“

پراگ جادونگری ہے تو بڈاپسٹ بھی کسی سحرانگیز بستی سے کم نہیں۔ دنیا کے کئی شہروں کے درمیان ندیاں بہتی ہیں لیکن بڈاپسٹ کے بیچوں بیچ بہنے والی ڈونا ندی کی بات ہی کچھ اور ہے جیسے

اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

ڈونا ندی شہر کا ایک ایسا حصہ بن چکی ہے کہ آپ شہر میں کہیں بھی جائیں وہ آپ کے ساتھ ساتھ رہے گی۔ اس کی ایک جانب اونچے سرسبز پہاڑوں کے درمیان سے جھانکتے مکان دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری طرف میدان میں بسا ہوا شہر پسٹ ہے۔ تقریباً سو سال دریائے ڈونا کے دونوں کناروں پر آباد، یعنی پہاڑوں پر بسا بڈا اور میدانی علاقے میں پسٹ دو الگ الگ شہر تھے لیکن 1872ء میں ان دو شہروں کی شادی ہوگئی یعنی درمیان میں بھی مکانات بنتے گئے اور اتصال ہوگیا۔ اس طرح بڈاپسٹ کا جنم ہوا تھا لیکن اب تک ندی کے کنارے پہاڑوں پر بسے شہر کو بڈا اور دوسری طرف آباد شہر کو پسٹ کہا جاتا ہے۔ درمیان میں ڈونا ندی بل کھاتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اس کے دونوں طرف دو دو سڑکیں اور ٹرام کی لائنیں ہیں۔ ڈونا اس قدر قریب معلوم ہوتی ہے کہ تم آسانی سے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہہ سکتے ہو۔

ڈونا مجھے عجیب پُراسراری سی ندی لگتی ہے۔ اتنے رنگ بدلتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کبھی ایک دم نیلی ہو جاتی ہے، کبھی مٹیالی سی اور کبھی کچھ سرخ سی...... کبھی نہایت پُرسکون تھکی تھکی سی معلوم ہوتی ہے تو کبھی چنچل اور بے چین۔ رات میں اس کے دونوں کناروں پر لگی روشنیاں جگمگا اٹھتی ہیں اور ساتھ ہی روشن عمارتوں کا عکس ڈونا میں اس طرح نظر آتا ہے جیسے ڈونا کے اندر بھی ایک شہر بسا ہو۔ دن میں بھی شاندار عمارتیں ڈونا کے اندر سے جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔

ہنگرین لوگ گیتوں میں ڈونا کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ جو گیت میں نے سنے ہیں ان میں کہیں اس کو نرم ہواؤں کی محبوبہ قرار دیا گیا ہے اور کہیں کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے ڈونا میں کود جاتا ہے اور اسے پار کر کے وصال کے لمحوں سے سیراب ہوتا ہے۔ لیکن اب تو دریا پار کرنے کے لیے ساتھ عدد پل موجود ہیں جیسا کہ تم نے دیکھا ہے کہ یہ پل لندن کے پلوں کی طرح کم بلند ہرگز نہیں ہیں۔ لندن کے صرف ایک پل ”ٹاور برج“ کو چھوڑ کر باقی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے انہیں ہمارے دیسی انجینئرز نے بنایا ہے۔

بڈاپسٹ میں ڈونا پر بنے ساتوں پلوں کی الگ الگ شناخت اور تاریخ ہے۔ ان پر ہنگرین شاعروں نے اشعار کہے ہیں۔ یہ پل شہر اور لوگوں کی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ ”چین برج“ جس پر رات میں روشنیاں ہوتی ہیں۔ اس کے بارے میں یہاں ایک دلچسپ کہانی سنائی جاتی ہے۔ تم بھی سنو...... لیکن کہانی سننے سے پہلے یہ بتادوں یا شاید تم نے دیکھا ہی ہو کہ پل کے دونوں طرف پتھر کے دو شیر دھاڑنے کے انداز میں منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ پلوں کے آغاز پر ایسے پتھر کے شیر کھڑے کرنا یا بٹھانا شاید یورپین کی پرانی روایت رہی ہے کیونکہ میں نے اپنے ملک میں بھی کچھ پرانے پلوں میں ایسے شیر دیکھے ہیں۔ خیر، اب کہانی سنئے۔

کہتے ہیں کہ جس آرکیٹیکٹ انجینئر نے وہ پل ڈیزائن کیا تھا، اس کا دعوا تھا کہ پل کا ڈیزائن اس قدر پرفیکٹ ہے کہ کوئی اس میں کسی قسم کی کمی یا نقص نہیں نکال سکتا یعنی آرکیٹیکٹ صاحب خود ستائشی میں اس قدر پھول کر کپا ہوگئے کہ بس ایک چھوٹی سی پن کی ضرورت تھی ان کی ہوا نکالنے کے لیے۔ یہ کام کیا ایک بچے نے۔ وہ اپنی ماں کی انگلی پکڑے پل پر سے گزر رہا تھا۔ اس نے منہ کھولے، دھاڑتے ہوئے شیر کو دیکھا اور ماں سے کہا۔

”دیکھو، دیکھو امی شیر کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔“

کہتے ہیں کہ ایک بچے کی طرف سے نکالی جانے والی غلطی یا نقص کا سن کر آرکیٹیکٹ صاحب نے پل سے ڈونا میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔

ویسے ڈونا جانیں بھی خوب لیتی ہے۔ ہنگری میں خودکشی کا تناسب بہت زیادہ ہے کیوں ہے؟ یہ تو کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے جن کی یہاں کمی نہیں ہے لیکن بدقسمتی کہ میں نہیں ہوں، خیر پلوں پر سے ڈونا میں کود کر جان دینا، یہاں خودکشی کرنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ ڈونا پر بنے ایک پل ''مارگریٹ برج'' پر ہنگرین شاعر یارلش ارنے (1762-1716ء) کی مشہور نظم ''پل کا افتتاح'' کا بھی موضوع ہے کہ جن لوگوں نے ڈونا میں کود کر خودکشی کر لی تھی، ان لوگوں کی روحیں پل پر منڈلاتی رہتی ہیں۔

کبھی کبھی خودکشی کرنے والے تماشا بھی کر لیتے ہیں۔ ایک دوسرا پل جسے ''فریڈم برج'' کہتے ہیں، اس پر آسانی سے چڑھا جا سکتا ہے۔ خودکشی کے ارادے سے کچھ لوگ اس پر چڑھ جاتے ہیں۔ اوپر پہنچ کر ان کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے۔ وہ خود کو اتنی بلندی پر موجود پا کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ نہ تو وہ کود کر خودکشی کر پاتے ہیں اور نہ ہی اس پل سے نیچے اتر پاتے ہیں پھر وہ چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ تب فائر بریگیڈ کی گاڑی آتی ہے اور اسنارکل کے ذریعے اسے نیچے اتارا جاتا ہے۔ اچھا خاصا تماشا ہو جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ یہاں کے قانون میں خودکشی کرنا جرم نہیں ہے۔

خیر بات ہو رہی تھی ڈونا کی۔ اگر میں شاعر ہوتا، جیسا کہ تم ہو تو میں کہہ سکتا تھا کہ ڈونا اس شہر کی محبوبہ ہے جو اس کی گود میں اٹھلاتی، مچلتی اور ادائیں دکھاتی رہتی ہے۔ کبھی روٹھتی ہے، کبھی مان جاتی ہے اور محبوب اسے بہلاتا رہتا ہے۔ کبھی محبوبہ اسے سہلاتی ہے اور شہر اس کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھتا ہے۔

میں ان الفاظ کو اشعار کے روپ میں نہیں ڈھال سکتا لیکن محبوب اور محبوبہ کے ذکر پر یاد آیا کہ کسی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بڈاپسٹ کے عام سماجی ماحول میں ایسی کیا چیز ہے جو مجھے پسند آئی ہو، پسند تو پتا نہیں کیا کیا آیا لیکن میں نے بتایا کہ مجھے سب سے زیادہ یہ پسند آیا کہ یہاں کے عوامی مقامات، بسوں، ٹراموں، میٹرو اور پارکوں میں جب محبوب اور محبوبہ ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں تو عام طور پر لڑکیاں اپنے محبوب کی غیر معمولی فکر میں مبتلا محسوس ہوتی ہیں۔

فرض کیجیے کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی بس میں ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ لڑکی میٹھی میٹھی نظروں سے لڑکے کو دیکھ رہی ہے، اسے چوم رہی ہے، اس کے بال سنوار رہی ہے۔ اس کے لباس کی سلوٹیں درست کر رہی ہے ......اور لڑکا کھڑکی سے باہر کے مناظر میں کھویا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی وجہ......؟ دو معاشروں کے درمیان جو فرق ہے، وہی ہے۔

ہنگرین لڑکیاں کس قدر حسین ہوتی ہیں، تم دیکھ چکے ہو۔ تم نے کہا بھی تھا کہ مغربی یورپ میں لڑکیاں عام طور پر ''ان اپروچ ایبل'' معلوم ہوتی ہیں جبکہ ہنگرین لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا۔ ہنگرین لڑکیوں کی خوب صورتی کا راز مجھے تو یہ بتایا گیا ہے کہ ہنگرین لوگ بنیادی طور پر ایشین ہیں۔ دسویں صدی میں یہ لوگ وسطی ایشیا میں کہیں سے یہاں آئے تھے۔ بربر قسم کے لوگ تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ مغربی یورپ کے کلیساؤں میں یہ دعا مانگی جاتی تھی کہ اے خدا! ہمیں ہنگرین لوگوں کے تیروں سے محفوظ رکھ۔ اب وہ زمانہ بیت گیا۔ اپنے بادشاہ اشتوان (1038ء) کے عیسائی ہونے کے بعد یہ تمام لوگ بھی عیسائی ہو گئے پھر یہ ملک ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔ مطلب یہ کہ ایشیائی اور یورپی اختلاط سے ہنگرین نسل نے وجود پایا۔ یہ تو تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جب دو رنگ ملتے ہیں تب ہی اچھا رنگ سامنے آتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کے رویوں اور زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ شادی کرنا، گھر بنانا، بچے پیدا کرنا یہاں کی ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کا بھی کافی اثر ہے لیکن خاندانی رشتے مغربی یورپ اور امریکا کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

لیکن پیارے دوست ہنگرین لڑکیوں اور عورتوں کی زندگی ظاہری طور پر جتنی آزاد اور پرکشش دکھائی دیتی ہے اتنی ہے نہیں۔ میں یہاں سنتا ہوں کہ ہنگرین عورت نوجوانی میں محبت کرتی ہے (عموماً کئی بار) پھر شادی، ایک یا دو بچے ......پھر طلاق۔ اس کے بعد پوری زندگی تنہائی کی نذر۔ یعنی عمر بڑھنے کے باعث کسی عاشق کے ملنے کا سوال ہی نہیں، شوہر پہلے ہی الگ ہو چکا ہے۔ بچے بھی اپنے لیے راستہ بنا کر کہیں نکل جاتے ہیں باقی بچتی ہے ڈھلتی عمر اور تنہائی۔

ایک دوست نے ہنگرین عورتوں پر ایک لطیفہ سنایا تھا۔

''اگر تم اٹھارہ بیس برس کی لڑکی سے کہو کہ تم اس کے لائق ایک لڑکے کو جانتے ہو تو وہ پہلا سوال کرے گی، دکھنے میں کیسا ہے؟ اگر تم یہی بات پچیس تیس سال کی لڑکی سے کرو تو وہ دریافت کرے گی، اس کے پاس دولت کتنی ہے؟ اور

اگر یہی تم چالیس سال کی عورت سے کہو گے تو فوراً پوچھے گی کہاں ہے؟''

یہاں کے معاشرے پر بھی ایک طرح سے مردوں ہی کی حکمرانی ہے۔ ابھی حال ہی میں ایک ہنگرین دوست نے کہا تھا کہ ان کے ملک کی ایک عورت سفیر بن گئی ہے پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہمارے ملک میں عورتیں اس طرح کے عہدوں تک پہنچ پاتی ہیں؟

کچھ تحقیق اور مطالعے کے بعد میں یہ جان پایا ہوں کہ اس ملک میں عورتوں کو اہم عہدے نہیں مل پاتے۔ انہیں چھوٹے چھوٹے اور معمولی کام ہی دیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی گھریلو تشدد کی کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان تفریق کے حوالے سے یہاں ایک محاورہ مشہور ہے ''شیطان سے تھوڑا ہی کم سہی لیکن ہے تو آدمی۔''

شیطان صاحب یہاں بھی دندنا رہے ہیں۔ پچھلی حکومت نے مسٹر شیطان کے کام کو مزید آسان بلکہ قانونی شکل دے دی ہے۔ اب یہاں مرد وزن کے بے محابہ میل جول اور تعلقات پر کوئی قانونی روک ٹوک نہیں ہے۔ سیکس کی دکانیں اور ٹاپ لیس بار کثرت سے نظر آنے لگے ہیں۔ رات کو یہاں کا ریڈ لائٹ ایریا نیون لائٹوں سے لکھے ترغیبی الفاظ کے ذریعے لوگوں کو اپنی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے لیکن فی الحال یہ بے راہ روی اس درجے کو نہیں پہنچی ہے جیسی پیرس میں ہے۔

بڈاپسٹ ایک معنوں میں رات کا شہر ہے۔ جب تم آئے تھے تو موسم سرما کی وجہ سے یہاں کی راتیں سرد تھیں۔ اگر گرمیوں میں آؤ تو دیکھ سکتے ہو کہ ڈونا کے دونوں طرف کی عمارتیں، خاص طور پر بڈا پہاڑ پر بنے چرچ اور محلوں کی جگمگاتی شبیہہ کچھ اس طرح کا پُرسحر منظر پیش کرتی ہے جیسے سیاہ آسمان پر ایک چمکتا ہوا طلسمی شہر اڑتا چلا جا رہا ہے۔ چین برج کو مکمل طور پر روشن کر دیا جاتا ہے اور یہ دریائے ڈونا کے گلے میں پڑے ہیروں کے ہار جیسا معلوم ہوتا ہے اگر رات میں ڈونا کے کنارے والے سب سے بڑے پہاڑ ''گولیت ہِل'' پر چڑھ کر دیکھو تو ہوا میں اڑتا ہوا جگمگاتا طلسمی شہر مزید واضح دکھائی دیتا ہے۔

گولیت ہِل کا بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ جب ہنگرین، عیسائی نہیں تھے تو بہت سے عیسائی مبلغ یہاں عیسائیت کا پرچار کرنے اور ان کو مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دینے کے لیے آتے تھے۔ ان ہی میں گولیت نام کا ایک عیسائی مبلغ بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ ان کا خدا بہت طاقت ور ہے وغیرہ وغیرہ پھر کہا کہ ہنگرین لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان کے خدا کو مانیں۔ ہنگرین نے مبلغ سے کہا۔ ''اگر تمہارا خدا سب کچھ کر سکتا ہے تو ہم اسے مان لیں گے؟ اس کی عبادت کریں گے لیکن ہم اس کا ثبوت چاہتے ہیں۔''

''کس قسم کا ثبوت؟'' مبلغ گولیت نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''ہم لوگ تمہیں لکڑی کے ایک بڑے سے ڈرم میں بند کرکے پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکا دیں گے اگر تمہارا خدا سب کچھ کرسکتا ہے تو تمہیں بچالے گا۔ یہ ثبوت ہمارے لیے کافی ہوگا اور ہم عیسائی ہوجائیں گے اور اگر ایسا نہیں ہوا، تم مر گئے تو ہم عیسائی ہرگز نہیں ہوں گے۔''

یہ تو نہیں معلوم کہ عیسائی مبلغ گولیت اس امتحان کے لیے تیار ہوا تھا یا نہیں لیکن اس زمانے کے بربر ہنگرین لوگوں نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا۔ مبلغ گولیت کی نہایت درد ناک موت واقع ہوگئی۔ ہنگرین عیسائی نہیں ہوئے لیکن بادشاہ کے عیسائی ہونے کے بعد پورا ملک عیسائی ہوگیا تو اس پہاڑ کا نام ''گولیت پہاڑ'' رکھ دیا گیا جس پر سے مبلغ کو لڑھکایا گیا تھا۔ آج اس پہاڑ پر گولیت کا ایک بڑا سا مجسمہ دیکھا جاسکتا ہے۔ رات میں اس پر روشنی کی جاتی ہے۔ آپ شہر کے ایک بڑے حصے سے اس مجسمے کو دیکھ سکتے ہیں۔

رات میں شہر کا حسن اس لیے بھی دوبالا ہوجاتا ہے کہ سڑکوں پر رات کو دیر تک چہل پہل رہتی ہے۔ حسین اور نوجوان لڑکیاں تنہا اور بے فکری سے چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں تک ''لا اینڈ آرڈر'' کا سوال ہے اب تک یعنی سرمایہ داری کے ودود کے دوران بھی اسے بہتر کہا جاسکتا ہے لیکن اسے پرانی تہذیب کا اثر ہی کہہ سکتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنی وقعت کھورہا ہے۔ اب جرائم میں اضافہ ہونے لگا ہے لیکن ویسا نہیں جیسے تمہارے اور میرے دیس میں ہے۔ یہاں کے اخبارات میں چھپتا رہتا ہے کہ ہنگری میں ''انڈر ورلڈ'' اور جرائم کی دنیا مضبوط ہورہی ہے لیکن وہ تمام لوگ روسی ہیں۔ کچھ اخبارات میں طنزیہ انداز میں چھپنے والے مضامین میں یہ بھی کہا گیا ہے۔

''دیکھیے، ہم ہنگرین لوگ کیسے ہیں ہمارے جرائم پیشہ لوگ اپنے ملک میں جرائم کی دنیا آباد کرنے کے بھی اہل نہیں ہیں جس کے لیے میدان کھلا ہے۔''

ہنگری، بڈاپسٹ میں سوشلزم کے دوران جرائم کے خلاف جو سخت اقدامات اٹھائے گئے، اس نے جرائم کا صفایا کردیا تھا۔ اب درآمد ہورہے ہیں۔ اگر تم مجھے قسم دے کر بھی پوچھو تو میں یہی کہوں گا کہ ہنگرین بہت سیدھے اور شریف لوگ ہیں۔ عام ہنگرین دھوکا دینا تک نہیں جانتے، یہ ایمان دار لوگ ہیں۔ کچھ ''ریزرو'' سے معلوم ہوسکتے ہیں لیکن تعارف کے بعد یہ تاثر ختم ہوجاتا ہے۔ مجھے یہاں ایک بینک میں چارسو ڈالر حساب سے زیادہ دے دیے گئے پھر مجھے فون کیا گیا کہ آپ کو چارسو ڈالر فالتو دے دیے گئے ہیں، آپ لوٹا دیجیے۔''

سیدھے پن اور شرافت کے باوجود میں نے ہنگرین لوگوں اور یہاں کے معاشرے میں پنپتی ہوئی نفرت کو بھی واضح طور پر محسوس کیا ہے اور یہ نفرت یہودیوں کے خلاف ہے اور کیوں ہے؟ میں نے اپنے طور پر اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

سنو...... کہنا یہ ہے کہ یہودی اس قدر منظم اور ایک دوسرے کا اتنا خیال رکھنے والے ہیں کہ اکثر درست فیصلے نہیں ہوپاتے۔ بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی ادارے میں کوئی یہودی اعلیٰ پوسٹ پر ہوتا ہے تو وہ پورے ادارے میں یہودیوں کو بھر دیتا ہے۔ یہ کام اس قدر دھڑلے سے ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اہانت محسوس کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہنگرین میڈیا اور کاروباری دنیا پر بھی یہودیوں کا قبضہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی جتنی سہولیات یہودیوں کو حاصل ہیں اتنی مقامی ہنگرین کو بھی حاصل نہیں ہیں۔

یہی اسباب ہیں کہ میں نے یہاں اکثر لوگوں کو یہودیوں کا مخالف پایا ہے۔ کچھ لوگ اس حد تک جاچکے ہیں کہ اب وہ مطالبہ کرنے لگے ہیں کہ یہودیوں کو ہنگری سے نکال دیا جائے۔ اس پر بعض لوگوں کی رائے ہے کہ اگر ہنگری سے یہودیوں کو نکال دیا گیا تو یہاں کی اکانومی تباہ ہوکر رہ جائے گی۔ ہنگری میں کاروباری دنیا ٹھپ ہوکر رہ جائے گی۔

مقامی لوگ یہودیوں کے خلاف نہیں بلکہ یہاں جپسیوں، عربوں اور چینیوں کے لیے بھی کچھ ایسی ہی فضا قائم ہورہی ہے۔ یہاں اتنی قوم پرست قوتیں موجود نہیں جتنی دیگر ملکوں میں ہیں لیکن پھر بھی ابھر کر سامنے آرہی ہیں۔ عوام اور حکومتی ایوانوں میں ان کی آہٹیں سنی جاسکتی ہیں۔

میں نے یہاں آباد اپنے دیسی لوگوں اور جپسیوں سے ملنے، انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا احوال آئندہ کسی خط میں تحریر کروں گا۔ اب مزید لکھنے کو دل نہیں چاہ رہا کیونکہ پڑوس کے کسی فلیٹ سے کتے کے رونے اور چلانے کی آوازیں آرہی ہیں۔ کوئی اپنے کتے کو فلیٹ میں بند کرکے چلا گیا ہے۔ کتا زور، زور سے رو رہا ہے۔ ویسے عام طور پر یہاں کتوں کے ساتھ انسانی رویہ رکھنے کی روایت ہے۔''

انوکھے امراض

کشمالہ حسن

یہ خاک کا پتلا خاکی جسم پر کتنا اتراتا ہے۔ گھمنڈ کرتا ہے جب کہ یہ جسم بیماریوں کا مسکن ہے۔ ہر روز ایک نئی بیماری سامنے آتی ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ میڈیکل سائنس ایک بیماری کا علاج دریافت کرتی ہے تو دوسری اس سے بھی زیادہ خطرناک بیماری سر اٹھا لیتی ہے۔ آج سے دو ڈھائی سو سال قبل بخار سب سے خطرناک مرض کہلاتا تھا۔ اس کا علاج دریافت ہوا تو تپ دق سامنے آگیا جسے موت کی گھنٹی کہا جانے لگا۔ ٹی بی پر قابو پا گیا تو کینسر نے پھن گاڑھ لیا۔ کینسر کو دبانے کی کوشش ہو ہی رہی تھی کہ ایڈز نے جنم لے لیا، ایڈز کا علاج دریافت کرنے کی کوشش جاری تھی کہ ای بولا۔ ”موت کا ہرکارہ بن کر سامنے آگیا۔ ان کے علاوہ بھی چند پُراسرار مرض بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں جو کہ موت کے پیامبر نہ سہی لیکن جسم کے مدافعتی نظام کو ضرور نقصان پہنچا کر بڑے مرض کی راہ ہموار کررہے ہیں۔

دنیا بھر میں پھیل رہے کچھ انوکھے امراض کا تذکرہ

آپ نے تو سنا ہی ہوگا مریضِ عشق پہ رحمت خدا کی، یا بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے۔ یا اس قسم کا کوئی اور شعر۔ انسان اور اس کے ساتھ لگی ہوئی بیماریوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

ہر دور میں بیماریاں آتی رہی ہیں اور ان کا علاج دریافت ہوتا رہا ہے۔ بڑے بڑے اطبا، کیمسٹ، فزیشن، سرجن انسان کو بیماریوں سے محفوظ کرنے کے جتن کرتے رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے وہ فرشتے ہیں۔ دونوں کے پاس بڑے بڑے صندوق ہیں۔ ایک فرشتہ کسی مرض کے علاج کی پرچی دنیا میں پھینکتا ہے اور دوسرا فرشتہ فوراً ہی کوئی دوسرا مرض دنیا میں پھینک دیتا ہے اور یہ کشمکش ازل سے جاری ہے۔

جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ایسی ایسی بیماریوں کے نام سامنے آئے ہیں جو ہمارے اجداد نے کبھی نہ سنے ہوں گے۔

کینسر، شوگر، ہیپاٹائٹس (اور اس کی ذیلی اقسام)، ایڈز، نگلیریا، ایبولا وائرس، ہائپر ٹینشن اور نہ جانے کون کون سی بیماریاں حضرت انسان کو لگی ہوئی ہیں۔

بیماریوں کی وجوہات بے شمار ہو سکتی ہیں۔ ناقص خوراک، صفائی کا فقدان، ماحول کی آلودگی، بے احتیاطی، غرض یہ کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

بہت سے امراض ایسے ہیں جن کا تعلق کسی خاص کلچر یا جغرافیہ سے ہوتا ہے۔ زرد بخار، کانگو وائرس وغیرہ افریقا سے آئے ہیں۔ ڈینگی بھی اسی فہرست میں ہے۔

میں نے خود جغرافیائی تبدیلیوں کے ساتھ امراض کی نوعیت تبدیل ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔ میں نے ہندوستان اور بنگلہ دیش میں فیل پا دیکھے ہیں (وہ مرض جس میں پاؤں ہاتھی کے پیر جیسے موٹے ہو جاتے ہیں)۔ جب کہ اس قسم کا مرض اس طرف کم دیکھنے میں آتا ہے۔

جب کہ شوگر، کینسر اور برص وغیرہ میں نے اس طرف بہت دیکھے ہیں اور ان علاقوں میں بہت کم ہوتے ہیں۔

بہت سی بیماریاں موروثی ہوتی ہیں۔ جینز کے ساتھ سفر کرتی ہوئی ایک نسل سے دوسری کو منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

بہت سی بیماریاں عالمی درجہ رکھتی ہیں۔ یعنی پوری دنیا میں ہوتی ہیں اور بہت سی خاص خطے سے تعلق رکھتی ہیں۔

بہت سی معاشرتی بیماریاں ہوتی ہیں۔ بہت سی بیماریوں کا تعلق اپنے مزاج اور رویے سے ہوتا ہے۔ جیسے حسد، غصہ اور نفرت وغیرہ جیسے جذبوں، ہائپر ٹینشن اور ڈپریشن ہو جاتا ہے۔

غذائی عادات بھی بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے لوگ کھانے پینے کے معاملات میں احتیاط کے قائل نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب مل ہی رہا ہے تو کیوں نہ کھایا جائے لیکن تمام میٹھی اشیاء غرض یہ کہ جو مل جائے وہ کھا لیتے ہیں۔

نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ شوگر اور دل کی بیماریاں ان کا مقدر بن جاتی ہیں۔

یہ صورتِ حال بہت خطرناک ہے۔

اس مضمون میں ایسی چند بیماریوں کا تعارف کروایا گیا ہے جو اپنی جغرافیائی حدود میں ہونے کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں۔

ان بیماریوں کا تعلق کسی خاص خطے یا کلچر سے ہوتا ہے۔ یہ پُراسرار بیماریاں کہلاتی ہیں۔ ان کا علاج بھی ہوتا ہے لیکن علاج سے زیادہ ماحول اور رویے میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

آئیں ایسی کچھ پُراسرار اور انوکھی بیماریاں دیکھتے ہیں۔

ریٹائرڈ شوہروں کا سنڈروم

یہ وہ معاشرہ ہے جہاں کام کو عبادت سمجھا جاتا ہے۔

کام، کام اور صرف کام۔ جہاں کام کے علاوہ کسی اور طرف دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ ہر ترقی یافتہ اور تیز رفتار معاشرے کے افراد اسی طرح کام میں لگے رہتے ہیں۔

یہ مرض جاپان میں بہت عام ہے اور خاص طور پر خواتین اس کی زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ یہ کوئی ایک مرض نہیں ہوتا بلکہ اس کے سبب کئی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

جب شادی ہوتی ہے تو شادی کے دوسرے ہی دن سے مرد کی مصروفیات شروع ہو جاتی ہیں۔ دفتر، کارخانہ، غرض یہ کہ جہاں بھی اس کی جاب ہو۔

یہی حال عورت کا ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح مصروف ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔

آپس کی ملاقات بھی ذرا سی دیر کے لیے ہوا کرتی ہے۔ اس وقت بھی دونوں بری طرح تھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھر کے دیگر مسائل بھی ہوتے ہیں۔

جاپان میں یہ سنڈروم اس وجہ سے اپنے عروج کو پہنچا ہوا ہے (ویسے تیز رفتار زندگی کی وجہ سے ایسی صورتِ حال ہمارے یہاں بھی پیدا ہوتی جا رہی ہے لیکن ابھی صورتِ حال جاپان جیسی خراب نہیں ہوئی ہے)۔

ایک عرصہ اس طرح ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد جب شوہر ریٹائر ہوتا ہے تو صورتِ حال بالکل بدل جاتی ہے۔

اب وہ زیادہ وقت گھر پر رہنے لگتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو اچھی طرح جاننے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہو جاتے ہیں۔

ایک دوسرے کے مزاج اور فطرت کی خرابیاں سامنے آنے لگتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان تلخیاں شروع ہو جاتی ہیں اور تلخیاں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ طلاق تک کی نوبت آ جاتی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق جاپان میں طلاق کی شرح شوہروں کے ریٹائرمنٹ کے بعد زیادہ ہو گئی ہے اور اس کی وہی وجہ ہے۔

اب جو صورتِ حال بنتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ یا تو عورت طلاق لے لیتی ہے اگر ایسا نہ کر سکے تو پھر ذہنی دباؤ میں مبتلا ہو کر مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

جیسے السر، جسم پر دانے، بے خوابی اور کبھی کبھی تو قوتِ گویائی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

جاپان میں ماہرین اب اس طرف توجہ دینے لگے ہیں لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں کہ ایسے شوہروں کو مشورہ دیں کہ ریٹائر ہونے کے بعد گھر پر اپنا مکمل اختیار جتانے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ اب تک اس گھر کو آپ کی بیوی دیکھتی بھالتی آئی ہے۔ وہ شاید آپ کا یہ مالکانہ رویہ پسند نہ کر سکے۔

نیو ورلڈ سنڈروم

یہ بھی صنعتی اور تیز رفتار معاشرے کا رجحان ہے۔

اس سنڈروم کا تعلق بنیادی طور پر لائف اسٹائل سے ہے۔ یورپ اور امریکا میں بہت زیادہ عام ہے۔

طرز زندگی نے عورتوں، بچوں اور مردوں کو ٹی وی، اسکرین اور وڈیو گیمز کے سامنے لاکر بٹھا دیا ہے۔ ان کے پاس وقت گزارنے کا اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ وہ ٹی وی دیکھتے رہیں اور کھاتے رہیں کھاتے چلے جائیں۔

جو بھی مل جائے دنیا بھر کے جنک فوڈز، مشروبات اور نہ جانے کیا کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بہت بری طرح موٹاپے کا شکار ہو رہے ہیں۔

امریکا میں آپ کو ایک سے بڑھ کر ایک کلاسیکل قسم کے موٹے مل جائیں گے۔ اس میں عورت، مرد اور بچے وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

سروے کے مطابق پوری دنیا کے تین فی صد موٹے صرف امریکا میں ہیں اور اس بے تحاشا موٹاپے کے نتیجے میں انہیں بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ جیسے دل کے امراض، شوگر، بلڈ پریشر، سانسوں کا پھولنا وغیرہ۔ اس پر قابو پانے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے لائف اسٹائل کو بدلا جائے۔

Latah (اعصاب)

یہ ایک پُراسرار بیماری ہے اور ملائیشیا میں بہت عام ہے۔

اس مرض میں اعصاب بہت کمزور ہو جاتے ہیں۔ اس کا شکار خواتین زیادہ ہوتی ہیں۔ جب کہ عمر کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ یہ کسی بھی جگہ کے لوگوں کو ہو سکتی ہے۔

اس میں ہوتا یہ ہے کہ اعصاب ذرا سی بلند آواز یا شور برداشت نہیں کر پاتے۔ شور سے ان کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو جاتی ہے اور وہ گھبرا کر الٹی سیدھی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ وہ نفسیاتی مریض بن کر رہ گئے۔

انہیں اتنا بھی ہوش نہیں رہتا کہ وہ کون ہیں اور کیا ہیں۔

ایسا ہی ایک کیس یہ تھا کہ ایک عورت کو ایک ریبٹ دے کر یہ کہا گیا کہ یہ اس کا بچہ ہے اور بھوک سے بے تاب ہو رہا ہے۔ وہ عورت اس ریبٹ کو دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔

سوال یہ ہے کہ شور تو پوری دنیا کا مسئلہ ہے ہر جگہ شور ہی شور ہے۔ پھر یہ مرض صرف ملائیشیا میں کیوں ہے۔

ماہرین اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش تو کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کی وجوہات سامنے نہیں آسکی ہیں۔

مرضِ آتش

کوریا کی زبان میں Fire sicknes Hwrbyung.

یہ مرض کوریا کا منفرد مرض ہے۔ مریض کے سینے میں اچانک آگ سی جلنے لگتی ہے یا اسے ایسا محسوس ہوتا ہے (ویسے ہمارے یہاں بھی لوگ کہتے ہیں کہ ان کا سینہ جل رہا ہے)۔

سینے کی یہ جلن بدہضمی یا تیزابیت وغیرہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔

لیکن کوریا کی ادھیڑ عمر خواتین کا سینہ جلتا ہی نہیں ہے بلکہ باقاعدہ آگ کی جو علامات ہو سکتی ہیں وہ ہو جاتی ہیں۔

اچانک بے ہوشی، چکرا کر گر جانا، تڑپنا، یہ تو فوری طور پر ہوا کرتا ہے بعد میں وہ مختلف امراض کا مغلوبہ بن جاتی ہیں۔

وزن میں کمی، بدن میں ہر وقت درد، بے خوابی، دھڑکنوں کی بے ترتیبی، نگاہوں میں دھندلاپن وغیرہ۔

اس کی وجوہات مکمل طور پر سامنے تو نہیں آسکی ہیں۔

لیکن ایک خیال یہ ہے کہ بے پناہ غصے کو ضبط کرنے برداشت کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ماہرین نفسیات اسے خاندانی مرض قرار دیتے ہیں۔

ویسے یہ محاورہ صحیح معلوم ہونے لگتا ہے کہ غصہ ایسی آگ ہے جو انسان کو اندر سے جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

مِنی سنڈروم

یہ مرض برصغیر کے نوجوانوں کا ہے۔

یعنی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال وغیرہ میں بہت عام ہے۔

اس کی بے شمار نفسیاتی وجوہات ممکن ہیں۔ مذہب سے دوری، جنسی ہیجان، وقت پر شادی نہ ہو سکنا۔

اس مرض میں مبتلا نوجوان کسی نہ کسی وجہ سے اپنے مادہ منویہ کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب یہ جوہر حیات ختم یا کم ہو جائے تو اس کے بعد بہت سی ذہنی اور جسمانی بیماریاں ان کا مقدر ہو جاتی ہیں۔

ان کی بھوک ختم ہو جاتی ہے، آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے

لگتے ہیں، سو نہیں پاتے، کمزوری اتنی ہوتی ہے کہ دو قدم بھی چلنا محال ہو جاتا ہے۔ سانسیں پھولنے لگتی ہیں۔ اعصاب مرجھا کر رہ جاتے ہیں۔ زندگی سے دل چسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے تدارک کے لیے مذہبی اور نفسیاتی مفکروں کو اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

Paleng اور Pafeng

یہ دو بیماریاں ہیں لیکن ایک ہی سلسلے کی ہیں۔ ایک کے بعد دوسری بیماری بھی ہو جاتی ہے۔ یہ مرض چینی باشندوں کا ہے۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا انوکھا مرض ہے۔

پالینگ سخت ترین سردی کا احساس اور پافینگ انتہائی شدید ہواؤں کا خوف۔

یہ مرض اچانک حملہ کرتا ہے اور ذرا سی دیر میں مریض کو بے حال کر کے رکھ دیتا ہے۔ چین میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص Yin اور Yan میں مبتلا ہو گیا ہے۔

مریض کو بے پناہ سر درد ہوتا ہے۔ پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ چکر آتا ہے اور بے تحاشا کھانسی ہونے لگتی ہے۔

اچانک موت

یہ مرض ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں بہت عام ہے۔

یہ بھی ایک پُراسرار مرض ہے۔ جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ رات میں سوئے اور صبح تک مر گئے یعنی بستر پر پڑے۔

جب ایسے مریض میں ہارٹ اٹیک کی بھی کوئی علامت نہیں پائی جاتی اور ویسے بھی عام طور پر ایسے افراد کی عمومی صحت ٹھیک ہی ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ اس پُراسرار موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان علاقوں کی روایات اور کہانیوں کے مطابق اس قسم کی اموات ایک پُراسرار روح کی وجہ سے ہوتی ہے۔

وہ روح رات بھر بھٹکتی ہے۔ گھروں میں جھانک کر دیکھتی ہے اور اپنے مرض اور پسند سے کسی کو بھی اپنا شکار بنا لیتی ہے۔

جاپان میں اس بدروح کو Pok-Kuri، ویتنام اور لاؤس میں Tsab-Tsung اور فلپائن میں Bati-bat کہا جاتا ہے۔

اس سے بچنے کی کوئی احتیاطی تدبیر بھی نہیں ہو سکتی۔

منیلا میں ہونے والے ایک سروے کے مطابق 1948ء سے 1982ء تک اس قسم کی اموات کی شرح بہت زیادہ تھیں۔

یعنی بہت لوگ ان برسوں میں اس پُراسرار موت کا شکار ہوئے۔

اس کے شکار زیادہ تر لوگ 30 سے 37 برس کے تھے۔ یعنی بڑھاپے کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ زیادہ تر اموات تین بجے صبح کے وقت ہوئیں، دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں ہوئیں۔

کیا خیال ہے۔ یہ ہے نا پُراسرار مرض۔

Tabanka

ٹریڈاڈ کا مرض

اس علاقے کا یہ ایک عام مرض ہے اور اس کی وجوہات بھی ابھی تک سامنے نہیں آ سکی ہیں۔ اس علاقے میں ہر طرح اور ہر جنس کے لوگ اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ویسے بہت سے لوگ ہمارے یہاں بھی اس قسم کے مرض کا شکار ہو چکے ہیں۔

یہ اچانک بغیر کسی سبب کے بے پناہ اداسی کا مرض ہے۔

ہمارے ایک شاعر نے تو اس کا علاج بتا دیا ہے۔ غبار دل پہ بہت چھا گیا ہے دھولیں آج۔ کھلی فضا میں کہیں دور جا کے رولیں آج۔

لیکن اس علاقے میں ایسا کوئی علاج نہیں بتایا جا سکا ہے۔

اس میں ہوتا یہ ہے کہ اچانک ہی دنیا سے دل چسپی ختم ہو جاتی ہے۔ مریض کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کیفیت سے بچنے اور اپنے آپ کو بھلا دینے کے لیے بے پناہ شراب نوشی کرنے لگتا ہے۔

اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ جاتا ہے۔ مردم بے زار ہو جاتا ہے۔ خودکشی تک کر لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجوہات نفسیاتی ہوں۔ لیکن کیا ہیں اور اس کا علاج کیا ہے۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔

تو آپ نے دیکھ لیا کہ یہ دنیا کیسے کیسے امراض سے بھری ہوئی ہے۔ نہ سمجھ میں آنے والے امراض اور اگر گہری نگاہوں سے دیکھا جائے تو زیادہ تر امراض نفسیاتی ہیں یا بے راہ روی کی وجہ سے ہیں، یہ بے راہ روی جنسی بھی ہو سکتی ہے اور جسمانی بھی۔

نانگا پربت کا عقاب

ندیم اقبال

ارض پاک کو خدا نے بے شمار نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ قدرتی حسن سے اس طرح مالا مال کر رکھا ہے کہ اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملتی جو لوگ سوئٹزر لینڈ کے قدرتی حسن پر رطب اللسان رہتے ہیں انہیں سوات و مری و نتھیا گلی دیکھنا چاہیے جو سہارا ڈیزرٹ کی خاموشی کی تعریف کیا کرتے ہیں انہیں چولستان دیکھنا چاہیے جو نیپال کے ہمالیائی حسن کے گن گاتے ہیں انہیں بلتستان کی سیر ضرور کرنا چاہیے۔ اسی خیال کے تحت "سیر پاکستان" کے سلسلے کو شروع کیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں اب تک جتنی بھی تحریر شامل ہوئیں یہ تحریر ان سے ذرا مختلف ہے کیونکہ ندیم اقبال عالمی پیمانے کے عکاس ہیں۔ قدرتی حسن کی فوٹو گرافی میں ان کی شہرت بہت زیادہ ہے لیکن اب جب انہوں نے اپنے سیر کی روداد قلمبند کی تو ایک اور خوبی سامنے آئی کہ وہ منجھے ہوئے قلمکار بھی ہیں۔ نہایت پُرلطف انداز میں لفظوں سے عکاسی کرتے ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ فوٹوگرافر کے قلم کا شاہکار ایک پراثر رودادِ سفر کا تیسرا حصہ

پروگرام یہ تھا کہ بلتت فورڈ دیکھ کر التت فورڈ جائیں گے۔ شاہ جی سج بن کر تیار ہو گئے تھے۔ بوسکی کی قمیص اور سفید لٹھے کی شلوار میں وہ جیسے عید کی نماز کے لیے تیار ہوئے تھے۔ اشفاق نے آ کر بتایا کہ وہ ہلکے ہلکے گنگنا بھی رہے ہیں۔ ہم سب دیکھ رہے تھے کہ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ کیونکہ انہیں یہ خبر نہ تھی کہ فورٹ میں ان پر کون سی افتاد ٹوٹنے والی ہے۔ وہ خوش خوش ہمارے ساتھ چل پڑے۔

ہم بازار سے گزر کر ایک عمودی بلندی والے راستے

پر پہنچے پھر اوپر چڑھتے چلے گئے۔ ہانپتے کانپتے فورٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ جب ہم اس کے سامنے پہنچے تو انتہائی خطرناک بلندی پر ایک بالکونی نظر آئی، جسے دو لمبے شہتیروں نے تھاما ہوا تھا اور وہ شہتیر بلندی سے زمین تک آئے تھے۔ یہ مکمل طور پر بدھ اسٹائل کی عمارت تھی۔ اسے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر ایسے تعمیر کی گئی ہے کہ اس چوٹی کی کوئی جگہ خالی نہ رہ سکی۔ جیسے کسی نے اس کو بنا کر بڑی احتیاط سے چوٹی پر رکھ دیا ہو۔

ایک بار میں نے اسے پیچھے کی جانب سے دیکھا تھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ خوف کی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی تھی۔ پچھلی جانب سے نوّے کے زاویے پر ہزاروں فٹ کی بلندی پر قلعے کی دیواریں اس طرح چوٹی پر ایستادہ تھیں کہ اگر کوئی چیز قلعے کی کھڑکی سے باہر پھینکیں تو وہ بلا روک ٹوک سیدھی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا گرے۔

قلعے کا نام لو تو ذہن میں شاہی قلعے کا نقشہ ابھرتا ہے۔ جیسے کوئی وسیع و عریض قلعہ، اونچی اونچی برجیاں، بڑے بڑے چوبارے، وسیع و عریض بادشاہ کے محلات، فوج بمعہ اپنے ہاتھیوں اور گھوڑوں کے اس میں با آسانی سما سکتی ہو مگر یہ قلعہ وہ نہیں ہے۔ یہ بس نام کا ہی قلعہ ہے۔ یہ کسی جانے مانے قلعے کا بچہ نہیں بلکہ پوتا یا پڑپوتا بھی نہیں اس کی خوب صورتی کی وجوہات صرف تین ہیں ایک یہ کہ یہ عمارت کسی بلند چٹان پر ایستادہ ہے دوسری یہ کہ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے اور تیسری و آخری وجہ یہ ہے کہ یہ ہنزہ میں ہے اور یہاں سے کریم آباد اور راکاپوشی کا نظارہ قابلِ دید ہے۔

اس میں کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے کمرے تھے۔ جن کو اب میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ پرانی تصویریں، روزانہ کی ضرورتوں کا سامان، مارخور کے سینگ، موسیقی کے آلات، کھانے کے برتن جو زیادہ تر چینی اسٹائل کے تھے۔ چھتوں پر بھی نقش و نگار تھے۔ روشنی کے لیے دیواروں میں درزیں بنی ہوئی تھیں۔ اوپر نیچے کمرے، جن کو لکڑی کی سال خوردہ سیڑھیاں آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم ان سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتے کہ کہیں یہ زمین بوس نہ ہو جائیں۔ سیڑھیاں تو زمین بوس نہ ہوئیں مگر شاہ جی کی چیخ ضرور گونج گئی۔ وہ اوپر پہنچنے کی جلدی میں توازن کھو بیٹھے۔ پیر رپٹا اور نیچے گرتے چلے گئے۔ شاہد پیچھے تھا اس نے کمال پھرتی سے انہیں سنبھال لیا۔ وہ گرتے گرتے پانچویں سیڑھی پر سنبھل گئے تھے۔ میں اس اچانک حادثے پر ڈر سا گیا تھا مگر جب یہ دیکھا کہ وہ صحیح و سلامت ہیں تو میں ذرا پُرسکون ہوا۔ وہ اب شاہد کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے اور خفت مٹانے کے لیے معصوم انداز میں بولے۔ ''میں دیکھنا چاہتا تھا کہ حکام کسی غریب مزارعے کو اوپر سے دھکا دیتے ہوں گے تو وہ کیسے گرتا ہوگا۔''

اس جواب نے سب کے ہونٹوں پر ہنسی کی لکیر کھینچ دی۔ میں نے کہا۔ ''شاہ جی یہ غلطی نانگا پربت پر چڑھ کر مت دھرانا ورنہ......''

جواب میں قہقہہ گونج اٹھا۔ اس لیے کہ کسی کو مستقبل میں جھانکنے کی قوت جو نہیں ہے۔

اشفاق بولا۔ ''حکام سیڑھیوں سے نہیں بلکہ بالکونیوں سے نیچے پھینکتے تھے۔''

اس بات پر شاہ جی بگڑ گئے۔ ''تو کیا میں اپنے آپ کو بالکونی سے نیچے گرا دوں۔''

اشفاق نے انہیں ناراض ہوتے دیکھ منت کر کے منالیا۔ یہ شاہ جی کی خاصیت وشفافیت ہے کہ وہ دل کے صاف، طبیعت کے معصوم اور حد درجہ نرم دل و دوسروں کا خیال رکھنے والے ہیں۔ وہ کسی سے ناراض رہ ہی نہیں سکتے اور نہ کوئی ان سے ناراض رہ سکتا ہے۔ کوئی بات بری لگی تو فوراً کہہ دینے والوں میں ہیں۔ ناراض شخص کو منا بھی لیتے ہیں۔

ہم انہیں سہارا دے کر اوپر بڑھے۔ کچھ کوٹھڑیاں قیدیوں کے لیے تھیں جس پر شاہ جی کو اعتراض یہ تھا کہ گھر کے اندر قیدی رکھے ہوئے تھے، کیا کوئی پردہ داری نہیں تھی۔ گھر کی سو باتیں ہوتی ہیں۔ بادشاہ بھی ملکہ سے چہلیں بھی کرتا ہوگا تب یہ قیدی بھی دیکھتے ہوں گے۔ شاہ جی کو یہ رنج بھی تھا کہ بادشاہ واقعی بادشاہ لوگ تھے جو اس کال کوٹھری میں رہتے تھے۔ بس ایک فائدہ تھا کہ اوپر بیٹھ کر پورے ہنزہ پر نظر رکھتے ہوں گے۔

''یار شاہد ایک بات تو بتاؤ۔'' شاہ جی نے سانس لے کر کہا۔

''جی فرمائیں!''

''بادشاہ سلامت کا تخت کہاں گیا؟''

''ان کا کوئی تخت نہیں تھا۔'' شاہد نے جواب دیا۔

''اسی لیے تختہ ہوگیا۔'' کہتے ہوئے انہوں نے قدم بڑھا دیے۔

شاہ جی ہلکے سے لنگڑا رہے تھے۔ اپنی چوٹ کا انہیں

کوئی درد نہ تھا۔ بس رنج یہ تھا کہ بوسکی کی قمیص پر سلوٹیں آ گئی تھیں، رگڑنے کریز خراب کر دی تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ بادشاہ کا اتنا سامان پڑا ہے۔ اشفاق سے پوچھ کر بتاؤ اس میں کوئی استری ہے یا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "خدا کا خوف کرو شاہ جی...... وہ بادشاہ تھے کوئی دھوبی نہیں تھے۔" کچھ توقف کے بعد خود ہی بولے۔ "دھوبی ہوتے تو اچھا تھا۔ ایسا کچا اور گرتا گھر نہ ہوتا۔" پھر ڈیرا کے ان دھوبیوں کا ذکر کرنے لگے جنھوں نے کاروبار بڑھا کر پکے گھر بنوا لیے تھے۔

جب ہم سیڑھیاں چڑھتے اوپر بالکونی میں آئے تو کریم آباد کے ساتھ ساتھ راکاپوشی تک کا علاقہ ہمارے قدموں تلے تھا۔ قلعے کا پچھلا حصہ، ایک عمودی گہرائی میں گرتا جاتا تھا۔ ہزاروں فٹ گہری کھائی کے کنارے بنی دیواریں، کچھ دیر کے لیے دیکھنے والے کو لرزہ دیتی ہیں۔

مجھے ڈیرہ اسماعیل خان کے ساتھ، چار ہزار فٹ بلند شیخ بدین کے پہاڑ پر بنا ڈاک بنگلا یاد آ گیا، جو ایسی ہی ایک کھائی کے کنارے بنا ہوا ہے، جس کے نیچے جھانک کر دیکھیں تو درہ پیزو کے خشک پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا نظر آتا ہے۔ انگریزوں کے بنائے اس سمر کیمپ کے کھنڈر میں گزارے تین دن میری زندگی کے اہم لمحات تھے، جب میں ایک اجڑے دیار میں کسی روح کی طرح اکیلا پھرتا تھا۔ میں بادلوں اور ٹھنڈ میں تھا، نیچے گرمی کی حدت سے لوگ پریشان حال تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے کھولتے اور تپتے موسموں سے چالیس میل دور، میں ٹھنڈی ہواؤں اور جھومتی گھٹاؤں میں بادلوں کے سنگ گھومتا تھا۔ اس ڈاک بنگلے میں انگریزوں کا فرنیچر، کراکری، سب اصلی حالت میں موجود تھی۔ چوکیدار کھانا بناتا اور میں ان ویران کھنڈر میں گھومتا یا کسی بادام کے پیڑ تلے ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھاتا۔

میرے ساتھی جو اس سفر میں ہمرکاب تھے۔ ڈار سے بچھڑی کونجوں کی طرح اکیلے ہو کر گھوم رہے ہوتے۔ پہاڑ کی دوسری جانب ایک چھوٹا سا قبرستان تھا، جہاں انگریزوں کی قبریں اور قبروں پر ان کے نام کندہ تھے۔ رات کو آگ کے گرد، چاندنی رات میں، میرے ساتھی دیوانہ وار رقص کرتے اور میں جنگلی بوٹیوں کی مہک سونگھتا۔ بغیر چھتوں کی دیواریں، اپنے شاندار ماضی کو یاد کرتی نظر آتی تھیں۔ کئی عمارتوں کی چھتیں زمین بوس ہو چکی تھیں اور کھنڈر ہمیں حیرت سے دیکھتے تھے کہ یہ کون ہے جو ہماری تنہائی میں مخل ہے۔ یہ

کھنڈر شاید عرصے بعد کوئی انسانی شکل دیکھ رہی تھیں۔

میں کریم آباد میں بلتت قلعے کی چھت پر کھڑا، شیخ بدین کے پہاڑ کو یاد کر رہا تھا اور ہوا کے زور سے ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ مجھے اٹھا کر وادی میں پٹخ نہ دے۔ میں نے ذرا پیچھے ہو کر ہنزہ سے پرے راکاپوشی کو دیکھا جہاں سورج کی چمک سے نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ سب کہتے ہیں کہ ہنزہ میں سب سے شاندار منظر بلتت فورٹ کا ہے اور میرا خیال ہے کہ بلتت فورٹ سے ہنزہ کا نظر آنا سب سے شاندار منظر نظر آتا ہے۔ پوری وادی آپ کے قدموں تلے بچھی نظر آتی ہے۔ دور دور تک کھیت کھلیان ہیں اور داہنی طرف بلند و بالا پہاڑ اور ان پر پڑی برف جس سے بادل لپٹے نظر آتے ہیں۔ ہم بالکونی سے یہ نظارہ دیکھتے تھے اور شاہ جی ذرا پیچھے ہٹ کر کریم آباد کا نظارہ کر رہے تھے۔

اب ہمیں التت فورٹ جانا تھا۔ شاہ جی ہلکے ہلکے لنگڑا رہے تھے۔ قلعہ میں آتے ہی ان پر یہ افتاد پڑی تھی۔ کمر میں خاصی چوٹ آئی ہوگی لیکن وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے اور خود کو ہشاش بشاش ثابت کرنے کے لیے چلتے چلے جا رہے تھے اور مجھے اندازہ تھا کہ یہ وقتی چوٹ ہے اور شاہ جی کچھ دیر میں جیسے اس حادثے کو بھولیں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔

یہاں سے چند کلومیٹر دور گنیش کے آس پاس، دریائے ہنزہ کے کنارے ایک بلند اور عمودی چٹان پر ہزار سال سے زائد پرانا، التت فورٹ ایک بوسیدہ سی عمارت۔ جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اگلے ہی لمحے یہ زمین بوس ہو جائے گی۔ اس کو دیکھنے میں، اس کے زمین بوس ہونے کا اندیشہ ہمیشہ شامل ہوتا ہے اور یہی اس کا حسن ہے۔ پہلے یہاں میر رہتے تھے پھر یہاں سے وہ قدرے نئے قلعے بلتت فورٹ منتقل ہو گئے۔ التت فورٹ پرانے سلک روڈ پر عقاب کی سی نظریں گاڑے پتھریلی چٹان پر قائم ہے۔ ہم سب اس نئے سفر پر نکل پڑے۔ لہراتی راہ گزر سے ہوتی ہوئی ہماری گاڑی تنگ گلیوں میں اخروٹوں کے درختوں کو چھوتی ایک پرانے گیٹ سے گزرتی ایک گھنے درخت کے نیچے جا رکی۔ گاڑی رکتے ہی کود کر میں نیچے اترا۔ جسم کو جھکولے دے کر پہاڑ کی بلندی پر قائم قلعے کو دیکھا اور شاہ جی کے منہ سے، ماراوے کی بجائے ایک گالی سی نکلی۔ آواز دبی دبی سی تھی اس لیے مفہوم سمجھ نہ آیا۔

نیزے سے اگا قلعہ تھا کہ کسی دیو کی پناہ گاہ، کیونکہ کوئی اڑ کر ہی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ ہم مٹی میں اٹی ہوئی

سیڑھیاں چڑھتے جاتے تھے۔ اس دعا کے ساتھ کہ واپس بخیر سلامت گاڑی تک پہنچ جائیں۔ ایک آسمانی بلندی پر ہچکولے لیتے قلعے میں پہلا قدم رکھنے کے لیے ہر کوئی ایک دوسرے کی جانب دیکھتا تھا۔ شاہ جی کہتے تھے کہ سب جگہ جانا ٹھیک ہے مگر یہاں آنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ جن کی یہ جایداد ہے وہ بھی اسے بھول گئے ہوں گے۔ نہ وہ اس کی مرمت کرواتے ہیں اور نہ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ معلوم نہیں تم یہاں کیا دیکھنے آگئے ہو۔ میں شاہ جی کی باتیں مسکرا کر سنتا رہا اور وہ قلعہ دیکھنے کے پورے عرصے میں کوئی اسی طرح کا ورد کرتے رہے۔ گرتی دیواریں، بھربھری چھتیں، مخدوش بالکونیاں، گرتے درو دیوار اور ویرانگی۔ اس جگہ کی اپنی کوئی دلکشی نہیں تھی بلکہ یہاں سے دریائے ہنزہ کا منظر دیدنی تھا یہاں سے دریا، سلک روڈ اور قراقرم کے پہاڑ مزید حسین نظر آتے تھے۔

ہزاروں فٹ نیچے بہتا دریا اور اس کے پار چٹانوں سے لپٹی سلک روڈ، مجھے ان پرانے دور میں لے آئی جب میر یہاں سے اس گزرگاہ پر نظر رکھے آتے جاتے قافلوں سے ٹیکس وصول کرتے ہوں گے۔ چین کے ساتھ ہمسائیگی تھی اور ہند سے دوری۔ یہاں کوئی ایک انوکھی دنیا آباد تھی جو پاکستان بننے سے پہلے، پاکستان سے نہ آشنا تھی۔ یہاں نہ پاکستان موومنٹ کی آواز گونجی۔ نہ کسی مسلم لیگی رہنما نے ادھر توجہ دی۔ ہند میں کیا ہو رہا ہے اس کی خبر بھی یہاں کے مسلمانوں کو نہ تھی۔ صرف ایک ڈور تھی۔ اسلام کی ڈور جس نے انہیں ہند کے مسلمانوں سے باندھ رکھی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب پاکستان بن گیا تو اس زمین کے باسی پاکستان سے الحاق کے لیے، کشمیری راجاؤں سے الجھ پڑے۔ بزور قوت اس علاقے کو ڈوگرا راجا سے چھینا اور پاکستان کی جھولی میں ڈال دیا۔

آزادی کسی کو تحفے میں ملی اور کئی ایک علاقوں نے ہاتھ بڑھا کر آزادی کو اپنے لیے غاصبوں سے چھینا۔ ان لوگوں نے بھی چھین کر آزادی لی اس لیے میرے لیے محترم ہیں۔ پاکستان کے دیگر علاقوں کی عوام سے زیادہ محترم۔

میں ایک بالکونی سے نیچے گرتی جاتی گہرائی کو دیکھ کر لرز رہا تھا اور گائیڈ مجھے بتا رہا تھا کہ میر، اپنے مجرموں کو اوپر سے نیچے پھینک کر موت کی سزا دیتے تھے۔ یہ بوسیدہ، لرزتے درو دیوار کن کن واقعات کے چشم دید ہوں گے؟ میں چشم تصور سے ان واقعات کو دیکھ رہا تھا، مجھے خیالوں میں کھویا دیکھ کر شاہ جی نے ٹھوکا دیا اور میں سیڑھیاں اترنے پر مجبور ہو گیا۔

میں قلعے سے نیچے اتر کر گاڑی کے ساتھ بہتے پانیوں کی چھوٹی سی ندی کے کنارے آکر لیٹ گیا اور قلعے کے مینار کو دیکھ کر سوچنے لگا، وہ مینار ایسا لگتا تھا جیسے کسی بھی وقت سیدھا مجھ پر آگرے گا۔ دوپہر کی چمکتی دھوپ میں اخروٹ کے درخت کا سایہ اور آہستہ آہستہ چلتی خنک ہوا نے مجھے زیادہ سوچنے نہیں دیا اور کچھ لمحوں کے لیے نیند کی بانہوں میں لے لیا۔

کافی دیر تک سوتا رہا جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ باقی ساتھی بھی نیند کی حالت میں آس پاس بکھرے پڑے ہیں تب میں نے دوبارہ سے اپنی آنکھیں موندھ لیں۔

جب کافی وقت گزر گیا تو میں نے ہی واپسی کا بگل بجایا۔ ایک ایک کو بیدار کر کے لوٹنے پر آمادہ کیا۔

واپسی تیز رفتاری سے ہوئی اور کچھ دیر بعد ہم کریم آباد کے بازار میں گھوم رہے تھے۔ اسماعیل ہمیں یہاں اتار کر اشفاق اور شاہد کو کل والے کسی خفیہ مشن پر لے کر چلا گیا۔ ہم نایاب پتھروں کی دکانوں میں جھانکتے تھے۔ یہیں شاہ جی نے وہ انمول پتھر دکاندار کو دکھایا، جو ایک ملنگ بابا نے پنڈی میں ایک چھپر ہوٹل میں شاہ جی کو بیچا تھا۔ دکاندار کافی دیر اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، پھر بڑی تہذیب سے لوٹاتے ہوئے کہا کہ یہ تو کوئی گھٹیا سا پلاسٹک کا ٹکڑا ہے۔ شاہ جی نے دوبارہ ایک تبرک کے طور پر اسے اپنے ہاتھوں میں تھاما اور دوبارہ نہایت عقیدت سے اپنی قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔ دکاندار اب ہم سے بیزار سا لگتا تھا اور ہم بھی شرمندہ سے ہو رہے تھے۔

ہم خشک میوؤں، گرم کپڑوں، مقامی کشیدہ کاریوں کی دکانوں پر ونڈو شاپنگ کرتے رہے اور پھر ہوٹل کی چھت پر آبیٹھے۔ جیسے شام اتری، ویسے ہی ویرانے جگمگا اٹھے، کہکشائیں بنتی گئیں، تارے کھیل کھیلنے لگے۔ ہم یہ نظارے دیکھتے ہوئے اور اپنے اپنے افسانے سنانے لگے تھے۔ ماضی سے جڑا کوئی واقعہ جو یادوں میں کہیں بس گیا ہو، ایسے مواقع پر یاد کے پانیوں پر تیرنے لگا۔

رات ڈھلتی رہی، تارے مدھم پڑتے گئے اور ہماری یادوں کا سفر جاری رہا۔ شاہ جی نے سونے سے پہلے یہ وعدہ لیا کہ میں دوبارہ ان کو یہاں لے کر کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔

صبح دیر تک سوتے رہے۔ میری آنکھ کھلی تو ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ آج واپس گلگت جانا ہے۔ شاہ جی سے کل وعدہ کیا تھا کہ ہم ہنزہ دوبارہ ضرور آئیں گے مگر دل کہہ رہا تھا کل تو کل آئے یا نہ آئے، آج ہی ایک اور دن کے لیے رک جاتے ہیں۔ یہ میری خواہش تھی اگر میں اکیلا ہوتا تو ایک نہیں کئی دن کے لیے یہاں رک جاتا مگر میں کتنا کسی کو اپنے ساتھ باندھ کر رکھ سکتا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد، میں اکیلا ہوٹل کی دھوپ میں چمکتی چھت پر آبیٹھا۔ پورا منظر میرے سامنے تھا۔ وہی راکا پوشی کا نظارہ جس سے میں بچھڑ رہا تھا۔ نہ جانے اب کب آنا ہو۔ زندگی رہتی بھی ہے تو جانے کس انداز میں مجھے جکڑے رکھے، جو میں دوبارہ یہاں نہ آسکوں۔ دو سال بعد میں شمشال کا سفر کرنے مستنصر حسین تارڑ صاحب کے ساتھ یہاں آیا۔ ہنزہ تک شاہد اور اشفاق تو تھے مگر شاہ جی نہ تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

ایسا ہی ہوا ہے ایک بار جو بچھڑا تو پھر وہاں جا نہ سکا۔ اب تو میں پاکستان سے اتنا دور آگیا ہوں۔ چند دنوں کے لیے وطن جانا تو ہوتا ہے مگر شمال کے سفر کا خیال بس خیال بن کر رہ جاتا ہے مگر اب انشاءاللہ ارادہ بندھا ہے تو اُمید بھی بندھ گئی ہے کہ یہ سفر دوبارہ شروع ہوگا اور انشاء اللہ سرگزشت کے قارئین بھی اس سفر میں ساتھ ہوں گے میری تحریر کے ہمرکاب۔

رات دیر تک ہنزہ میں ہوٹل کی چھت پر مکمل تنہائی میں دیر تک ستارے دیکھتا رہا۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ شاہ جی سو رہے تھے۔ کریم آباد کے گھروں سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اکیلا دور تک چلتا چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو سب میرا انتظار کر رہے تھے اور اسی وجہ سے ہنزہ سے نکلنے میں دیر ہوگئی تھی۔ ایک ایک کر کے سب گاڑی میں بیٹھے اور نیا سفر دوبارہ سے شروع ہوگیا۔ راکا پوشی کے سامنے سے گزرے اور جب میں الوداعی نظروں سے اس کے عیاں حسن کو دیکھ رہا تھا، انہی لمحوں میں میرے تمام ساتھی مزے سے خراٹے لیتے خواب میں مدہوش تھے۔

ہم گلگت پہنچے تو سورج بلندی سے مغرب کی جانب جھکتا جا رہا تھا اور شیر باز، اپنے چہرے پر مسکراہٹ کی بجائے تشویش لیے، ہوٹل کے باہر ٹہل رہا تھا۔ ہوٹل کے اندر سے شور شرابا اٹھ رہا تھا۔ شاہ جی بولے۔ ”اللہ خیر کرے! کچھ ہوا ضرور ہے۔ کوئی چھاپا تو نہیں پڑا؟“

میں نے شاہ جی کی طرف غور سے دیکھا تو وہ خاموش ہوگئے۔

شیر باز نے ہم کو دیکھا تو اس کے چہرے پر سکون کی ایک لہر اپنی دائمی مسکراہٹ کے ساتھ پھیلتی چلی گئی۔ ”جلدی سے کھانا کھائیں اور پھر چلتے ہیں۔“ شیر باز گلے ملتے ہوئے بولا۔

”پھر کہاں چلتے ہیں۔“ شاہ جی تشویش بھرے انداز میں بولے۔ ان کے ذہن میں نہ جانے یہ کیسے آگیا تھا کہ ہر ہوٹل میں چھاپا ضرور پڑتا ہے۔

اپنی کلائی پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھتے ہوئے شیر باز نے کہا۔ ”میں بہت دیر سے آپ کا انتظار کررہا ہوں۔ ابھی ہمیں نلتر جانا ہے اسی لیے آپ کا انتظار ہو رہا تھا۔“

میں اس اچانک کے پروگرام پر سٹپٹا گیا۔ ”ابھی تو شام اترنے والی ہے اور ہمیں پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو جائے گا۔“

میں اس اچانک اور ڈھلتی شام کے سفر سے ذرا بے چین ہو رہا تھا۔ شیر باز اپنی عادت کے عین مطابق لگا تار مسکراتا چلا جارہا تھا۔ ”نہیں، میں نے جیپ کا انتظام کیا ہے اور ڈرائیونگ طاہر کرے گا۔“ اس نے ایک لمبے، تگڑے جوان کی طرف اشارہ کیا جو مسلسل اپنی چھوٹی سی سیاہ داڑھی کو متواتر کھجلائے چلا جارہا تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر رات کہاں ٹھہریں گے۔“ میں پروگرام کو کل پر ڈالنا چاہتا تھا مگر شیر باز، باز نہیں آرہا تھا۔

”خیمے تو ہیں ناں؟ کیمپنگ کریں گے اور پکانے کا سامان ساتھ لے جائیں گے۔“ ہماری تکرار جاری تھی اور ہوٹل کے اندر سے شور مسلسل بلند سے بلند ہوتا جارہا تھا۔

”کیا ٹورسٹ زیادہ آگئے ہیں؟“ شاہ جی ابھی تک چھاپے والی پریشانی سے باہر نہیں نکلے تھے۔

”نہیں۔ آپ کی یونیورسٹی کے اسٹوڈنٹس اپنی بس پر ابھی پہنچے ہیں اور کل خنجراب جارہے ہیں۔“ شیر باز کے جواب پر میں چونک پڑا۔

”کتنے اسٹوڈنٹس ہیں اور ٹیچر کون ہے؟“

اس سے پہلے کہ شیر باز جواب دیتا، ہمارے فارمیسی فیکلٹی کا چپراسی محبوب ہوٹل کے گیٹ سے باہر آیا اور جھک کر سلام کیا اور اپنی عین عاجزی کے تحت میرے گھٹنے چھونے

کے لیے جھکا۔ میں نے راستے میں ہی اسے تھام کر گلے لگایا۔

وہ بتا رہا تھا کہ فارمیسی کے تیس اسٹوڈنٹس ہیں اور طاہر سلیم صاحب انہیں لے کر خنجراب جا رہے ہیں۔ مجھے طاہر سلیم سے توقع یہی تھی۔ وہ گول یونیورسٹی کی کوئی ایک پرانی سی بس لے کر بھی چین کے اندر گھس سکتے ہیں۔ میں نے شیر باز کو باہر چھوڑا اور محبوب کے ساتھ ہوٹل کے اندر اپنے دوست طاہر سلیم اور اسٹوڈنٹس سے ملنے کے لیے آ گیا۔ دیکھا کہ طاہر سلیم صاحب ایک شہنشاہ کی مانند صوفے پر لیٹے ہیں اور تمام اسٹوڈنٹس ان کے گرد جمع ہیں۔ ان میں کچھ بیٹھے اور کچھ کھڑے ہیں، کل کے خنجراب پاس کے پروگرام پر باتیں کر رہے ہیں، یہ منظر ہوٹل کے ڈائننگ روم کا تھا۔ مجھے دیکھ کر سب بہت خوش ہوئے۔ میں بھی شاد ہوا کیونکہ اتنی دور اچانک میرے اپنے میرے سامنے بیٹھے تھے۔

طاہر سلیم مجھے خنجراب پاس لے جانا چاہتے تھے مگر آدھے اسٹوڈنٹس میرے ساتھ ظلتر جانا چاہتے تھے۔ ایک دلچسپ صورتِ حال بن گئی۔ اسٹوڈنٹس کو جب معلوم ہوا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں تو بہت سے میرے ساتھ نتھی ہونے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ میں نے اسٹوڈنٹس کو انکار کر دیا کہ جس کے ساتھ آئے ہو، انہی کے ساتھ جاؤ اور ہمارے پاس خیمے بھی اپنے نہیں ہیں۔ (کافی دنوں بعد انہی اسٹوڈنٹس کے ساتھ مل کر میں نے یونیورسٹی میں ایڈونچر کلب بنایا اور شیخ بدین کی چوٹی پر کیمپنگ کی۔)

محبوب اکڑ گیا تھا کہ وہ میرے ساتھ ظلتر جائے گا۔ بہانہ اس نے یہ بنایا کہ اسے سانس کی تکلیف ہے اور خنجراب پر آکسیجن ویسے ہی کم ہوتی ہے۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ صرف محبوب ہمارے ساتھ ظلتر جائے گا۔ محبوب خوشی سے اڑ رہا تھا۔ محبوب بہت زیادہ بولنے والا مگر سادہ لوح اور بہت خدمت گزار انسان ہے۔ ہر وقت وہ اردگرد گھومتا رہتا اور بار بار پوچھتا کہ کوئی کام ہے۔ میرے آفس میں گریڈ فور کا ملازم تھا اور میں اسے اپنے بھائیوں کی طرح دیکھتا تھا اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا بلکہ فیکلٹی میں سب اس کا خیال رکھتے تھے۔

اب ہماری ٹیم تیار تھی۔ شاہد، اشفاق، محبوب، شاہ جی، شیر باز اور اس کا دوست طاہر، ہم ظلتر جانے والی ٹیم کا حصہ تھے۔ شاہ جی محبوب کو لے کر بھاگم بھاگ، بازار سے کھانا بنانے کا سامان لینے چلے گئے۔ واپسی پر گھی، چینی، پتی، دودھ، چاول، گوشت، پھل، ڈبل روٹیاں، انڈے اور بہت کچھ تھیلوں میں بھر کر جیپ میں ٹھونس لائے۔ میں نے اپنے خیمے کا جائزہ لیا، جس میں زندگی میں پہلی بار سونا تھا۔ سلیپنگ بیگ اور دوسرے سامان کو پیک کیا۔ شاہ جی نے ''کے ٹو'' مہم کا سامان، جو پنڈی سے خریدا تھا، وہ بھی ساتھ رکھ لیا، جن میں اونی ٹوپیاں، برفانی دستانے، اونی پاجامے، گرم جیکٹ اور بھی بہت کچھ جو اس نے میرے کہنے پر خرید لیا تھا۔ جب ہم آخر میں فیری میڈو سے واپس آئے تو شاہ جی نے اپنا سارا نیا سامان مفت میں ہوٹل کے بیروں میں بانٹ دیا تھا۔ میرے پوچھنے پر فرمایا تھا کہ نہ سامان ہوگا اور نہ آنے کا ارادہ بنے گا۔ یعنی نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری! یہ تو ان کا وقتی ردِعمل تھا ورنہ بعد میں وہ فیری میڈو کو یاد کرتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔

ہماری جیپ جب گلگت دریا پر بنے پل سے گزر رہی تھی تو سورج کی کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمکی پڑ رہی تھیں۔ بلند و بالا پہاڑ صدیوں سے اپنی جگہ مستقل مزاجی سے ایستادہ منہ اٹھائے، سینہ تانے کھڑے تھے اور ہماری جیپ ایک چیونٹی کی مانند ان کے بیچوں بیچ گزرتی، وادی نومل کے باغوں کے پہلو سے لگتی چلی جا رہی تھی۔ چیری اور خوبانی کا موسم ختم ہو رہا تھا اور سیب پکنے کے قریب تھے۔ ہم اس مہک زدہ ماحول میں، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اپنے چہروں پر محسوس کرتے، وادی نومل کا حسن دیکھتے رہے۔

سطح سمندر سے دس ہزار فٹ کی بلندیوں پر بکھری، برفانی چوٹیوں میں گھری، سرسبز اور حسین ظلتر وادی ہر ایک کو اپنے حسن کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ شفاف پانیوں کے بہتے دھارے، نیلگوں اور سبز جھیلیں، آبشاریں اور سینکڑوں سال پرانے درختوں سے بھرے جنگلات، ایک مختلف حسن لیے ہوئے ہیں جس نے ایک بار ظلتر دیکھ لیا، اس کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو گئی۔

جیپ بائیں جانب ایک درّے کو مڑی اور میں اسی لمحے، دریا کے پار پہاڑوں سے لپٹا، شاہراہ ریشم کا سیاہ فیتہ دیکھ رہا تھا۔ جیپ جیسے ہی تنگ درے میں داخل ہوئی تو شور مچاتے پانیوں کی گونج ہماری سماعت سے ٹکرائی۔ ظلتر سے پانیوں کا ذخیرہ لیے ایک نالہ تیزی سے نیچے اترتا دریائے ہنزہ کی جانب دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

درّے میں سائے لمبے ہوتے چلے گئے اور چوٹیوں

پر سنہری کرنیں گلابی ہونے لگیں اور ان میں سرخ رنگ گھلنے لگا تھا۔

بائیں جانب ظفر نالہ کے پانی ایک گہری گونج سے چنگھاڑ رہے تھے اور ہمیں خوف زدہ کر رہے تھے۔ محبوب جو اب تک مسلسل بولے جا رہا تھا، دبک کر میرے رک سیک کے پیچھے، ٹٹولتی نظروں سے پانیوں کو دیکھتے ہوئے کانپ رہا تھا۔ ایک چشمے کے کنارے رک کر ہم نے اس کا ٹھنڈا ٹھار پانی پیا، محبوب کو کچھ دلا سا دیا۔ میں ان لمحات کو اپنی روح میں اترتا محسوس کر رہا تھا اور اپنی کم مائیگی کا احساس ہو رہا تھا کہ میرے پاس وہ الفاظ کیوں نہیں ہیں، میرے قلم میں وہ طاقت کیوں نہیں ہے جو ان لمحات کو کاغذ پر بیان کر سکے۔ بس ذہن میں ایک ہی بات گونج رہی تھی۔ "فبای الا ربکما تکذبان۔"

ہماری جیپ دوبارہ روانہ ہوئی۔ ایک موڑ کاٹا ہی تھا کہ اچانک پوری وادی، بلندیوں سے لے کر پستیوں تک، ایک مہیب اندھیرے میں اچانک ہی ڈوبتی چلی گئی۔ یہ تاریکی کسی کالی آندھی کی طرح، صرف ایک موڑ کاٹتے ہی نازل ہوئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ دونوں طرف کھڑے بلند و بالا پہاڑوں نے سورج کی باقی ماندہ روشنی روک کر اندھیرے کی چادر پھیلا دی تھی۔ شاہ جی اور محبوب اس نئی افتاد سے گھبرا اٹھے۔ شاید موت بھی اسی طرح آتی ہو۔ آپ زندگی کے سفر کا کوئی موڑ کاٹیں اور اسی طرح کسی گھپ اندھیرے میں ڈوبتے چلے جائیں۔ اس گہرے اندھیرے میں، صرف ظفر نالے کے سفید جھاگ اڑاتے پانی نظر آ رہے تھے جو ناگوں کی طرح پھنکارتے، ہماری جانب لپک رہے تھے۔ یہ ہمیں مسحور کر کے اپنی جانب بلا رہے تھے۔ ارد گرد کے پہاڑ آسیبوں کی مانند، ہماری جیپ پر نظر رکھے تھے۔ سڑک آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھی۔ جیپ میں مکمل خاموشی تھی، ماسوائے انجن کی مسلسل گڑگڑ کے۔ میں بھی دھیرے دھیرے خوف زدہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ شاہ جی کبھی باہر کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے اور جب کچھ نظر نہ آتا تو شاکی نظروں سے میری جانب گھورتے۔ ہمیں سڑک کا صرف وہ حصہ نظر آ رہا تھا جو ہیڈ لائٹ کی زد میں تھا۔ ہم نے کئی خطرناک موڑ کاٹے، کئی شکستہ اور جان لیوا پل عبور کیے۔ ان کی ہولناکی کا اندازہ ہمیں دوسرے دن ہوا جب ہم واپس اسی راستے سے گلگت جا رہے تھے۔ وہاں ہم نے طاہر کی ماہرانہ ڈرائیونگ کی بہت تعریف کی۔

ہم ایک مقام میں داخل ہوئے جہاں دور اوپر پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے کہیں کہیں روشنی، کوئی قمقمہ جلتا بجھتا، دکھائی دیتا تھا۔ اس سے ہمیں یہ تسلی ہوئی کہ ہم کسی ویرانے میں نہیں بلکہ کسی آبادی کے قریب ہیں۔ شیر باز بولا کہ یہ ظفر پائیں ہے۔

ہماری جیپ کسی میدانی علاقے سے گزر رہی تھی۔ آگے دائیں جانب ایک روشنی دکھائی دی تو ہم اس کے قریب جا رکے۔ وہ ایک کھوکھا نما، چھوٹی سی دکان تھی۔ شیر باز اس سے اپنی مقامی زبان میں کوئی معلومات لیتا رہا۔ وہاں سے میں نے خشک میوہ جات خریدے۔ ہم اطراف میں مکمل اندھیرے میں گھرے کھڑے تھے۔ چند قدم دور بھی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم ایک ٹمٹماتی روشنی کے نیچے کھڑے کیمپنگ سائٹ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ وہاں سے کچھ فاصلہ طے کر کے ایک ندی کنارے جا رکے۔ پروگرام یہی بنا کہ ادھر ہی خیمے لگاتے ہیں۔ ٹارچ کی روشنیوں میں بھی ہم ہر قدم پھونک پھونک کر رکھ رہے تھے۔ ندی کے پانیوں کا بہاؤ ہمیں سنائی دے رہا تھا۔ میں نے ندی کے ٹھنڈے پانیوں سے منہ دھویا۔ محبوب نے ان پانیوں میں کوک کی بوتلیں رکھ دیں، جو کچھ ہی دیر میں ٹھنڈی ٹھار ہو گئیں۔

ساتھ ہی پتھروں کی چار فٹ بلند کسی احاطے کی دیوار تھی۔ اس دیوار کی آڑ میں محبوب اور شاہ جی چولہا بنانے میں جت گئے۔ طاہر اور شیر باز جیپ کے قریب گئے اور اندر سے ایک کلہاڑی نکالی اور گھپ اندھیرے جنگل سے لکڑیاں لانے چلے گئے۔ اشفاق اور شاہد خیمے لگانے میں مصروف تھے۔ ہر ایک کچھ نہ کچھ کر رہا تھا، سوائے میرے جو چولہا بنانے کے بعد، ندی کے ارد گرد منڈلا رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے بادل تھے اور کوئی تارا نہیں دکھتا تھا۔

لکڑیاں آ گئیں تو ہم نے ان کو ایک ماچس کی تیلی دکھائی اور وہ بھڑک اٹھیں۔ کچھ دیر میں وہاں پر پلاؤ تیار ہو رہا تھا اور ہم آگ کے ارد گرد بیٹھے ہنستے اور خوش ہو رہے تھے۔

کھلے آسمان تلے فضاؤں میں ہمارے قہقہے تھے اور جب وہ تھمتے تو ندی کے بہتے پانی بولنے لگتے۔ میں ذرا دیر کے لیے اٹھا، سگریٹ سلگائی اور اندھیرے میں ٹہلتا ہوا، کچھ فاصلے پر ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ یہاں مکمل خاموشی تھی اور چار جانب گھپ اندھیرا تھا اور دور ایک الاؤ

روشن تھا، جہاں سے کبھی کبھار کوئی قہقہہ تیرتا ہوا میری جانب آتا۔ میں ایک اور دنیا میں گم، اس تنہائی اور خاموشی میں مکمل غرق ہو چکا تھا۔

اچانک ایک چنگھاڑتی آواز ہوا کے دوش پر تیرتی میری جانب آئی۔ میں چونک اٹھا۔ دوبارہ اس آواز کو سننے کے لیے گوش برآواز ہوا۔ تب معلوم ہوا کہ محبوب منادی کر رہا تھا کہ کھانا تیار ہے اور سب پہنچ جائیں۔ پہاڑوں میں آواز کی بازگشت نے محبوب کی آواز کو گونج بخش دی تھی۔ محبوب کو آج پر لگے تھے۔ اس کی پھرتیاں دیکھنے والی تھیں، جیسے کسی ولیمے کا نگراں ہو۔ بھاگا دوڑا پھرتا تھا۔ دری بچھائی، ہمارے آگے پلیٹیں لگائیں اور گرم پلاؤ پر آم کا اچار رکھ کر ہمیں پیش کیا۔ ہم سب اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ خوشی سے پھولا نہیں سما تا تھا۔

جب تک ہم نے کھانا ختم نہیں کیا، وہ ہمارے اردگرد رہا۔ کسی کو پانی پوچھ رہا ہے، کسی کو اور پلاؤ کھانے کی منت کر رہا ہے۔ آج کھانے کی لذت ہی کچھ اور تھی۔ کھانے کے بعد، محبوب ندی کی طرف دوڑا اور برف بنی کوک کی بوتلیں لے آیا۔ ہم سب محبوب کی خدمت گزاری کی تعریف کرتے اور وہ خوشی سے پھولا نہیں سما تا تھا اور جھک جھک کر ہمارا شکریہ ادا کرتا تھا۔

ہم سب نے سردی سے بچاؤ کے لیے اونی سوئیٹرز، ٹوپیاں اور مفلر لپیٹ رکھے تھے۔ کھانے کے بعد ہم آگ سینکتے، اس کے اردگرد ہاتھ پھیلائے بیٹھے تھے۔ آگ کے سرخ شعلے، سانپوں کی مانند اپنا پھن اندھیرے میں لہرا رہے تھے۔ ہم ان لمحوں کے لیے ایک دوسرے کا شکریہ ادا کر رہے تھے کہ خداوند کریم کی صناعی دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا اور اس کام میں ان کی مدد شامل ہوئی۔

محبوب پر اس ماحول کا اثر نہیں ہوا تھا۔ نہ یہ تنہائی، نہ ندی اور نہ کھلا آسمان۔ وہ تب خوش ہوتا، جب ہم ہنستے تھے۔ اس کی نس نس میں جیسے یہ تھا کہ کسی طرح مجھے خوش دیکھے۔ میں بھی ہمیشہ اس کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک رکھتا تھا۔

بادلوں کے ٹکڑے کہیں اِدھر اُدھر ہوئے ہوں گے، جبھی آسمان تاروں سے اچانک بھرتا چلا گیا۔ ایک روشنی پھیلتی چلی گئی۔ ہمیں لوہے کے بڑے بڑے کھمبے نظر آنے لگے تو معلوم ہوا کہ یہاں نلتر کا اسکینگ ریزورٹ ہے۔ اتنے قریب ہو کر بھی ہم اس کے بارے میں جان نہ پائے تھے۔ اندھیرے کی چادر نے پردہ ڈال دیا تھا۔ ادھر سے منہ موڑ کر ہم پھر باتوں میں لگ گئے۔

ہم تاروں کی روشنی میں بے فکر بیٹھے، طاہر سے شمال کے ان علاقوں کے قصے سن رہے تھے، جہاں جہاں وہ سفر کر چکا تھا۔ وہ اس مارخور کا ذکر کر رہا تھا جو اسے درہ چیلنجی کے قریب ملا تھا اور طاہر کے مضبوط ہاتھوں نے اسے سینگھوں سے پکڑ کر بعد میں چھوڑ دیا تھا۔ ہم گرم کافی پیتے، یہ واقعات سن رہے تھے، جن کا محبوب پر ابھی تک کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

ہم ایک اجنبی جگہ بیٹھے کھلے آسمانوں پر نظریں ٹکائے تاروں سے بھرے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ سوچ رہے تھے کہ شاید ہمیں یہاں پھر نہیں آنا اگر آئے تو مختلف فضا اور ماحول میں آنا ہوگا۔

ہم تین خیمے لائے تھے۔ چھ تو تین خیموں میں سما سکتے تھے مگر ساتواں کہاں جاتا؟ محبوب نے صورت حال بھانپ لی شاید ذہن پڑھنا جانتا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ جیپ میں سوئے گا، یہ کہتے ہی ایک گدا، کمبل اور تکیہ لے کر جیپ میں گھس گیا۔ طاہر نے اس کے لیے سیٹیں فولڈ کر دیں۔

میں اپنے خیمے میں رینگتا ہوا داخل ہوا تو ایک نئے تجربے سے روشناس ہوا۔ اس تجربے سے گزرنے کا جوش بھی تھا۔ میں اور شاہ جی ہنس رہے تھے۔ کوئی بھی تجربہ اگر اپنے دل سے کیا جائے تو اکثر خوشگوار رہتا ہے۔

میں نے پہلے میٹرس بچھایا اور پھر اس پر سلیپنگ بیگ کھول کر رکھا۔ اس کے ... بعد اندر ایسے گھستا پڑا جیسے ڈانگری پہن رہا ہوں۔ سر کے نیچے چھوٹا بیگ رکھا اور سیدھا لیٹ کر خیمے کی چھت گھورنے لگا۔ اندر باہر کی نسبت سردی کا احساس کم تھا۔ سرتلے رکھے بیگ میں الارم والی گھڑی تھی، جس کی مسلسل ٹک ٹک مجھے بے آرام نہیں کرتی تھی۔ میں بچپن سے اس ٹک ٹک کا عادی تھا۔ میرے مرحوم والد صاحب ہمیشہ سرہانے گھڑی رکھتے تھے اور اس کی مانوس آواز میری نیندوں کی ساتھی بن چکی تھی۔ شاہ جی دونوں ہاتھ سرتلے رکھے کسی گہری سوچوں میں گم تھے۔ ایک خیمے کی چھت تلے ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں کے سمندر میں ڈوب ابھر رہے تھے اور پھر ہم اسی خاموشی میں نیند کی وادیوں میں اترتے چلے گئے۔

رات بھر ہوا سیٹیاں بجاتی، ہمارے خیمے پر دستک دیتی رہی۔ ساتھ بہتی ندی کے پانیوں کا بہاؤ اور اس کی مترنم آواز کانوں میں آتی رہی۔

تقریباً تین چار گھنٹے سویا ہوا ہوں گا کہ آنکھ کھل گئی۔ شاہ جی کے خراٹوں سے خیمے کے پردے تک ہل رہے تھے۔ میں کچھ دیر تک لیٹا رہا۔ سوچوں میں گم رہا کہ انسان کوئی ارادہ باندھ لے تو رب کی مدد بھی شاملِ حال ہو جاتی ہے۔ میں نے ایک سفرنامہ پڑھا اور پھر اس کی تقلید میں کہاں سے کہاں آنکلا۔ آوارگی تو پہلے بھی میرے اندر تھی۔ بس مجھے کوئی راستہ چاہیے تھا۔ یہ راستہ مجھے تارڑ صاحب کے سفر ناموں نے دے دیا تھا اور اب میں رکنے والا نہیں تھا۔

سوچوں نے نیند کا راستہ روکا تو میں آہستگی سے سلیپنگ بیگ کی قید سے باہر نکلا، ٹارچ جلا کر جوتے پہنے اور خیمے کی زپ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں علی الصبح کا منظر دیکھنا چاہتا تھا اور یہ بھی خواہش تھی کہ جتنی جلدی ہو سکے طلتر کی وادی کو سورج نکلنے سے پہلے دیکھوں۔ باہر نکلا تو سرد ہواؤں نے میرا استقبال کیا اور کپکپی لگنے لگی۔ پوری وادی اندھیرے میں ڈوبی تھی مگر بلند پہاڑوں کی چوٹیاں ہلکی سنہری ہو رہی تھیں۔ ایک سناٹے دار خاموشی، جہاں صرف ہواؤں کے چلنے کا دھیما سا سرور تھا۔ تازگی کا بھرپور احساس، دل سے لے کر روح میں اترتا چلا گیا۔ صبح کا سحر چار سو پھیلا تھا اور تازہ نتھری، شفاف ہوائیں، بلا روک ٹوک چہار جانب تیرتی پھر رہی تھیں۔

یہ مناظر کل رات میں اندھیرے کی وجہ سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میرے خیمے کی دائیں جانب ایک سیاہ، گھنا جنگل تھا جو وادی سے ہوتا چوٹی تک چڑھتا چلا گیا تھا۔ یہیں سے کل رات طاہر اور شیر باز لکڑیاں کاٹ کر لائے تھے۔ میرے ارد گرد سبز پانیوں کی چھوٹی چھوٹی ندیاں تھیں، جو مترنم دھن میں بہتی چلی جا رہی تھیں۔ میرے پیچھے ایک بلند پہاڑ تھا اور اس کی چوٹیوں پر پڑی سفید برف، ہلکی سنہری تھی۔ پوری وادی میں سفید اور پیلے پھول دور تک پھیلے تھے۔ دور پہاڑ کی بلند، سرسبز ڈھلوانوں پر، دو نیلے رنگ کے خیمے ایستادہ تھے جو بڑے بھلے لگ رہے تھے، جیسے دو پرندے ابھی اپنی اڑان بھریں گے۔

میں ٹہلتا ہوا جنگل میں چلا گیا۔ یہاں اندھیرا زیادہ تھا اور پرندے، اپنی اپنی بولیوں میں ایک دوسرے کو بیدار کر رہے تھے۔ میں پہاڑ پر چڑھتا چلا گیا۔ جنگل میں سائیوں اور روشنی نے مل کر عجب سماں باندھ رکھا تھا۔ بلند اور حد درجہ بلند چنار کے درختوں کے اوپر، نیلے شفاف آسمان کی چادر تنی تھی۔ اب سورج بلند ہو کر اپنی کرنیں آہستہ آہستہ زمین پر پھینکتا چلا جا رہا تھا۔ ہوائیں درختوں کے تنوں سے لپٹ لپٹ کر چل رہی تھیں۔ تنہائی نے ایک ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔ ایک چھوٹی ندی میرے پیروں تلے آرام اور سرمستی سے بہہ رہی تھی۔ میں اس پورے منظر میں اکیلا تھا مگر پھر ایک چرواہا مخل ہوا، جو اپنی بھیڑ بکریوں کو اوپر کسی چراگاہ کی طرف لیے جا رہا تھا۔ میری ان بکریوں کے ساتھ بنی تصویر اتنے برسوں بعد میرے سامنے رکھی ہے اور مجھے ماضی میں لیے جاتی ہے۔ وہی مناظر وہی پہاڑ پر لگے خیمے، شاہ جی اور دیگر دوستوں کی یاد دلا رہی ہے۔

اس صبح کاذب کا منظر ہی کچھ اور نظر آیا تھا۔ ایسا منظر اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ جوش ملیح آبادی کا شعر یاد آنے لگا تھا کہ وجود خداوندی کے لیے نمود سحر ہی کافی ہے۔

وہ حسین منظر دھیرے دھیرے صاف ہوتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بلند پہاڑوں کی چوٹیاں مکمل سنہری ہو گئیں۔ میں واپس اتر کر خیموں کی جانب آیا تو دور سے دیکھا کہ محبوب ایک دیگچے میں پانی بھر کے اسے چولہے پر گرم کرنے کے لیے رکھ رہا ہے۔ اسے آس پاس کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ بس ہم سب اس سے خوش ہو رہیں۔ مجھے اس سے ہمدردی کے ساتھ پیار بھی تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایسا کرے مگر اس کو یہ سب کرنے سے روکنا، میرے بس میں بھی نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ سب لوگ خیموں سے باہر نکلنے لگے۔ ہر ایک باہر نکل کر ایک لمبی انگڑائی لیتا اور پھر اسی منظر میں جم جاتا۔ شاہ جی، اپنے برفانی لباس میں لپٹے نکلے۔ چاروں جانب گھوم کر پہاڑوں کو دیکھا۔ چند قدم چلے اور پھر گھوم کر دیکھا۔ پھر کہا ''ماراوے''۔

وہ بلندیوں، پھولوں، نیلے آسمان سے بہت متاثر دکھائی دیتے تھے۔ ایک وسیع و عریض سبزہ زار میں ان کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ نہ کوئی کھائی اور نہ کوئی بلندیوں کو جاتا راستہ اور نہ کوئی خطرناک مقام ان کے ماراوے کا سلسلہ جاری رہا جب تک محبوب نے ناشتا تیار ہونے کا واویلا نہیں کیا۔

ناشتے میں ابلے انڈے، ڈبل روٹی کے سلائس۔ ساتھ میں جام اور مکھن تھا۔ اس ناشتے سے مجھے اتنی توانائی مل گئی تھی کہ میں بہ آسانی طلتر جھیل تک چار پانچ گھنٹے چل کر جا سکتا تھا۔

ناشتے کے بعد سامان لپیٹا گیا، محبوب اور طاہر نے جیپ کو چمکایا اور ہم خوش و خرم، علتر جھیل کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ انسان مستقبل میں جھانک نہیں سکتا۔ ہم بھی مستقبل کے واقعات سے بے خبر علتر کی طرف بڑھنے لگے۔ علتر کی دو جھیلیں مشہور ہیں۔ ایک بلند پہاڑوں کے دامن میں، علتر نالے سے جڑی ہوئی اور دوسری اس سے تقریباً ایک گھنٹے کی پیدل مسافت پر ہے۔ نالے کے قریب جھیل اوپر والی سے چھوٹی ہے اور پانی اس کے حیران کن حد تک سبز جھلک دیتے ہیں۔ اوپر بڑی اور نیلے رنگ کے پانیوں کی جھیل ہے، جیسے کسی نے بہت سا نیل اس میں گھول دیا ہو۔ ہم صرف سبز جھیل تک جا رہے تھے کیونکہ آج رات ہی ہمیں واپس گلگت پہنچنا تھا۔

ہم علتر وادی سے قدرے نیچے اترے اور اب ہم علتر نالے کی بائیں جانب ہچکولے لیتی جیپ میں سفر کر رہے تھے۔ جہاں تک جیپ جا سکتی تھی، وہاں جیپ پر جانا تھا اور آگے تک کا سفر ہمیں پیدل طے کرنا تھا۔ کچھ دیر میں ہم نے لکڑی کا بنا ایک انتہائی مخدوش پل پار کیا اور اب نالہ بڑے سکون سے ہماری بائیں جانب بہنے لگا۔ ہم پتھریلے راستے پر چل رہے تھے جس کے دونوں جانب پتھروں سے بنی ایک دیوار تھی جو پار کے منظر کو چھپاتی تھی۔ جب بھی دیوار کی بلندی کم ہوتی تو پار سرسبز لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے۔ پتھریلی سڑک کے باعث ہم اچھل اچھل کر ایک دوسرے سے ٹکراتے اور قدرے بے آرام ہو رہے تھے۔

جیپ کے تمام مسافر خاموش تھے، سوائے محبوب کے۔ وہ جیپ کے پیچھے لٹکا لگاتار بول رہا تھا۔ نہ ہم نے غور کیا کہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ اس نے ضرورت محسوس کی کہ ہمیں یہ بتائے کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ پر ہمیں یہ معلوم تھا کہ اس کا موضوع نہ تو یہ لہلہاتے کھیت تھے، نہ بہتے جھرنے اور نہ آسمان کی بلندیوں کو چھوتے چنار کے درخت، جو دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ وہ ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا، جو دن رات ایک کر کے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں۔ نہ بہار کے کھلتے پھول ان کا دل لبھاتے ہیں اور نہ ساون کی بارش اس کے احساسات میں کوئی خوشی لاتی ہے۔ نہ آسمان پر بکھرے رنگ ان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور نہ پرندوں کی بولیاں ان کے دل کو گدگداتی ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے راستے پر اپنی لاش اپنے کاندھے پر رکھے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ کوئی وقت آ پڑے تو مدد طلب نظروں سے دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں۔

ایک بار محبوب کی ٹانگ ایکسیڈنٹ میں ٹوٹ گئی۔ میں اس کے گھر عیادت کے لیے گیا۔ کچی مٹی سے بنا ایک کمرا جس میں وہ چارپائی پر پڑا تھا۔ اس کا پورا کنبہ کچے صحن کے کونے میں بنے ایک کچے چولہے کے نزدیک بنی کچی چار دیواری میں دبکا، مجھے آسمان سے اترے فرشتے کی طرح دیکھ رہا تھا۔ محبوب کی آنکھوں میں آنسو میرے بہتے آنسوؤں سے کم پڑ گئے۔ میں اپنے آنسو چھپانے کے لیے اس سے لپٹ گیا اور اس کے منہ سے میرے لیے دعاؤں کا ایک دھارا نکلا جو تھمتا نہیں تھا اور نہ میں تھمنے دیتا تھا۔ وہ منظر آج بھی میری نظروں میں منجمد ہے اس وقت جیپ میں بیٹھے محبوب کے چہرے کو دیکھ کر اس کا وہ چہرہ نظروں میں گھوم گیا تھا۔ میں نے جلدی سے نظریں موڑیں اور جیپ سے باہر دیکھنے لگا۔

ہماری جیپ اب بلندی پر جا رہی تھی۔ ہواؤں میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ نالہ اب پھر سے بہت شور کرنے لگا تھا۔ اس کے پانی ہمیں یہ بتلاتے تھے کہ ہم کس بلندی سے گر رہے ہیں۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا گیا، ویسے ہی ہم بھی سطح سمندر سے بلند ہوتے گئے۔ کچھ دیر میں ہماری جیپ ایک بھربھرے، بلند اور چٹان سے لپٹے راستے پر رینگ رہی تھی۔ ٹائروں تلے آتے کنکر سیدھا بہت نیچے بہتے نالے میں گر رہے تھے۔ وہ خطرناک مقامات تھے، جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ آگے کوئی خطرہ ہوتا تو ہمیں قبل از وقت اس کا پتا چل جاتا تھا، کیونکہ محبوب کی بولتی بند ہو جاتی تھی اور وہ لرزنے لگتا تھا۔ اس راستے پر چھوٹے، بڑے پتھر لاتعداد بکھرے پڑے تھے۔ ہم اردگرد کے نظاروں کو نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ پتھروں کی وجہ سے جیپ اچھل کود کر رہی تھی اور ہم جم کر بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔ میں نالے کی طرف کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں علتر نالے کے تند و تیز پانیوں کے اوپر پرواز کر رہا ہوں۔ ابھی اچانک ہی ایک بڑا پتھر جیپ کے ٹائر تلے آیا اور جیپ ایک لمحے کو زمین سے بلند ہوئی۔ میں نے سیٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جیپ جب واپس زمین سے ٹکرائی۔ میں نے نیچے جھانکا۔ اگلے وہیل کی پوزیشن دیکھ کر مجھے اپنی سانس رکی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل اچھل کر حلق میں جا اٹکا تھا۔ اگلا وہیل عین سڑک کے کنارے پر تھا۔ بس ایک ڈیڑھ انچ کا فاصلہ رہ گیا

تھا۔ طاہر بھی ایک لمحے کو لرز گیا۔ محبوب کی چیخ اتنی زور سے نکلی تھی کہ ایسا محسوس ہوا کہ نالے کا پانی بھی ایک لمحہ کو ساکت ہو گیا ہو۔ چلتی ہوائیں اور اڑتے پرندے بھی تھم گئے ہوں۔ بڑی مہارت سے طاہر نے جیپ کو سنبھالا۔ ہم سب دعاؤں کا ورد باآواز بلند کر رہے تھے۔ اگر ایک انچ اور وھیل بڑھتا تو زمین بھر بھرا جاتی، بریک لگنا کام آگیا تھا۔ ورنہ جیپ کسی بھاری پتھر کی طرح لڑھکتے ہوئے نیچے گرتی۔ چھپاک کی زوردار آواز آتی اور کہانی ختم......! شاہ جی کا خوف شاید اتنے شاندار جھٹکوں سے زائل ہو چکا تھا اور وہ خاموشی سے اپنی سیٹ کو پوری قوت سے پکڑے سب کے چہرے کو تک رہے تھے۔

شکرِ خدا کرتے دعا پڑھتے سفر دوبارہ شروع ہوا۔

کچھ ہی دیر میں میدانی علاقے کی ابتداء ہوگئی۔ گاڑی کے لیے کوئی باقاعدہ راستہ تو نہیں تھا، صرف ٹریکنگ کے لیے چھوٹے اور بڑے پتھروں سے بھرا چک پھیریاں لیتا راستہ تھا۔ جیپ کی اچھل کود بڑھتی گئی۔ میرا خیال تھا کہ جیپ یہیں روک کر جھیل تک پیدل چلتے ہیں۔ اشفاق بضد تھا کہ نہیں، یہاں سے آگے راستہ ہموار ہے۔ طاہر ایک اچھا اور قابل اعتماد ڈرائیور تھا مگر اب اس نے اپنے ہاتھ کھڑے کر لیے۔ اشفاق اور طاہر میں تو تکرار بھی ہوئی مگر فیصلہ یہ ہوا کہ باقی کا راستہ پیدل طے کرتے ہیں۔ محبوب نے جیپ کے ساتھ ٹھہرنے کا اعلان کر دیا۔ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ہم نے جیپ کھڑی کی۔ میں نے اپنے رک سیک سے کچھ خشک میوہ جات نکال کر محبوب کو اس لیے دیئے کہ اگر اس کو بھوک لگے تو یہاں کھانے کے لیے اسے اور کیا ملے گا۔ ایک پانی کی بوتل بھی اس کے حوالے کی پھر آگے بڑھے۔

ہم نے اپنے رک سیک پیٹھ پیچھے لٹکائے اور اللہ کا نام لے کر ایک جنگل میں جا گھسے، میں نے زندگی میں آج تک اتنے بلند درخت نہیں دیکھے ہوں گے۔ زمین پر کچھ پتھر تھے اور باقی سبز گھاس بچھی تھی۔ ہم یہ منظر کافی دیر بعد دیکھ رہے تھے۔ ایک موڑ ہی مڑے ہوں گے کہ راستے میں ایک شوریدہ ندی راستہ روکے، ہمیں چڑاتی بہتی چلی جا رہی تھی۔ طاہر نے طنز بھری نظروں سے اشفاق کو دیکھا، یہ بتانے کے لیے کہ جیپ یہاں سے کیسے گزرتی؟ اور اشفاق بے پروا نظر آنے کی اداکاری کرتے آگے ہوئے بڑھ گیا۔

شاہ جی، مجھے پھر کچھ خفا خفا نظر آ رہے تھے کہ وہ یہاں میرے بہکاوے پر کیوں آ گئے۔ طاہر اور شیر باز نے لنگوٹ کسا اور اس ندی میں گھس گئے۔ پانی کمر سے نیچے تھا۔ ندی میں پڑے بڑے پتھر نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی بھرپور قوت لگا کر ندی کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ بہاؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے ہی اس ایک قوت کے ساتھ سیدھا جانا پڑ رہا تھا۔ وہ پار اترا تو میں اور اشفاق اسی طرح پانیوں سے زور آزمائی کرتے دوسرے کنارے پہنچے۔ چند گز کا فاصلہ شاہ جی نے بھی اپنے زور پر طے کر لیا اور ہم سب ان کی اس کامیابی پر مسرور تھے۔ وہ خود بھی .... اب مسکرا رہے تھے۔ میں ایک پتھر پر دور بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پار اترے تو میری جانب دور سے ہاتھ ہلا کر پیغام دیا کہ سب ٹھیک ہے۔ میں اب ان کی طرف سے مطمئن تھا۔ ندی پار اترے تو ایک سبز و شاداب وادی تھی۔

سینکڑوں سالہ پرانے درخت، درجنوں سال خوردہ گرے ہوئے درختوں کے تنے، مخمل کی طرح ہری بھری ملائم گھاس جس پر چلنے سے محسوس ہوتا تھا کہ کسی قالین پر چل رہے ہوں۔ ان گرے ہوئے تنوں، سر اٹھائے کھڑے درختوں، بکھرے پتھروں، نیلے آسمان پر کہیں کہیں تیرتے بادلوں کے جھنڈ نے ایک شاندار منظر تخلیق کر دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے دور ہو کر، اپنی اپنی دنیا میں تنہا چل رہے تھے۔ یہاں مداخلت کسی کو گوارہ نہیں تھی۔ سب خاموشی سے چلتے جا رہے تھے۔ کانوں میں کبھی کبھی کسی پرندے کی انجانی سی بولی ٹکرا جاتی جو اس ماحول کو زیادہ خوبصورت بنا دیتی۔ ظتر نالہ میری بائیں جانب کچھ دور ہو کر آرام سے بہہ رہا تھا۔ سامنے برفانی چوٹیوں سے سجے بلند پہاڑ تھے۔ جنہیں ذہن کے کینوس پر محفوظ کرتا ہوا میں دوسروں سے دوری بنا کر تنہا چل رہا تھا۔

جنگل گھنا ہوتا گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ شام اتر رہی ہو۔ دو دو سو فٹ بلند صنوبر، چیڑ اور دیودار کے درختوں نے زمین کو اپنے سائے میں سمیٹ رکھا تھا۔ درختوں کے تنے اتنے چوڑے تھے کہ واپسی کے وقت ایک درخت کو ہم پانچ لوگوں نے مل کر جپھا ڈالا مگر وہ پھر بھی ہماری گرفت میں نہ آیا۔ انہی درختوں پر نظر ڈالتے ہوئے میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کئی درختوں نے وقت کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لی تھیں۔ کسی کے دو تنے بن گئے تو کسی کے تنے بل کھا کر لپٹتے بلندی کی جانب چلے گئے تھے جیسے موٹی سوتی رسوں کو ایک دوسرے سے بل دے کر کسی

بلندی سے لٹکا دیا جائے۔

ایک مخدوش سا پل عبور کیا اور ظفر نالہ ہم سے پرے ہوتے ہوئے دائیں جانب چلا گیا مگر میں ابھی اسی سیاہ جنگل میں بھٹک رہا تھا۔ مجھے اس طرح جنگل میں خاموش گھومنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چلتے چلتے، ایک گھنٹے سے زائد کا وقت ہو چکا تھا۔ میرا دل کر رہا تھا کہ میں ایسے ہی بھٹکتا رہوں اور جھیل کبھی نہ آئے، بلکہ جھیل کا وجود ہی نہ ہو اور میں جھیل تلاش کرتا رہوں۔ کبھی کبھی اپنے آپ کو کچھ دیر کے لیے دھوکا دینا جس میں کسی دوسرے کا حرج نہ ہو اچھا لگتا ہے یا آپ جس کی تلاش میں نکلیں وہ تو نہ ملے مگر اس سے کہیں زیادہ بہتر چیز مل جائے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ آج یہ جنگل مجھے کسی بھی جھیل سے زیادہ دلکش لگا مگر دیکھتے ہی دیکھتے میں جنگل سے باہر نکل کر ایک پہاڑ کے مقابل کھڑا ہو گیا جس کی چوٹی برف سے لدی تھی۔

ابھی میں وہیں کھڑا تھا کہ اِدھر اُدھر سے جنگل عبور کرنے والے ساتھی بھی پہنچ گئے سب نے ایک دوسرے کو خوشدلی سے دیکھا پھر اس طرح حال احوال پوچھنے لگے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوں۔ اس کام سے فرصت ملی تو پھر آگے کا سفر شروع کیا۔

اب سامنے ایک اور ندی ہماری منتظر تھی جس میں بڑے بڑے پتھر پانی کے بہاؤ سے ہل رہے تھے۔ شوریدہ پانی شور مچا رہا تھا۔ یہ شور اس قوت کا تھا جو وہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ڈرڈر کے اس مقام کو پتھروں پر چھلانگیں لگا کر پار کیا۔ شاہ جی کے پار اترنے پر سب نے مل کر زور سے تالیاں بجائیں جس پر شاہ جی نے کوئی کان نہ دھرا اور نہ کسی خوشی کا اظہار کیا۔ سنجیدگی سے آگے بڑھ گئے۔

ندی کے پار اترے تو پھر ایک اندھیرے جنگل میں داخل ہو گئے۔ دو گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے۔ اشفاق پہلے یہاں آچکا تھا اور بار بار شاہ جی کے پوچھنے پر بتاتا ”بس قریب ہی ہے۔“

جب آپ کسی ٹریک پر چل رہے ہوں تو کبھی نہیں پوچھنا چاہیے کہ منزل کتنی دور ہے، کیوں کہ آپ کو کبھی اپنی توقع کے مطابق جواب نہیں ملے گا۔ جہاز میں تو آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ کتنی رفتار ہے اور فاصلہ کتنا رہ گیا ہے۔ پیدل کی رفتار کبھی جانچی نہیں جا سکتی۔ اس لیے میں اپنی دھن میں چلتا جا رہا تھا۔ کہیں بیٹھ کر پانی پی لیا یا ڈرائی فروٹ کھا لیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

شاہ جی کا ایک بار اشفاق سے جھگڑا بھی ہوا۔ شاہ جی کو گلہ تھا کہ وہ ایک گھنٹے سے کہہ رہا ہے کہ جھیل سامنے ہے اور وہ ایک گھنٹے سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ سامنے نہیں ہے۔ شاہ جی کہنے لگے کہ یہاں کوئی جھیل نہیں ہے، یہ سب جھوٹ بولتے ہیں۔ شاہ جی کے غصے پر ہم ان سے دور ہو کر چل رہے تھے۔ مبادہ ان کے غصے کا شکار نہ ہو جائیں۔ اب وہ جنگل بھی تمام ہوا اور اردگرد بلند چٹانیں کھڑی نظر آئیں۔ ان چٹانوں کی بلندیوں پر سیاہ داغ تھے۔ معلوم ہوا کہ سلاجیت کے ذخائر ہیں۔ لوگ چوٹیوں پر جاتے ہیں اور پھر رسوں سے لٹک کر ان مقامات سے سلاجیت نکال کر لاتے ہیں جو چوٹیوں سے قدرے نیچے موجود ہوتی ہے۔ شاہ جی کے پاس سلاجیت کی ایک لمبی فرمائشی لسٹ تھی اور شاہ جی کی نگاہیں ان بلندیوں پر ٹکی تھیں۔ کسی کے بتانے پر کہ یہ گلگت میں بہ آسانی مل جائے گی تو شاہ جی نے فرمائش نوٹ کر لی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ فرمائش کرنے والے پچاس سے زائد تھے۔

شیرباز بولا۔ ”شاہ جی! اس سے خالص سلاجیت آپ کو پورے گلگت میں کہیں نہیں ملے گی۔ بالکل تازہ دودھ کی طرح خالص ہے۔ کہیں تو کسی طرح اوپر جاتے ہیں اور ایک بوری بھر کر لاتے ہیں۔“

شاہ جی کہنے لگے۔ ”پاگل مت بناؤ! بوری ہے کہاں؟“

طاہر کے کندھے پر چادر تھی وہ بولا۔ ”یہ چادر کب کام آئے گی؟ اس میں لا دلاتے ہیں۔“

شاہ جی میری جانب دیکھ کر میری رائے جاننا چاہتے تھے۔

میں نے کہا۔ ”وہ غار یاد ہے ناں جو سامنے دکھتا تھا اور سامنے نہ تھا۔“

شاہ جی بولے۔ ”یاد کیوں نہیں۔ وہاں چڑھے تو تھے۔ غار سامنے ہی نظر آ رہا تھا اور کئی گھنٹے لگ گئے تھے اوپر چڑھنے میں۔“

وہ اب شیرباز کو کہانی سنا رہے تھے۔ میں نے کہا کہ شاہ جی وہ سامنے تھا پر دور ہو گیا تھا اور یہ پہلے ہی سے میلوں دور ہے اور آپ سلاجیت ان لوگوں کے کہنے پر وہاں سے اتارنے چلے ہیں۔

بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی اور پھر ان کا طاہر اور شیرباز سے جھگڑا شروع ہوتا کہ میں نے وہاں سے کھسکنے ہی

میں عافیت تھی۔ مجھے ان کی آوازیں پیچھے سے آتی رہیں۔
"کوئی خوب صورت چیز باآسانی دستیاب نہیں ہوتی، کوئی قیمتی پتھر ہر جگہ نہیں پایا جاتا، حسن پردے میں ہی اچھا لگتا ہے، عیاں ہوجائے تو بے مول ہوجاتا ہے، اسرار اُٹھ جائیں تو قیمتیں گرجاتی ہیں۔ اسی طرح جھیلیں راستوں میں پڑجائیں تو کشش کھودیتی ہیں۔ کسی خوب صورت اور حسن کو کبھی ارزاں نہیں ہونا چاہیے۔ علیحدہ چھپ کر ویرانوں اور پہاڑوں میں گھری جھیلیں، ایک عجیب کسک اور دلکشی رکھتی ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک بلندی آئی اور اس پر چڑھے تو سامنے سبز پانیوں والی علتر جھیل تھی۔

میں نے آج تک جتنی بھی جھیلیں دیکھی ہیں، ان کے لیے مجھے پہلے کسی بلندی پر چڑھنا نہیں پڑا۔ کوئی جھیل چلتے چلتے، آسانی سے میرے راستے میں آجاتی اور یہی اس جھیل کا حسن تھا۔ علتر کی جھیل کو دیکھ کر دھوکا ہوتا ہے کہ یہ پانی ہے کہ شیشہ۔ جو منظر جھیل کے اوپر پہاڑوں، درختوں اور آسمان کا تھا، وہی جھیل کے اندر تھا۔ پانی ساکت اور شیشہ تھا۔ اس کی تہہ میں جو سبزہ تھا، وہی اسے سبز رنگ دیتا تھا۔ ایک ایک پودا اور اس کے پتے تک نظروں کے سامنے تھے۔ کوئی سکہ ڈال دیتا تو وہ بھی تہہ میں پڑا نظر آتا۔ پہلی نظر میں اس جھیل نے ہم سب پر کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ ایک عام سی جھیل لگی تھی سب مایوسی میں گھر گئے۔ شاہ جی تو کچھ زیادہ ہی مایوس ہوئے۔ اشفاق بھی ذرا سا شرمندہ ہوا۔

کئی مناظر ایسے ہوتے ہیں، جن کی تاثیر رگِ احساس میں قدرے دیر سے جذب ہوتی ہے۔ جب تک آپ ان مناظر میں ٹھہرتے نہیں، ان کے ماحول سے آشنا نہیں ہوتے، وہ اپنے جلوے آپ پر عیاں نہیں کرتے۔ آپ کو کسی کو سمجھنے کے لیے اس کے دل میں اترنا پڑتا ہے۔ یہی حال جھیلوں کا ہوتا ہے، اسی لیے ہم بھی اس کے دل میں جھانکنے کے لیے بلندی سے پستی میں اترے۔ جھیل کنارے ایک کچے کمرے کا ہوٹل سا تھا، جس کے اندر داخل ہوئے تو دیواریں سیاہ پڑ رہی تھیں۔ ایک خاموشی آکر یہاں ٹھہری سی گئی تھی۔ چارپائیاں لگی تھیں اور سب اس پر ڈھیر ہوچکے تھے۔ ہم نے خاموشی سے دھوئیں میں لپٹی چائے پی۔ پھر سب دھیرے دھیرے باہر کھسکنے لگے۔ میں وہیں پڑا رہا۔ میرے دل میں باربار یہ خیال آرہا تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے کہ سب چلے جائیں اور میں رات تنہا اس کمرے میں بسر کروں۔ دیر تک

جیلی فش آپ نے اگر دیکھی نہ بھی ہو تو اس کے بارے میں سنا ضرور ہوگا۔ یہ جیلی بھی ہوتی ہے اور فش بھی۔ لیکن اس کا پورا نام ہونا چاہیے جیلی واٹر فش۔ کیونکہ اس میں 95 فیصد پانی ہوتا ہے۔

آپ لوبسٹر کو فریزر میں فریز کردیتے ہیں اور جب خواہش ہوتی ہے فریزر سے نکال کر فرائی کرکے کھا جاتے ہیں۔ لیکن بہت امکان ہے کہ فرائی کرتے ہوئے وہ زندہ ہوجائے۔

فرنچ زبان صرف فرانس ہی میں نہیں بولی جاتی بلکہ یہ 600 سال تک انگلینڈ کی سرکاری زبان رہی ہے۔ ہے نا حیرت کی بات۔ جب کہ انگلینڈ میں انگریزی موجود تھی۔

مرسلہ: ہما بخاری۔ ملتان

☆☆☆

جھیل کنارے بیٹھا رہوں۔ کبھی تو یہ اپنا حسن مجھ پر آشکار کرے گی۔ کسی پہر تو اس کے رنگ نکھریں گے۔ کبھی تو یہ جلوہ افروز ہوگی۔ سورج نکلنے سے پہلے اٹھوں اور جھیل پر پڑتی اس کی پہلی کرنوں کا نظارہ کروں۔ آسمان سے اترتے، صبح میں نکھرتی سرخ، نارنجی اور گلابی رنگوں کو جھیل کے شیشوں میں دیکھوں اور جب وہ رنگ پھیکے پڑنے لگیں تو واپس لوٹ جاؤں۔ میں نے ہر پہلو سے اس لائحہ عمل کے پورے ہونے کا جائزہ لیا اور جب کوئی اُمید نظر نہ آئی تو کمرے سے باہر نکل آیا۔

جھیل کا دور سے ایک جائزہ لیا تو اپنے ساتھیوں کو جھیل کے بیچ لگ بھگ دس میٹر چوڑے ایک جزیرے پر لیٹے پایا۔ وہ سب ایک دوسرے کے کندھے پر سر رکھے، مخمل جیسی سبز زمین پر ایک گھنے درخت تلے استراحت فرماتے نظر آئے۔ ان پر کہیں سایہ پڑتا اور کہیں کرنیں۔ شاہ جی کو حیرت سے دیکھا کہ بغیر کسی کشتی کے وہ اس جزیرے پر پہنچے کیسے ہوں گے۔ اچانک ایک بیس فٹ لمبا اور اندازاً دو فٹ چوڑا شہتیر نظر آیا جو جھیل کے ایک کنارے سے اس جزیرے تک رکھا تھا۔ تب اندازہ ہوا کہ سب اسی پل صراط کو پار کرکے اس جزیرے تک پہنچے ہیں۔ شاہ جی بھی دھوپ

سینکنے اسی جانب چل پڑے اور میں جھیل کے گرد چکر لگانے کے لیے دوسری جانب چل دیا۔

مجھے تنہائی بھی چاہیے تھی اور اسی تنہائی کو پانے کے لیے میں جھیل کی جانب نیچے اترا تو میرے سامنے کئی رنگ پھلجڑیوں کی مانند بکھرتے چلے گئے۔ میں جس کو ایک عام سی جھیل سمجھ رہا تھا، وہ عام ہرگز نہیں تھی۔ خاص الخاص تھی۔ رنگوں کی ایک برسات تھی جو جھیل پر برس رہی تھی۔ حیرت انگیز حد تک جھیل کے پانی نیلے و سبز تھے اور یہ سب رنگ ایک دوسرے سے جدا جدا دکھتے تھے۔ اتنے شفاف کہ جھیل کی تہہ میں پڑا کوئی کنکر، کوئی درخت کا پتا بھی شفاف نظر آرہا تھا۔ جھیل کی تہہ میں کہیں کائی تھی اور کہیں ریت، چھوٹی چھوٹی ٹراوٹ مچھلیاں اِدھر اُدھر تیرتی پھر رہی تھیں۔ وہ جھیل کسی ایکوریم کی طرح دکھلائی دیتی تھی، جس کے پانیوں کو رنگ برنگے پتھروں اور مختلف رنگ کی روشنیوں نے قوس قزح بنایا ہوا تھا۔ یہاں بھی نظر آنے والے کئی رنگ تھے۔ جھیل کی سطح پانی کی نہیں بلکہ ایک آئینہ جیسی تھی جہاں اردگرد کے بلند پہاڑوں، شاداب درختوں، سورج کی کرنوں کا عکس دکھتا تھا۔ کرنیں ان پانیوں کے پار اترتیں تو اپنے سات رنگوں میں منعکس ہو جاتیں۔ میں اپنے دوستوں سے دور ایک کنج میں بیٹھا، اپنی تھکاوٹ بھلا کر اس منظر کا حصہ بنا، اس دنیا سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کھویا، آس پاس پھیلی خاموشی کی دلفریب صدائیں سنتا رہا۔ ایسی ویران اور خاموش جگہ رات بسر کرنے کے لیے انتہائی موزوں ہوتی ہے، ان کے لیے جو زندگی کے ہجوم سے چند دن اپنے لیے چرانے کا گر جانتے ہیں۔

میں ٹہلتا ہوا، درختوں کی ان ٹہنیوں سے جو جھیل پر سایہ کررہی تھیں، بچتا بچاتا اس پل صراط پر آیا۔ اب مجھے اس سے گزر کر اپنے ساتھیوں کے پاس جزیرے تک جانا تھا، جہاں مخمل کی طرح سبز گھاس بچھی میری منتظر تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جھیل کا پانی کتنا گہرا ہے۔ جھیل کی تہہ شفاف دکھتی تو تھی مگر آئینے سے آسمان بھی قریب دکھتا ہے، اس لیے میں کوئی اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ بیس فٹ سے زائد کا سفر کہیں مجھے ان پانیوں میں پھینک نہ دے، جس کی نہ گہرائی کا پتا ہے اور نہ یہ اندازہ کہ وہاں کوئی دلدل ہے یا نہیں۔ مجھے پار اتارنے کے لیے شاہد اور اشفاق، دونوں نے بار بار پل سے گزر کر مجھے دکھایا اور آخر کار میں بھی کچھ لمحوں میں اس مخمل جیسی ٹھنڈی گھاس پر درخت کے سائے میں جھیل سے ٹکرا کر آتے جھونکوں کی آغوش میں پسلٹیاں مار رہا تھا۔ غنودگی اچانک آتی گئی اور میں کچھ لمحوں کے لیے بے خبر ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں گلگتی دوستوں کی اجنبی خوبصورت بولی، شینا میرے کانوں سے مسلسل ٹکرائی تو میں بیدار ہوا۔ شاہ جی کے اس جزیرے پر بھی خراٹے جاری تھے۔ سورج ڈوبنے کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ پیچھے محبوب ہمارا انتظار بھی کررہا تھا اور آج ہی ہمیں گلگت پہنچنا بھی تھا۔ میں ایک حسرت لیے کچھ دیر اسی جزیرے پر بیٹھا رہا کہ یہاں ایک رات کا قیام کتنا حسین ہوگا؟ کیا میں اکیلا ان سب کو واپس بھیج کر رک سکتا ہوں؟ مجھے اپنے آپ سے جواب جب نفی میں ملا تو ہم واپس جیپ کی جانب روانہ تھے۔ جیپ تک پہنچے تو محبوب کو اپنا منتظر پایا۔ اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر شکن نہ تھی۔ اکیلے میں اس نے یہ وقت کیسے گزارہ اس کا شکوہ بھی نہ تھا۔ اس نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ اب ہمیں جلدی نکل کر اندھیرا ہونے سے پہلے وہ تنگ درہ عبور کرنا تھا۔ اس لیے فوراً ہی چل پڑے۔ واپسی کا سفر خاموشی میں گزرا۔ گلگت پہنچے تو شام مکمل طور پر چھا چکی تھی۔

رات کو شیر باز ہمیں ہلمت ٹورسٹ ہوٹل میں ڈنر کرانے لے گیا۔ اس کے خوبصورت ہال میں ہم بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ مدھم آواز میں شیر باز مجھے فیری میڈو جانے سے باز رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ شاہ جی تائیدی انداز میں اپنا سر ہلا رہے تھے اور میں کڑھائی گوشت پر ہاتھ صاف کررہا تھا۔ میرے ہم سفر بھی اس سفر پر راضی نہیں تھے مگر وہ مجھے اکیلا چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ سفر جو ہم نے کل کرنا تھا، اس کی اُمید ابھی تک مجھے نہیں تھی۔ سب اس جیپ حادثے سے ڈرے ہوئے تھے جو چند دن پہلے فیری میڈو کے راستے میں ہوا تھا اور کئی جانوں کی المناک موت کا سبب بنا تھا۔ ہم اس حادثے کے دن سے اس کا ذکر بھی ایک دوسرے سے نہیں کرتے تھے۔ ہر ایک فیری میڈو جانے کے ارادے سے اندر ہی اندر متزلزل ہو چکا تھا۔ میں اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ شاہ جی خاموش تھے۔ نہ معلوم اشیاء کو گھور رہے تھے، خلاؤں میں تک رہے تھے۔ اپنے ریوڑ سے گم ہوئی کسی بھیڑ کی مانند ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ شاہد اور اشفاق خالی خالی نظروں سے مجھے تک رہے تھے۔ میرے مصمم ارادے کے سامنے سب نے

سرِ خم تسلیم کر رکھا تھا۔ میں انہیں کئی بار کہہ چکا تھا کہ میں اکیلا چلا جاؤں گا مگر وہ سب اس پر بھی راضی نہ تھے۔

رات میں نیند گہری آئی۔ صبح اٹھے تو ویٹروں کی وہی مانوس آوازیں کانوں میں پڑیں۔ شاہ جی مجھ سے پہلے بیدار ہو کر چھت کو مسلسل گھورے جا رہے تھے۔ آج مجھے فیری میڈو جانا تھا۔ میرا ایک ساتھی اپنے بستر پر پڑا چھت کو ایسے گھور رہا تھا جیسے ہم آخری سفر پر جا رہے ہوں۔ اشفاق اور شاہد کچھ بولتے تو نہ تھے مگر اُمید افزا نظروں سے شاہ جی کو تک رہے تھے کہ ممکن ہے کہ میں شاہ جی پر ترس کھا کر فیری میڈو کا ارادہ بدل دوں۔ ان دونوں نے اپنی بندوقیں شاہ جی کے ناتواں کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں اور شاہ جی اپنی بندوق تانے میرے سامنے کبھی بھی کھڑے ہو سکتے تھے۔ میں جب کسی بات کو ٹھان لوں تو اللہ میرا ساتھ دیتا ہے اور آج بھی یہی ہونے والا تھا۔

ناشتے کے لیے ہم اپنے ہوٹل سے نکل کر بازار میں آئے۔ آج ذرا مختلف قسم کے ناشتے کا پروگرام تھا۔ ہم نے گرم نانوں کے ساتھ مرغ چھولوں کا ناشتا کیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد میں نے شاہ جی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ”شاہ جی! اب جلدی کرنی ہے کیونکہ رک سیک بھی پیک کرنے ہیں اور سارے سامان کو ایک بار پھر سے چیک کرنا ہے تاکہ اگر کوئی چیز رہ گئی تو بہت مشکل ہو گی۔“

شاہ جی میری اس بات پر پھر ایک بار ذرا سی دیر کے لیے کھوسے گئے کہ یہ کہاں جا رہے ہیں جہاں کوئی چیز بھی مہیا نہیں ہوتی۔ صرف ”ہوں“ میں جواب دینے کے بعد شاہ جی قدرے آگے نکل گئے اور میرا ان کے کندھے پر دھرا ہاتھ لٹک کر رہ گیا۔

پھر جب واپس آئے تو کمرے میں بددلی سے رک سیک پیک کرنے لگے، میرے رک سیک میں ہر قسم کی ضرورت کا سامان پیک ہو گیا۔ آلو، پیاز، مرچ مصالحے، دالیں، چاول، ٹافیاں، دوائیاں، سوئٹس، گرم کپڑے، اونی ٹوپیاں، گرم دستانے، موزے، ٹارچ، کیمرا اور بیٹری سیل، اس کے علاوہ خیمہ، سلیپنگ بیگ، میٹرس بھی تھا۔ مجھے خیال ہی نہ آیا کہ یہ سب مال مجھے اکیلے اٹھانا ہے۔ اتنا سامان تو کوئی گدھا ہی اٹھا سکتا تھا۔ میں کافی دیر اسی سوچ میں رہا کہ کیا میں ایک گدھا ہوں۔ کیونکہ یہ سارا سامان میں اپنی پیٹھ پر لادے، تاتو سے فیری میڈو تک کا ٹریک کیسے طے کروں گا۔

آج کا ہمارا سفر تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا ویگن پر ڈھائی تین گھنٹوں میں گلگت سے رائے کوٹ پل دوسرے حصے میں وہاں سے جیپ پر دو سے ڈھائی گھنٹوں میں گرم چشموں والے تاتو گاؤں اور آخری حصے میں پیدل ٹریک تین سے چار گھنٹے کا تاتو سے فیری میڈو تک طے کرنا تھا۔

فیری میڈو کو دو راستے جاتے ہیں۔ ایک قدرے آسان مگر دراز راستہ جو جنگلوں کے اندر سے ہو کر وہاں پہنچتا ہے۔ دوسرا قدرے مختصر مگر جان لیوا راستہ ہے جو ایک بلند پہاڑی سے ہو کر فتوری گاؤں کو جاتا ہے۔ یہ راستہ دشوار گزار ہے کیونکہ ایک عمودی پہاڑی پر چلنا پڑتا ہے۔ جہاں چڑھتے ہوئے گھٹنے منہ کو لگتے ہیں اور پھیپھڑے پسلیوں پر زور لگا کر باہر کو نکلتے محسوس ہوتے ہیں۔

مجھے ابھی بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ سامان مجھ پر بہت بھاری پڑ جائے گا، کیونکہ یہ میرا باقاعدہ پہلا ٹریک تھا۔ اگر شاہد اور اشفاق نہ ہوتے تو معلوم نہیں میرا کیا حال ہوتا۔ وہ دونوں اللہ کے فرشتے بن کر میری مدد کو آ پہنچے اور آج میں سلامت ہوں۔

نانگا پربت کی چاہ میں مجھے کتنے مصائب اٹھانے ہوں گے، ان کا میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ اب تو لوگ بہت جانے لگے ہیں اور کافی سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں، آج سے سترہ سال پہلے، فیری میڈو کے نام سے بھی بہت کم لوگ آشنا تھے اور راستے ویران اور دشوار لگتے تھے۔

سامان پیک ہو گیا تھا۔ اب انتظار شروع ہوا کہ کب اشفاق اور شاہد کی جوڑی آئے اور ہم روانہ ہوں۔ وہ دونوں ”ہم کچھ دیر میں آئے“ کہتے ہوئے کچھ دیر پہلے چلے گئے تھے۔ یہ انتظار مجھے بھاری پڑ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ہم آج فیری میڈو نہ گئے تو پھر کبھی نہ جا سکیں گے۔ کبھی ذہن میں آتا کہ یہ کیا پنگا لے بیٹھا ہوں؟ کوئی بھی دل سے تیار نہیں لگتا۔ سب کو کیا میں گھسیٹ کر ساتھ لے جا رہا ہوں؟ کیا یہ فیری میڈو اتنا ہی اہم ہے کہ سب کو اور اپنے آپ کو بھی ایک مصیبت میں ڈالوں۔ پھر سوچتا کہ جس کے خواب میں نے پورا ایک سال بُنے اور جب تعبیر سامنے ایک قدم دور ہے تو پیچھے ہٹ جانا کہیں ہمیشہ کا پچھتاوا نہ بن جائے۔ یہ خیال میرے ارادے کو مضبوط کر رہا تھا۔

شاہ جی خاموش سے تھے۔ وہ انکار بھی نہ کرتے تھے مگر اب تھک سے گئے تھے۔ میرے اور ان کے ذہن میں

وہی جیپ تھی جو پانچ دن پہلے ناتو کے ہولناک راستے پر رائے کوٹ دریا میں ہزاروں فٹ نیچے گرگئی تھی اور چار سیاح ڈرائیور سمیت ہلاک ہو گئے تھے۔ میں اس افسوس ناک حادثے کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا کہ شاہ جی میری سوچ پڑھ لیں۔

میرے ذہن میں اسی طرح کے مختلف خیالات آتے رہے اور میں اسی دوران اپنے دونوں ساتھیوں کا انتظار کرتا رہا۔ وہ میرے خیال سے لیٹ ہو رہے تھے، کیونکہ آج ہی ہم کو یہ سب مراحل طے کرکے شام سے پہلے فیری میڈو پہنچنا تھا۔ میں اسی پر غور کررہا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔

کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا تھا جس کی وجہ سے میرے خیالات کے تانے بانے ٹوٹ گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح شاہد کمرے میں بوکھلایا سا داخل ہوا۔ ''آپ تیار نہیں ہیں۔ چلیں دیر ہو رہی ہے۔''

وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ اسے ایک خیمہ مل گیا ہے اور اب وہ اپنی دانست میں تیار تھا۔ اس کے کندھے پر لٹکتا ایک چھوٹا سا شولڈر بیگ تھا اور اس کی تیاری مکمل تھی۔ میں نے اس سے لیٹ آنے کی شکایت کی تو وہ مسکرا کر بولا۔ ''ہم ابھی نکلیں گے تو شام سے پہلے فیری میڈو میں خیمے لگا لیں گے۔''

شاہ جی ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے بستر سے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ ہم سب ایک ایک کرکے شیر باز کی گاڑی میں جا بیٹھے جو ہمیں ویگن اسٹینڈ پر چھوڑ آئی۔ وہاں پہنچتے ہی ایک بجے کی ویگن سے میں نے چار ٹکٹ بک کرائے اور گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

فضا میں شدید حبس تھا، گرمی سے حال بے حال تھا۔ شاہ جی اپنی قمیص کے دامن سے اپنے آپ کو پنکھا جھلتے تھے۔ ہم نے وہیں ایک ریسٹورنٹ سے دوپہر کا کھانا کھایا۔ شاہ جی آج ایسے کھانا کھا رہے تھے کہ یہ ان کا آخری کھانا ہے۔ تین بار بسم اللہ پڑھی، کھانے کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

شاہد اور اشفاق یہ سب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ہمارا سامان اوپر چھت پر منتقل ہوگیا، شاہ جی اور میں پیچھے والی سیٹ پر جا بیٹھے۔ شاہد اور اشفاق گل اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ مزید دو نوجوان آ بیٹھے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر میں ویگن جگلوٹ کی جانب فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔

ٹھنڈی ہوا لگی تو اسماعیل بھی بول پڑے۔ ان کو فیری میڈو سے زیادہ واپس جانے کی فکر تھی۔ ''کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جو فیری میڈو سے سیدھا پنڈی جائے۔ یہ تو لمبا راستہ ہے کہ پہلے گلگت آؤ، اور پھر واپس پنڈی۔''

شاہ جی فیری میڈو سے سیدھا پنڈی کا پروگرام بنا رہے تھے۔ میں نے کہا مگر ایک ہفتہ پیدل چلنا ہوگا۔ فیری میڈو سے بابوسر پہنچ کر پہاڑ پار کریں گے اور پھر ناران کے راستے پنڈی پہنچ سکتے ہیں۔

میرے اس جواب پر شاہ جی ڈھیلے پڑتے ہوئے اپنی سیٹ پر ڈھیر ہوتے گئے اور اپنا سر ویگن کی کھڑکی سے ٹکا کر پھر کسی گہری سوچ میں کھوگئے۔

لگتا یوں تھا کہ شاہ جی کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ ان میں جتنا دم تھا وہ میرے ساتھ چلے آرہے تھے۔ اب شاہ جی کو میں ایک طرح اپنے کندھے پر اٹھائے گھوم رہا تھا۔ گویا وہ دکھاوے کو ساتھ تھے۔ اتنے میں شاہد نے...... میری جانب مڑ کر جو کہا، اس سے میرے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ذہن سن اور زبان گنگ ہو گئی جس خیال اور تذکرے سے میں گریز کر رہا تھا، مجھے کیا معلوم تھا وہ میرے ہمراہ اسی ویگن میں میرا ہمسفر ہے۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے دو نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ حیدرآباد سے آئے ہیں اور جو لوگ چند دن پہلے ناتو جاتے ہوئے جیپ حادثے کا شکار ہوئے تھے، یہ ان کے رشتہ دار ہیں۔''

شاہ جی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور جو حادثہ ہم بھول چکے تھے یا بھولنے کی کوشش کررہے تھے، وہ پھر سے تازہ ہوگیا۔ شاہد نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ لوگ اپنے رشتہ داروں کی لاشیں تلاش کرنے آئے ہیں۔''

میرے دماغ میں ایک ہلچل سی پیدا ہونے لگی۔ شاہ جی رحم طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے اور میں خالی دماغ افسردہ اور سہمی نظروں سے ان دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ان میں سے ایک میری طرف اداس نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ بھی فیری میڈو جا رہے ہیں۔''

میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے اس نے کہا ہو کیا آپ بھی مرنے جا رہے ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ جس خوف کے سانپ کو میں نے اپنے اندر دبا کر رکھا ہوا تھا، وہ

کنڈلی اٹھائے پھنکارنے لگا تھا۔

میرے اندر ایک افسوس اور دہشت کی ملی جلی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ رائے کوٹ، تاتو، جیپ کا ہزاروں فٹ سے نیچے گرنا، فیری میڈو اور نانگا پربت آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ میں ایک بے یقینی کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا کہ میں کیا نانگا پربت جا بھی سکوں گا کہ نہیں؟ اگر چلا بھی گیا تو کیسے جاؤں گا۔ میرے سامنے اب کچھ لاشیں تھیں، ان کے روتے لواحقین تھے۔ ساتھ میں لرزتے شاہ جی، اندر سے کانپتا میں خود اور آگے بیٹھے اپنا خوف چھپاتے دو بلتی، شاہد اور اشفاق۔ وہ دونوں اپنا خوف چھپا ہوئے تھے تاکہ ان کے بلتی ہونے پر کسی کو شبہ نہ ہو۔

مجھے نانگا پربت کی درندگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ یہ قاتل پہاڑ اپنی ایک خونی تاریخ رکھتا ہے۔ کوئی بھی اس کی جانب بڑھا، اس نے اسے آدبوچا۔ اس نے کئی کوہ پیما نگل لیے اور تو اور ہمارے سامنے چار جوان بندوں کی قربانی مانگ لی، جو صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے جا رہے تھے مگر انسان بھی بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔ نانگا پربت للکارتا رہا کہ کوئی میری تنہائی میں مخل نہ ہو مگر ہرمن بوہل ہو یا میسنر، رجب شاہ ہو یا نذیر صابر۔ سب اس پر چڑھ دوڑنے اور اس کی برف کو مسمار کرنے، اس کی بلند چوٹیوں تک جا پہنچنے کو بے قرار ہو گئے شاید اس کا بھی اسے غصہ ہو مگر میں تو صرف فیری میڈو میں اپنا خیمہ لگانا چاہتا تھا۔ اس کی پُراسرار گھاٹیوں کو دور سے ایک بار دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنے بوٹوں سمیت اس معبد میں گھسنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر یہ مجھے لگاتار ڈرائے چلا جا رہا تھا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی اور ہماری ویگن رائے کوٹ کی جانب بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے بھاگتے درخت دیکھتا تھا۔ دریا اور پہاڑ میری نظروں سے اوجھل تھے۔ میں عجیب کشمکش میں تھا۔ میرے اندر سوالات اٹھ رہے تھے کہ کیا میں اتنا خودغرض ہو گیا ہوں جو تین ہرنوں کو لیے شیر کی کچھار میں، اپنی غرض سے گھس رہا ہوں؟ کیا فیری میڈو واقعی اتنا دلکش ہے جس کے لیے میں اتنا تردد کر رہا ہوں۔

ویگن نے ایک موڑ کاٹا تو سامنے پتھریلی، دھوپ میں چمکتی چٹانوں کے پیچھے، نانگا پربت کے برفانی اہرام نظر آئے، جیسے وہ دانت نکالے مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ مجھے اپنی تذلیل محسوس ہوئی اور اسی لمحے میں نے اپنا ٹوٹتا ہوا ارادہ پھر سے پکا کرلیا کہ فیری میڈو میں آج رات میرا خیمہ ضرور لگے گا۔ خواہ کچھ ہو جائے میرے ارادے متزلزل نہیں ہوں گے۔ مجھے نانگا پربت سے ٹکرانا ہے۔ اسے جھکانا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ نانگا پربت کی قہرناکی کا مجھے مقابلہ کرنا ہے۔

سائے لمبے پڑ رہے تھے۔ چٹانوں پر دھوپ پڑ رہی تھی اور وہ اس وادی میں زرد لگتی تھی اور ہم اسی وقت رائے کوٹ کے پل پر اترے، ویگن کی چھت سے اپنا سامان اتارا۔ ہم اترے تو وہ دونوں جوان بھی کھولتی سڑک پر کھڑے آسمانوں کی طرف جاتے راستے کو دیکھنے لگے تھے، جو تاتو کی جانب جاتا تھا۔ اسی خونی سڑک نے ان کے عزیزوں کی جانیں لے لی تھیں۔ فضا میں شدید تپش کا احساس تھا۔ یہ تپش، لہروں کی صورت ان چٹانوں سے تیرتی چلی آ رہی تھی، جنہوں نے پورا دن سورج کی گرمی کو جذب کرتے گزارا تھا۔ ایک ویرانی تھی جو چار سو پھیلی تھی۔ ایسی ویرانی جو گرمیوں کی تپتی دوپہر میں، دامان سے جڑے میرے چھوٹے سے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی گلیوں میں آوارہ پھرتی تھی۔

آج میں اپنی بچپن کی یادوں میں دیکھتا ہوں تو کچھ موتی میرے ہاتھ آتے ہیں۔ انٹرنیٹ اور میڈیا نے پوری کائنات ہی پلٹ کر رکھ دی ہے۔ ہمارے بچپن میں ابھی ٹی وی نیا نیا آیا تھا۔ ہمارے چھوٹے سے شہر میں ٹی وی بڑے شہروں کی نسبت آٹھ سال بعد آیا تھا۔ صرف شام کی نشریات ہوتی تھیں، جو رات گیارہ بجے ختم ہو جاتی تھیں۔ اسکول کے بعد تو ہمارے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ ہم گلیوں، محلوں میں پلے تھے اور بچپن کا لطف ہم نے اٹھایا ہوا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتیں اور میں اپنا چھٹیوں کا کام پہلے دس دن میں ختم کر لیتا۔ میرے شہر ڈیرہ کی تپتی، ویران اور اجڑی دوپہریں میرے لیے نت نئے مشغلے لے آتیں۔ جب سب گھر والے دوپہر کے کھانے کے بعد ایک کمرے میں اور ایک پنکھے تلے سو جاتے تو میں چپکے سے اٹھتا اور آہستگی سے باہر کا دروازہ کھول کر گلی میں دوڑ لگا لیتا۔

گلی میں ایسی ہی ویرانی ہوتی، جو آج مجھے رائے کوٹ کے پل پر نظر آ رہی تھی۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک ویرانہ شروع ہو جاتا تھا۔ کھجوروں کے درخت تھے اور ان سے پرے قبرستان تھا۔ کبھی میں کسی کھجور کے درخت پر چڑھ کر کھجور توڑ رہا ہوتا تو کبھی کسی پیپل کے درخت کی

اونچائی پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلے دیکھنا۔ میرے دوست خالد اور اللہ وسایا میرے ہمراہ ہوتے۔ ایک بار شہر سے باہر واحد عیدگاہ میں درخت سے کھجور توڑتے ہوئے نیچے آگرا اور بے ہوش ہو گیا۔ مجھے ہوش تب آیا جب میرے دوست، ہوش میں لانے کے لیے مجھے نہر میں پھینک چکے تھے۔ پانی کے چھپاکے سے ہوش آیا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھا ایک ویرانہ تھا، تپش اور گرمی تھی۔ کبھی کوئی انسان آتے جاتے نظر آجاتے، ورنہ گدھے کسی سائے میں کھڑے سستا رہے ہوتے۔ ان گدھوں کی سواری بھی ہمارا ایک محبوب مشغلہ تھا اور اسی چکر میں کئی بار گدھوں کی دولتی کھائی۔ اگر گدھوں سے بچ جاتے تو ان دیہاتی مالکوں سے ضرور پٹتے جو ان پر لکڑیاں لاد کر شہر بیچنے آتے۔

اس رائے کوٹ پل کی ویرانی پر اب مجھے اپنے بچپن کی دہکتی گلیاں یاد آگئیں۔ واقعات یاد آگئے۔

ہم سامان سمیت کھڑے چاروں جانب دیکھ رہے تھے۔ سڑک کی دوسری جانب ایک ویران سا ہوٹل تھا۔ نام تو شنگریلا تھا مگر شنگریلا جیسی دلکشی نہ تھی۔ ہوٹل کے ساتھ چند گیراج بنے تھے اور کچھ جیپیں باہر پارک تھیں اور گیراجوں میں چارپائیاں بچھی تھیں، جن پر ڈرائیور حضرات اپنی شلواریں گھٹنوں سے اوپر تک چڑھائے دراز تھے۔ ہمارے ساتھ، جہاں ہم اترے تھے، وہاں چند دکانیں تھیں جہاں ضرورت کا سامان دستیاب تھا۔ میں چاروں جانب کا جائزہ لیتے ہوئے ان گیراجوں کی جانب اپنے ساتھیوں سمیت بڑھا۔ حیدرآباد کے دونوں نوجوان بھی غم سے نڈھال ہمارے ساتھ ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے غم میں، میں اپنا فیری میڈو بھولتا جا رہا تھا۔ ان سے سوالات کرتا تھا۔ کب روانہ ہوئے؟ آپ لوگوں کو کب اور کیسے معلوم ہوا؟ کیا پہلی بار فیری میڈو جا رہے تھے؟ پھر بار بار ان کو تسلیاں دیتا، گلے لگاتا، وہ رو رہے تھے۔ آنسو میری آنکھوں میں بھی بھر آئے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ ہمیں معلوم ہے کہ اتنی بلندی سے دریا میں گرنے کے بعد لاشیں نہیں مل سکتیں۔ ہم تو بس اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے یہاں آئے ہیں کہ دیکھیں ہمارے بھائی کہاں سے گرے تھے اور یہ سب ان کی ماؤں کو بتائیں تاکہ ان کا غم کچھ ہلکا ہو۔

ہم اپنے منوں وزنی پاؤں پر چلتے ان گیراجوں میں پہنچے۔ جیسے ہی سب کو لواحقین کا معلوم ہوا تو کچھ ہی دیر میں سب مقامی افراد بشمول ڈرائیوروں کے ہمارے اردگرد جمع ہو گئے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خطرناک چٹانوں سے نیچے اتر کر لاشیں ڈھونڈنے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ بیٹھے تھے اور کچھ کھڑے ہوئے ہمیں بتا رہے تھے۔ ایک ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ وہ چاروں اس دن بہت خوش تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ آپس میں مذاق کر رہے تھے۔ ڈرائیور نیا تھا۔ پہلے وہ چترال روٹ پر چلتا تھا۔ وہ اسی وقت روانہ ہوئے تھے۔ ڈرائیور سمیت وہ چاروں جیپ سمیت ایک موڑ کاٹتے ہوئے نیچے گر گئے۔ ان کو معلوم تب ہوا جب شام ہو رہی تھی۔ انہوں نے لکڑیوں سے اسٹریچر سے بنائے۔ ساتھ رسے لیے تاکہ لاشوں کو ان سے باندھ کر اوپر لاسکیں۔ خطرناک چٹانوں سے نیچے رائے کوٹ نالے تک اترے۔ رات ہو چکی تھی۔ جیپ نالے کے کنارے پر پڑی تھی۔ کافی دور ڈرائیور کی لاش پڑی ملی اور باقی نالے میں بہہ گئے۔ بہہ کر کہاں جاتے۔ کچھ ہی فاصلے پر سندھ غراتا ہوا بہہ رہا تھا۔ وہ ڈرائیور کی لاش اوپر لائے اور نماز جنازہ پڑھ کر چترال روانہ کر دی۔ حیدرآباد کے لواحقین رونے لگے۔ شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے اور میں شاہ جی کو۔ ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

ہمیں بیٹھے اور باتیں کرتے کافی دیر ہو گئی تھی۔ شاہد میرے کان میں بولا۔ ”چلنا ہے تو ابھی نکلیں، ورنہ یہاں شام ہوتے دیر نہیں لگتی۔“

میں نے سوچا واقعی یہاں شام ہوتے دیر نہیں لگتی۔

ان دونوں لواحقین نے مجھے اٹھایا اور کہا۔ ”ہمارا جو ہونا تھا ہو چکا۔ آپ فیری میڈو ضرور جائیں۔ واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے، ہم بھی تین سال پہلے جا چکے ہیں۔ اللہ مالک ہے۔ حادثے ہر روز تو نہیں ہوتے۔“

ایک نے مجھے گلے لگا لیا اور رونے لگا، اس کے دو بھائی ہلاک ہو چکے تھے۔ میں بھی آب دیدہ ہو گیا۔

شاہد نے پہلے ہی سے ایک جیپ والے سے بات کر لی تھی اور میں بھیگتی آنکھوں سمیت سیدھا ڈرائیور کے ساتھ، جیپ میں آگے بیٹھ گیا۔ سامان اشفاق اور شاہد نے پہلے ہی لوڈ کر لیا تھا۔ وہ پہلے سے ہی شاکی تھے کہ میں نے بہت دیر کر دی ہے۔ ہمیں تاتو دو گھنٹے میں پہنچنا تھا اور آگے تین گھنٹے سے زائد کا فیری میڈو کا ٹریک تھا۔ جیپ پہلے سے اسٹارٹ تھی، میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گیئر بدلا، موڑ کاٹا اور پھر ہم موت کی وادی کے مسافر بنے آگے بڑھتے چلے گئے۔

(جاری ہے)

زویا اعجاز

اس کی زندگی بحران کی زد میں رہی، لمحہ بھر کو سکون ملتا کہ پھر کوئی نیا بحران گھیر لیتا۔ اتنے بحرانوں کی زد میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے چاہنے والوں کو مایوس نہیں کرتا، کھیل کے میدان میں اترتے ہی مردِ میدان بن جاتا۔ اس کے پرستار اس کی کارکردگی دیکھتے، جھوم جھوم اٹھتے مگر کوئی اس کے زخم دل کا مداوا نہیں کرتا۔

مقبولیت کی معراج پر پہنچنے والے ایک کھلاڑی کا ذکر خاص

24 مارچ 2015ء کا دن دو مختلف برِاعظموں کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ آکلینڈ کی سرزمین پر طلوع ہونے والا سورج اپنے جلو میں بے پناہ سنسنی سمیٹ لایا تھا۔ کرکٹ کا گیارہواں عالمی کپ اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔ سیمی فائنل مقابلوں کے پہلے میچ میں نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقا کو اپنی بقا کی دھواں دھار جنگ درپیش تھی۔ یہ میچ دونوں ہی ممالک کے عوام اور کھلاڑیوں کے لیے جذباتی اہمیت کا حامل تھا۔ میزبان نیوزی لینڈ کی ٹیم قبل ازیں عالمی کپ کے چھ سیمی فائنل کھیل چکی تھی۔ لیکن فائنلسٹ بننے کا اعزاز حاصل کرنے میں ہنوز ناکام تھی۔ رواں ٹورنامنٹ ان کے لیے بہت یادگار ثابت ہو رہا تھا اور اب تک کھیلے گئے تمام میچز میں وہ ناقابلِ تسخیر رہے تھے۔ لیکن مقابل ٹیم بھی بہترین عالمی رینکنگ کے حامل کھلاڑیوں پر مشتمل جنوبی افریقا جیسی ٹیم تھی جو باولنگ، بیٹنگ اور فیلڈنگ میں لاثانی تھی۔ عالمی مقابلوں میں انہیں چوکرز کا خطاب حاصل تھا کیونکہ وہ ہمیشہ ناک آوٹ مراحل تک پہنچ کر کسی نہ کسی اتفاق یا بدقسمتی کی بدولت ٹورنامنٹ

سے باہر ہو جاتے تھے۔ لیکن اس بار معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ پہلی مرتبہ کسی ناک آؤٹ مرحلے سے سرخرو ہونے میں کامیاب رہے تھے۔ امنگیں جوان تھیں اور ارادے مہمیز تھے۔ ٹاس جیت کر جنوبی افریقا نے پہلے بیٹنگ کا فیصلہ کیا۔ ایک محتاط اور قدرے سست آغاز کے بعد انہوں نے گیم پلان تبدیل کرتے ہوئے روایتی جارحانہ انداز میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ان کے کپتان نے اپنے ترکش کے تمام تیر آزماتے ہوئے اپنی ٹیم کو ایک مضبوط پوزیشن میں لا کھڑا کیا۔ لیکن ماضی کی روایات کے عین مطابق اس دن بھی انہیں بیرونی عوامل سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا۔ تاریخ ایک دفعہ پھر خود کو دہراتی محسوس ہو رہی تھی۔ بارش بار بار کھیل میں رخنہ انداز ہو رہی تھی۔ بالآخر کرکٹ کے قانون کو حرکت میں آنا پڑا۔ اور کھیل 43 اوورز تک محدود کر دیا گیا۔ نیوزی لینڈ کو فائنل میں رسائی کے لیے 43 اوورز میں 299 رنز درکار تھے۔ دوسری اننگز میں کئی ڈرامائی موڑ آئے۔ جیت کی دیوی کبھی نیوزی لینڈ پر مہربان نظر آتی تو کبھی اس کا دست شفقت جنوبی افریقا کے حق میں محسوس ہونے لگتا۔ لیکن ان سے پے در پے کئی بھیانک غلطیاں سرزد ہوئیں جو کھیل کا پانسا پلٹ چلی تھیں۔ میچ اب آخری اوور میں آن پہنچا تھا۔ جیت نیوزی لینڈ سے محض بارہ رنز کی دوری پر تھی۔ کپتان نے گیند اپنے بہترین باولر ڈیل سٹین کو تھما دی۔ یہ وہی باولر تھا جس نے ٹھیک ایک سال قبل اسی ٹیم کے خلاف عالمی کپ ہی کے ایک میچ کے آخری اوور میں سات رنز کا دفاع نہایت کامیابی سے کیا تھا۔ تاہم اس دن اس کا تمام تر تجربہ، جارح مزاجی اور کوششیں ناکام رہیں۔ تینتالیسویں اوور کی پانچویں گیند پر گرانٹ ایلیٹ نے ایک فلک بوس چھکا رسید کیا تو اسٹیڈیم میں موجود ہزاروں تماشائی خوشی سے گویا دیوانے ہو گئے۔ دوسری طرف جنوبی افریقی کھلاڑیوں پر سکتہ طاری تھا۔ جو کھلاڑی گراؤنڈ میں جس پوزیشن پر کھڑا تھا وہیں ڈھے گیا۔ مورنی مورکل، ڈوپلیسی بچوں کی طرح اشک بہا رہے تھے۔ ان کا قائد، مرد بحران اے بی ڈی ویلیئرز بھی ہونٹ بھینچے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام نظر آ رہا تھا۔ وہ آٹھ سال کی عمر سے اپنے ملک کے عالمی چیمپئن بننے کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن ہنوز دلی دور است کے مصداق ایک بار پھر اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ جس کا درد اور اذیت اس کے بہتے آنسوؤں میں عیاں تھی۔ دنیا کے ہر گوشے میں یہ منظر کروڑوں دلوں کو آزردہ کر گیا تھا اور پہلی بار تعصب، قومیت رنگ، نسل اور فرقے سے بالاتر ہو کر سب شائقین کرکٹ نے اس کے آنسو اپنے دلوں پر گرتے محسوس کیے تھے۔ عالمی کپ میں شکست پر آنسو بہانے والا وہ پہلا کھلاڑی نہ تھا اس سے قبل اس خواب کے ٹوٹنے پر بہت سے کھلاڑی اس جذباتی ردعمل سے گزر چکے تھے جن میں ویراٹ کوہلی، مصباح الحق اور شاہد آفریدی جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ لیکن ان کا درد صرف ان کے اپنے عوام محسوس کر پائے تھے۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ کسی کے نیر بیک وقت ہر براعظم کے عوام کو افسردہ کریں۔

بلاشبہ یہ ایک تاریخی لمحہ تھا۔

ڈی ویلیئرز کو یہ عالمی شہرت و محبت راتوں رات حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی داستانِ حیات اس کے خلوص، لگن، جنون اور انتھک محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ابراہام بینجمن ڈی ویلیئرز کی ولادت ۱۷ فروری ۱۹۸۴ء میں پریٹوریا (صوبہ ٹرانسوال) میں ہوئی۔ وہ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے والد ڈاکٹر جبکہ والدہ جائیداد کے شعبہ میں کام کرتی تھیں۔ اس کا بڑا بھائی جان نو سال جبکہ ویسلز چھ سال کا تھا۔

اس کے گھر میں بچوں پر پڑھائی کا بے جا بوجھ لادنے کی روایت نہ تھی۔ اسے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں شمولیت کی اجازت تھی۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ گھر کے گرد واقع گراؤنڈ میں کھیلا کرتا تھا۔ اپنے بچپن کے اس دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ابراہام کا کہنا ہے۔ ”میں بچپن میں اپنے بھائیوں جان اور ویسلز کے ساتھ گراؤنڈ میں کھیلتا تھا جہاں ان کے ہم عمر دوست بھی کھیلنے آیا کرتے تھے۔ وہ وقت میرے لیے بہت سخت ہوتا تھا۔ وہ سب میٹرک کے طالب علم تھے جبکہ میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھے اکثر انہیں پانی پلانے کے فرائض سونپے جاتے تھے۔ سارا دن یہ فرائض سرانجام دینے کے بعد بلا مجھے تھمایا جاتا تھا جو اس وقت میرے لیے بہت وزنی ہوتا تھا۔ بھائیوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے جلد از جلد گیم سے باہر کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ لطف اندوز ہو سکیں۔ میٹرک کے ان سب لڑکوں کے مابین میرے ساتھ ایک دودھ پیتے بچے جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ ہفتے کو بیلا بیلا میں ہمارے گھر ہونے والی گیمز بہت سخت ہوتی تھیں۔ میرے بھائی بہت بے رحم اور سنگدل ثابت ہوتے تھے۔ یہ گیمز اکثر آنسوؤں پر ختم ہوتی تھیں اور وہ آنسو ہمیشہ میرے ہوتے تھے۔“

ابراہام نے بچپن ہی سے بہت سخت مقابلہ دیکھا تھا۔ اپنے بھائیوں اور دیگر لڑکوں میں اپنا آپ منوانے کے لیے

وہ اپنی جان لڑا دیا کرتا تھا۔ اسے ان مقابلوں میں کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی۔ ہر گزرتا دن اس کے لیے سخت سے سخت تر مسابقت لاتا تھا۔ وہ جان توڑ محنت کرتا تھا۔ اکثر اسے شکست کا تلخ مزہ ہی چکھنا پڑتا تھا۔ لیکن یہی تربیت اسے ایک دن ایک ایسے مقام پر لے آئی جہاں وہ ہر طرح کے پریشر اور نامساعد حالات کا کامیابی سے مقابلہ کرتے ہوئے سرخرو ہونے لگا۔

کھیلوں کا شوق اس کے خاندان میں گویا لہو کی طرح دوڑتا تھا۔ اس کے والدین اور بھائی بھی کسی نہ کسی سطح پر کھلاڑی تھے لہٰذا ابراہام کا مستقبل میں کھلاڑی بننے کا جنون ان کے لیے کسی اچنبھے کا باعث نہ تھا۔ ابراہام کا کہنا ہے ”مجھے اپنے بچپن میں کوئی ایک بھی ایسا دن یاد نہیں پڑتا جب میں کھیل سے دور رہا ہوں۔“

قدرت نے ابراہام کو بہت سی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا جس کا اسے بخوبی احساس بھی تھا۔ اسکول میں ایک سائنس پراجیکٹ میں کامیابی پر اسے نیلسن منڈیلا کی جانب سے ایک میڈل دیا گیا تھا۔ وہ ہر قسم کے کھیل یکساں مہارت سے کھیل سکتا تھا۔ ہر وہ چیز جو کھیل میں شمار ہوتی تھی ابراہام اس سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔

کرکٹ اس کا پہلا انتخاب اور پہلی چاہت کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا اوّلین جنون ٹینس تھا۔ اس نے انڈر نائن ٹورنامنٹس کے لاتعداد مقابلوں میں حصہ لیا۔ اور اپنے پہلے ہی مقابلے میں آئزک وین مروی جیسے کھلاڑی کو شکست دی جس نے آگے چل کر ٹینس میں جنوبی افریقا کی قومی سطح پر نمائندگی کی تھی۔ اے بی ۱۳ سال کی عمر تک ٹینس کھیلتا رہا تاہم بعد ازاں دیگر کھیلوں میں رغبت کے باعث اس نے ٹینس سے کنارہ کشی کرلی۔

۱۳ سال کی عمر میں اس نے افریقنز ہائی اسکول میں داخلہ لیا جسے ایفیز بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اسکول کھیلوں کے فروغ میں بہت شہرت رکھتا تھا۔ فاف ڈوپلیسی اور جیک روڈولف بھی اسی اسکول میں زیر تعلیم تھے جنہوں نے بعد ازاں جنوبی افریقی کرکٹ ٹیم کی قومی سطح پر نمائندگی بھی کی۔ اس اسکول میں اسے اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے بھرپور مواقع میسر آئے۔ اساتذہ اور کوچز کی جانب سے لاگو کردہ سخت نظم و ضبط نے بحیثیت کھلاڑی اس کی شخصیت پر بہت دور رس اثرات مرتب کیے۔ اسے سابق جنوبی افریقی ٹیسٹ وکٹ کیپر ڈینس لنڈ سے کی جانب سے بھی بھرپور کوچنگ ملی جس نے اسے وکٹ کیپنگ کے تمام اسرار و رموز سکھا دیے۔ وہ اسکول کی انڈر 14 ٹیم کا اہم حصہ تھا۔ اس کے اسکول میں رگبی کا کھیل سب سے زیادہ مقبول تھا۔ پھر بھلا وہ اس میں طبع آزمائی سے کیسے پیچھے رہتا؟

ایک وقت میں اسے ہاکی کھیلنے کا بھی بہت جنون رہا۔ اپنی قدرتی صلاحیتوں کے باعث وہ اسکول کی انڈر 16 ہاکی ٹیم کا حصہ بھی بنا اور ٹیم کی جیت میں نمایاں کردار ادا کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے ہاکی چھوڑ دی اور اس کا رجحان ایک بار پھر رگبی کی طرف ہوگیا۔ بھرپور محنت اور لگن نے اسے ایفیز کے بہترین ۱۵ لڑکوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس کی شاندار کارکردگی کے باعث اسے انڈر ۱۸ کی سطح پر بلیو بالز (صوبائی رگبی ٹیم) کے لیے منتخب کرلیا گیا۔ بلیو بالز اس وقت جن کھلاڑیوں پر مشتمل تھی انہوں نے مستقبل میں جنوبی افریقا کی قومی رگبی ٹیم کی بھی نمائندگی کی۔

علاوہ ازیں ابراہام نے اسکول میں تیراکی کے کئی مقابلوں میں بھی کامیابی حاصل کی اور انڈر 19 سطح پر بیڈمنٹن بھی کھیلتا رہا۔ بنیادی طور پر اس نے جو بھی کھیل کھیلا اس میں اپنی برتری اور ہنر ثابت کرنے میں کامیاب رہا۔ اپنے بچپن کی یادوں کو دہراتے ہوئے اس کا کہنا ہے۔ ”بچپن میں جب بھائیوں اور میرے پاس کھیلنے کے لیے کچھ نہ ہوتا تھا تو ہم گھر کے پاس واقع پہاڑی پر چڑھنے اور اترنے کی دوڑ لگایا کرتے تھے۔“

انہی ابتدائی سرگرمیوں اور بھرپور محنت نے اسے مستقبل میں ہر قسم کے کھیل میں ارفع ثابت کیا۔

اب وہ عمر کے اس دور میں تھا جہاں اسے کسی ایک کھیل کو مستقل طور پر اپنانا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنے ابتدائی جنون کرکٹ کا انتخاب کیا۔ اس کا کہنا ہے۔ ”میں آٹھ سال کا تھا جب آسٹریلیا میں ہونے والے 1992ء کے عالمی کپ میں میری ٹیم دو عشروں کے بعد کرکٹ کھیلنے گئی تھی۔ پاکستان کے خلاف ایک میچ میں جونٹی رہوڈز نے جس طرح اڑتے ہوئے انضمام الحق کو رن آؤٹ کیا۔ میرے ذہن پر اس نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ مجھے یہ کھیل بہت زبردست لگا اور میں نے جونٹی کے نقشِ قدم پر چلنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ میں نے بہت سے کھیلوں میں حصہ لیا لیکن جب مجھے سولہ سال کی عمر میں جنوبی افریقی کو کرکٹ ٹیم کے لیے منتخب کیا گیا تو مجھے احساس ہوا کہ ہاں کرکٹ ہی وہ کھیل ہے جس میں مجھے بہت کچھ کرنے کے مواقع میسر آسکتے ہیں۔ میں نے مزید محنت

جندرلی

جندرلی، عثمانی ترکوں میں علما اور سیاست دانوں کا ایک خاندان تھا۔ یہ خاندان 750ھ / 1350ء تا 905ھ / 1500ء تک ممتاز اور نمایاں رہا۔ اس خاندان سے پانچ افراد وزیر اعظم بنے۔ پرانے ماخذوں میں اس خاندان کا نام چندرلی اور جندرلی ہے۔ اس خاندان کے مشہور افراد مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ خیرالدین خلیل بن علی: جو کرہ خلیل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کے بعد دیگرے بلیجک، ازنک اور برسہ کا قاضی رہا۔ مراد اوّل نے مسند نشینی کے بعد جلد ہی اسے قاضی عسکر کے عہدے پر مقرر کیا۔ غالباً 783ھ / 1381ء میں اسے وزیر بنا دیا گیا۔ وہ پہلا وزیر تھا جسے ملکی نظم و نسق کی نگرانی کے ساتھ فوج کی قیادت بھی دی گئی تھی۔ وہ مغربی تھریس، مقدونیہ اور تھسلی کی فتوحات میں بھی برابر شریک رہا۔ کرمان کی جنگ کے دوران میں اسے سلطان مراد نے اپنے نمائندے کی حیثیت سے روم ایلی میں تعینات کر دیا۔ جہاں وہ 789ھ / 1387ء میں وفات پا گیا۔ اس کا بیٹا الیاس بیگلر بیگی ہوا جس نے بایزید اوّل کے عہد میں انتقال کیا۔

2۔ علی پاشا: اس نے بھی وزیر اعظم کے طور پر مراد اوّل، بایزید اوّل اور امیر سلطان کی خدمات انجام دیں۔ اس نے 809ھ / 1406ء میں انتقال کیا۔

3۔ ابراہیم پاشا: 808ھ / 1406ء میں برسہ کا قاضی تھا۔ 818ھ / 1415ء میں قاضی عسکر بنا۔ 823ھ /

کرنی شروع کر دی۔ میں اپنے ہم عصر کھلاڑیوں میں خود کو بہترین ثابت کرنا چاہتا تھا۔"

قسمت بھی اپنی نادیدہ ڈوریاں ہلا رہی تھی۔ انڈر ۱۹ ٹیم کی جانب سے کھیلتے ہوئے ٹائٹنز کے کوچ ڈیو نوسورتھی کی نظر کرم ابراہام پر پڑ گئی جس نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپتے ہوئے اسے براہ راست ٹائٹنز کی طرف سے کھیلنے کے لیے مدعو کر لیا۔ اسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع بہت جلد مل گیا۔ ڈیو نے عالمی کپ 2003ء کے ایک وارم اپ میچ میں کینیڈا کے خلاف اپنی ٹیم کی طرف سے کھیلنے کا موقع دیا۔ ابراہام کی سلیکشن پر کافی لے دے بھی ہوئی کیونکہ وہ اس وقت صرف 19 سال کا تھا۔ لیکن اس نے سنچری بنا کر اپنے ناقدین کے منہ بند کر دیے۔ ان لمحات کو یاد کرتے ہوئے اے بی نے ایک بیان میں کہا۔ "وہ پہلا موقع تھا جب میں ایک ایسا میچ کھیل رہا تھا جو ٹی وی پر براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔ فطری طور پر میں تھوڑا گھبراہٹ کا شکار ہو گیا تھا مگر میں نے ہمیشہ دباؤ میں ہی کامیابی حاصل کی ہے۔ میری تمام تر صلاحیتیں دباؤ ہی کے تحت پروان چڑھی ہیں، خاص طور پر جب مجھ پر لوگوں کی توجہ بھی مرکوز ہو۔ زندگی میں اگر خود کو منوانا ہے تو زندگی سے مواقع ہتھیانے پڑتے ہیں اور میں نے اس سنہری موقع کو دونوں ہاتھوں سے چھینا۔"

اس کے بعد ٹائٹنز نے اس کے ساتھ باقاعدہ کانٹریکٹ کر لیا۔ نوسورتھی کے بے حد اصرار پر اس نے یونیورسٹی کرکٹ سے دوری اختیار کر لی۔ کیونکہ نوسورتھی کی خواہش تھی کہ ابراہام اب کرکٹ کو باقاعدہ بطور پیشہ اختیار کرے۔ اپنی پہلی چار صوبائی اننگز میں اس نے مسلسل ففٹی اسکور کیں انڈر 19 ٹیم کے دورہ انگلینڈ میں اے بی ایک اسٹار ثابت ہوا 2004ء میں شمالی آئرلینڈ میں کرکٹ کلب آف آئرلینڈ کے ممبر کے طور پر اس نے بہت شاندار سنچریاں بھی بنائیں۔ اے بی کا کہنا ہے۔ "وہ میری زندگی کا بہت اہم موڑ تھا کیونکہ میں پہلی دفعہ اپنے گھر اور خاندان سے دور رہ رہا تھا۔ اس دوران میں نے زندگی سے خود مختاری اور خود اعتمادی سیکھی۔"

اس کی کارکردگی جلد ہی ہر جگہ سرخیوں کا مرکز بن گئی اور اسے جنوبی افریقا کی A ٹیم میں شمولیت کا بلاوا آ گیا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ جنوبی افریقی قومی کھلاڑیوں کی کارکردگی ان دنوں زوال پذیر تھی اور سلیکٹرز نئے باہنر کھلاڑیوں کی تلاش میں تھے۔ بیس سالہ ابراہام بینجمن ڈی ویلیرز اس وقت موزوں ترین کھلاڑی تھا لہٰذا اسے انگلینڈ کے

1420ء کی ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ وزیر دوم تھا۔ مراد ثانی جب خلیفہ بنا تو بایزید پاشا (وزیر اعظم) تخت کے مدعی مصطفیٰ کے ہاتھوں مارا گیا اور ابراہیم اس کی جگہ وزیر اعظم بنا پھر مرتے دم تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس نے بعارضہ طاعون 24 ذیقعدہ 832ھ / 25 اگست 1429ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنے دور میں ایک محتاط اور دانشمندانہ خارجی حکمتِ عملی اختیار کی۔

4۔ خلیل پاشا: ابراہیم پاشا کا بڑا بیٹا تھا۔ 847ھ / 1443ء تک وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رہا۔ 850ھ / 1446ء میں اس نے مراد کو دوبارہ تخت نشین کروانے میں جو کردار ادا کیا نیز بزنطی شہنشاہ کے ساتھ ساز باز رکھنے کے شبہے میں محمد ثانی نے ناراض ہو کر فتح قسطنطنیہ کے بعد 857ھ / 1453ء میں اسے قتل کروا دیا۔

5۔ ابراہیم پاشا: خلیل پاشا کا بیٹا۔ 833ھ / 1430ء میں پیدا ہوا۔ جب خلیل سلطان کی نظروں میں معتوب ہوا تو اس وقت ابراہیم ادرنہ کا قاضی تھا اور 869ھ / 1465ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ بعد میں قاضی عسکر بنایا گیا۔ 878ھ / 1473ء تک وہ سلطان بایزید کا للہ (وزیر کے منصب کے ساتھ) تھا۔ بایزید ثانی نے اپنی تخت نشینی کے بعد 890ھ / 1485ء میں روم ایلی کا قاضی عسکر بنایا۔ لیکن اگلے سال 891ھ / 1486ء میں اسے اپنا وزیر مقرر کیا۔ 903ھ / 1498ء میں وزیر اعظم بنا لیکن اس کے دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ابراہیم پاشا کے بعد جندرلی خاندان میں پھر کوئی اس منصب پر فائز نہ ہو سکا اور یہ خاندان معرض گمنامی میں پڑ گیا۔

مرسلہ: رامش عطاری، کراچی

خلاف دسمبر 2004ء میں پورٹ الزبتھ میں ٹیسٹ کیپ دی گئی۔ ایک بیان میں اس نے کہا۔ "مجھے ٹیسٹ کرکٹ سے بہت لگاؤ ہے۔ دباؤ اور شدت سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں ڈربن میں بیٹنگ کر رہا تھا مجھے تماشائیوں کی آوازیں بالکل سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ جب آپ صوبائی سطح سے قومی سطح پر پہنچ کر کھیلیں تو فطری طور پر چند اوہام اور شکوک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاہم اگر یہ شکوک و اوہام آپ پر حاوی ہو جائیں تو آپ زوال پذیر ہونے لگیں گے۔ کرکٹ کو اپنا کیریئر بنانا اور پھر قومی سطح پر ملک کی نمائندگی کرنا میرے لیے ایک دیرینہ خواب کی سہانی تعبیر تھی۔ ماضی میں ہم نے کچھ غلطیوں اور غیر مستقل مزاجی کا بہت تاوان ادا کیا ہے۔ لیکن اب ہم نے اپنے لیے کچھ اہداف مقرر کر کے مستقل مزاجی سے کام کرنا سیکھ لیا ہے۔ ہم نے دلیرانہ کرکٹ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

اے بی ڈی ویلیرز اس وقت جنوبی افریقی کرکٹ ٹیم کا اہم ترین حصہ ہے۔ کرکٹ کے ہر فارمیٹ میں اس کی شمولیت ناگزیر ہے۔

ابراہام کے لیے زندگی محض کرکٹ ہی پر توجہ مرکوز رکھنے کا نام نہیں ہے۔ میدان سے باہر اسے اپنے دوستوں اور خاندان کے ساتھ وقت گزارنا بہت پسند ہے۔ وہ گالف، ٹینس اور گٹار سے بھی کافی رغبت رکھتا ہے۔ اے بی اور اس کے دوست ایمکی ڈو پریز کا ایک مشترکہ گانا show them who you are ریلیز ہو چکا ہے۔ جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ 2009ء میں پروٹیز کی آسٹریلیا کے خلاف شاندار فتح پر یہ گانا بطور ترانہ گایا جاتا رہا۔ پرائمری اسکول میں پیانو کے لیے گئے اسباق اور اسکول طائفہ کے ساتھ گائے گئے گانوں نے اسے اس شعبہ میں اجنبیت محسوس نہیں ہونے دی۔ مختلف ممالک کے دوروں میں وہ اپنے ساتھ گٹار ضرور رکھتا ہے۔ ابتدائی گانے کی کامیابی کے بعد وہ اپنے دوست کے ساتھ کئی گانے خود لکھ کر گا چکا ہے۔

اپنے بھائی کے ساتھ فاسٹ فوڈ کے کاروبار میں وہ شراکت دار ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کیٹرنگ کے کاروبار میں بھی قسمت آزمانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یہ کاروبار اس کے کرکٹ کے بعد مستقبل بعید کی حکمتِ عملی میں شامل ہیں۔

2009ء میں ایک انٹرویو میں اس سے سوال کیا گیا "کیا آپ خود کو چالیس سال کی عمر تک کھیلتا دیکھتے ہیں؟"

اے بی نے جواب دیا، "نہیں! بالکل نہیں۔ زندگی میں

کرکٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ میں جب مناسب سمجھوں گا اور اپنا خاندان بناؤں گا تو یقینی طور پر ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دوں گا۔ اس کے لیے میں زندگی کے چالیسویں سال کا انتظار بالکل نہیں کروں گا۔"

اے بی مختلف فلاحی تنظیموں میں شمولیت اور رفاہ عامہ کے کاموں کے متعلق بھی بہت پُرجوش ہے۔ اس کی ایک تنظیم Make A Difference Foundation مستحق بچوں کو ملک کے بہترین اسکولوں میں پڑھائی کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے۔ "میں ایک مخلص عیسائی ہوں۔ مجھے نیک نیتی سے اہداف مقرر کر کے لوگوں کی زندگیوں میں مثبت تبدیلیاں لانے کی طرف پیش قدمی کرنا بہت پسند ہے۔ میں ہر ممکن طریقے سے اس دنیا کو ایک بہترین جگہ بنانے کا متمنی ہوں۔ زندگی کے اس موڑ پر فی الحال یہ محض ایک خواب لگتا ہے۔ میں اپنی ذات کے لیے نہیں جیتا۔ آج کا یہ خواب کل ایک خوشگوار تعبیر بھی بن سکتا ہے۔ جنون کی منازل محنت اور خود اعتمادی سے بآسانی طے کی جاسکتی ہیں۔ کامیابی 99 فیصد خود اعتمادی سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ کو اپنی صلاحیتوں پر مکمل بھروسا ہونا چاہیے۔ اگر آپ کو کسی بھی منزل کی سچی لگن اور جنون ہے تو سخت محنت آپ میں فطری طور پر ودیعت کردہ ہوگی۔"

ابراہام بینجمن ڈی ویلیرز کی شادی ڈینیل سوارٹ کے ساتھ 6 سالہ شناسائی کے بعد ہوئی ہے۔ وہ دونوں بیلا بیلا میں واقع ابراہام کے والد کے فارم ہاؤس پر ملے تھے۔ ڈینیل بھارت میں ہونے والے آئی پی ایل میچز دیکھنے کے لیے اس کے ہمراہ ہوتی تھی۔ ابراہام آئی پی ایل میں رائل چیلینجر بنگلور کی نمائندگی کرتا ہے۔

اے بی ڈی ویلیرز کا کرکٹ کیریئر فقید المثال اور حیران کن کامیابیوں سے بھرپور ہے۔ وہ کسی بھی زاویے پر اپنا جسم موڑ کر مکمل کنٹرول کے ساتھ کوئی بھی شاٹ کھیل سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے کرکٹ حلقوں میں مسٹر 360 کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ابراہام کے چند اہم ترین نمایاں ریکارڈز حسبِ ذیل ہیں۔

☆ 18 جنوری 2015ء کو وانڈررز اسٹیڈیم جوہانسبرگ میں اے بی نے ویسٹ انڈیز کے خلاف 16 گیندوں پر ففٹی اور 31 گیندوں پر سنچری اسکور کر کے ماہرین کرکٹ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

☆ کرکٹ میں ڈیبیو کے بعد اس نے جنوبی افریقا کی طرف سے تمام تر ٹیسٹ میچز (98) کھیلے ہیں۔ اسے کبھی کسی میچ میں ڈراپ نہیں کیا گیا۔

☆ ایک روزہ کرکٹ میں 7000 رنز کا سنگ میل تیز ترین رفتار میں عبور کرنے والا پہلا کھلاڑی۔

☆ وانڈررز اسٹیڈیم جوہانسبرگ میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ایک روزہ میچ میں 16 چھکے لگا کر بھارت کے روہت شرما اور ویسٹ انڈیز کے کرس گیل کا ریکارڈ برابر کیا۔

☆ اے بی ایک ناپسندیدہ ریکارڈ کا حامل بھی ہے۔ عالمی کپ 2007ء میں وہ چار مرتبہ صفر پر آؤٹ ہوا۔ اس کے علاوہ یہ ریکارڈ گریگ چیپل اور کائل میک کلن کے پاس بھی ہے۔

☆ کسی بھی عالمی کپ میں سب سے زیادہ (37) چھکے لگانے کا ریکارڈ کرس گیل کے علاوہ اے بی کے نام ہے۔

☆ وہ جنوبی افریقا کی جانب سے کسی بھی عالمی کپ میں سب سے زیادہ اسکور کرنے والا کھلاڑی ہے۔

☆ اے بی ڈی ویلیرز نے ایک روزہ کرکٹ کی تیز ترین ففٹی، سنچری اور ۱۵۰ رنز اسکور کیے ہیں۔

ایک روزہ کرکٹ میں وہ عالمی نمبر ایک اور ٹیسٹ کرکٹ میں عالمی نمبر ۲ کی پوزیشن پر قابض ہے۔ اس کے مداح پوری دنیا میں موجود ہیں۔ وہ کسی ایک ملک، فرقے یا نسل کا پسندیدہ کھلاڑی نہیں ہے۔ اس کی ہمہ جہت شخصیت، لگن، خلوص نیت اور ایمانداری نے اس کی ذات کو ایک مقناطیسیت عطا کر رکھی ہے جس کی طرف ہر رنگ و نسل کے شائقین کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ جنوبی افریقا کے علاوہ بھی تمام دنیا اسے ایک آئیڈیل کھلاڑی تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی خواہاں ہیں۔ اس کی انتھک محنت اور کھیل کے جنون کو دیکھ کر کوئی بھی یہ پیش گوئی کر سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں وہ اَن گنت نئے ریکارڈز بناتا رہے گا۔ جن تک پہنچنے کے لیے کسی بھی دوسرے کھلاڑی کو ایک طویل عمر یا پھر کوئی معجزہ ہی درکار ہو سکے گا۔ کسی بھی انسان کو زندگی میں نمایاں مقام حاصل کرنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اور عام طور پر کسی بھی کھلاڑی کی صلاحیتوں کو اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہی زیادہ مدح سرائی ملتی ہے۔ لیکن اے بی ڈی ویلیرز ایک زندہ لیجنڈ ہے۔ جس کی لگن نے اسے کیریئر کے دوران ہی ایک مثالی مقام عطا کر دیا ہے۔ اس کی عاجزی اور بے لوث فطرت اسے کسی بھی زوال سے بچائے ہوئے ہے۔ بلاشبہ وہ ایک ہرفن مولا شخص ہے۔

ملکۂ موسیقی

انور فرہاد

فلم نگری عروج و زوال کی لاتعداد کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ پاکستانی فلم نگری کو دانستہ تباہ کیا گیا یہی وجہ ہے کہ یہاں زوال ہی کی کہانیاں زیادہ ہیں مگر ایک ایسی بھی گلوکارہ ہے جو تقریباً آدھی صدی قبل سامنے آئی اور اب بھی جب سامنے آتی ہے تو مقبولیت کی حد پار کرتی نظر آتی ہے۔ یقیناً آپ بھی اس کے گیت سن کر محظوظ ہوتے ہوں گے۔ اس نے بحیثیت گلوکارہ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا پھر اس نے مقبول اداکارہ کا تاج اپنے سر پر رکھا ایامِ عروج میں ہی پیادیس سدھار گئی اور ایک اچھی بیوی کی طرح گھر گرہستی میں مشغول ہو گئی۔ سب نے یہی سمجھا کہ شائقین اسے بھلا چکے ہیں لیکن جب وہ دو تین دہائی کے بعد پھر سے سامنے آئی تو لوگ اسی طرح سر دھنے لگے، جیسے روزِ اوّل مقبول تھی وہی مقبولیت برقرار رہی۔ ایسے فنکار کمیاب کہلاتے ہیں۔

پاک فلم نگری کی ایک مقبول گلوکارہ کا مختصر سا احوال

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ایک سر سے پیر تک برقعے میں ڈھکی لڑکی گانے کے لیے اپنی آواز کا آڈیشن دینے اپنی ایک دوست کے ساتھ پہنچی۔ یادر ہے یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ہاں ریڈیو کے علاوہ انٹرٹینمنٹ کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ سیاسی خبریں ہوں، ڈرامے یا گانے ہوں، انہیں عوام تک پہنچانے کا ذریعہ صرف اور صرف ریڈیو تھا۔

یہ برقع پوش لڑکی جب ریڈیو اسٹیشن پہنچی اور اس نے اپنے وجود کو برقع سے باہر نکالا تو دیکھنے والی نگاہوں نے

دیکھا وہ ایک دیدہ زیب اور نوخیز تھی۔
ریڈیو پر اپنی آواز کا آڈیشن دینے اکثر شوقین لوگ آتے تھے جن کا تعلق ہر عمر سے ہوتا تھا۔ کوئی ڈراموں میں کوئی گانوں میں اور کوئی دیگر پروگراموں میں صداکاری کے لیے آڈیشن دیتا تھا۔
اس لڑکی سے پوچھا گیا۔ ''تم کس شعبے کے لیے آڈیشن دو گی؟''
''گلوکاری کے لیے۔''
لہٰذا اس کا آڈیشن لاہور ریڈیو کے پروگرام عبدالحق قریشی اور گلوکارہ امت الرشید نے لیا۔ امت الرشید نابینا ہونے کے باوجود ریڈیو کی بہت اچھی اور منجھی ہوئی گلوکارہ اور ریڈیو کی پیڈ ملازمہ تھیں۔
آڈیشن کے بعد عبدالحق قریشی نے کہا۔ ''اپنے آڈیشن کا نتیجہ اگلے ہفتہ آکر معلوم کر لینا۔''
لڑکی اپنی سہیلی کے ساتھ واپس چلی گئی تو امت الرشید نے کہا۔ ''قریشی صاحب! اچھی بات تو یہ ہے کہ اسے ابھی اسی وقت بتا دینا چاہیے تھا کہ تم پاس ہو گئی ہو۔ کامیاب ہو گئی ہو۔ اتنی نکھری ہوئی آواز بہت کم گانے والیوں کی ہوتی ہے۔''
''آپ غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔'' قریشی صاحب نے جواب دیا۔ ''مگر آپ جانتی ہیں کہ ہمارا اصول یہ ہے کہ حتمی فیصلہ سلیکشن بورڈ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بورڈ کے اراکین کو بھی اس آواز نے ضرور متاثر کیا ہوگا۔''
اور ایسا ہی ہوا۔ اس کھیپ میں جتنے گانے والوں نے آڈیشن دیا تھا۔ ان میں سب سے زیادہ نمبر اس نوخیز برقع پوش گلوکارہ نے حاصل کیے تھے۔ ایک ہفتے کے بعد جب وہ اپنے آڈیشن کا نتیجہ معلوم کرنے گئی تو اسے یہ خوش خبری سنائی گئی۔
''اب ہم تمہیں وقتاً فوقتاً گانے کے لیے بلایا کریں گے۔''
لڑکی کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ یہ خوشگوار واقعہ 1953ء میں پیش آیا تھا۔ یعنی آج سے کوئی 62 برس پہلے۔ اس زمانے میں ریکارڈنگ کا رواج رائج نہیں تھا کیونکہ یہ ٹیکنالوجی ابھی ہمارے ہاں نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے سیاسی حالات و واقعات اور ڈراموں کی طرح گانے بھی براہِ راست نشر کیے جاتے تھے۔ یہ نوخیز کھنکتی ہوئی آواز بھی ہواؤں کے دوش پر دور دور تک پہنچنے لگی۔ ہر سننے والا اس آواز سے متاثر ہوتا مگر کسی کو معلوم نہیں تھا کہ آج کی یہ اجنبی آواز آنے والے دنوں میں ایک منفرد آواز کہلائے گی اور وہ ایک معروف شخصیت کا روپ دھارنے والی ہے۔

اور اس کے گانے ریڈیو کے ذریعے گلی گلی تک پہنچے تو اس کی آواز کے سحر میں گرفتار ہونے والوں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ لاہور کے علاقے گڑھی شاہو میں رہتی ہے۔ اس کے باپ کا نام خواجہ نذیر احمد ہے جو ایک کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور 1936ء میں لاہور آکر یہیں کا ہو رہا ہے۔ لاہور میونسپل کارپوریشن میں بحیثیت رجسٹرڈ کنٹریکٹر کے کام کرتا ہے۔ یہ لڑکی 16 جون 1936ء کو گڑھی شاہو لاہور میں ہی پیدا ہوئی جب خواجہ نذیر احمد کو لاہور پہنچے ہوئے کئی مہینے ہی ہوئے تھے۔ اللہ رب العزت نے اس لڑکی کو جیسی من موہنی شکل دی تھی اسی طرح خوب صورت آواز سے بھی اسے نوازا تھا۔ اسے گانے کا شوق بچپن ہی سے تھا جو اس کی عمر کے ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ جس محلے میں وہ رہتی تھی وہاں ایک کرسچین فیملی بھی آباد تھی۔ ان کی ایک لڑکی زورس کو بھی موسیقی کا بڑا شوق تھا۔ جب اس لڑکی کو معلوم ہوا کہ کرسچین لڑکی زورس بھی گانے کی شوقین ہے تو اسے اپنی سہیلی بنا لیا اور اس کے ساتھ مل کر گلوکاری کا شوق پورا کرنے لگی۔
اس کے والد زیادہ خوش حال نہیں تھے مگر اپنی اولادوں کو اچھی تعلیم دلوانے کے خواہش مند تھے۔ اپنی اس بیٹی کی پیدائش پر وہ اس قدر مسرت سے سرشار ہوئے کہ اس کا نام ہی مسرت رکھ دیا۔ اسے وہ ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسرت ڈاکٹر بن کر دکھی انسانوں کی خدمت کرے۔ ان کی یہ بیٹی جتنی حسین تھی اتنی ہی ذہین تھی۔ اسکول میں داخل ہوئی تو ہر جماعت میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوتی گئی میٹرک کا امتحان بھی اسی شان سے پاس کیا۔ اس کے بعد کوئنز میری کالج میں اسے داخل کرایا گیا یہاں بھی اس نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بہترین نمبروں سے پاس کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی گلوکاری کا شوق بھی جاری رہا اور یہی شوق اسے ایک دن ریڈیو اسٹیشن لے گیا۔ اس کے والدین کو اس بات کا علم تھا کہ ان کی بیٹی کو گانے کا شوق ہے اور وہ اسے برا نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے جب وہ ریڈیو میں آڈیشن دینے گئی تھی تو اس نے ان سے اس کی اجازت لی تھی اور آڈیشن میں کامیاب ہونے کی خوش خبری سنانے کے بعد ریڈیو سنگر کے طور پر گانے کی بھی باضابطہ اجازت لی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام طور پر آج کی طرح نوجوان نسل مادر پدر آزاد نہیں تھی۔ اپنے ماں باپ اور بڑوں کی فرمانبردار ہوا کرتی تھی۔

ریڈیو کے سامعین اس نئی سنگر کی آواز کے سحر میں جیسے جیسے مبتلا ہوتے گئے ویسے ویسے اس کی شہرت اس کی آواز کی طرح دور دور تک دل و دماغ کو مسخر کرتی گئی۔ جب ریڈیو سے یہ اعلان ہوتا کہ فلاں دن، فلاں وقت پر مسرت نغمہ سرا ہوں گی تو اس کی آواز کے شیدائی مقررہ وقت پر ریڈیو آن کر کے بیٹھ جاتے۔

اس کی آواز سے متاثر ہونے والوں میں فلم والے بھی تھے۔ آج کی طرح اس دور میں بھی فلم میکرز اس بات کے قائل تھے کہ

دیکھتا ہوں جو حسیں پھول وہ چن لیتا ہوں

ریڈیو سنگر مسرت کی عوامی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہدایت کار لقمان نے چاہا کہ اسے اپنی فلم ''محبوبہ'' کے لیے گوائے۔ اس مقصد کے لیے اسے بلایا گیا۔

''ہم تمہیں اپنی فلم کے لیے پلے بیک سنگر کے طور پر گوانا چاہتے ہیں۔''

''ہم حاضر ہیں۔''

''مگر اس کے لیے تمہیں پہلے آڈیشن دینا پڑے گا۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟ میری آواز پسند ہے اسی لیے آپ نے مجھے بلایا ہے۔''

''تمہاری آواز کی پسندیدگی اپنی جگہ مگر ریڈیو اور فلم کا فارمیٹ چونکہ مختلف ہے اس لیے ہم اپنی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھ کر تمہارا آڈیشن لیں گے۔''

''اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ آڈیشن لے لیجیے۔''

مسرت کو یقین تھا کہ ریڈیو کی طرح فلم کے اس آڈیشن میں بھی اس کی آواز فلمساز و ہدایت کار کے معیار پر پوری اترے گی۔

مگر اس کی یہ سوچ غلط ثابت ہوئی۔ لقمان نے اس سے معذرت کر لی۔ ''مجھے افسوس ہے کہ فلموں کی پلے بیک سنگر کے معیار پر آپ متاثر نہیں کر سکیں۔''

مسرت نذیر کو پہلی بار اس بات پر دکھ ہوا کہ میری اتنی خوب صورت آواز کے باوجود فلموں کے لیے مجھے ریجیکٹ کر دیا گیا ہے مگر چونکہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھی اس لیے اس ناکامی کی وجہ تلاش کرنے لگی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید لقمان صاحب نے درست کہا تھا کہ فلم کا فارمیٹ ریڈیو سے مختلف ہے۔ اس سے ناواقف ہونے کی وجہ سے ہی میں فلمی گلوکارہ کے طور پر مسترد کر دی گئی۔

اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ اس لیے اس نے کمر کس لی اور فلمی فارمیٹ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ پھر وہ وقت بھی آ گیا جب موسیقار اختر حسین اکھیاں نے پلے بیک سنگر کے طور پر اسے منتخب کر لیا اور ہدایت کار ایم حاذق کی فلم ''اسٹریٹ 77'' میں پسِ پردہ گلوکارہ کے طور پر اس کا گایا ہوا گیت ریکارڈ کیا جس کے بول تھے۔

یوں چپکے چپکے آنکھوں میں تصویر تری لہرائی ہے

مسرت نذیر کی فلموں کی فہرست

نمبر شمار	فلم	زبان	سال	ہدایت کار
1	قاتل	اردو	1955	انور کمال پاشا
2	پتن	پنجابی	1955	لقمان
3	پاٹے خان	پنجابی	1955	ایم اے رشید
4	قسمت	اردو	1956	نذیر اجمیری
5	ماہی منڈا	پنجابی	1956	ایم جے رانا
6	پینگاں	پنجابی	1956	امین ملک
7	مرزا صاحبان	اردو	1956	داؤد چاند
8	باغی	اردو	1956	اشفاق ملک
9	گڈی گڈا	اردو	1957	ولی صاحب
10	سیستان	اردو	1957	این ایم خواجہ
11	یکے والی	پنجابی	1957	ایم جے رانا
12	پاٹکاں	پنجابی	1957	امین ملک
13	ٹھنڈی سڑک	اردو	1957	اے حمید
14	آنکھ کا نشہ	اردو	1957	سبطین فضلی
15	سہتی	پنجابی	1957	ایم جے رانا
16	باپ کا گناہ	اردو	1957	انور کمال پاشا
17	نیا زمانہ	اردو	1958	نصرت منصوری
18	جانِ بہار	اردو	1958	شوکت حسین رضوی
19	زہرِ عشق	اردو	1958	مسعود پرویز
20	جٹی	پنجابی	1958	ایم جے رانا
21	رخسانہ	اردو	1958	فضل دین
22	سوسائٹی	اردو	1959	ایم اے خان جونیئر
23	سہارا	اردو	1959	نسیم چنگیزی

24	یار بیلی	پنجابی	1959	خلیل قیصر
25	سولہ آنے	اردو	1959	آغا حسینی
26	کرتار سنگھ	پنجابی	1959	سیف الدین سیف
27	راز	اردو	1959	ہمایوں مرزا
28	گلن مٹی	پنجابی	1959	ولی صاحب
29	جائیداد	پنجابی	1959	ریاض احمد راجو
30	جھومر	اردو	1959	مسعود پرویز
31	کلرک	اردو	1959	خلیل قیصر
32	اسٹریٹ 77	اردو	1960	ایم حاذق
33	وطن	اردو	1960	انور کمال پاشا
34	نوکری	اردو	1960	ایم کے پاشا
35	گلبدن	اردو	1960	اے حمید
36	دلِ ناداں	اردو	1960	نجم نقوی
37	خان بہادر	اردو	1960	ایم جے رانا
38	ڈاکو کی لڑکی	اردو	1960	ہمایوں مرزا
39	سنہرے سپنے	اردو	1961	امین ملک
40	چھوٹے سرکار	اردو	1961	ریاض احمد راجو
41	منگول	اردو	1961	اے کے مسرت
42	مغت بر	پنجابی	1961	اسلم ایرانی
43	گلفام	اردو	1961	ایس سلیمان
44	شہید	اردو	1962	خلیل قیصر
45	اک منزل دو راہیں	اردو	1962	نجم نقوی
46	عشق پر زور نہیں	اردو	1963	شریف نیر
47	بہادر	اردو	1967	منور رشید

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ گیت اس جاسوسی فلم میں مسرت پر ہی فلمایا گیا تھا۔ اب وہ پورے نام مسرت نذیر سے پہچانی جارہی تھی۔ ''محبوبہ'' کے آڈیشن سے لے کر اس وقت تک بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ قدرت کے کھیل بھی بڑے نیارے ہوتے ہیں۔ وہی لقمان جنہوں نے پلے بیک سنگر کے طور پر مسرت نذیر کو فیل کردیا تھا اپنی اگلی فلم ''پتن'' کے لیے اسے ہیروئن کے طور پر کاسٹ کرلیا۔ ہے نا قدرت کا کرشمہ؟ آڈیشن کے دوران لقمان کی دوربین نگاہوں نے اس من موہنی صورت کی گلوکارہ کو ایک کامیاب اداکارہ کے طور پر دیکھ لیا تھا۔

حالات کیسے بدلتے ہیں اور واقعات کیسے رونما ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایئے۔ لقمان نے ''پتن'' کے لیے اس وقت کی ٹاپ ہیروئن صبیحہ خانم کو کاسٹ کیا تھا اور معاہدہ کے تحت 15 ہزار روپے انہیں ادا کیا جانا تھا۔ جو اس دور کے حساب سے ایک بڑی رقم تھی۔ فلمبندی کے دوران ہدایت کار لقمان اور صبیحہ کے والد محمد علی ماہیا کے درمیان کسی بات پر اَن بن ہوگئی اور بات اتنی بڑھی کہ ہدایت کار نے فلم کی ہیروئن صبیحہ کو فلم سے کٹ کردیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد انہیں نئی ہیروئن کو منتخب کرنا تھا۔ اس موقع پر انہیں مسرت نذیر کی یاد آئی۔ جسے انہوں نے بطور پلے بیک سنگر مسترد کردیا تھا۔ اس لڑکی کی شکل صورت، رنگ دروپ، اس کا پیکر کسی ہیروئن سے کم نہیں۔ اسے کیوں نہ اداکارہ کے طور پر آزماؤں؟ لقمان صاحب نے سوچا اور اپنے پروڈکشن کنٹرولر کو بلا کر اس سے کہا۔

وہ ریڈیو سنگر جو ہماری فلم ''محبوبہ'' میں پلے بیک سنگنگ کے لیے آئی تھی۔

''اور ناکام ہوکر مایوس لوٹ گئی تھی۔'' پروڈکشن کنٹرولر نے لقمان صاحب کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں وہی۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''مسرت نذیر۔''

''یار! اس لڑکی کو بلاؤ۔''

''کیا اس کا دوبارہ آڈیشن لیجیے گا؟''

''نہیں......تم اسے بلا کر تو لاؤ۔''

اگلے روز خوبرو گلوکارہ مسرت نذیر ہدایت کار لقمان کے روبرو بیٹھی تھی۔ لقمان نے اسے شوخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم وہی ہونا جو ایک بار میری ایک فلم کے لیے پلے بیک کا آڈیشن دینے آئی تھیں؟''

''جی ہاں وہی ہوں۔ کیا ایک بار پھر آڈیشن لینے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں، میں تمہیں اپنی فلم کی ہیروئن بنانا چاہتا ہوں۔''

''اس کے لیے بھی مجھے ٹیسٹ دینا پڑے گا اور آپ مجھے ریجیکٹ کردیں گے۔''

''ارے نہیں، اس بار ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم یہ بتاؤ تم

نے کبھی اداکاری کی ہے؟''

''جی ہاں، اسکول کے زمانے میں ایک ڈرامے میں انارکلی کا کردار ادا کیا تھا۔''

''گڈ!''

''اور آج کل......'' اتنا کہہ کر رک گئی۔ جیسے سوچ میں پڑ گئی ہو کہ آگے کچھ بولے یا نہ بولے۔

''ہاں ہاں بتاؤ...... کس ڈرامے کے لیے اداکاری کر رہی ہو؟''

''ڈرامے کے لیے نہیں۔'' اس کو اب بتانا ہی پڑا۔

''فلم کی اداکاری کر رہی ہوں۔''

''فلم کی! یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کون سی فلم میں اداکاری کر رہی ہو؟''

''وہ کمال صاحب...... میرا مطلب ہے محترم انور کمال پاشا صاحب کی فلم ''قاتل'' میں ایک ثانوی کردار ادا کر رہی ہوں۔''

''چلو...... تم نے تو میری ساری پریشانی ہی دور کردی۔ پاشا صاحب کی فلم میں کام کرنے کا مطلب ہے فلموں کی اداکاری کی تمہیں شد بد مجھ میں آگئی ہوگی۔ فلموں کی اداکاری اسٹیج کی اداکاری سے مختلف ہوتی ہے۔'' لقمان صاحب ذرا رک کے پھر مسکراتے ہوئے بولے۔ ''اب تمہیں کسی اسکرین ٹیسٹ کی ضرورت نہیں اور ہاں ہماری فلم میں تم ہیروئن کا کردار ادا کروگی۔ میں ایگریمنٹ تیار کرتا ہوں۔''

''نہیں...... ابھی نہیں......'' مسرت نذیر نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

''کیوں...... ابھی کیوں نہیں......؟''

''میں اپنے اباجی کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔''

انور کمال پاشا صاحب کو بھی اباجی کو رضامند کرنا پڑا تھا۔''

''چلو اپنے اباجی سے پوچھ لو۔ اگر وہ راضی نہ ہوئے تو میں انہیں منانے کی کوشش کروں گا۔''

مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ خواجہ نذیر احمد نے خوشی سے اجازت دے دی اور بیٹی کے ساتھ لقمان صاحب سے آکر ملے۔ ان کی موجودگی میں ایگریمنٹ تیار ہوا اور معاہدے کے تحت اس کا معاوضہ 15 سو مقرر ہوا جب کہ اسی کردار کے لیے صبیحہ بیگم کو 15 ہزار دیا گیا تھا مگر معاملہ سینئر اور جونیئر کا تھا۔ اس لیے یہ معاوضہ بخوشی قبول کرلیا گیا۔

انور کمال پاشا کی اردو فلم ''قاتل'' اور لقمان کی پنجابی فلم ''پتن'' یکے بعد دیگرے 1955ء میں ریلیز ہوئیں اور

میرا لونگ گواچا

اللہ کے نیک بندوں کا کہنا ہے کہ ہر کام میں اللہ کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ مسرت نذیر لندن اور کینیڈا دونوں جگہ خوش تھی۔ گھریلو ذمہ داریوں کے ساتھ گانے کا شوق بھی پورا کرتی تھی۔ اس کا میکہ اور سسرال دونوں ہی لاہور میں تھے اور میکے اور سسرالیوں کی یاد انہیں بہت ستاتی تھی۔ اکثر وہ ڈاکٹر صاحب سے کہتی چلو لاہور کا ایک چکر لگا آئیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے۔ ''ارے بھئی! یہ کوئی گوالمنڈی سے گلبرگ تک کا سفر نہیں کہ اٹھے اور ایک چکر لگا لیا۔ جانے آنے میں خاصے دن لگ جائیں گے جب کہ میرے لیے یہاں ایک دن کی مہلت ملنی بھی دشوار ہے۔ آخر ایک دن مسرت بول پڑی۔ ''تو پھر آپ یہاں رہیے مجھے ہی بھجوا دیجیے۔'' ڈاکٹر صاحب کے لیے یہ بات بھی قابلِ قبول نہیں تھی کیونکہ وہ تو اس کو دیکھ کر جیتے تھے مگر بالآخر ایک دن انہیں دل پر صبر کی سِل رکھنا پڑی کہ وہ اپنی ملکۂ حیات کو تڑپتا ہوا بھی تو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ بیس سال کے طویل عرصے کے بعد جب وہ وطن واپس آئی تو جہاں اس کے عزیز و اقارب کے گھروں میں خوشیوں کے شادیانے بج اٹھے وہیں سرسنگیت کے شیدائیوں نے بھی اس کی موجودگی کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اس دوران کچھ ایسے گیتوں اور نغموں کا اضافہ ہوا جنہوں نے گائیگی کی دنیا میں ایک نئی تاریخ رقم کی۔ جن میں سب سے نمایاں گیت ''لونگ گواچا'' ہے جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ گیت مسرت نذیر کی پہچان اور شناخت بن گیا۔ یہ گیت عیدالفطر کے موقع پر اس نے پی ٹی وی پر گایا۔ اس گیت کی خالق خود مسرت نذیر ہے۔ اسے لکھا بھی اس نے اور اس کی دھن بھی اس نے بنائی۔ بعد میں یہ گیت فلم ''دلاری'' میں شامل کیا گیا اور اداکارہ انجمن پر فلمایا گیا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ فلم ''اللہ رکھا'' میں بھی انجمن پر ہی اس گانے کی فلمبندی ہوئی۔ اس کی دھوم ہندوستان تک پہنچی اور وہاں کی فلموں اور ڈراموں میں بھی اسے شامل کیا گیا۔

دونوں نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ جس کے بعد کامیاب ریڈیو سنگر مسرت نذیر کو کامیاب فلمی اداکارہ تسلیم کرلیا گیا۔ اس کی مدھر آواز کی طرح اس کی جاندار اداکاری نے بھی اس کی ترقی اور شہرت کے ساتوں در کھول دیئے۔ اسے اداکاری کے ساتھ ساتھ گلوکاری کا بھی موقع ملنے لگا۔ ہدایت کار ایم حاذق کی جاسوسی فلم ''اسٹریٹ 77'' سے بطور گلوکارہ فلموں کے لیے گانے بھی لگی اور اداکاری بھی کرنے لگی۔ یہ فلم 1960ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

پھر یکے والی آئی تو اس کی شہرت آسمان پر پہنچ گئی۔

ایک زمانہ تھا جب لاہور میں یکے یا تانگے عوامی سواری کے طور پر چلتے تھے۔ اسی تانگے یا یکے کو مرکزی خیال بنا کر فلم کی کہانی کے تانے بانے بنے گئے تھے اور کہانی کو ایک نیا رنگ دینے کے لیے تھرڈ تانگہ بان کی جگہ ایک لڑکی کو استعمال کیا گیا تھا۔ اس لیے عام یکوں سے ہٹ کر اس کا یکہ تھا اور وہ یکے والی کے نام سے پکاری جاتی تھی۔ تانگہ اسٹینڈ میں وہ دوسروں سے مختلف اور منفرد نظر آتی تھی۔ تانگہ بانوں کی طرح وہ آوازیں لگا کر سواریوں کو بلاتی تھی۔ اس سچویشن کے لیے اس پر ایک گانا بھی فلمایا گیا تھا۔

کلی سواری بھٹی بھاٹی لوہاری

اس فلم کی کامیابی کے بعد یہ گیت اتنا مقبول ہوا کہ جب تک لاہور میں تانگوں کا دور رہا یہ عوامی گیت ہزاروں تانگے والوں کا کاروباری سلوگن رہا۔

مسرت نذیر نے یکے والی کا یہ ٹائٹل کردار اتنی فنی مہارت کے ساتھ ادا کیا تھا کہ ناظرین اور ناقدین نے اسے سپر کلاس اداکارہ قرار دیا۔ جہاں فلم کی کہانی عام روش سے ذرا ہٹ کر تھی۔ مسرت نذیر کی ایکٹنگ بھی اتنی ہی اعلیٰ معیار کی تھی کہ اس نے اس فلم کو کامیابیوں کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ یہ فلم 22 جنوری 1957ء کو ریلیز ہوئی اور اس نے متعدد سنیماؤں میں مسلسل 36 ہفتے چل کر ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ اس دور میں جب سنیما ٹکٹ آٹھ دس آنوں سے لے کر ایک ڈیڑھ روپے تک ملتے تھے۔ اس فلم ''یکے والی'' نے چالیس لاکھ کا بزنس کیا۔ جو آج کے حساب سے چالیس پچاس کروڑ سے کم نہیں تھا۔ اس فلم سے کمائے ہوئے سرمائے سے اس کے فلم ساز باری ملک نے لاہور میں سب سے بڑا فلمی نگار خانہ باری اسٹوڈیو تعمیر کیا جس میں جدید طرز کے کئی فلورز کے علاوہ پورا ایک گاؤں بنایا گیا تھا۔ جہاں پنجاب کے دیہاتوں اور گاؤں کی لوکیشن میں عکس بندی ہونے لگی اور فلم والوں کو آؤٹ ڈور کے لیے باہر جانے کی ضرورت نہیں رہی۔

یکے والی کے عوامی ٹائٹل نے مسرت نذیر کو پاکستان کی پہلی اور اب تک کی آخری عوامی اداکارہ تسلیم کروایا۔ یوں تو اس فلم میں اس کے تمام کلیدی کرداروں کو انہیں ادا کرنے والوں نے بڑی عمدگی سے نبھایا تھا مگر مسرت نذیر نے اپنا ٹائٹل رول اس خوبی کے ساتھ ادا کیا تھا جیسے وہ پیدائشی یکے والی ہو۔ سدھیر اس فلم میں اس کے ہیرو تھے۔ اجمل نے اس کے اندھے باپ کا کردار ادا کیا تھا جو رات کو ڈاکو بن کر لوگوں کو لوٹتا تھا۔ آج کے معروف ہدایت کار اقبال کاشمیری نے نکو کے نام سے یکے والی (مسرت نذیر) کے چھوٹے بھائی کا کردار ادا کیا تھا۔ الیاس کاشمیری، نذر، زینت، ظریف اور غلام محمد کی کردار نگاری بھی قابلِ ستائش تھی۔ اس فلم کی موسیقی بابا جی اے چشتی نے دی تھی جس نے فلم کی کامیابی اور مقبولیت میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہدایت کار ایم جے رانا کی مضبوط اور بھرپور ہدایت کاری نے ''یکے والی'' کو کامیاب ترین فلم بنا دیا تھا۔ کہانی فلم کی بنیاد ہوتی ہے اگر یہ بنیاد مضبوط اور مستحکم ہو تو اس پر بننے والی فلم یقینی طور پر کامیاب ہوتی ہے۔

اس فلم کی کہانی کا مرکزی خیال سعادت حسن منٹو کے افسانے ''لائسنس'' سے لیا گیا تھا۔ پہلے اس افسانے کو بنیاد بنا کر بھارتی ہدایت کار رام شرما نے فلم ''تانگے والی'' بنائی بعد میں مصنف و اداکار شیخ اقبال نے بھارتی فلم میں کچھ تبدیلیاں کر کے یکے والی لکھی۔ ایسی اچھی اور مضبوط کہانی کہ ایک اچھے ہدایت کار نے تمام فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اچھی ڈائریکشن اور بے حد مسحور کن موسیقی سے سجا کر پیش کیا۔ اس پر سونے پر سہاگا، اس کے آرٹسٹوں کی اعلیٰ معیار کی اداکاری نے اسے اپنے وقت کی بلاک بسٹر فلم بنا دیا۔ مسرت نذیر جس نے فلم کا مرکزی کردار کیا تھا اس نے اپنی بے ساختہ اور فطری اداکاری سے اس فلم کی سپر کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ ''یکے والی'' ایک نغماتی، معاشرتی اور رومانوی فلم تھی۔ یہ مسرت نذیر کی ایک ایسی فلم تھی جس کے تذکرے کے بغیر مسرت نذیر کا فنی کیریئر نامکمل سمجھا جاتا ہے۔

کیا ''یکے والی'' مسرت نذیر کی واحد کامیاب فلم تھی؟ نہیں وہ ایک باصلاحیت اداکارہ تھی۔ اس لیے اس کی فنی صلاحیتوں کے ثبوت کے طور پر اس کی دیگر فلمیں بھی

موجود ہیں جنہوں نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی اور اسے وراسٹائل اداکارہ کے طور پر فلم انڈسٹری میں ممتاز مقام متعین کیا۔ پتن، پاٹے خان، ماہی منڈا، پینگاں، مرزا صاحباں، قسمت، باغی، آنکھ کا نشہ، زہر عشق، جٹی، سوسائٹی، کرتار سنگھ، جھومر، شہید اور عشق پر زور نہیں۔ اردو اور پنجابی کی وہ فلمیں رہیں جن میں ہر طرح کے کردار کو اس نے یادگار بنا دیا۔ اس نے ثابت کر دیا کہ وہ سنہری آواز کی ملکہ ہی نہیں پرفارمنگ کوئن بھی ہے۔

مسرت نذیر نے پتن، یار بیلی اور ماہی منڈا وغیرہ میں جہاں پنجاب کی روایتی مٹیار کا کردار کامیابی کے ساتھ ادا کیا وہاں اس نے پینگاں اور پاٹے خان میں ماڈرن شہری لڑکی کے روپ میں بھی بھرپور اداکاری کی۔ اداکاری کے میدان میں وہ ایسی شہ سوار تھی جس نے ہر میدان میں اپنی فنی صلاحیتوں کا کھل کر مظاہرہ کیا اور ناقدین فن سے پذیرائی کی سند حاصل کی جہاں اس نے الہڑ دوشیزاؤں کا کردار کیا وہاں اس نے ماں کا بھی کردار ادا کرنے میں نہ جھجک محسوس کی نہ ہی ناکام رہی۔ لالہ سدھیر کی ہوم پروڈکشن میں بننے والی فلم ''آنکھ کا نشہ'' میں مسرت نذیر نے صبیحہ خانم کی ماں کا کردار ادا کیا۔ صبیحہ خانم اس کی ہم عصر اور حریف اداکارہ تھیں۔ کوئی دوسری اداکارہ ہوتی تو صاف انکار کر دیتی کہ اس طرح تو میری ساکھ پر منفی اثر پڑے گا مگر مسرت نذیر نے ایک حوصلہ مند اداکارہ کے طور پر اس چیلنجنگ کردار کو قبول کر کے اور ہر طرح سے کامیاب ہو کر اداکاری میں جو مقام حاصل کیا اس سے قبل وہ مقام کسی دوسری اداکارہ کو نصیب نہ ہو۔ اسی طرح فلم ''وطن'' میں اس نے کمال اور اعجاز کی ماں کا رول بھی کیا تھا۔

ایک فلم میں زیبا بیگم کو قدرے اولڈ ایج دکھانا تھا۔ ہدایت کار نے ان سے کہا۔ ''آپ کے بالوں کی ایک دو لٹوں کو میک اپ کے ذریعے سفید کرنا ہوگا۔'' زیبا بیگم ایک دم ناراض ہوگئیں۔

''نہیں...... یہ کیسے ہو سکتا...... میں اس طرح اپنے امیج کو سبوتاژ کرنے نہیں دوں گی۔ آپ میرے بال سفید کیے بغیر شاٹ لیں۔ ورنہ میں گھر جاتی ہوں۔''

دیکھا آپ نے اداکارائیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔

اس تناظر میں مسرت نذیر کے کردار کا جائزہ لیجیے اور داد دیجیے کہ وہ کیسی باہمت اور پُراعتماد اداکارہ تھی کہ وہ اپنی ہم عصر اداکارہ کی ماں کا رول ادا کرنے میں بھی کسی فکر اور تردد کا

جھومر کی لیلیٰ

خواجہ خورشید انور کو عام لوگ ایک لیجنڈ موسیقار کی حیثیت سے جانتے ہیں جب کہ وہ فلم کے بہت سے شعبوں پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ جھومر ان کی ذاتی فلم تھی جس کی کہانی انہوں نے خود لکھی تھی۔ انہیں پلاٹ اور موضوع کے انتخاب، کردار نگاری اور منظر نامے پر اس قدر قدرت حاصل تھی جو بہت ہی کم کہانی نویسوں کو میسر آئی ہے۔ جھومر کی کہانی کا پس منظر پہاڑی ماحول میں رہنے والے انسان کی ہے۔ بہن اور بھائی کی محبت اور لیلیٰ کے کردار میں پاکستانی عورت کے جذبۂ ایثار کا خاصی اہمیت کے ساتھ ایک پُر تاثیر انداز میں نمایاں کیا گیا۔

جھومر میں ادا کیے گئے کردار کے بارے میں مسرت نذیر نے جو کچھ کہا وہ کچھ یوں ہے۔ ''میں نے فلم جھومر میں ایک الہڑ دوشیرہ کا کردار کیا تھا۔ فلمبندی سے پہلے مجھے ہدایت کار مسعود پرویز نے سمجھا دیا تھا کہ اس فلم میں تم اپنے آپ کو ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی تصور کر کے کام کرنا۔ کردار میں جان ڈالنے کے لیے مسعود صاحب نے مجھے چلنے پھرنے، بات چیت کرنے کی خاص ہدایات دی تھیں۔ اس لیے کہ نوخیز لڑکیوں کی چال ڈھال بڑی عمر کی لڑکیوں سے الگ ہوتی ہے۔ ان کے بات چیت کرنے میں معصومیت اور شوخی کا ایک ایسا امتزاج ہوتا ہے جو انہیں ہی زیب دیتا ہے۔ چنانچہ اس فلم میں، میں ایک الہڑ دوشیزہ کے روپ میں ہیرو سے ملتی ہوں اور اسے پسند کرنے لگتی ہوں تو اس کا سبب نہیں جانتی۔ اس لیے کہ ایک کم عمر لڑکی محبت کے جذبے سے ناآشنا ہوتی ہے۔''

جھومر پاکستان کی وہ خوب صورت نغماتی فلم تھی جسے نہ صرف پاکستان میں پسند کیا گیا بلکہ اس کو برلن فلم فیسٹیول کے لیے بھی بھیجا گیا اور جب اس کی نمائش لندن کے کامن ویلتھ فلم ویک میں ہوئی تو اسے تماشائیوں نے بے حد پسند کیا۔ اس فلم میں مسرت نذیر کو اس کی نیچرل اور خوب صورت اداکاری پر سال کی بہترین اداکارہ کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔

شکار نہیں ہوئی۔ وہ اداکارہ جو کئی فلموں میں گلیمر اداکارہ کے روپ میں نمودار ہو کر اپنا ایک بہتر تشخص اور پہچان بنا چکی ہو اس کا عین عروج کے دور میں ماں کا کردار ادا کرنا کوئی عام اور معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے ہر طرح کے کردار ادا کر کے ثابت کر دیا کہ وہ ایک ورسٹائل اداکارہ ہے۔

مسرت نذیر نے اپنی ابتدائی فلموں قاتل، پتن اور پاٹے خان میں اپنی خداداد فنی خوبیوں کا بھرپور مظاہرہ کر کے اپنے لیے ایک مستند اداکارہ کی حیثیت منوالی تھی۔ کسی بھی نئی اداکارہ یا اداکار کے لیے مستند اور مستحکم فنکاروں کے سامنے اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا بڑا چیلنجنگ مرحلہ ہوتا ہے۔ مسرت نذیر کو بھی اس صورتِ حال کا سامنا تھا مگر اس نے اپنی بے پناہ فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہر صورت حال کا مقابلہ بڑی جوانمردی سے کیا جس کردار کے لیے بھی اسے منتخب کیا جاتا اسے قبول کر لیتی۔ اگرچہ اس طرح اسے نقصان بھی پہنچتا۔ اس کا اپنے آپ پر اعتماد اپنی جگہ مگر دوسرے جب اپنے معیار پر پورے نہیں اترے تو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں ایسے میں اس کی فلموں کا ناکام ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ناکام فلموں سے اس میں کام کرنے والوں کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسرت نذیر کو اس کی ناکام فلموں نے متاثر نہیں کیا کیونکہ فلم میکرز جانتے تھے کہ فلم کی ناکامی میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اس لیے اس کی مانگ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اچھی ٹیم نے جب بھی اچھی کہانی پر کوئی اچھی فلم بنائی، اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، مسرت نذیر نے اس میں اپنی سپر فارمنس سے ایسا رنگ بھرا کہ وہ کامیاب فلم کی کامیاب اداکارہ قرار دی گئی۔ اس کی پنجابی اردو کی مجموعی 47 فلموں میں سے 15 فلمیں مختلف وجوہ کی بنا پر ناکام ثابت ہوئیں۔ تاہم ان فلموں کی ناکامی سے اس سے زیادہ ان فلموں کے دیگر ساتھی آرٹسٹ متاثر ہوئے۔ اس کی اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے اس کی ساکھ سلامت رہی مگر کئی بری طرح متاثر ہوئے۔ ان میں سرفہرست اسلم پرویز تھا، جسے ناکام ہیرو کی حیثیت سے ریجیکٹ کر دیا گیا۔ جو کچھ دنوں تک گوشہ گمنامی میں رہا اور جب ایک فلم میں اسے ولن کے روپ میں پیش کیا گیا تو اسے دوبارہ زندگی ملی۔

مسرت نذیر کی کئی کامیاب فلموں کے بعد ... ری میک فلمیں بنائی گئیں۔ ان میں پاٹے خان، قسمت، باغی اور یکے والی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

پاٹے خان کو ہدایت کار مسعود پرویز نے 1975ء میں میراناں پاٹے خان کے نام سے بنایا جب کہ پاٹے خان 1955ء کی فلم تھی۔ مگر اس پر بنائی جانے والی ری میک میراناں پاٹے خان پاٹے خان جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

قسمت مسرت نذیر کی اردو فلم تھی۔ 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ہدایت کار ایس سلیمان نے 1976ء میں طلاق کے نام سے اس کا ری میک بنایا۔ اس میں شبنم اور شاہد نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

باغی ہدایت کار اشفاق ملک کی فلم تھی۔ 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کی بلاک بسٹر کامیابی سے متاثر ہو کر ہدایت کار ایس سلیمان نے 1978ء میں آگ اور زندگی کے نام سے اس کی ری میک بنائی جس میں ممتاز اور محمد علی نے مسرت اور سدھیر کے کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم بھی باغی جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اپنے وقت کی بلاک بسٹر فلم ''یکے والی'' ہدایت کار ایم جے رانا کی پنجابی فلم تھی جو 1957ء میں ریلیز کی گئی تھی۔ 1980ء کی دہائی میں ای جے رانا ہی نے اس فلم کو اردو زبان میں تانگے والی کے نام سے دوبارہ بنایا۔ اداکارہ شبنم نے مسرت نذیر والا کردار کیا تھا جس میں وہ بری طرح ناکام رہی تھی۔ اس فلم کو یکے والی جیسی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔

مسرت نذیر کی ری میک فلموں کی عدم پذیرائی کی کیا وجہ تھی؟ جب کہ انہیں دوبارہ بنانے والے اور ان میں کام کرنے والے سب ہی اپنے دور کے بڑے لوگ تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان فلموں میں سب کچھ تھا مگر مسرت نذیر نہیں تھی۔ مسرت نذیر جو اپنی فنی صلاحیتوں سے ایسی مالا مال تھی کہ اس جیسی خوبیاں دوسروں کو نصیب نہیں ہوئیں۔ اپنی انہی خداداد خوبیوں کی وجہ سے وہ معمولی نوعیت کے گھسے پٹے کرداروں کو بھی زندگی سے بھرپور بنا دیتی تھی۔ ''قاتل'' سے لے کر ''بہادر'' تک اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کی عظمت اور سربلندی نظر آتی ہے۔ کوئی دوسری اداکارہ اس کی فنی بلندیوں کو نہ چھو سکی اس نے مختلف فلموں میں مختلف نوعیت کے کردار کیے اور ہر کردار کے مطابق اسے زندگی بخشی جانِ بہار، کلرک اور سوسائٹی میں اس کے کردار آنسوؤں میں گندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شہید میں وہ ایک بے باک توپ شکن حسینہ کے روپ میں جلوہ نما نظر آتی ہے تو دوسری طرف وطن سے محبت کرنے والی ایک جانباز

عورت کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ زہرِ عشق میں اس کا کردار انتہائی پیچیدہ اور مشکل تھا۔ اس فلم میں وہ اس دھرتی کی علامت ہے جو بنجر ہے مگر اس کے سینے میں گہرے گھاؤ ہیں۔ بانجھ ہونے کا دکھ اس عورت کا المیہ ہے۔

اس نے اردو فلموں کی طرح پنجابی فلموں میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ پنجابی فلموں میں وہ پہلی مٹیار بن کر سامنے آئی۔ یکے والی میں اس کا کردار عوامی سطح پر مقبول ہوا اور اسے پہلی عوامی اداکارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ماہی منڈا اور جٹی اس کی کامیاب اور خوب صورت فلمیں اس لیے قرار پائیں کہ اس کی اداکاری نے ان کرداروں کو یادگار بنا دیا۔

مسرت نذیر کو مکالموں کی ادائیگی میں جو کمال حاصل تھا وہ بہت ہی کم اداکاراؤں کو نصیب ہوا۔ اس کی ڈائیلاگ ڈیلیوری میں ایک خاص طرح کا ناقابلِ بیان مگر پُرآشوب کرب جھلکتا ہے۔ مکالموں کی ادائیگی کے وقت لہجے میں موسیقیت، آہ وبکا کی کیفیت میں ایک تاثر۔ اس میں وہ اپنی سانسوں کے تلاطم کو بھی شامل کر لیتی تھی۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس کی یہ ساری خوبیاں عطیۂ خداوندی تھی۔

اس نے رب کریم کی جانب سے بخشی اپنی سنہری آواز اور اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے پاکستانی فلموں اور فلمی صنعت کو تروتازگی، سربلندی اور استحکام عطا کیا۔ یہ پاکستانی فلم انڈسٹری کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت فلمسازی کے جدید ساز و سامان موجود تھے نہ ٹیکنالوجی کی سہولتیں حاصل تھیں۔ اس وقت تیکنیک کاروں اور فنکاروں کی صلاحیتیں ہی اس صنعت سیمیں کا سرمایہ تھیں۔ ایسے باصلاحیت افراد میں مسرت نذیر کی شخصیت بھی نمایاں تھی۔

اس دور میں عوامی پذیرائی کے طور پر کوئی ایوارڈ یا اعزاز نہیں دیا جاتا تھا۔ نگار ایوارڈ کا اجراء 1957ء میں ہوا۔ اس کی دوسری تقریب میں مسرت نذیر کو سال کی بہترین اداکارہ کا نگار ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد جھومر اور پھر شہید میں اسے اسی اعزاز سے نوازا گیا۔

مسرت نذیر کے والدِ محترم خواجہ نذیر احمد نے اپنی ہونہار بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھا تھا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اللہ نے اسے ابھرتی ہوئی پاکستانی فلمی صنعت کی مسیحائی کا کام سونپ دیا۔ گلوکاری اور اداکاری میں وہ اتنی مصروف ہوگئی کہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا اور قومی

شادی خانہ آبادی

ڈاکٹر ارشد مجید کی مسرت نذیر سے پہلی ملاقات صحافی، ادیب اور ہدایت کار احمد بشیر کے گھر پر ایک پارٹی کے دوران ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا و پسند کیا۔ پھر کچھ ملاقاتوں کے بعد دونوں ذرا کھلے تو ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

’’مجھ سے شادی کرو گی؟‘‘

مسرت خاموش رہیں جس پر ڈاکٹر نے ٹوکا۔

’’کیا بات ہے تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟‘‘

’’وہ...... بات دراصل یہ ہے کہ یہ فیصلہ میں خود نہیں کر سکتی۔‘‘

’’پھر کون فیصلہ کرے گا؟‘‘

’’میرے والدین۔‘‘

’’تم اتنی بڑی فنکارہ ہو کر اتنی دقیانوسی بات کرتی ہو۔‘‘

’’میں آج جو کچھ بھی ہوں اپنے ماں باپ کی دعاؤں اور کوششوں کی وجہ سے ہوں۔ اس لیے میں کوئی بھی کام ان کی مرضی اور منشا کے بغیر نہیں کرتی۔ شادی بھی میں ان کی مرضی اور پسند سے کروں گی۔ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو اپنے بڑوں کو میرے گھر بھیج کر میرا رشتہ مانگیں۔‘‘

اور پھر ڈاکٹر نے ایسا ہی کیا۔ ان کے گھر والے ان کے لیے مسرت نذیر کے گھر پہنچ گئے اور اس کا رشتہ مانگا جو تصدیق و تحقیق کے بعد قبول کر لیا گیا اور 21 اپریل 1961ء کو دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ کر ایک دوسرے کے شریکِ حیات بن گئے۔

فلمی صنعت کی ایک اہم ضرورت بن گئی۔ عین اس وقت جب وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھی اس کا ایک رشتہ آیا۔ یہ ایک ڈاکٹر کا رشتہ تھا۔ خواجہ نذیر احمد کو کچھ پرانی باتیں یاد آگئیں۔ انہوں نے اپنی اس بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہا تھا مگر وہ ڈاکٹر نہ بن سکی۔ اب انہیں داماد کی صورت میں ایک ڈاکٹر مل رہا تھا۔ اس لیے اس رشتے سے انکار نہ کر سکے۔ تصدیق و تحقیق کے بعد جب وہ ہر طرح قابلِ قبول نظر آیا تو 21 اپریل 1961ء کو انہوں نے مسرت نذیر کا نکاح ڈاکٹر ارشد مجید سے کر دیا۔ ہر اداکارہ کی طرح مسرت نذیر کے بھی ہزاروں پرستار اور چاہنے والے تھے۔ اب تو نہیں،

پہلا انٹرویو

سترہ سال کی عمر میں فلمی دنیا میں قدم رکھنے والی اداکارہ جس نے جلد ہی اپنی خداداد فنی صلاحیتوں سے فلم انڈسٹری میں اپنے لیے ایک ممتاز اور مستحکم مقام بنالیا۔ اپنی دو ابتدائی فلموں ''قاتل'' اور ''پتن'' کی کامیابیوں کے بعد جب میڈیا والوں کی توجہ کا مرکز بنی تو اس نے اپنے پہلے اخباری انٹرویو میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنی کم عمری کے باوجود وہ کس قدر بالغ نظر تھی۔

مسرت نذیر نے ایک اخباری سوال کے جواب میں کہا۔ ''میں نے 28 نومبر 1954ء کے دن فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ مجھے یہاں آکر کوئی خوف محسوس نہیں ہوا کیونکہ جہاں تک میرے کردار کا تعلق ہے میرا یقین ہے کہ اس کا بڑی حد تک انحصار خود مجھ پر ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ فلمی نگار خانے بدکردار لوگوں سے پاک ہیں۔ ایسے لوگ تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی لڑکی اپنے کردار پر آنچ نہ آنے دینے کا عزم کرلیتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا بگاڑ نہیں سکتی۔ میں اس واثق یقین کے ساتھ فلمی دنیا میں داخل ہوئی ہوں۔''

بازی گر

مسرت نذیر کی آخری فلم ''بازی گر'' جو اس کے لندن چلے جانے کی وجہ سے التواء کا شکار ہوگئی تھی۔ جب 1966ء میں مختصر مدت کے لیے وہ پاکستان آئی تو اس کے فلمساز نے اپنی فلم مکمل کرانے کی درخواست کی۔ جسے مسرت نذیر نے قبول کرلیا۔ جب یہ فلم مکمل ہوگئی تو سنسر میں پھنس گئی اور وہاں سے چھٹکارے کی صورت میں اس کا نام بہادر رکھ دیا گیا۔ نمائش کے بعد یہ فلم بری طرح ناکام ہوگئی جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ محمد علی نے اس فلم میں ولن کے طور پر کام کیا تھا مگر جن دنوں (1967ء) یہ فلم ریلیز ہوئی تھی محمد علی کامیاب اور سپر ہیرو کے طور پر مقبول ہو چکے تھے۔ ان کے پرستاروں نے انہیں اس فلم میں ولن کے طور پر ناپسند کیا اور فلم فلاپ ہوگئی۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ مقبول اداکاراؤں کی شادی کے بعد ان کی عوامی مقبولیت کم ہوجاتی ہے مگر مسرت کی ڈاکٹر ارشد مجید سے شادی کے بعد ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس نے 1963ء تک فلموں میں کام کیا۔ عوام میں بھی اور فلم والوں میں بھی اس کی پسندیدگی برقرار رہی۔ 1962ء میں شروع ہونے والی ہدایت کار منور رشید کی فلم ''بازی گر'' کی عکس بندی تھوڑی سی باقی رہ گئی تھی کہ ڈاکٹر ارشد مجید کے ساتھ مسرت نذیر کو لندن جانا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے بہتر مستقبل کے لیے لندن میں رہائش اختیار کرنا چاہی تو مسرت نذیر نے ایک اچھی بیوی کی طرح بھریا میلہ چھوڑ کران کے ساتھ جانے ہی میں اپنی بہتری سمجھا۔ ڈاکٹر صاحب کچھ عرصہ تک لندن میں رہے پھر کینیڈا شفٹ ہوگئے۔

مسرت نذیر فلمی صنعت کا بھریا میلہ چھوڑ کر اپنے جیون ساتھی کے ساتھ وطن عزیز سے دیار غیر چلی گئی تو اسے اپنی اداکاری کا شوق پورا کرنے کا مزید موقع نہیں ملا۔ اس لیے اس نے اپنے اوّلین شوق گلوکاری پر ہی اپنی توجہ مرکوز کردی۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی بیوی کے اس شغل پر کوئی اعتراض نہیں تھا، وہ جانتے تھے کہ مسرت ایک فنکارہ ہے اور اسے اس کے اس شوق کی تکمیل سے روکنا زیادتی ہوگی۔ اسے گانے کی مکمل آزادی دے دی۔ لہٰذا کینیڈا پہنچ کر مسرت نذیر نے بطور گلوکارہ اپنے دوسرے فنی دور کا آغاز کردیا۔ کینیڈا میں مقیم کلاسیکل موسیقی کے ماہر استاد ڈاکٹر فاضل سے اس نے مکمل طور پر موسیقی کے رموز سیکھنا شروع کردیے جس کے بعد بی بی سی لندن سے باقاعدہ گائیکی کی شروعات کردیں۔ سب سے پہلے اپنی آواز میں مسرت نذیر نے بی بی سی سے جو گانا ریکارڈ کروایا اس کے بول تھے

لمّی واڈھولاوے رات دھیمی دھیمی

بی بی سی عالمی شہرت یافتہ نشریاتی ادارہ ہے۔ اس میں گانے کی وجہ سے اس کی آواز کی خوشبو دور دور تک پھیل گئی۔ مسرت نذیر کی اس مقبولیت کو دیکھ کر بھارت کی ایک ریکارڈنگ کمپنی نے بمبئی سے اس کے ایک لانگ پلے کا اہتمام کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ اس لانگ پلے کی زبردست پذیرائی کے بعد بھارتی ٹی وی چینل دوردرشن نے اپنے ایک پروگرام ''پھول کھلے ہیں گلشن گلشن'' کے لیے مسرت نذیر کا ایک خصوصی انٹرویو نشر کیا۔ یہ انٹرویو امرتسر ٹی وی سے بھی دکھایا گیا جسے لاہور کے باسیوں نے بھی دیکھا اور بہت خوش

ہوئے کہ ان کی ایک پاکستانی گلوکارہ کی مقبولیت انڈیا میں بھی اپنا لوہا منوا رہی ہے۔

ٹی وی انٹرویو کے بعد پرنٹ میڈیا نے بھی مسرت نذیر کو خصوصی توجہ کی مستحق سمجھا اور بھارت سے شائع ہونے والے مقبول رسالوں، فلم فیئر، فیمینا اور سوسائٹی میں اس کے انٹرویوز شائع ہوئے۔ غالباً یہ اس وقت کی بات ہے جب نازیہ حسن کا پورے انڈیا میں ڈسکو دیوانے مقبولیت کی بلندیوں پر تھا۔

بھارتی الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے جو تشہیر ہوئی اس کے نتیجے میں 1980ء سے 1983ء تک گلوکارہ مسرت نذیر کے تین لانگ پلے ریلیز ہوئے جن میں سے ہر ایک بے پناہ مقبول ہوا یہ تمام ڈسکو اسٹائل کے تھے۔

برطانیہ کے پرائیویٹ چینل نے بھی مسرت نذیر کی شہرت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس سے ڈسکو اور پاپ میوزک سے آراستہ گیت گوائے۔

1964ء میں مسرت نذیر جب دیارِ غیر چلی گئی تھی تو وہ اپنے دور کی ایک مقبول گلیمرل اداکارہ تھی لیکن جب 1984ء میں پاکستان آئی تو ایک ورلڈ فیمس گلوکارہ کے طور پر چار دانگ اس کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے۔ اس بار ڈاکٹر ارشد مجید نے اپنی فنکارہ بیوی کو کچھ زیادہ دنوں کے لیے اس کے میکے بھیجا تھا۔ مسرت نذیر کی آمد کی خبر ملتے ہی اس کے فن کے دیوانے اس سے آن ملے۔ پی ٹی وی نے اس کی آواز میں گیتوں اور گانوں کی ریکارڈنگ شروع کردی اور ''میری پسند'' نامی پروگرام میں انہیں ٹیلی کاسٹ کرنا شروع کردیا جو بے حد مقبول ہوئے۔ ضیا جالندھری کی غزل

چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ

نے زبردست مقبولیت حاصل کی۔ جو اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اس کے گانوں کی موسیقی میں چونکہ پاپ میوزک کے ساتھ مشرقی موسیقی کا روایتی حسن بھی شامل ہوتا تھا اس لیے ہر طبقۂ فکر کے سننے والوں میں مقبول ہوتا تھا۔

1985ء میں اسلام آباد ٹی وی نے شادی بیاہ کے گیتوں پر مشتمل ایک پروگرام ''مہندی ناں سجدی'' کے نام سے نشر کیا جس میں گانے کے لیے مسرت نذیر کا انتخاب کیا گیا جو توقعات سے بڑھ کر مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کے پیشِ نظر اسلام آباد ٹیلی ویژن نے اپنے الیکشن کی خصوصی نشریات کے دوران دوبارہ اسے پیش کیا۔

شعلہ سی لپکتی ہوئی آواز میں کچھ ایسا جادو تھا کہ اس کی

ایک چیلنجنگ کردار

پاکستانی فلمی صنعت کے ابتدائی دنوں میں بڑی خوب صورت اور اچھے سبجیکٹ پر بڑی معیاری فلمیں بنائی گئیں۔ ایسی ہی فلموں میں ایک فلم ''زہر عشق'' بھی تھی جسے پاکستان کی پہلی نفسیاتی فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس فلم میں مسرت نذیر فن کی ان بلندیوں پر نظر آتی ہے جہاں بہت کم ایکٹریس پہنچ پائیں۔ مسرت نذیر نے ایک موقع پر اس فلم کی کردار نگاری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ ''زہر عشق میں مجھے ایک ایسی لڑکی کا کردار دیا گیا جو متضاد طبیعت اور فطرت کی حامل تھی۔ بہت بے باک، سخت ضدی، اجڈ اور گنوار، اس کے باوجود فطرتاً نیک دل۔ امتحان سخت تھا۔ کردار مشکل مگر مسعود پرویز جیسے اچھے ہدایت کار کے سہارے یہ کردار نبھا گئی۔ اس فلم میں ایک سخت مقام تھا۔ یعنی محبت میں پیدا ہونے والے وسوسے اور شک کی کشمکش۔ انسان جتنا جس سے محبت کرتا ہے اتنا ہی اس کے متعلق وسوسے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنے محبوب کی طرف کسی کا دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ بسا اوقات اپنی قسمت پر خود رشک کرنے لگتا ہے۔ مجھے بھی محبت کے اس نازک ترین جذبے کو پیش کرنا تھا۔ میرے محبوب کی چاہت میں ایک کتا شریک ہوگیا۔ اس کی توجہ اس معصوم جانور پر ہونے لگی۔ میں جو پہاڑوں میں پلی بڑھی تھی۔ انتہا پسند لڑکی تھی، کس طرح برداشت کرسکتی تھی کہ میرا محبوب میرے علاوہ کسی اور کو چاہے یا کسی جانب متوجہ ہو۔ میں نے کتے کو پہاڑ پر لے جاکر گھاٹیوں میں پھینک دیا۔ میرے اس عمل میں کھلی بربریت تھی لیکن جس والہانہ محبت کے جذبے کے تحت میں نے یہ کام کیا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ ارفع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس منظر کے بھیانک ہونے کے باوجود تماشائیوں کی چیخیں نہیں نکلیں اس کے برعکس میری محبت کی گہرائی کو سراہا گیا۔ اس چیلنجنگ کردار کو تمام تر فنی خوبیوں کے ساتھ ادا کرنے پر مسرت نذیر کو سال کی بہترین ہیروئن کا نگار ایوارڈ دیا گیا۔

گائی ہوئی ہر غزل، ہر گیت، ہر نغمہ سننے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔ آواز کے ساتھ اس کے گانے کا انداز بھی منفرد تھا۔ یوں تو اس کی آواز میں گایا ہوا ہر گیت پسند کیا جاتا تھا مگر کچھ کو زبردست پسندیدگی کی سند حاصل ہوتی تھی ایسے ہی گیتوں میں ٹی وی پر گایا ہوا ایک گیت ''پردیسی کب آؤ گے'' بھی بے حد مقبول ہوا۔ اسی طرح پی ٹی وی پر عیدالفطر کے موقع پر گایا ہوا گیت ''میرا لونگ گواچا'' نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ صاحب طرز موسیقار خواجہ خورشید انور نے بھی ایک ٹی وی پروگرام میں اپنی دھنوں سے ترتیب دیا ایک گیت ''میرا بچھڑا بلم گھر آگیا'' مسرت نذیر پر ریکارڈ کروایا۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔ ایک مقبول گیت جو فلم ''راز'' میں مسرت نذیر پر پکچرائز ہوا تھا جسے زبیدہ خانم نے گایا تھا اور جس کے بول تھے ''میٹھی میٹھی بتیوں سے جیا نہ جلا'' جب یہی گیت فیروز نظامی کی ''دھن'' میں مسرت نذیر سے گوایا گیا تو اس گیت کا لطف ہی دوبالا ہو گیا۔ سرسنگیت کے پنڈتوں نے زبیدہ خانم کی آواز میں گائے ہوئے گیت سے مسرت نذیر کے گائے ہوئے گیت بدرجہا بہتر قرار دیا۔

کچھ اسی طرح ہوا جب موسیقار رشید عطرے کا مشہور اور مقبول گیت ''آج میرے منڈیر کا گابولے'' مسرت نذیر سے گوایا گیا، آواز کی اس جادوگرنی نے اس گیت کو کچھ اس انداز سے گایا کہ لوگوں کو تسلیم کرنا پڑا اچھے گیتوں کو اچھا گانے والا ہی مقبولیت کی سربلندی عطا کرتا ہے۔

وہ جو بعض چہروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خدا ایسے چہرے بناتا ہے کم، اسی طرح مسرت نذیر کی آواز کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا ایسی سریلی اور دلوں میں اتر جانے والی آواز بہت کم گانے والیوں کو عطا کرتا ہے۔ یہ اس کی آواز ہی تھی جس نے سارے عالم کو اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ اس کی عالمگیر مقبولیت کی وجہ سے لندن، کینیڈا اور ابوظہبی میں اس کی گائیکی کے کئی شوز کیے گئے جو توقعات سے بڑھ کر کامیاب ہوئے۔ ان پروگراموں میں اس وقت کے سپر پاکستانی فنکاروں ندیم اور شبنم نے بھی شرکت کی جب کہ میزبانی کے فرائض طارق عزیز نے انجام دیئے۔

مسرت نذیر کی عوامی مقبولیت کی وجہ سے اسے پاکستان کی نمائندگی کرنے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ سارک ممالک کے درمیان ثقافتی پروگراموں کے تبادلے میں مسرت نذیر کے شادی بیاہ کے ایک پروگرام کو ٹیلی کاسٹ کیا گیا جسے بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔

جب وہ کچھ دنوں کے لیے پاکستان آئی اور اس کی موجودگی سے ٹی وی والوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا تو فلم والے بھلا کیوں پیچھے رہتے کیونکہ وہ تو انہی کے قبیلے کی فنکارہ تھی۔ چنانچہ موسیقار وزیر افضل نے اپنی دو فلموں ''جگادر'' اور ''بگڑو'' کے لیے اس کی آواز میں کئی گانے ریکارڈ کروائے پہلی فلم جگادر کے تین گیت

اچے نہ اچ میری بانھ پڑھ چندوے
وے دیھو جیا تکیا بس دنگ رہ گئی
ہائے مرے میری اڈی وچ کھنڈا چھبیا

اور دوسری فلم بگڑو کے لیے

ڈھول بجا کے کہند کے مل جہان نو
مہندی تاں سجدی جے نچے منڈے دی ماں
میلے دے وچ سجن ملدے وج کے لڈی

پہلی فلم 1985ء میں اور دوسری 1987ء میں ریلیز ہوئی۔ موسیقار ایم اشرف نے بھی اپنی پنجابی فلم ڈسکو ڈانسر کے لیے مسرت نذیر سے چار گیت ریکارڈ کروائے جن کے بول تھے

آ آجانِ من آ ہووے ملن
آن دی میرے محبوب ملتان دی
چن وے کہ شوقنان ڈسکو دی
ڈسکو ڈانسر ریشمی نین باتھواں

ہدایت کار حیدر چوہدری نے اپنی فلم ''ناچے ناگن'' کے لیے ایک گیت مسرت نذیر سے ریکارڈ کروایا۔ یہ گیت تھا دو پنالڑ ابلھیاں نال کھنداری جو اداکارہ نادرہ پر فلمایا گیا تھا اور بہت مقبول ہوا تھا۔

موسیقار ذوالفقار علی نے بھی اپنی فلم ''آخری قتل'' کے لیے مسرت سے ایک گانا گوایا تھا اس کے بول تھے کا ماںواں تے دھیاں رل بیتھیاں۔

اپنی آواز کا جادو جگانے والی ساحرہ پاکستان میں کچھ دنوں تک سرسنگیت کی دنیا میں دھوم مچانے کے بعد واپس چلی گئی کیونکہ ہر عورت کے لیے پیا کا گھر ہی سب سے پیارا ہوتا ہے جہاں وہ خوش ہے، شاد ہے، آباد ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر اس کی خوب صورت آواز پہلے کی طرح اب بھی بھرپور جوان ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں خوب صورت آوازوں کے رسیا موجود ہیں وہاں مسرت نذیر کے گیتوں کی قندیل روشن ہے۔

میری کوم

تنویر ریاض

اس نے ہندوستان کے ایک انتہائی پسماندہ علاقے میں جنم لیا۔ ہندو مذہب میں عورتوں کو تو ویسے بھی حقیر سمجھا جاتا ہے۔ پھر وہ غریب بھی تھی اس لیے اسے تحقیر کے لائق گردانتے تھے مگر اس کے دل میں حوصلہ تھا۔ وہ خود کو منوانا چاہتی تھی اس لیے اس نے ایک مردانہ کھیل منتخب کیا، اس کھیل میں مہارت حاصل کی تو وہی لوگ جو اسے حقیر سمجھتے اپنا فخر کہنے لگے۔

برِصغیر کی نامور لیڈی باکسر کی روداد زندگی

کھیلوں کی دنیا میں بے شمار خواتین نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر کا تعلق ٹینس، بیڈمنٹن، اتھیلٹک اور فن پہلوانی سے ہے لیکن باکسنگ کے شعبے میں خواتین کی دلچسپی برائے نام تھی۔ گو کہ پہلا خواتین کا باکسنگ میچ 1876ء میں کھیلا گیا لیکن بہت سی بڑی تنظیموں نے خواتین کے باکسنگ کھیلنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی۔ سویڈن وہ پہلا ملک ہے جس نے 1988ء میں یہ پابندی ختم کی اور خواتین کو امیچر باکسنگ میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی۔ بعد ازاں امریکا اور دوسرے ملکوں نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کھیل میں بھی خواتین آگے بڑھتی نظر

آئیں۔ ان میں سے چند ایک نے باکسنگ کی دنیا میں بہت نام کمایا اور عالمگیر شہرت حاصل کی۔ انہی میں سے ایک نام بھارتی باکسر میری کوم کا بھی ہے۔ اس کا پورا نام منگتی چنگ نی جنگ میری کوم ہے۔ وہ یکم مارچ 1983ء کو کنگاتھی میں پیدا ہوئی جو بھارتی ریاست منی پور کے ضلع چوراچند پور میں واقع ہے۔ میری کوم پانچ مرتبہ ورلڈ امیچر باکسنگ چیمپئن رہ چکی ہے اور وہ واحد خاتون باکسر ہے جس نے چھ مرتبہ ہونے والی چیمپئن شپ میں ہر بار تمغہ جیتا۔ وہ واحد بھارتی خاتون باکسر ہے جس نے 2012ء کے اولمپکس میں فلائی ویٹ کیٹیگری میں کانسی کا تمغہ جیتا۔ اسے انٹرنیشنل باکسنگ فیڈریشن کی ورلڈ وومن کی فلائٹ ویٹ کیٹیگری میں چوتھے نمبر پر رہنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس نے 2014ء میں ہونے والے ایشین گیمز میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ 2013ء میں اس کی خودنوشت "ان بریک ایبل" کے نام سے شائع ہوئی جب کہ 2014ء میں اس کے اوپر بننے والی فلم میں بولی ووڈ کی سپر اسٹار پریانکا چوپڑا نے میری کوم کا کردار ادا کیا۔ اس کی تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی۔ میری کوم نے منی پور کے دارالحکومت امپھال میں خواتین کے لیے ایک نائٹ کلب بھی قائم کیا ہے۔ جس میں لڑکیوں کو جنسی تشدد کے خلاف مزاحمت کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

☆......☆

میری کوم کا بچپن غربت میں گزرا۔ اس کے والدین تونپا کوم اور اکھم کوم، کھیتوں میں کام کرتے تھے جس سے ان کا بمشکل گزارہ ہوتا تھا۔ میری کوم نے چھٹی جماعت تک تعلیم لوک تک کرچین ماڈل ہائی اسکول موئے رنگ سے حاصل کی اور آٹھویں کلاس تک سینٹ زیویئر کیتھولک اسکول میں پڑھا پھر اس نے آدم جاتی لوئی اسکول امپھال میں داخلہ لے لیا۔ لیکن میٹرک کا امتحان پاس نہ کرسکی۔ اس نے دوبارہ امتحان دینے کی بجائے وہ اسکول چھوڑ دیا اور دوسرے اسکول سے امتحان میں شرکت کی۔ پھر پوراچند پور سے گریجویشن کرلیا۔

گوکہ اسے بچپن سے ہی ایتھلیکس سے دلچسپی تھی لیکن منی پور سے تعلق رکھنے والے باکسر ڈنگ کو سنگھ کی کامیابی سے متاثر ہوکر اس نے بھی باکسر بننے کا فیصلہ کیا اور اس نے منی پور اسٹیٹ باکسنگ کوچ نرجیت سنگھ کی زیرنگرانی اپنی تربیت شروع کردی۔ اس کی شادی کے اونلر کوم سے ہوئی۔

ان دونوں کی ملاقات 2001ء میں ہوئی جب میری کوم پنجاب میں ہونے والے نیشنل گیمز میں شرکت کے لیے نئی دہلی گئی جب کہ اونلر، دہلی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا ان دونوں نے 2005ء میں شادی کرلی اور پھر دو جڑواں بیٹے کے والدین بن گئے۔ 2013ء میں اس نے تیسرے بچے کو جنم دیا۔

دو سال کے وقفے کے بعد میری کوم نے 2008ء میں ہونے والی ایشین ویمنز باکسنگ چیمپئن شپ میں چاندی کا تمغہ جیتا جب کہ چین میں ہونے والی وومنز ورلڈ باکسنگ چیمپئن شپ میں وہ لگاتار چوتھی بار سونے کا تمغہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ اس کے فوراً بعد اس نے 2009ء میں ہونے والے ویت نام کے ان ڈور گیمز میں سونے کا تمغہ جیتا۔ 2010ء میں اس نے کازغستان میں ہونے والی ایشین ویمنز باکسنگ چیمپئن شپ میں سونے کا تمغہ اور بار باڈوس میں ہونے والی ویمنز ورلڈ باکسنگ چیمپئن شپ میں مسلسل پانچویں بار سونے کا تمغہ جیتا۔

2010ء کے ایشین گیمز میں اس نے اکیاون کلو گرام کے مقابلے میں حصہ لیا اور کانسی کا تمغہ جیتنے میں کامیاب رہی۔ اس نے 2011ء میں چین میں ہونے والے 48 کلوگرام کے ایشین ویمنز کپ مقابلے میں سونے کا تمغہ جیتا جب کہ 2012ء میں منگولیا میں ہونے والی ایشین باکسنگ چیمپئن شپ میں اسے سونے کا تمغہ ملا۔ یکم اکتوبر 2014ء کو اس نے پہلی بار جنوبی کوریا میں ہونے والے ایشین گیمز میں سونے کا تمغہ جیتا۔

پانچ مرتبہ کی ورلڈ چیمپئن میری کوم 46 اور 48 کلو گرام کی کیٹیگری میں کئی تمغے جیت چکی تھی لیکن باکسنگ کی عالمی تنظیم کی جانب سے پابندی عائد کردی گئی کہ خواتین صرف تین کیٹیگریز میں حصہ لے سکتی ہیں اور ان میں سب سے کم اکیاون کلوگرام کیٹیگری تھی۔ چنانچہ 2012ء میں ہونے والی ویمنز ورلڈ باکسنگ چیمپئن شپ میں میری کوم نہ صرف اس مقابلے میں حصہ لے رہی تھی بلکہ اسے اسی سال لندن میں ہونے والے سمر اولمپکس کے لیے بھی کوالیفائی کرنا تھا۔ تاہم وہ اکیاون کلوگرام کے کوارٹر فائنل میں برطانیہ کی نکولا ایڈنز سے شکست کھا گئی۔ ویمنز ورلڈ باکسنگ چیمپئن شپ شروع ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میری کوم کوئی تمغہ حاصل نہ کرسکی تاہم وہ لندن اولمپکس کے لیے کوالیفائی کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

میری کوم اس مقابلے میں شرکت کے لیے اپنی ماں

اور شوہر کے ہمراہ لندن پہنچی۔ اس کا پہلا مقابلہ 5 اگست 2012ء کو پولینڈ کی کیرولینا سے ہوا جسے اس نے 14-19 سے شکست دے دی۔ دوسرے روز کوارٹر فائنل میں وہ تیونس کی میروواراحیلی کو شکست دینے میں کامیاب رہی لیکن سیمی فائنل میں ایک بار پھر برطانیہ کی نکولا ایڈمز سے ہار گئی۔ اس طرح وہ اولمپک گیمز میں کانسی کا تمغہ حاصل کر سکی۔ اس کامیابی کی خوشی میں منی پور کی حکومت نے اسے پچاس لاکھ روپے نقد اور دو ایکڑ زمین دینے کا اعلان کیا۔

میری کوم نے صرف ملکی اور بین الاقوامی مقابلوں میں ہی کامیابیاں حاصل نہیں کیں بلکہ اسے متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

پدما بھوشن (بھارت کا سب سے بڑا اعزاز جو اسے اسپورٹس میں ملا) 2013ء، ارجن ایوارڈ (باکسنگ 2003ء، پدماشری (بھارت کا دوسرا بڑا اسویلین اعزاز جو اسے اسپورٹس میں ملا) 2010ء، راجیو گاندھی کھیل رتنا ایوارڈ 2007ء، پیوپل آف دا ایئر، مکا بک آف ریکارڈز 2007ء، راجیو گاندھی کھیل رتنا ایوارڈ 2009ء، اسپورٹس وومن آف دا ایئر، صحارا اسپورٹس ایوارڈ۔

لندن اولمپکس میں کانسی کا تمغہ جیتنے پر راجستھان حکومت کی جانب سے پچاس لاکھ روپے، منی پور حکومت کی جانب سے پچاس لاکھ روپے اور دو ایکڑ زمین، آسام حکومت کی جانب سے بیس لاکھ روپے، اروناچل پردیش حکومت کی جانب سے دس لاکھ روپے، وزارت قبائلی امور کی جانب سے دس لاکھ روپے اور نارتھ ایسٹرن کونسل کی جانب سے چالیس لاکھ روپے نقد انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔

میری کوم کا بچپن بڑے ہی نامساعد حالات میں گزرا جب اس نے باکسر بننا چاہا تو اس کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اس کھیل کی مناسب تربیت حاصل کر سکے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے عزم و حوصلے کی بدولت منزل کی جانب بڑھتی رہی۔ ریڈرز ڈائجسٹ کو دیے گئے ایک انٹرویو میں میری کوم نے اپنی ابتدائی زندگی اور کیریئر کے حوالے سے کچھ دلچسپ حقائق بیان کیے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے اس انٹرویو کے چند اقتباسات پیش کیے جارہے ہیں۔

س: تمہارا نام چنگ نی جنگ رکھا گیا تھا لیکن تم میری کے نام سے پہچانی جاتی ہو۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: میں ایسا نام اختیار کرنا چاہتی تھی جو بولنے میں آسان ہو۔ اس لیے میں نے اپنا نام میری رکھ لیا جو عیسائیت پر میرے پختہ یقین کا مظہر ہے۔

س: بچپن کا زمانہ کیسا گزرا؟

ج: ہم بہت غریب تھے اور گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ مجھ پر بچپن میں ہی ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا۔ جہاں تک ممکن ہوتا والدین کی مدد کرنے کی کوشش کرتی جب میں نے باکسنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو ابتداء میں والدین سے یہ بات چھپائی کیوں کہ ہمارے قبیلے اور معاشرے میں اس کھیل کو عورتوں کے لیے مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

س: تمہیں باکسر بننے کا خیال کیسے آیا؟

ج: مجھے مارشل آرٹس سے دلچسپی تھی۔ ہمارے علاقے میں صرف امیر گھروں کے بچے ہی پرائیویٹ اسکولوں میں اچھی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں جب کہ غریب کے بچے کو سرکاری اسکول میں داخلہ لینا پڑتا ہے جہاں تعلیم کا معیار انتہائی پست ہے اور ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو کوئی ڈھنگ کی ملازمت بھی نہیں ملتی لہٰذا وہ کھیل پر اپنی توجہ مرکوز کردیتے ہیں تاکہ اس میں مہارت حاصل کر کے معاشرہ میں کوئی جگہ بنا سکیں جس طرح مجھے چیمپئن بننے کے بعد اسٹیٹ پولیس میں ملازمت مل گئی گو کہ میں کام پر نہیں جاتی۔ میرے والدین کو چار بچوں کی تعلیم اور پرورش کا خرچ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ میں سب سے بڑی تھی۔ اس لیے ماں باپ کا بوجھ بانٹنے کے لیے مجھے میدان میں آنا پڑا۔ میں نے اپنا پہلا میچ 2000ء میں سب جونیئر باکسنگ چیمپئن شپ میں کھیلا اور بہترین باکسر قرار پائی اور مجھے یقین ہوگیا کہ قدرت نے مجھے یہ صلاحیت عطا کی ہے۔

س: بارہ سالہ کیریئر کے دوران تمہیں کئی مرتبہ اپنی کیٹیگری تبدیل کرنی پڑی۔ پہلے تم نے 45 کلو کی کیٹیگری میں حصہ لیا۔ پھر 48 کلو میں آئیں اور 2012ء کے اولمپکس میں تم 51 کلو کی کیٹیگری میں شامل تھیں۔ جب تم زیادہ وزن کے مقابلے میں حصہ لیتی ہو تو تمہیں ہارنے کا خوف نہیں ہوتا؟

ج: نہیں خدا نے مجھے یہ صلاحیت بخشی ہے اگر مناسب تربیت کے بعد مقابلہ میں حصہ لوں تو کوئی خوف نہیں ہوتا گو کہ بڑے مخالفین سے مقابلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کیوں کہ وہ زوردار ضرب لگاتے ہیں اور ان کی رینج بھی دور تک ہوتی ہے۔ اس لیے رنگ میں اترنے کے بعد ان کی قوت کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔ میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ ان کی رینج سے دور رہوں اور موقع ملتے ہی ضرب لگادوں۔

س: رنگ میں اترتے وقت تمہارے ذہن میں کیا بات ہوتی ہے۔

ج: میچ شروع ہونے سے پہلے صرف جیت کے بارے میں سوچتی ہوں۔ ایک بار مقابلہ شروع ہو جائے تو میرے ذہن میں کچھ نہیں ہوتا کیوں کہ ایک لمحے کے لیے بھی توجہ ہٹ جائے تو ایک پوائنٹ کا نقصان ہو سکتا ہے۔ اگر فیملی میں کوئی مسئلہ ہو تو میرے شوہر کبھی نہیں بتاتے اور یہی کہتے ہیں ہمارے بارے میں مت سوچو اور اپنی ٹریننگ پر توجہ دو۔ اب میں پہلے کے مقابلے میں بہتر طور پر اپنی حکمتِ عملی ترتیب دینے کے قابل ہو گئی ہوں۔ مجھے اپنی طاقت اور کمزوریوں کا بخوبی اندازہ ہے۔

س: تمہارے کیریئر میں سب سے مشکل مرحلہ کب آیا؟

ج: 2012ء اولمپکس کے سیمی فائنل میں برطانوی باکسر نکولا ایڈمز سے ہارنے کا مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔

س: کیا تمہیں اس بات کی خوشی نہیں ہے کہ اولمپک مقابلوں میں وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے ہونے کا خواب پورا ہو گیا۔

س: یقیناً یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے لیکن میں اس تمغہ کا رنگ تبدیل کرنا چاہتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ 2016ء کے اولمپکس میں سونے کا تمغہ حاصل کروں۔

س: تمہارے کیریئر کا ناقابلِ فراموش واقعہ؟

ج: اس وقت میں اٹھارہ برس کی تھی اور دہلی میں ٹریننگ لے رہی تھی۔ جب میری ملاقات اونکولہ سے ہوئی وہ سول سروس کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ انہی دنوں مجھے پہلی بار ورلڈ چیمپئن شپ میں شرکت کے لیے امریکا جانا تھا لیکن میرے پاس صرف پندرہ سو روپے تھے۔ جب اسے یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے چندہ جمع کر کے میرے لیے پندرہ ہزار روپوں کا انتظام کیا۔ میں اس کے خلوص اور جذبے سے بہت متاثر ہوئی اور اس طرح ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے پھر 2005ء میں ہماری شادی ہو گئی۔

س: شادی کس طرح ہوئی؟

ج: اس نے ایک سال بعد ہی مجھے پروپوز کر دیا تھا لیکن میں اور میرے گھر والے تیار نہیں تھے۔ والد کا کہنا تھا کہ میں ابھی بہت چھوٹی ہوں اور مجھے کچھ عرصہ بعد شادی کرنی چاہیے چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

س: تم نے تین سال انتظار کیا اور 22 سال کی عمر میں شادی کر لی۔ کیا اس سے تمہارا کیریئر متاثر نہیں ہوا؟

ج: بالکل نہیں، دراصل جب آپ مشہور ہو جاتے ہیں تو لوگ آپ کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ میں دہلی، بمبئی یا کول کتہ میں بوائے فرینڈ بنانا نہیں چاہتی تھی بلکہ میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد اپنے کھیل پر یکسوئی سے توجہ دے سکوں گی۔ اونکولر میرے مشن سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ میں شادی کے بعد بھی باکسنگ جاری رکھوں گی۔ میں نے 2007ء میں باکسنگ اکیڈمی قائم کی۔ میں زیادہ تر سفر میں رہتی ہوں اور میری غیر موجودگی میں وہی اس اکیڈمی کا انتظام کرتا ہے۔ اسی لیے میں نے اسے ہوم منسٹر کا خطاب دے رکھا ہے۔

س: تمہیں یہ اکیڈمی قائم کرنے کا خیال کیسے آیا؟

ج: کچھ نوجوان میرے پاس آئے اور بولے۔ میڈم! ہمیں باکسنگ سکھائیں۔ ہم آپ جیسا بننا چاہتے ہیں۔ میں انہیں انکار نہ کر سکی اور مجھے اپنا زمانہ یاد آ گیا جب خود بھی اسی طرح کھیل میں دلچسپی لے رہی تھی۔ چنانچہ میں نے انہیں اگلے ہفتے آنے کے لیے کہا۔ اس وقت بہت تھوڑے لوگ آئے تھے۔ میں نے انہیں ورزش کے وقفے کے دوران سکھانا شروع کر دیا۔ اب ان کی تعداد تیس تک پہنچ چکی ہے اور ان میں سے ایک نئی ہیت کوم، قومی چیمپئن بھی رہ چکا ہے۔

س: کیا تم صرف اپنے قبیلے کوم کے نوجوانوں کو تربیت دیتی ہو؟

ج: جی نہیں، ایسی کوئی پابندی نہیں۔ کوئی بھی لڑکا یا لڑکی اس اکیڈمی میں آ سکتی ہے۔ البتہ میں منی پور سے باہر کے لوگوں کو داخلہ نہیں دیتی کیوں میرے پاس اتنی سہولتیں نہیں ہیں۔ اب بھی تقریباً پندرہ طالب علم میرے گھر میں رہتے ہیں اور ہمیں ان کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔

س: اس اکیڈمی کے اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں۔ کیا تم طالب علموں سے کوئی فیس لیتی ہو؟

ج: میں کسی سے ایک روپیا بھی نہیں لیتی۔ یہ سب غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور میں اپنی جیب سے ان کے اخراجات پورے کرتی ہوں۔ ہمیں اسپورٹس اتھارٹی سے کچھ مشینیں ملی ہیں لیکن اس کے علاوہ کوئی انفرااسٹرکچر یہاں تک کہ باکسنگ رنگ بھی نہیں ہے۔

س: تم یہ فیصلہ کس طرح کرتی ہو کہ کسے داخلہ دینا ہے؟

ج: میں صرف جسمانی فٹنس نہیں دیکھتی۔ کوئی بھی شخص باکسنگ سیکھ سکتا ہے۔ چند دن کی تربیت کے بعد کچھ

لوگوں کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور وہ آنا چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ اس میں محنت بہت ہے۔

عالمی شہرت یافتہ باکسر میری کوم کی اپنے شوہر اونلر کیرونگ سے ملاقات ایک حادثہ تھی، جس کی تفصیل اونلر نے کچھ اس طرح بیان کی ہے۔ ''جی ہاں میں اسے ایک حادثہ کہوں گا۔ یہ 2000ء کی بات ہے۔ جب ایک غیر معروف کوم گرل نیشنل باکسنگ چیمپئن شپ میں حصہ لینے کے لیے منی پور سے بنگلور کے لیے روانہ ہوئی۔ اس سے پہلے ٹرین کے سفر میں اس کا والٹ گم ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس مرتبہ اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اس نے سوٹ کیس کو ایک زنجیر کے ذریعے اپنی کلائی سے باندھ لیا جس میں اس کا پاسپورٹ اور نقدی تھی لیکن اس کی یہ احتیاط رائیگاں گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو سوٹ کیس غائب تھا۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے میری کوم آبدیدہ ہوگئی۔ اس نے کہا۔ ان دنوں میری مالی حالت بہت خراب تھی۔ سب سے زیادہ فکر پاسپورٹ کی تھی جس کے بنوانے میں وقت لگتا۔ میں فطرتاً فائٹر ہوں لیکن اس..... لمحے میں نے خودکشی کرنے کے بارے میں سوچا میں جدوجہد کرتے کرتے تھک چکی تھی۔

اونلر اس وقت نارتھ ایسٹ اسٹوڈنٹ باڈی کا صدر تھا۔ اسے جب اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے میری کوم کو مدد کی پیشکش کی۔ ''میں پہلی بار میری سے دہلی کے نہرو اسٹیڈیم میں ملا تھا کہ وہ مشکلات کے باوجود باکسر بننے کے لیے پُرعزم ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے جس قسم کی مدد چاہیے وہ اسے مل سکتی ہے۔ وہ ایک مرتبہ میرے گھر کھانا کھانے آئی پھر ہم دوست بن گئے۔ ہماری دوستی چار سال چلتی رہی۔ پھر میں نے سوچا کہ ہمیں شادی کر لینی چاہیے۔ میں اس کے خواب کے بارے میں جانتا تھا اور ہر طرح سے اس کی مدد کے لیے تیار تھا۔

میری کوم سے ملنے کے بعد میری قسمت بدل گئی۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ بہت خوب صورت یا مشہور تھی بلکہ میں نے اس کی سادگی اور ایک کامیاب باکسر بننے کی خواہش دیکھ کر شادی کی۔ ہماری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں لیکن ہم اتنی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے جیسے صدیوں سے جانتے ہوں۔

میری کوم کی خودنوشت سوانح حیات ان بریک ایبل کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کی تقریب افتتاح کے موقع پر میری کوم نے کہا۔ میری کہانی اس ملک کی ہزاروں

عورتوں جیسی ہی ہے۔ اپنی زندگی کی جدوجہد کے بارے میں لکھنے کا مقصد دوسرے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ کبھی بھی اُمید کا دامن نہ چھوڑیں اور اپنے خوابوں کے لیے لڑتے رہیں۔''

جب اس سے دوسری کتاب لکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا۔ ''کتاب لکھنا، اولمپک میں برونز میڈل جیتنے سے زیادہ مشکل ہے۔ میں فطرتاً باکسر ہوں، لکھنا میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں عام طور پر گھر پر بیٹھ کر لکھتی تھی، جب میرے پاس فالتو وقت ہوتا تھا، اس سلسلے میں بہن نے میری بہت مدد کی۔ زندگی کے بارے میں بہت سے واقعات یاد دلائے جو میں بھول چکی تھی۔

میری کوم کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کی زندگی اور کارناموں پر بولی ووڈ میں ایک فلم بنائی گئی جس کے پروڈیوسر سنجے لیلا بھنسالی اور ڈائریکٹر اومنگ کمار تھے جب کہ ہندی فلموں کی سپر اسٹار پریانکا چوپڑا نے اس فلم میں میری کوم کا کردار ادا کیا۔ درشن کمار نے میری کوم کے شوہر اونلر اور سنیل تھاپا نے کوچ نرجیت سنگھ کے رول پلے کیے۔ یہ فلم ڈیڑھ سو ملین روپوں کی لاگت سے بنائی اور اس کا پریمیئر ٹورنٹو انٹرنیشنل فیسٹیول میں ہوا۔ بھارت میں یہ فلم 5 ستمبر 2014ء کو ریلیز ہوئی اور اسے نقادوں کے ساتھ ساتھ عام فلم بینوں نے بھی پسند کیا۔ باکس آفس پر اس کی کامیابی کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے پہلے چار ہفتوں میں چھ سو ملین روپوں کا بزنس کیا۔

پریانکا چوپڑا نے اس کردار میں خصوصی دلچسپی لی اور شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے وہ میری کوم سے ملنے منی پور گئی کہ اس کی زندگی کے بارے میں مزید جان سکے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میری کوم نے کہا۔ ''میں نے اسے اپنی زندگی کے ان گوشوں کے بارے میں بتایا جو وہ نہیں جانتی تھی۔ ایک بیوی اور ماں ہونے کے باوجود میں نے کس طرح اپنی گھریلو زندگی اور پروفیشن میں توازن برقرار رکھا ہوا ہے اور اپنی فیملی کے ساتھ کس طرح رہ رہی ہوں۔''

پریانکا نے شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے دس روز تک باکسنگ کی تربیت لی اور شوٹنگ کے دوران وہ زخمی بھی ہوئی۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ اس کے کیریئر کی سب سے مشکل فلم تھی جس میں اسے ایک گلیمرس ایکٹریس کی بجائے سخت گیر باکسر کا رول پلے کرنا پڑا۔ تاہم اس کی محنت رنگ لائی اور اسے بہترین اداکاری پر کئی ایوارڈز ملے۔

میری کوم نے حال ہی میں شائع ہونے والی ان خبروں کی تردید کی ہے جن میں اس سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ وہ شمالی مشرقی علاقوں میں کشیدگی کی وجہ سے منی پور چھوڑنے پر غور کررہی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اخبارات میں اس کے بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ میں نے کبھی منی پور چھوڑنے کی بات نہیں کی۔ میرا تعلق اسی ریاست سے ہے اور یہاں سے کہیں اور جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔

اس سے پہلے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ میری کوم منی پور میں ہونے والے حالیہ پُرتشدد واقعات سے خوف زدہ ہے جن میں باغیوں نے ایک فوجی قافلے پر حملہ کر کے بیس فوجیوں کو ہلاک کردیا تھا۔ وہ اس وقت بنگلور میں آئندہ سال ہونے والی ورلڈ چیمپئن شپ کی تیاری کررہی ہے۔ جس میں کامیابی کی صورت میں وہ 2016ء کے اولمپک گیمز کے لیے کوالی فائی کرسکے گی تاکہ اس کا سونے کا تمغہ جیتنے کا خواب پورا ہوسکے۔

معلوم ہوا ہے کہ میری کوم کے نام سے ٹیلی ویژن کے لیے ایک اینیمیٹ سیریز بنانے کی تیاری ہورہی ہے جس کا نام میری کوم جونیئر رکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں 32 سالہ باکسر نے پروڈکشن کمپنی سے معاہدہ کرلیا ہے۔ اس بارے میں اس کا کہنا ہے میں سمجھتی ہوں کہ اس بارے میں ہمیں زیادہ ذمے داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ لڑکیاں مضبوط بنیں اور ان میں اعتماد آئے۔

اس ٹی وی سیریز میں میری کوم کے بچپن، اس کی اسکول لائف اور باکسر بننے کے مراحل کا احاطہ کیا جائے گا اور اس کا مقصد کم عمر بچیوں کو اپنی حفاظت کے لیے تیار کرنا اور ایسے کھیلوں بالخصوص باکسنگ کی جانب راغب کرنا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو مضبوط بناسکیں۔

میری کوم کی جدوجہد ابھی جاری ہے۔ 32 سال کی عمر میں تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اس کا حوصلہ جوان ہے اور وہ پورے عزم کے ساتھ آئندہ سال ہونے والے مقابلوں کے لیے تیاری کررہی ہے۔ اب اس کی اگلی منزل 2016ء کے اولمپکس میں سونے کا تمغہ جیتنا ہے۔ جس کے لیے وہ بھرپور تیاری کررہی ہے۔ اس نے گزشتہ تجربات اور ناکامیوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس کی روشنی میں وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ اسے پوری اُمید ہے کہ اس بار وہ اپنے مداحوں کو مایوس نہیں کرے گی۔

تاریخ عالم

منظر امام

یہ عالم رنگ و بُو لفظِ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بِگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آتے ہی زندگی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے ہی اس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس میں ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا ساتواں حصہ

پچھلی قسط میں ہم نے تاریخ کو جلد از جلد سمیٹنے کی کوشش کی تھی تا کہ پڑھنے والوں کو تھوڑے سے مطالعے کے بعد بہت کچھ جاننے کا موقع مل جائے۔

ہم مختلف ادوار کا تجزیہ کرتے ہوئے 399 قبل مسیح تک آگئے۔ یعنی اوّل قبل مسیح سے چار سو تک۔ اس دور میں جو بڑے لوگ انسانی تاریخ میں سامنے آئے۔ ان کا مختصر ذکر کر دیا گیا تھا۔

جیسے سقراط، افلاطون، ارسطو، سکندر اعظم، مانی اور لاؤ تسو۔ یہ لوگ دنیا کے مختلف ممالک میں تھے اور مختلف قوموں سے ان کا تعلق تھا۔

ہم ارسطو تک آئے تھے۔ اب اسی عہد کا ایک اور بڑا آدمی سکندر اعظم بھی تھا۔ سکندر اعظم کی شہرت افسانوی ہو کر

رہ گئی ہے۔ بلکہ مقدر کا سکندر۔
کچھ باتیں سکندر اعظم کے حوالے سے ہو جائیں تو بہتر ہے۔

سکندر اعظم (356 تا 323 قبل مسیح)

دنیائے قدیم کا عظیم فاتح سکندر اعظم مقدونیہ میں 356 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ بادشاہ فلپ دوم صحیح معنوں میں غیر معمولی قابلیت اور بصیرت کا حامل انسان تھا۔
فقط چھیالیس برس کی عمر میں فلپ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ باپ کی موت کے وقت سکندر صرف بیس برس کا تھا۔ تاہم وہ کسی دشواری کے بغیر باپ کی جگہ اقتدار میں آ گیا کیونکہ باپ نے اپنے بیٹے کی جانشینی کے لیے راہیں ہموار کر دی تھیں۔
نوجوان سکندر کو اعلیٰ عسکری تربیت سے لیس کیا گیا تھا۔ فلپ نے اس کی ذہنی تربیت کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا تھا۔ عظیم عالم ارسطو کو اس کا اتالیق مقرر کیا تھا۔
سکندر کی فتوحات بے شمار ہیں۔ تخت نشین ہونے کے دو سال بعد ہی سکندر نے یونان اور شمالی علاقہ جات کو پھر سے فتح کر لیا جو مقدونیہ کے دباؤ سے نکل چکا تھا۔
بعدازاں وہ ایران کی طرف بڑھا۔ دو سو سالوں سے ایرانیوں نے ایک وسیع علاقے پر جو بحیرہ روم سے ہندوستان تک محیط تھا۔ ایک عظیم سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ اگرچہ ایرانی سلطنت کو اب ماضی جیسا عروج حاصل نہیں رہا تھا لیکن یہ ہنوز ناقابلِ تسخیر تھا۔ دنیا کی وسیع ترین طاقت۔
334 قبل مسیح میں سکندر ایران پر حملہ آور ہوا۔ اسے اپنی فوج کا کچھ حصہ مقدونیہ میں چھوڑنا پڑا تھا اور صرف پینتیس ہزار فوجیوں کے ساتھ ایران پر حملہ آور ہوا تھا۔
ایران کے پاس کہیں بڑی فوج تھی۔ اس کے باوجود سکندر نے شکست دے دی۔ اس کی کامیابی کی تین بڑی وجوہات تھیں۔
ایک۔ فلپ کی تیار کردہ فوج ایرانی فوجوں سے کہیں زیادہ تربیت یافتہ اور منظم تھی۔
دوم۔ سکندر ایک غیر معمولی اہلیت کا حامل سالار تھا۔ غالباً تاریخ کا سب سے بڑا جنگجو۔
سوم۔ اس کی ذاتی شجاعت مندی نے بہت اہم کردار ادا کیا۔
اپنے خاص سواروں کے رسالے کی قیادت وہ خود کیا کرتا تھا۔ جس سے اس کی فوج کے حوصلے بلند رہتے تھے۔
ایک بار محاصرے کے دوران میں اسے شاہ ایران کا ایک پیغام موصول ہوا کہ وہ اپنی نصف سلطنت کے بدلے اس سے امن معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔
سکندر کے ایک سپہ سالار پارمینو کو یہ پیشکش قابل قبول معلوم ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”اگر میں سکندر ہوتا تو یہ پیشکش قبول کر لیتا۔“
اس پر سکندر نے ایک تاریخی جملہ کہا۔ ”ہاں! میں بھی قبول کر لیتا اگر میں پارمینو ہوتا۔“
ایران کے بعد وہ مصر کی طرف متوجہ ہوا۔ کسی حملے کے بغیر اسے کامیابی حاصل ہو گئی۔ وہ صرف چوبیس برس کا تھا جب اس نے فرعون کا تاج پہنا اور خود کو دیوتا قرار دیا۔
پھر وہ ایشیا واپس آیا اور آربیلا کی فیصلہ کن جنگ میں اس نے ایرانی فوج کو مکمل طور پر اکھاڑ پھینکا۔ اس کے بعد بابل، افغانستان، ہندوستان۔
وہ ایک دانش ور بھی تھا۔ اس نے صرف فتوحات ہی حاصل نہیں کیں بلکہ تہذیبوں پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ اس نے ایرانیوں اور یونانیوں کی شادیاں کروائیں تاکہ ایک نیا تمدن سامنے آئے۔
323 قبل مسیح میں جون کے اوائل میں بابل میں سکندر اچانک بیمار پڑ گیا اور صرف دس روز بعد ہی دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ تب اس کی عمر فقط تینتیس برس تھی۔
اپنی گیارہ سالہ عسکری زندگی میں اس نے ایک بار بھی شکست نہیں کھائی۔
اب ہم چین کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں یہ زمانہ لاؤ تسو کا ہے۔
ان ہزار ہا کتابوں میں جو چین میں لکھی گئیں ایک ایسی بھی ہے جس کے سب سے زیادہ تراجم ہوئے اور جو ملک سے باہر بھی پڑھی گئی۔
یہ قریب دو ہزار سال قبل لکھی گئی اور راؤ تسو یا تاؤتی چنگ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ تاؤمت کے فلسفہ کے حوالے سے ایک بنیادی کتاب ہے۔ یہ ایک پیچیدہ اور غیر معمولی و پُراسرار انداز میں لکھا گیا ہے۔ تاؤمت کے بنیادی تصور ”تاؤ“ کا عموماً راستے کے طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔
چینی روایت کے مطابق تاؤتی چنگ کا اصل مصنف راؤ تسو یا تھا۔
قبل از مسیح چین میں بہت سے ایسے دانشور اور مفکر گزرے ہیں جن کے افکار نے چینیوں کی تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

جیسے کنفیوشس، ماؤتی، مینی لیس، چوانگ تسو وغیرہ۔

تو تاریخ کے جس حصے میں ارسطو، سقراط، افلاطون اور سکندر اعظم وغیرہ تھے اس حصے میں چین میں لاؤتسو کی کتاب ''تاؤتی چنگ'' بھی لکھی گئی تھی۔

اب ہم 300 قبل مسیح سے ہوتے ہوئے 199 قبل مسیح تک آجاتے ہیں۔ اس دور میں بھی کئی اہم کردار سامنے آئے جیسے اقلیوس، مہاراجا اشوک، ارسٹاکس آف ساموس، آرشمیوس وغیرہ۔ اس دور میں شی یانگ تی نے چین کو متحدہ کیا تھا۔

آرشمیدس دنیائے قدیم کا ایک انتہائی ذہین ریاضی داں اور سائنس داں تھا۔ اسے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے ''لیور'' (پہیا) کا اصول اور مخصوص کشش ثقل کا تصور وضع کیا۔

آرشمیدس سے صدیوں قبل لیور کے بارے میں محسوس آگاہی موجود تھی لیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے لیور کے عمل کو ایک کلیہ کی صورت میں واضح طور پر بیان کیا۔

جب کہ آرشمیدس سے بہت پہلے مصری معمار لیور کو استعمال میں لانے لگے تھے۔

کسی شے کی کثافت (جسم کی ہر اکائی کا وزن) کا تصور جو شے کے جملہ وزن کے برعکس ہے، آرشمیدس سے پہلے انسان علم کا حصہ بن چکا تھا۔

آرشمیدس کے حوالے سے یہ روایت بہت مشہور ہے کہ وہ ان ہی سب پر سوچتا ہوا نہانے کے ٹب میں داخل ہوا اور نہاتے وقت اس پر اس کلیے کا انکشاف ہوگیا۔ وہ اس حالت میں ٹب سے باہر نکل کر گلیوں میں یوریکا یوریکا پکارتا ہوا دوڑنے لگا۔ یعنی ''میں نے پالیا، میں نے پالیا۔''

بطور ریاضی داں آرشمیدس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ دراصل اس نے قریب قریب ایک داخلی علم الاحفا (Calcos) وضع کرلیا تھا جسے مکمل حالت میں اٹھارہ سو سال بعد نیوٹن نے تخلیق کیا تھا۔

اب ہم اس دور کے ایک اور اہم شخص کی طرف آتے ہیں۔ وہ ہے ہندوستان کا مہاراجا اشوک۔ ہندوستان کی تاریخ میں غالباً سب سے اہم مہاراجا، موریہ خاندان کا تیسرا فرمانروا اور اس سلسلے کے بانی چندر گپت موریا کا پوتا تھا۔

چندر گپت ایک ہندوستانی سپہ سالار تھا۔ جس نے سکندر اعظم کی یورش کے بعد کے برسوں میں شمالی ہندوستان کا بیشتر علاقہ فتح کیا اور ہندوستانی تاریخ میں پہلی بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

اشوک کا سال پیدائش نامعلوم ہے۔ غالباً 300 قبل مسیح کے بعد پیدا ہوا۔ 273 قبل مسیح میں تخت پر بیٹھا۔ اوّل اوّل اس نے اپنے دادا کی حکمتِ عملی کا اتباع کیا اور لشکر کشی کے ذریعے فتوحات حاصل کرتا چلا گیا۔

اپنے اقتدار کے آٹھویں برس اس نے ہندوستان کی مشرقی سرحدوں پر واقع ریاست کلنگا کو گھمسان کی جنگ کے بعد جیت لیا (آج اس ریاست کو اڑیسہ کہا جاتا ہے)۔ لیکن جب اسے اپنی فتح کے بعد انسانی جانوں کی قربانیوں کا احساس ہوا تو وہ خوف زدہ ہوگیا۔ ایک لاکھ انسان اس جنگ میں مارے گئے تھے۔ جب کہ اس سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے تھے۔

اس صدمے اور پشیمانی کے عالم میں اشوک نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستان کی فوجی فتح مکمل نہیں کرے گا بلکہ ہر طرح کی جارحانہ کارروائیوں کو ترک کردے گا۔

اس نے بدھ مت کو مذہبی فلسفے کے طور پر اپنا لیا اور دھرم کی فضیلتوں کو واضح کرنے کی کوشش کی۔

ذاتی طور پر اشوک نے شکار ترک کردیا اور سبزی خور بن گیا۔ جب کہ زیادہ اہم وہ صلح جویانہ اور سیاسی حکمت عملیاں ہیں جو اس نے اختیار کیں۔

اس نے بہت سے اصلاحی کام کیے۔ اسپتال اور جانوروں کے اصطبل تعمیر کروائے۔ سخت قوانین کو ختم کیا۔ سڑکیں بنوائیں اور نظام آب پاشی کو ترقی دی۔

بدھ مت کے پھیلاؤ میں اشوک کا بہت بڑا حصہ ہے۔

اس نے حکم دیا کہ اس کی زندگی کی تفصیلات اور اس کی حکمتِ عملیوں کو بڑی چٹانوں اور ستونوں پر کندہ کروا کے تمام سلطنت میں نصب کیے جائیں۔ ان میں سے کئی ابھی تک باقی ہیں۔

ان یادگاروں کے پھیلاؤ سے ہمیں اشوک کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔

اب آجائیں چین کی طرف۔ تاریخ کے اس دور میں عظیم چینی شہنشاہ یوانگ تی 210 تا 238 قبل مسیح تک چین پر حکمران رہا۔ اس نے عسکری قوت سے چین کو متحدہ کیا اور متعدد جامع اصلاحات کیں۔ ان اصلاحات نے چین کے تہذیبی اتحاد کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا جو آج بھی موجود ہے۔

شی یوانگ تی 259 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ 210 قبل مسیح میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ چاؤ خاندان کے دورِ اقتدار کے آخری دنوں میں پیدا ہوا تھا۔

اس زمانے میں چین بے شمار جاگیردارانہ ریاستوں میں تقسیم تھا۔ یہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ شی ہوانگ تی نے اپنی عسکری قوت کے بل پر سب کو زیر کر کے ایک عظیم سلطنت کی بنیاد رکھی اور خود کو ہوانگ تی کہلوایا۔ یعنی "اوّلین بادشاہ"۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ چین کی سرحدوں پر موجود بے شمار دیواروں کو ایک سلسلے میں جوڑ دینا ہے اور یہی دیوار دنیا کی سب سے بڑی دیوار چین ہے۔ جو آج بھی عجوبے میں شامل ہوتی ہے۔

اب ہم تاریخ کا سفر طے کرتے ہوئے 101 قبل مسیح سے 200 قبل مسیح تک کے حالات کا جائزہ لے رہے ہیں۔

200 قبل مسیح

لیو یانگ نے ہانی خاندان کی بنیاد رکھی۔ اور اس دور میں روم نے یونان پر قبضہ کرلیا۔

اب آجاتے ہیں سن 200 قبل مسیح سے 100 قبل مسیح تک۔ اس کے بعد، بعد از مسیح کا ذکر ہوگا اور تاریخ کے اس مطالعے کو سمیٹ دیا جائے گا لیکن مجھے اس بات کا اطمینان ضرور ہوگا کہ خاص خاص واقعات اور کردار پڑھنے والوں تک پہنچ گئے ہیں۔

سن 100 قبل مسیح، جولیس سیزر نے گاڈل قوم پر فتح پائی۔

جولیس سیزر چونکہ تاریخ کا ایک اہم انسان ہے اس لیے اس کے بارے میں اگر تھوڑی تفصیل دے دی جائے تو بہتر ہے۔

مشہور رومی عسکری اور سیاسی قائد جولیس سیزر 100 قبل مسیح میں پیدا ہوا جو غیر معمولی سیاسی ابتری کا دور تھا۔

جولیس سیزر نے اپنی دانش مندی، بہادری اور تدبر سے عسکری فتوحات حاصل کیں۔ سازشوں کا خاتمہ کیا۔ وہ ایک فوجی آمر تھا لیکن اس نے اپنے دورِ اقتدار میں بے شمار اصلاحات بھی کیں۔

کیا وہ ایک کامیاب سیاست داں، زیرک سپہ سالار اور ایک شاندار خطیب اور مصنف تھا۔

اس کی کتاب De Bello galico کو جو گاڈل کی جنگ کی تفصیلات پر مبنی ہے۔ کلاسکی ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔

سیزر ایک نڈر، جوشیلا اور خوب صورت انسان تھا۔ اس نے کئی معاشقے کیے۔ اس کا سب سے مشہور معاشقہ قلوپطرہ سے تھا۔ اسے روم میں قتل کیا گیا۔

اس کی تمام اصلاحات میں سے ایک جس نے سب سے زیادہ دیرپا اثرات چھوڑے۔ وہ ایک نئے کیلنڈر کا اجرا تھا۔ جو ترمیم اس نے متعارف کروائی وہ معمولی سی ترمیم کے ساتھ آج بھی رائج ہے۔

اور یہی دور آگسٹس سیزر کا ہے۔ سلطنت روما کا بانی آگسٹس سیزر تاریخ کی چند عظیم مرکزی شخصیات میں سے ایک ہے۔ وہ 63 قبل مسیح میں پیدا ہوا اور جولیس سیزر کا منہ بولا بیٹا تھا۔ اس کا نام اوکتاوین تھا۔

سیزر کی موت کے بعد اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہو گئی تھی۔ پھر آگسٹس اور انتھونی کے درمیان طویل جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں عارضی وقفے کے دوران میں انتھونی قلوپطرہ سے محبت کی پینگیں بڑھاتا رہا۔ جب کہ آگسٹس نے اپنی عسکری قوت مضبوط کرنا شروع کر دی۔

اگلے برس جنگ پھر چھڑی اور اوکتاوین (آگسٹس) کو مکمل فتح حاصل ہوگئی اور انتھونی، قلوپطرہ نے خودکشی کرلی۔

مکمل اختیار میں آنے کے بعد آگسٹس حیرت انگیز طور پر صلح جو ہو گیا تھا۔ وہ غالباً تاریخ میں ایک قابل اور کریم النفس آمر کی بہترین مثال ہے۔ وہ ایک سچا سیاست داں تھا۔ اس کی صلح جویانہ حکمتِ عملیوں نے رومی خانہ جنگیوں سے پیدا ہونے والے خلفشار کو دور کیا۔ اس نے تقریباً چالیس برس روم پر فرمانروائی کی۔

ہم قبل از مسیح کے تقریباً تمام اہم واقعات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ دنیا کے مختلف ممالک میں زندگی اور تہذیب کس رفتار سے سفر کرتی رہی۔

اب ہم بعد از مسیح کی تاریخ کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یاد کریں کہ ہماری تاریخ کا یہ سفر کہاں سے شروع ہوا تھا۔

اس وقت سے جب انسان نے کرۂ ارض پر اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر پتھروں کا عہد، دھاتوں کا عہد اور ہوتے ہوتے ہم بعد از مسیح تک آگئے ہیں۔ بعد از مسیح وقت اور زندگی کی رفتار بہت تیز تھی۔

اس عہد کا سب سے بڑا واقعہ اور سب سے بڑا کردار تو خود حضرت عیسیٰؑ ہیں۔ ان کا زمانہ 6 قبل مسیح سے تیس عیسوی تک کا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ہماری مذہبی کتابوں میں اور دوسرے حوالوں سے اس قدر لکھا گیا ہے کہ ان کی تفصیل دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک عیسوی سے سو عیسوی تک سینٹ پال نے عیسائیت کی تبلیغ کی۔ تحریر اور تالیف کا کام شروع کیا۔ مسیحی الہمات کو وضع کرنے کا کام بنیادی طور پر سینٹ پال نے سر انجام دیا۔

سینٹ پال عہد نامہ جدید کے ایک بڑے حصے کے مصنف تھے۔ وہ یسوع مسیح کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ایک سے سو عیسوی تک کے اہم ترین واقعات قابلِ ذکر ہیں (حضرت عیسیٰ کو مصلوب کرنے کی کوشش بھی اسی دورانیے میں ہوتی ہے)۔

سن ایک سو ایک سے ایک سو نانوے عیسوی تک۔

اس پوری صدی کا اہم ترین واقعہ جس نے انسانی تاریخ بدل کر رکھ دی وہ کاغذ کی ایجاد تھا۔ اس کے بعد رومی سلطنت کا عروج، بطلیوس، گیلن وغیرہ۔

تسائی لون

کاغذ کے موجد تسائی لون کا نام بہت سے قارئین کے لیے زیادہ معروف نہیں ہے اس شخص کی اس ایجاد نے انسانی ترقی کی رفتار کو پر لگا دیے۔ اس نے 105ء میں شہنشاہ کو کاغذ کے نمونے پیش کیے تھے۔

تسائی لون کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ چینی تاریخی دستاویزات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک مخنث تھا۔ شہنشاہ تسائی لون کی اس ایجاد سے بہت خوش تھا۔ اس نے تسائی لون کو انعام واکرام دینے کے علاوہ اس کا عہدہ بھی بڑھا دیا تھا۔ بعدازاں وہ شاہی محل کی سازشوں میں مبتلا ہو گیا۔ اسے معتوب ٹھہرایا گیا۔ احساسِ جرم کی وجہ سے اس نے خودکشی کر لی تھی۔

بہرحال اس کی زندگی کے واقعات اور حالات چاہے کچھ بھی ہوں اس کی ایجاد نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

اور یہ وہی زمانہ ہے جب رومی سلطنت نے بے پناہ عروج حاصل کیا۔ اس کی بنیاد آگسٹس سیزر نے رکھ دی تھی۔ جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اب آتے ہیں سن 200 عیسوی سے سن 300 عیسوی تک۔

یعنی ان ایک سو برسوں میں دنیا میں کیسے بڑے واقعات رونما ہوئے اور کون کون سے کردار سامنے آئے۔

یہاں ایک بار پھر یہ واضح کر دیا جائے کہ یوں تو دنیا کے ہر حصے میں کوئی نہ کوئی عظیم الشان واقعہ ضرور رونما ہوا ہوگا یا کوئی بڑا کردار سامنے آیا ہوگا لیکن ہم یہاں ان کرداروں اور ان واقعات کا جائزہ لے رہے ہیں جنہوں نے تاریخ پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔

اس سو سال کے عرصے میں چین میں یان خاندان کا اختتام ہوا اور مانی نے میسوپوٹیمیا ایران میں اپنی تعلیمات کا پرچار شروع کیا۔

ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ 226 عیسوی میں ساکا اور ستیان کی بلاوا قوم کے سرداروں نے مشرقی ایران، سیستان، بلوچستان، سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ میں جاگیریں قائم کر کے وسیع سلطنت بنا لی اور کوشانی قوم کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔

اس دور کا ایک اہم کردار مانی ہے۔

مانی کا زمانہ 216 عیسوی سے 276 عیسوی تک کا ہے۔

مانی، مانی مت کا بانی تھا۔ آج یہ مذہب باقی نہیں رہا۔ لیکن اپنے عروج کے زمانے میں اس کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مشرقِ وسطیٰ میں اس کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد مانی مت مغرب میں بحر اوقیانوس اور مشرق میں بحرالکاہل تک پھیل گیا۔

مانی نے جو مذہب تخلیق کیا وہ قدیم مذاہب کے خیالات کا ایک دلچسپ امتزاج تھا۔ مانی کے مطابق زرتشت، بدھا اور یسوع مسیح پیغمبر تھے لیکن مانی مت کی صورت میں یہ ایک ہی مذہب اب مکمل ہو گیا تھا۔

مانی نے تعلیم دی کہ دنیا پر ایک ہستی کی حکومت نہیں ہے بلکہ اس مسلسل دکھائی دینے والے عمل میں دو قوتیں کارفرما ہیں۔ ان میں سے ایک شر ہے جسے مانی نے ظلمت اور مادے سے مماثل قرار دیا۔ دوسری قوت خیر کی ہے جسے اس نے نور اور روح کہا۔ (بظاہر یہ خدا اور شیطان کے تصور کا اعادہ ہے)۔

اس نے انسانی روح کو خیر کی اور انسانی جسم کو شر کل قرار دیا۔ جس سے یہ عقیدہ وجود میں آیا کہ تمام جنسی تعلقات سے اجتناب ضروری ہے۔ یہ گوشت خوری اور شراب نوشی سے بھی منع کرتا ہے لیکن یہ اصول عام لوگوں کے لیے نہیں ہیں۔ خاص لوگوں کے لیے ہیں۔

مانی 216 عیسوی میں میسوپوٹیمیا میں پیدا ہوا اور وہ علاقہ اس وقت چارنفیس خاندان کی ایرانی سلطنت میں شامل تھا۔ مانی خود فارسی النسل تھا۔

بارہ برس کی عمر میں ہی اس پر بقول اس کے وحی نازل

ہونی شروع ہوئی۔ بیس برس کا ہوا تو اس نے اپنے نئے عقیدے کا پرچار شروع کردیا۔

اپنے آبائی وطن میں ابتدا میں اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر وہ شمالی مغربی ہندوستان چلا گیا۔ جہاں وہ ایک مقامی حکمران کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

242 عیسوی میں وہ ایران واپس آیا۔ بادشاہ شاپور اوّل نے اسے اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت دے دی۔ مانی نے بہت سے پیروکار جمع کرلیے۔ زرتشت مت کے لیے اس کا عروج ناقابلِ برداشت تھا۔

276 عیسوی کے قریب نئے بادشاہ بیرام اوّل کی تخت نشینی کے بعد مانی کو گرفتار کر کے قید کردیا گیا۔ جہاں چھبیس روز تک بے پناہ تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

اپنی زندگی میں اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے ایک فارسی زبان میں ہے۔ باقی سریانی میں ہیں۔

ہم دوسو عیسوی سے دوسو ننانوے عیسوی تک آگئے ہیں۔

اب ہم جائزہ لیتے ہیں تین سو عیسوی سے تین سو ننانوے عیسوی تک کا۔ آئیں دیکھیں کہ اس دور میں کیا بڑے واقعات رونما ہوئے۔

اوّلین عیسائی شہنشاہ روم کا سٹنٹائن اوّل، آرڈیالیس کی جنگ میں رکابوں اور کھمڈہ کاٹھیوں سے آراستہ سے سواروں کے گومتک دستے نے رومی پیادہ فوج کو شکست دی۔

ہندوستان میں کوہستانی خاندان کے زوال اور خاتمے کے بعد گپتا خاندان کی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ 320 عیسوی میں اس خاندان کا ایک حکمران چندر گپت مہاراجا دھیراجا کے لقب سے وادی گنگا سے نکلا اور اس نے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کی غرض سے ایک مہارانی کمار دیوی سے شادی کرلی۔ پھر جلد ہی چڑھائی کر کے اودھ اور الہ آباد تک قابض ہوگیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سمدرا گپت تخت نشین ہوا۔

سمدرا گپت نے دکن کی سرزمین کو فتح کر کے وہاں کے راجاؤں کو اپنا مطیع بنالیا۔ سمدرا گپت کے بعد اس خاندان کا مشہور بادشاہ چندر گپت ثانی بکرماجیت حکمران ہوا۔ جس نے 375 عیسوی سے 413 عیسوی تک حکومت کی۔

اس بادشاہ کے عہد میں برہمنوں کو بہت عروج حاصل ہوا۔ بدھ مت کے مقابلے میں قدیم برہمن مت فروغ پانے لگا۔ سن سکرت زبان کو ازسر نو رائج کیا گیا۔ پرانوں اور مذہبی کتابوں پر نظر ثانی کی گئی۔ سن سکرت کی مشہور زمانہ ڈراما نویس کالی داس اس بادشاہ کے عہد میں گزرا ہے۔ (جس کا ناٹک شکنتلا اپنی مثال آپ ہے)۔

کانس ٹن ٹائن اعظم۔ اس کا زمانہ 280 عیسوی سے 337 عیسوی کا ہے۔

کانس ٹن ٹائن روم کا پہلا عیسائی شہنشاہ تھا۔ اس نے عیسائیت کے فروغ کے لیے بہت سے کام کیے۔ اس کے علاوہ اس کی دیگر اصلاحات بھی قابلِ ذکر ہیں۔

اس کا ایک بڑا کارنامہ قدیم بازنطین شہر کی تعمیر بھی ہے۔ اس شہر کو اس نے کالن ٹنٹی نوبیل کا نام دیا اور اسے اپنا دارالحکومت بنالیا۔ وہی شہر آج استنبول کہلاتا ہے اور دنیا کے چند بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔

ہم تین سو ایک عیسوی سے سفر کرتے ہوئے چار سو عیسوی تک آچکے ہیں۔ اب اس سے آگے کی تاریخ کچھ یوں ہے۔

یہ تاریخ 400 عیسوی سے 499 عیسوی تک ہے۔ اس صدی کے چند بڑے واقعات کچھ یوں ہیں۔

روم کا زوال شروع ہوتا ہے۔ سینٹ آگسٹائن کا دور۔ اینگلز سکین قوم انگلستان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ مغربی سلطنت روما کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

اب ہندوستان کی طرف آئیں۔

ہندوستان میں گپت خاندان کے بکراجیت کی حکومت ہے۔

اس دور میں ہندوستان میں آرٹ کو بہت ترقی ہوئی۔ سنگ تراشی کے بہت خوب صورت نمونے سامنے آئے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیاں بھی بہت زبردست بنائی جارہی ہیں۔

413 عیسوی میں چندر گپت نے دہلی کے قریب مہرولی میں لوہے کی ایک لاٹھ نصب کروائی۔ جس پر اس کے نام کا کتبہ درج ہے۔ یہ لاٹھ آج تک موجود ہے۔

ہم 499 عیسوی تک آچکے ہیں۔ اس سے آگے تاریخ اور بھی تیز رفتار ہوتی جارہی ہے۔ واقعات اور کردار کا انبار لگا ہوا ہے۔

بہرحال ہم کوشش کریں گے کہ خاص خاص واقعات اور کرداروں کو سمیٹتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں۔

(جاری ہے)

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے دوسرے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنھیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

اس ماہ کئی افراد کا تذکرہ دوبارہ مگر الگ انداز سے کیا گیا ہے تاکہ شخصیت کا خاکہ ذہن میں تازہ رہے

☆ فیض احمد فیض

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحرا میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

ان کے اشعار بھی عجیب ہیں۔ سنتے جائیں، سر دھنتے جائیں۔ بے قرار کو اُن کے مصرعوں سے قرار آجاتا۔

اردو شاعری کا ایک عہد غالب تو دوسرا اقبال سے منسوب۔ اس کے بعد کی صدی فیض کے نام ٹھہری۔ پوری دو نسلوں کو متاثر کیا۔ اب اپنی قوت سے تیسری نسل کے دلوں پر دستک دے رہے ہیں۔ ان کے اشعار زبان زدخاص وعام ہوئے۔ گیتوں کی صورت انھوں نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کیا۔ ان کے مصرعے مظلوم کی پکار بن گئے۔ گوکہ ان کا بہت ہلکا سا ذکر نومبر 15ء میں برسی کے موقع پر کیا جاچکا ہے۔ مگر نسبتاً مفصل معلومات ملاحظہ کرکے گزشتہ معلومات کو پیوستہ کرلیں کیونکہ ان کی عظمت کا ایک سبب ان کی جدوجہد بھی ٹھہری۔ جیل یاترا اور ان کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ جلاوطنی نصیب بنی۔ وہ ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ ادب میں یہی روش اختیار کی۔ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان کے بانی ارکان میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے اشعار نے اس تحریک کے لیے تیل کا کام کیا۔

ان کے مجموعے نقش فریادی، دست صبا، زنداں نامہ، دست تہ سنگ، سروادیٔ سینا، شام شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر کے زیر عنوان منظر عام پر آئے۔ انھیں بین الاقوامی شہرت ملی۔ لینن ایوارڈ سمیت کئی اہم اعزازات سے نوازے گئے۔ ان کی کلیات ''نسخہ ہائے وفا'' کا شمار اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں ہوتا ہے۔ اقبال بانو کی ملک گیر شہرت میں کچھ کمال فیض کی شاعری کا بھی ہے۔ ''ہم دیکھیں گے'' اور ''دشت تنہائی میں'' کا طلسماتی اثر درحقیقت فیض ہی کے لحن کی دین تھا۔

13 فروری 1911 کو وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

ایک علمی و ادبی گھرانے میں پرورش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے حاصل کی۔ 1921 میں اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ اسکول ہی کے زمانے میں فارسی اور عربی سیکھی۔ ایف اے انھوں نے مرے کالج سیالکوٹ سے کیا۔ میر مولوی شمس الحق ان کے اساتذہ میں شامل تھے، جو شاعر مشرق کے بھی استاد رہے۔ گریجویشن اور انگریزی میں ماسٹرز کا مرحلہ گورنمنٹ کالج لاہور سے طے کیا۔ بعدازاں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے کیا۔ اوائل میں تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں لیکچرر رہے۔ 1942 میں فیض صاحب فوج میں کیپٹن ہوگئے۔ محکمۂ تعلقات عامہ میں کام کیا۔ پہلے میجر پھر لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی۔ 1947 میں فوج سے مستعفی ہوکر واپس لاہور آگئے۔ 1959 میں پاکستان آرٹس کونسل میں سیکریٹری تعینات ہوئے، تین برس وہاں بتائے۔ 1964 میں لندن سے واپسی پر آپ عبداللہ ہارون کالج کراچی میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1947 تا 1953 وہ مدیر ادب لطیف اور مدیر لوٹس رہے۔

1930 میں ایلس فیض سے شادی ہوئی۔ اُن کی بیگم بھی اہم سماجی شخصیت تھیں۔

اب ذکر جیل یاترا کا ہوجائے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی وصل کی راحت کے سوا

کئی بار پابند سلاسل رہے۔ نمایاں ترین راولپنڈی سازش کیس ٹھہرا۔ 9 مارچ 1951 کو انھیں اس سازش میں معاونت کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ چار سال سرگودھا، ساہیوال، حیدرآباد اور کراچی کے جیلوں میں گزارے۔ اپریل 1955 میں رہائی نصیب ہوئی۔ ان کے مجموعے زنداں نامہ کی بیشتر نظمیں اُسی عرصہ میں لکھی گئیں۔

ایک زمانے میں ترقی پسند ادب کی مخالفت زوروں پر تھی، البتہ یہ حلقہ فیض کا ذکر احترام سے کیا کرتا تھا۔ سبب یہ رہا کہ ان کے شاعرانہ اظہاریے کی کوئی اور نظیر نہیں ملتی۔ ان کے استعارے، الفاظ اور تلازمے آج بھی زندہ ہیں۔ موضوعات تو شاید ہی کبھی پرانے ہوں۔ دراصل انہوں نے آفاقی موضوعات کا انتخاب کیا تھا۔ سماجی مسائل کو مختلف احساسات سے جوڑتے ہوئے یادگار نظموں کی صورت دی۔

مغرب میں انھیں اردو شاعری کا نیرودا کہا جاتا تھا۔ دراصل پابلو نیرودا اور فیض کو لگ بھگ یکساں حالات کا سامنا رہا۔ دونوں نے حقیقی مسائل کو موضوع بنایا۔ سلامتی اور امن پر قلم اٹھایا۔ فیض صاحب کا 20 نومبر 1984 کو لاہور میں انتقال ہوا۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

☆ فضل محمود

یہ اُس زمانے کی بات ہے، جب کرکٹ شرفا کا کھیل ہوا کرتا تھا۔ مقابلہ کتنا ہی کڑا ہو، تہذیبی اطوار سے روگردانی کی اجازت نہ تھی۔ اس زمانے کے کرکٹرز جنٹلمین تھے۔ انتہائی مہذب، سلجھے ہوئے، پڑھے لکھے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ برطانوی آداب معاشرت کو عام کرنے میں کرکٹ کا بڑا کردار رہا۔

کاردار کے بعد دوسری نفیس مثال فضل محمود ٹھہرے۔ انتہائی وجیہہ۔ کرکٹ کی سمت نہ آتے تو فلموں میں ہیرو ہوتے۔ ہر دل عزیز انسان تھے۔ آج بھی ان کی مثال دی جاتی ہے۔

وہ 18 فروری 1927 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی کرکٹر تھے۔ پھرتیلے۔ محنتی۔ متحدہ ہندوستان میں شمالی پنجاب کی کرکٹ ٹیم سے رنجی ٹرافی میں حصہ لے کر فرسٹ کلاس کرکٹ کا آغاز کیا۔ جلد ہی اپنی دھاک بیٹھا دی۔ وہ دائیں ہاتھ کے فاسٹ میڈیم بالر تھے۔ ان کی ہوا کو چیرتی ہوئی گیند کا پورے پنجاب میں چرچا تھا۔ اسی زمانے میں تقسیم کا واقعہ ہوا۔ یہ گوہرِ نایاب پاکستان کے حصے میں آیا۔ 16 اکتوبر 1952 کو انھوں نے دہلی میں بھارت کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا۔ اگلے دس برس تک پاکستان کی نمائندگی کی۔ آخری بار 62ء میں انگلینڈ کے خلاف ایکشن میں دکھائی دیے۔

ان دس برسوں میں فقط 34 ٹیسٹ میچ کھیلے مگر وکٹوں کی تعداد حیران کن رہی۔ جی ہاں، پورے 139 شکار کیے۔ 13 بار ایک اننگز میں پانچ وکٹیں لیں، چار بار ایک میچ میں دس وکٹیں لینے کا کارنامہ انجام دیا۔ وہ آف کٹر اور لیگ کٹر دونوں

طرح کی گیندیں کرانے کے لیے مشہور تھے۔ گیند پر زبردست کنٹرول اور پچ پر مسلسل موومنٹ اُن کا امتیاز تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ خوبصورت انسان کرکٹ کی دنیا میں خوف کی علامت تھا۔

1952 کی ٹیسٹ سیریز میں لکھنؤ کے میدان میں پاکستان نے بھارت کے خلاف جو تاریخی کامیابی حاصل کی، اس کا سہرا فضل محمود ہی کے سر، جنھوں نے 94 رنز دے کر 12 وکٹیں لیں اور جیت میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسری اننگز میں وہ بھارت پر قہر بن کر ٹوٹے اور سات وکٹیں لے اڑے۔

1954 کے دورۂ انگلینڈ نے اس باصلاحیت بولر کو افسانوی شہرت دے ڈالی۔ وہ چار میچز کی سیریز تھی۔ جب آخری میچ کے لیے دونوں ٹیمیں اوول میں سامنے آئیں، تو پاکستان ایک صفر کے خسارے میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سیریز انگلینڈ کے نام رہے گی۔

پہلی اننگز میں فضل محمود 6 وکٹیں لے اڑے، مگر پاکستان کے دیگر بلے باز بری طرح ناکام رہے۔ آخری اننگز میں انگلینڈ کو فقط 168 رنز کا ٹارگیٹ ملا۔ انھوں نے دو وکٹوں کے نقصان پر 109 رنز بنا لیے تھے، مگر پھر... فضل کا ستارہ چمکا۔ انھوں نے حیران کن بولنگ کرتے ہوئے تین اہم بلے بازوں کو پویلین کی راہ دکھائی۔ اس دن کے اختتام پر جب کپتان نے فضل سے پوچھا، نوجوان میچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تو انھوں نے اعتماد سے جواب دیا: سر، میچ میری جیب میں ہے۔

ایسا ہی ہوا۔ اگلی صبح ... انھوں نے دو وکٹیں مزید لیں۔ پاکستان 24 رنز سے وہ میچ جیت گیا۔ نئی تاریخ رقم ہوئی۔ اگلے برس انھیں وزڈن کرکٹر آف دی ایئر کا خطاب دیا گیا۔ مبصرین نے کہا: "یہ شخص مردوں کا ہیرو اور عورتوں کے دلوں کی دھڑکن ہے۔" ان کی شہرت سے متعلق ایک قصہ بڑا مشہور ہوا۔ برطانیہ کے ایک پرائمری اسکول میں ایک استانی نے طلبا و طالبات سے پوچھا۔ "پاکستان کس خطے میں ہے؟ کسی کو جواب نہیں پتا تھا۔ آخر ایک بچی کھڑی ہوئی۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا۔ "پاکستان وہاں ہے، جہاں فضل رہتا ہے۔" اس قصے کے بعد ان کی بابت مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

زندگی کے آخری حصے میں وہ خاصے مذہبی ہو گئے تھے۔

30 مئی 2005 کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

☆ جوش ملیح آبادی

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے دل برباد کیا
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

بیسویں صدی کس شاعر کے نام رہی؟ اس سوال کے جواب میں شاید بیش تر نقاد فیض کا نام لیں، مقبولیت کا ہیرا بھی ان ہی کے تاج میں جڑا ہے۔ البتہ ایک حلقہ ایسا بھی ہے جو اپنا فیصلہ جوش کے حق میں سناتا ہے۔ ان کے انتقال کو چار عشرے ہونے کو ہیں، لیکن یادوں کے نقش دھندلے نہیں پڑے۔ وقت کے ساتھ اُن کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ ان پر جامعات میں مقالے لکھے جا رہے ہیں۔

اس قادر الکلام شاعر کا تعلق آفریدی قبیلے سے تھا۔ وہ 5 دسمبر 1898 کو اتر پردیش کے مردم خیز علاقے ملیح آباد کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پورا نام شبیر حسین خان۔

اس خاندان میں نواب فقیر محمد خان، نواب محمد احمد خان اور امیر احمد خان جیسے شاعر اور ادیب گزرے۔ صحافی اور اسکالر عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اسی گھرانے سے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے سے حاصل کی۔ سینٹ پیٹرز کالج، آگرہ سے سینئر کیمبرج کا مرحلہ طے کیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم بھی متوازی چلتی رہی۔ وہ ٹیگور کے شانتی نکیتن میں بھی زیرِ تعلیم رہے، تاہم 1916 میں والد کے انتقال کی وجہ سے وہ تعلیمی منصوبے مکمل نہیں کر سکے۔

1925 میں اُنھوں نے ریاست حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کی ذمے داری سنبھالی۔ البتہ یہ زمانہ مختصر رہا۔ چند مؤرخین کے مطابق اس کا سبب نظام کے خلاف نظم لکھی تھی۔ پھر انھوں نے کلیم نامی پرچے کی بنیاد رکھی، جس کے ذریعے انگریز راج سے آزادی کے حق میں رائے عامہ ہموار کی۔ ان کی معرکۃ الآرا مرثیہ "حسین اور انقلاب" نے انہیں شاعر انقلاب کا خطاب دلوایا۔ وہ کمیونسٹ سے زیادہ انقلابی تھے۔ وقت کے ساتھ آزادی کے حق میں ان کی آواز بلند ہوتی گئی۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے نمایاں سیاست

دانوں سے تعلق قائم ہوا، جن میں پنڈت نہرو سرفہرست تھے۔ تقسیم کے بعد وہ ''آج کل'' کے ایڈیٹر ہوگئے۔

1958 میں پاکستان چلے آئے۔ اس کے پیچھے وہ خدشات تھے، جو ہندوستان میں اردو کو لاحق تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہرو نے انھیں ایسا نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کے قریبی حلقے کہتے ہیں، بعد میں وہ پاکستان آنے کے فیصلے پر افسوس کیا کرتے تھے۔

ادھر وہ انجمن ترقی اردو سے منسلک ہوگئے، اردو لغت کی تیاری سمیت کئی اہم منصوبوں میں معاونت کی۔ اردو کے ساتھ انھیں عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا۔ یہ لسانی مہارت بڑی کام آئی۔

شعری سفر کئی عشروں پر محیط ہے۔ اس نے نسلوں کے ادبی ذوق کی آب یاری کی۔ نئے رجحانات متعارف کروائے۔ اردو شاعری کو عصر سے جوڑا۔ انھیں کثیر التصانیف کہا جاتا ہے۔ ان کے شعری مجموعے کسی خزانے سے کم نہیں۔ نثر میں بھی اپنی مثال آپ۔ نثری تخلیقات مقالات جوش، اوراق زریں، جذبات فطرت، اشارات، مقالات جوش، مکالمات جوش کے عنوان سے آئیں۔ خودنوشت ''یادوں کی برات'' کو شاہکار کا درجہ حاصل ہے۔ یہ اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ معروف ہدایت کار ڈبلیو زیڈ احمد کے مشورے پر انھوں نے فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔

22 فروری 1982 کو اسلام آباد میں وہ 83 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے دے کر ہٹ گئے احباب

انھیں کتنے ہی اعزازات سے نوازا گیا۔ ہجرت سے قبل 1954 میں ہندوستانی حکومت نے انھیں پدم بھوشن جیسا اہم ایوارڈ دیا۔ ادیبوں کے ایک حلقے نے انھیں صدی کا سب سے بڑا شاعر ٹھہرایا۔ 2012 میں حکومتِ پاکستان نے ان کے لیے ہلال پاکستان کا اعلان کیا۔

☆ قدرت اللہ شہاب

اردو کی مقبول ترین کتب کی فہرست ترتیب دی جائے اور اس میں شہاب نامہ کا تذکرہ نہ ہو، یہ کیوں کر ممکن ہے۔ اور یہ مقبولیت قابلِ فہم ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی سوانح عمری ہے، جسے کبھی پاکستان کا سب سے بااثر بیوروکریٹ تصور کیا جاتا تھا۔ ایوب خان کے زمانے میں وہ طاقت کا مرکز رہے۔ البتہ ان کی افسانوی شہرت کی وجہ ادیبوں کا وہ حلقہ بنا، جو انھیں ایک صوفی کے روپ میں دیکھتا تھا۔ ان میں ممتاز مفتی نمایاں تھے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ بھی ان کے معتقدین میں شامل تھے، جن کی کتابوں میں شہاب سے متعلق محیر العقول واقعات ملتے ہیں۔ ویسے ان کی اپنی کتاب میں بھی ایسے کئی قصے موجود ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ قدرت اللہ شہاب نے تقسیم کے بعد اردو ادب میں مابعدالطبیعاتی حلقہ قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا، تو غلط نہیں ہوگا۔ اس عمل نے شہرت تو عطا کی، مگر مخالفین بھی پیدا ہوئے۔ ناقدین انھیں ادیبوں کو تقسیم کرنے، ایک مخصوص نظریے کے ادب کی ترویج اور مارشل لا کی چھتری تلے قلم کاروں کو اکٹھا کرنے کا الزام دیتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب 26 فروری 1917 کو گلگت میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ریاست جموں وکشمیر اور ضلع انبالہ میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے انگلش کیا۔ 1941 میں انڈین سول سروس میں شامل ہوئے۔ ابتدا میں بہار اور اڑیسہ میں خدمات انجام دیں۔ 1943 میں بنگال میں پوسٹنگ ہوگئی۔ قحط کے زمانے میں انھوں نے متاثرین کی بحالی کے لیے اہم اقدامات کیے۔ مسلمانوں کی جانب جھکاؤ فطری تھا۔ ایک اہم سرکاری دستاویز چپکے سے قائداعظم کو بھی پہنچائی۔

قیام پاکستان کے بعد حکومتِ آزاد کشمیر کے سیکریٹری جنرل ہوگئے۔ گورنر جنرل پاکستان غلام محمد کا سیکریٹری بننا بڑی کامیابی تھی۔ ان کا اثر بڑھنے لگا۔ وہ اسکندر مرزا اور بعدازاں ایوب خان کے بھی سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں بیوروکریسی میں قدرت اللہ شہاب کی بڑی گرفت تھی۔ ادیب بھی اسی زمانے میں ان کے گرد اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔

پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد انھوں نے سول سروس سے استعفیٰ دے دیا اور اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو سے وابستہ ہوگئے۔ وہ ایک معنوں میں جلاوطنی کا زمانہ تھا، جہاں انھیں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

انھوں نے مقبوضہ عرب علاقوں میں اسرائیل کی شرانگیزی کا جائزہ لینے کے لیے خفیہ دورہ کیا اور اس کا پردہ چاک کیا۔ ان ہی کی کوششوں سے مقبوضہ عرب علاقوں میں یونیسکو کا منظور شدہ نصاب رائج ہوا۔

بیوروکریسی اور ان کی صوفیانہ شبیہہ کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان ان کی تخلیقی جہت کو ہوا۔ وہ بہت عمدہ قلم کار تھے۔ فکشن نگاری میں بڑی گرفت تھی۔ ”ماں جی“ جیسا شاہکار افسانہ ان کے قلم سے نکلا۔ ان کی کہانیوں میں جنسی اور نفسیاتی پہلوؤں کا بڑا پختہ بیان ہوتا۔ ناولٹ ”یا خدا“ انتہائی متاثر کن تخلیق ہے۔ 24 جولائی 1986 کو اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا۔ شہر اقتدار ہی ان کا آخری ٹھکانا ٹھہرا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

☆یحییٰ خان

جنرل آغا محمد یحییٰ خان کا تعارف فقط یہ نہیں کہ وہ پاکستان کی بری فوج کے تیسرے سربراہ اور پاکستان کے پانچویں صدر تھے، ان کا تذکرہ اس سانحے کے بغیر ادھورا ہے، جس نے پاکستان دولخت کر دیا۔ جی ہاں، 16 دسمبر 1971 کو جب سقوطِ ڈھاکا ہوا، ملٹری اور سول قیادت کی باگ دوڑ یحییٰ خان کے ہاتھ میں تھی۔ شاید کچھ حلقے سارا الزام مجیب الرحمان پر تھوپ دیں، کچھ گروہ ذوالفقار علی بھٹو کو قصوروار ٹھہرائیں، مگر منطق اور دلیل یہ کہتی ہے کہ جو سب سے طاقتور اور بااختیار شخص ہوتا ہے، ذمّے داری بھی اسی کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ سربراہ مملکت کی غفلت اور بے پرواہی سانحات کو جنم دیتی ہے۔ سقوط ڈھاکا کے بعد اُنھیں طویل عرصے تک نظر بند رکھا گیا۔

یحییٰ خان نے 4 فروری 1917 کو چکوال میں آنکھ کھولی۔ اجداد براستہ افغانستان برصغیر آئے تھے۔ تعلق قزلباش قبیلے سے تھا۔ سات بہن بھائیوں میں چھٹے تھے۔ ان کے والد خان بہادر آغا سعادت علی خان انڈین پولیس میں افسر تھے۔ ابتدائی تعلیم گجرات سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ پھر انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون کا رخ کیا۔ 1938 میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ دوسری عالمی جنگ میں متعدد محاذوں پر لڑے۔ 1945 میں کمانڈ اینڈ اسٹاف کالج کوئٹہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ بعد ازاں انسٹرکٹر رہے۔

قیام پاکستان کے بعد کئی اہم ذمّے داریاں نبھائیں۔ 1962 میں مشرقی پاکستان کے گیریژن آفیسر کمانڈنگ مقرر ہوئے۔ 1965 کی جنگ میں نمایاں خدمات کے صلے میں ہلال جرأت کا اعزاز دیا گیا۔ ستمبر 1966 میں جنرل موسیٰ خان کے ریٹائر ہونے پر افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔

وہ انتشار کا دور تھا۔ مارشل لا مخالف تحاریک زوروں پر تھیں۔ معاہدہ تاشقند کے خلاف طلبا تحریک شدت اختیار کر گئی۔ اسے بہ زور قوت دبایا گیا، مگر اثرات ختم نہیں کیے جا سکے۔ وزارت خارجہ کا قلمدان چھننے کے بعد بھٹو نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی، تو عوام میں موجود ایوب مخالف جذبات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ 1966 میں عوامی لیگ نے مشہور زمانہ 6 نکات پیش کر دیے، جنھیں مغربی پاکستان اور حکومت نے علیحدگی کے مترادف ٹھہرایا۔ شیخ مجیب الرحمان گرفتار ہوئے، ادھر بھٹو کی تحریک زور پکڑنے لگی۔

نومبر 1968 میں سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ نے بحالی جمہوریت کی تحریک شروع کر دی۔ مارچ 1969 میں ایوب خان کی گرفت کمزور پڑنے لگی، تو جمہوریت کو موقع دینے کی بجائے ایک اور مارشل لا کے لیے راہ ہموار کی جانے لگی۔ 25 مارچ 1969 کو ایوب خان نے قوم سے خطاب میں اقتدار سے الگ ہونے کا اعلان کیا، تو ادھر یحییٰ خان نے باقاعدہ مارشل لا نافذ کر دیا۔

کچھ بڑے فیصلے کیے گئے، جن میں اگلے سال عام انتخابات کا فیصلہ سب سے اہم تھا۔ جون 1970 میں سرحد اور بلوچستان کی صوبائی حیثیت بحال کر دی گئی۔ سابق ریاست بہاول پور کو پنجاب میں اور کراچی کو سندھ میں شامل کر دیا گیا اور سابق سرحدی ریاستوں سوات، دیر اور چترال کو ملا کر مالاکنڈ ایجنسی قائم کی گئی۔

7 ستمبر 1970 کو قومی اسمبلی اور 17 دسمبر کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے، جنھیں ملکی و غیر ملکی مبصرین پاکستان کی تاریخ میں پہلے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات قرار

دیتے ہیں، مگر ان کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔ اقتدار کی کشمکش نے بگاڑ کو جنم دیا۔ مشرقی پاکستان انتشار کی لپیٹ میں آگیا۔ بھارتی مداخلت، اپنوں کی موقع پرستی، غلط فیصلوں اور حکمرانوں کی غفلت کے نتیجے میں 16 دسمبر 1971 کو مشرقی پاکستان بنگلا دیش میں ڈھل گیا۔ عوام کے بڑھتے دباؤ کے باعث 20 دسمبر 1971 کو جنرل یحییٰ نے اقتدار پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دیا۔ عوام کے غیظ و غضب کو بنیاد بنا کر 8 جنوری 1972 کو انھیں نظر بند کر دیا گیا۔ جولائی 1977 میں ضیاالحق کی آمد کے بعد نظر بندی ختم ہوئی۔

یحییٰ خان کے کردار پر کئی رنگین دھبے ہیں۔ کئی متنازع کہانیاں ہیں۔ 10 اگست 1980 کو ان کا انتقال ہوا۔

☆ طاہر القادری

اُن کا پہلا حوالہ درس و تبلیغ ہے، معتقدین کی تعداد لاکھوں میں ہیں، ہندوستان سمیت دنیا بھر میں ان کے چاہنے والے ہیں۔ سیاست دوسرا حوالہ ہے۔ پہلے پہل الیکشن کی راہ چنی، پھر دھرنوں کے راستے پر چل پڑے۔ 2014 میں تو وہ خبروں کا محور بنے رہے۔ تین ماہ تک دنیا بھر کے کیمرے ان پر مرکوز تھے۔ ان کے بیانات کبھی دھمکی آمیز ہوتے، کبھی رقت آمیز۔ خاصا ادھم رہا تھا۔

مغرب کے لیے وہ اسلام کا معتدل چہرہ ہیں۔ خود کش حملوں اور دہشت گردوں کے سخت ناقد ہیں۔ انگریزی میں اظہار کی قابلیت رکھتے ہیں۔ بین المذاہب مکالمے کے حامی۔ ایک عرصے سے بیرونِ ملک مقیم ہیں۔ اس باعث ان کی رائے کی رسائی بہت زیادہ ہے۔

تحریک منہاج القرآن کے بانی محمد طاہر القادری 19 فروری 1951 کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن ان کے ادارے کی ذیلی تنظیم ہے۔ انھوں نے منہاج یونیورسٹی بھی قائم کی اور پاکستان عوامی تحریک کے نام سے سیاست میں قدم رکھا۔ وہ 1980 سے اپنی تنظیم کے پلیٹ فورم سے تبلیغ میں مصروف ہیں۔ شیخ سید طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی کے مرید ہیں۔ انھیں 1994 میں چکوال کے معروف بزرگ سید رسول شاہ خاکی نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔

طاہر القادری نے معروف عالم دین ڈاکٹر فرید الدین قادری کے گھر آنکھ کھولی۔ اجداد سیال خاندان سے تھے، جو چنیوٹ روڈ پر واقع گاؤں کھیوا کے نواب تھے۔ طاہر القادری اوائل سے انقلابی رجحانات رکھتے تھے۔ 1971 میں انھیں معروف مفکر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی صحبت ملی، جس نے ان کی فکر کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

آنے والے برسوں میں جہاں امام غزالی، شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی، مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر کا مطالعہ کیا، وہیں کارل مارکس، فریڈرک اینجلس، لینن، اور ماؤزے تنگ کو بھی پڑھا۔ وہ انقلابی تحریک کے لیے ذہن سازی کا زمانہ تھا۔

جدوجہد کا آغاز 1976 میں جھنگ میں قائم ہونے والی نوجوانوں کی تنظیم محاذِ حریت سے کیا، جسے 1980 میں تحریک منہاج القرآن کا نام دے دیا گیا۔ اس دوران تصنیف و تالیف اور درسِ قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں لیکچرز دیتے رہے۔ فیڈرل منسٹری آف ایجوکیشن کے ممبر رہے۔ دھیرے دھیرے شہرت ملک میں پھیلنے لگی۔ پی ٹی وی کے پروگرام "فہم القرآن" نے بھی ان کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ کسی زمانے میں میاں صاحب کے بے حد قریب تھے۔ نواز شریف کی اتفاق مسجد میں انھیں خطیب مقرر کیا گیا۔

ان کے سیاسی اور انقلابی نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے، مگر ان کی تعلیم اور زندگی کے دیگر شعبوں میں خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ 1995 میں انھوں نے عوامی تعلیمی منصوبہ کی بنیاد رکھی، جسے کچھ حلقے غیر سرکاری سطح پر ایشیا کے چند بڑے تعلیمی منصوبہ میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے تحت پاکستان کے طول و عرض میں 572 تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ پھر لاہور میں قائم ہونے والی منہاج یونیورسٹی بھی ایک اہم ادارہ ہے۔

☆ عارفہ کریم

ہماری بدحالی اپنی جگہ، شعبہ تعلیم کی زبوں حالی کا بھی اعتراف، یہ بھی سچ ہے کہ ترقی کے لیے مختص بجٹ کا بڑا حصہ کرپشن کی نذر ہو جاتا ہے، مگر اس کے باوجود اس زرخیز زمین سے کیسی کیسی کونپلیں پھوٹیں۔ یہاں کیسی کیسی نابغۂ روزگار شخصیات

نے جنم لیے۔ اس آسمان پر کتنے ہی ستارے چمکے۔ بڑے تو بڑے، بچوں نے بھی ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ ملالہ یوسف زئی پہلی مثال نہیں۔ اس سے پہلے ایک عارفہ کریم بھی تو گزری تھی، جسے لوگ عبقری طفل (Prodigy) کہا کرتے تھے۔ یعنی ایسا بچہ جو خداداد صلاحیتوں کا مالک ہو۔

2 فروری 1995 کو پیدا ہونے والی اس عارفہ کریم کو قدرت نے روشن ذہن عطا کیا تھا۔ 2004 میں فقط نو برس کی عمر میں مائیکرو سافٹ کی تصدیق شدہ پروفیشنل (MCP) بن کر اس نے تہلکہ مچا دیا۔ امن و امان کی مخدوش صورتِ حال کے حوالے سے یاد کیے جانے والے پاکستان کو یکدم نئی شناخت ملی، تو اس کا سبب یہی بچی تھی۔ بل گیٹس نے عارفہ کو مائیکر سافٹ کے دفتر مدعو کیا، تو پاکستانیوں کے سر فخر سے بلند ہوگئے۔

اس نے جدید ٹیکنالوجی سے متعلق دنیا بھر میں ہونے والے سیمینارز اور کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ حکومت نے بھی اپنی اس بیٹی کو پرائیڈ آف پرفارمینس سے نوازا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والی کم عمر ترین شخصیت تھی۔ وزیراعظم کی جانب سے فاطمہ جناح میڈل بھی عارفہ کو دیا گیا۔ اس کے جذبے نے پاکستانی بچوں کو جوش سے بھر دیا۔ لاہور کا عارفہ سوفٹ ویئر ٹیکنالوجی پارک اُس سے موسوم ہوا۔ پاکستانی بچوں نے عارفہ کو آئیڈیل بنایا۔ (گو کہ مارچ 2006 میں بابر اقبال نامی بچے نے کم عمر ترین مائیکروسافٹ پروفیشنل بن کر اس کا ریکارڈ توڑ دیا) اس وقت عارفہ زندہ تھی۔ اس نے بابر کو مبارک باد دی۔ ستمبر 2014 میں ایان قریشی نے فقط پانچ برس کی عمر میں یہ ریکارڈ بنا کر عارفہ کی یاد تازہ کر دی۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں، اجلے انسانوں کی زندگی تھوڑی ہوتی ہے، باصلاحیت انسانوں کو خدا جلد اپنے پاس بلوا لیتا ہے۔ یہی کچھ عارفہ کے ساتھ ہوا۔ 22 دسمبر 2011 کو اسے مرگی کا دورہ پڑا۔ دماغ اس دورے سے بری طرح متاثر ہوا۔ اسے سی ایم ایچ لاہور میں ایڈمٹ کر دیا گیا، مگر حالت بگڑتی گئی اور وہ کوما میں چلی گئی۔ اس واقعے نے پورے ملک کو سوگوار کر دیا۔ بین الاقوامی میڈیا میں بھی اس کی بازگشت سنائی دی۔ بل گیٹس کی جانب سے عارفہ کے والدین سے رابطہ کیا گیا اور بین الاقوامی معالجین کا ایک پینل تشکیل دیا گیا، جو اس کیس میں پاکستانی ڈاکٹروں کی معاونت کرتا رہا۔ 13 جنوری 2012 کو اس کی حالت میں کچھ بہتری دیکھی گئی، مگر اُمید عارضی تھی۔ 14 جنوری 2012 کو یہ ہیرا ہم سے چھن گیا۔ اس کی تدفین میں مشاہیر کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

اور تو خیر کیا رہ گیا
ہاں مگر ایک خلا رہ گیا

☆چوہدری رحمت علی

جو گزاری نہ جا سکے ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

تحریکِ پاکستان نے ہمیں کیسے کیسے ستارے عطا کیے۔ سب ہی پوری قوت سے چمکے۔ بس، ان میں سے چند کی روشنی ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ شاید وہ ہم سے بہت دور تھے۔ ہمارا دھیان ہی ان کی سمت نہیں گیا۔ چوہدری رحمت علی بھی ایسا ہی ایک نام ہیں۔ اگر انھیں تحریکِ پاکستان کا خاموش سپاہی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ المیہ دیکھیں، اس محسن کا جسدِ خاکی آج کیمبرج کے قبرستان میں دفن ہے۔ انھیں امانتاً دفن کیا گیا تھا۔ مختلف اوقات میں ان کے جسدِ خاکی کو پاکستان لانے کے اعلانات کیے گئے، مگر وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے۔

چوہدری رحمت علی 16 نومبر 1897 کو مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور کے زمین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں دینی تعلیم حاصل کی۔ میٹرک انھوں نے اینگلوسن سکرت ہائی اسکول جالندھر سے کیا۔ 1914 میں لاہور کا رخ کیا، جہاں وہ اسلامیہ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم رہے۔

مولانا شبلی سے بہت متاثر تھے۔ 1915 میں اسلامیہ کالج میں بزمِ شبلی کی بنیاد رکھی۔ اسی پلیٹ فورم سے انھوں نے پہلے پہل (1915 میں) ہندوستان کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔ (چند مورخین کے نزدیک یہ معاملہ متنازع ہے) 1918 میں گریجویشن کرنے کے بعد وہ کشمیر گزٹ نامی اخبار میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوگئے۔ 1928 میں ایچی سن کالج میں اتالیق مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد برطانیہ کا رخ کیا۔ کیمبرج اور ڈبلن یونیورسٹیوں سے قانون اور سیاست میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔

1933 میں برصغیر کے طلبا پر مشتمل ایک تنظیم پاکستان

نیشنل لبریشن موومنٹ قائم کی۔ یہ ایک بڑا قدم تھا، جو برصغیر کی سیاست پر دوررس اثرات مرتب کرنے والا تھا۔ اسی سال دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر اپنا مشہور کتابچہ Never or Now (اب یا کبھی نہیں) شائع کیا، جس میں لفظ پاکستان استعمال کیا گیا۔ اس کی بازگشت بہت دور تک سنی گئی۔

انھوں نے پاکستان، بنگلستان اور عثمانستان کے نام سے تین دیگر ممالک کا بھی نقشہ پیش کیا۔ ان کے پیش کردہ نقشے میں پاکستان میں کشمیر، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے علاقے شامل تھے۔ دہلی بھی پاکستان میں شامل تھا۔ 1935 میں .... انھوں نے کیمبرج سے جو ہفت روزہ نکالا، اس کا نام پاکستان ہی تھا۔

وہ 23 مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں لاہور آنا چاہتے تھے لیکن چند روز قبل ہونے والے پُرتشدد واقعات کی وجہ سے ان کے پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کردی گئی۔ 1947 میں انھوں نے اقوام متحدہ میں کشمیر پر اپنا مؤقف پیش کیا۔ 6 اپریل 1948 کو پاکستان آئے تھے، مگر پاکستانی بیوروکریسی اس باصلاحیت اور صاحب کردار انسان کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔

29 جنوری 1951 کو ان پر نمونیے کا حملہ ہوا۔ 3 فروری 1951 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

☆ شعیب ملک

شماران کا پاکستان کرکٹ کے معروف ترین کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں کپتانی کا تاج بھی ان کے سر تھا۔ کچھ ان کی شادی بھی خبروں میں رہنے کی وجہ بنی کہ بیگم بڑی مقبول ہیں، اس کے باوجود مبصرین متفق ہیں کہ شعیب ملک نے جو کچھ حاصل کیا، وہ اس سے بہت زیادہ کے حق دار تھے۔ کچھ پسند ناپسند، کچھ گروہ بندیاں، پھر ان کی اپنی غفلت، ایک ایسا کھلاڑی جو جم کر پاکستان کی خدمت کرسکتا تھا، کپتانی سے محروم ہونے کے بعد ان آؤٹ کے بھنور میں پھنس گیا۔

اس آل راؤنڈر نے 227 ون ڈے میچز میں 5,990 رنز بنائے اور 147 وکٹیں لیں۔ 33 ٹیسٹ میچز میں 1,851 رنز اور 21 وکٹیں اپنے نام کیں۔ ایک شان دار ڈبل سنچری بھی بنائی۔

شعیب ملک یکم فروری 1982 کو سیالکوٹ، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ اوائل میں آف اسپنر تھے، مگر بلے بازی کی صلاحیت بھی جلد ہی آشکار ہوگئی۔ ایسے آل راؤنڈر ثابت ہوئے، جو محدود اوور کی کرکٹ میں کسی بھی نمبر پر کھیل سکتا ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے، پچ پر ٹھہرتے ہیں، جب تقاضا ہوتا ہے، آگے بڑھ کر ہٹ لگاتے ہیں۔

ون ڈے ڈیبیو 1999 میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم کے خلاف کیا۔

ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز 2001 میں بنگلادیش کے خلاف ہوا۔ جلد ہی نظروں میں آگئے۔ کچھ ہی برس بعد وہ ٹیم کا مستقل حصہ تھے۔ آف اسپن بولنگ اور سودمند بیٹنگ کے ساتھ ان کی فیلڈنگ بھی باکمال تھی۔ ہاں، ایک مرحلے پر ان کا ایکشن زیرِ عتاب آیا اور اسے غیر قانونی قرار دیا گیا، مگر بعد میں بازو کی سرجری اور مشق سے انھوں نے اس مسئلے سے نجات حاصل کرلی۔

کپتانی تو ان کا نصیب بنی ہی تھی، مگر بدقسمتی سے یہ واقعہ وقت سے کچھ پہلے ہوگیا۔ وہ ابھی نوجوان تھے اور 2007 ورلڈ کپ میں شکست کے بعد ٹیم اور کرکٹ بورڈ بڑی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ انضمام الحق کی ریٹائرمنٹ کے بعد محمد یوسف، محمد یونس اور شعیب ملک کا نام اگلے کپتان کے طور پر لیا جانے لگا۔ زیادہ تر لوگ یونس کے حق میں تھے اور شاید وہی اس وقت بہتر انتخاب تھے، مگر صورتِ حال میں تبدیلی آئی اور کپتانی کا تاج شعیب کے سر رہا۔

اوائل میں ان کی کارکردگی بہت اچھی رہی۔ چھوٹی ٹیموں کے خلاف انھوں نے تسلسل سے فتوحات حاصل کیں، مگر بڑی ٹیموں کے مدمقابل ان کی ٹیم کی ناتجربے کاری عیاں ہوگئی۔ حسبِ روایت کپتان کو شکستوں کا ذمے دار ٹھہرایا گیا۔

کوچ اور بورڈ خلاف ہوگئے، نیا کپتان چنے کا فیصلہ کیا گیا، اس بار قرعہ فال یونس خان کے نام نکلا۔ یوں وہ باصلاحیت کھلاڑی اور کپتان جو پاکستان کو ٹی 20 ورلڈ کپ کے فائنل تک لے گیا، یکدم مشکلات میں گھر گیا۔ حالاں کی ان کی قیادت میں 36 میں سے 24 ون ڈے میچز میں پاکستان فاتح رہا تھا۔ جن 17 ٹی 20 میچز میں وہ کپتان رہے، ان میں سے 12 میں فتح ملی۔

انھیں ٹیم سے باہر کردیا گیا، اگر شامل کیا جاتا تو بھرپور موقع نہیں ملتا۔ ایک زمانے میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ ان کا کیریر ختم ہوگیا، مگر 2014 میں ان کی واپسی ہوئی، تو یکسر الگ روپ میں نظر آئے۔ کارکردگی میں واضح بہتری دیکھی گئی۔ پھر محمد حفیظ کے ایکشن پر پابندی لگنے کے بعد ان کی اہمیت بڑھ گئی۔ اِس وقت وہ ٹیسٹ سے ریٹائرمنٹ لے چکے ہیں، مگر ون ڈے اور ٹی 20 ٹیم کا حصہ ہیں۔

2010 میں شعیب ملک خبروں کی زینت بنے رہے۔ اس کا سبب ہندوستان سے تعلق رکھنے والی بین الاقوامی شہرت یافتہ ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا سے ان کی شادی تھی۔ پھر ایک تنازع اور تھا۔ ہندوستان کا ایک خاندان یہ دعوے دار تھا کہ شعیب ملک ان کے داماد ہیں۔ الغرض ہندوستان ان کا سسرال بننے کے لیے بے چین تھا۔ خیر، 12 اپریل 2010 کو ان کی شادی ہوگئی اور ان تنازعات کا خاتمہ ہوا۔ بعد میں ثانیہ مرزا اکثر میچز میں شعیب ملک کی حوصلہ افزائی کرتی نظر آئیں۔

☆ فخر الدین جی ابراہیم

ان کی زندگی مختلف ادوار میں منقسم ہے۔ ایک زمانے میں وہ منصف تھے، تب انھوں نے مارشل لا کی چھتری تلے حلف لینے سے انکار کرکے جرأت کی انوکھی مثال قائم کی۔ آنے والے دور میں بہ طور قانون داں عزت کمائی۔ گورنر بھی رہے۔ پھر انھیں پاکستان کے اہم ترین انتخابات کے لیے الیکشن کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ الیکشن بے ضابطگیوں کی وجہ سے متنازع رہے۔ ان کا ہاتھ تو صاف تھا، مگر ادارہ پرفارم نہ کرسکے، تو سربراہ ہی ذمے دار ٹھہرتا ہے۔ یہی فخر الدین جی ابراہیم المعروف فخرو بھائی کے ساتھ ہوا۔ جب ہم انھیں ایک منصف، قانون دان اور سابق گورنر سندھ کے طور پر یاد کرتے تھے، تو ان کی ایمان داری، سچائی اور قابلیت کی مثال دی جاتی ہے، مگر الیکشن کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے صورت حال ذرا مختلف رہی۔

وہ 2 فروری 1928 گجرات میں پیدا ہوئے۔ تعلق پڑھے لکھے متوسط طبقے سے تھا۔ قابل طالب علم تھے۔ 1952 میں انگلینڈ سے قانون کی ڈگری لی۔ وہاں سے لوٹ کر کراچی کو مسکن بنایا۔ ان دنوں ان کے محسن زیڈ اے سلہری سینٹرل جیل کراچی میں نظر بند تھے۔ جرم اخبار میں ایک کارٹون چھاپنا تھا، جس میں مشرقی پاکستان کو شعلوں میں گھرا دکھایا گیا تھا۔ وہ زیڈ اے سلہری سے ملنے جیل جایا کرتے۔ وہیں مشہور ترقی پسند رہنما حسن ناصر بھی قید تھے۔

نوجوان فخر الدین جی ابراہیم نے ان کا مقدمہ لڑا۔ ان کی مخلص کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئیں۔ حسن ناصر کو بعد میں شہید کردیا گیا۔

انھوں نے کیریر میں بڑی کامیابی حاصل کیں۔ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، سپریم کورٹ کے جج رہے۔ اٹارنی جنرل اور وفاقی وزیر قانون جیسے اہم عہدے سنبھالے۔ اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ جب راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی، انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی سب سے بڑی اور روشن مثال ضیا دور میں سامنے آئی۔

1981 میں وہ سپریم کورٹ کے جج تھے۔ جنرل ضیاالحق نے ججز کو پی سی او کے تحت حلف اٹھانے کا حکم دیا۔ فخر الدین جی ابراہیم سپریم کورٹ کے ججز میں جونیر تھے، مگر انھوں نے اصولوں کو پیشِ نظر رکھا اور انکار کردیا۔ حرف انکار آمر کو کہاں گوارا تھا۔ ملازمت سے فارغ کردیے گئے۔

بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں انھوں نے گورنر سندھ کا عہدہ سنبھالا۔ یہ اپریل 1989 کا ذکر ہے۔ کراچی میں Citizen Police Liaison Committee (CPLC) کے قیام میں ان کا کردار کلیدی رہا۔ وہ فقط ایک برس گورنر کے عہدے پر رہے۔ علیحدگی کا سبب اصولی اختلاف ٹھہرا۔

1995 میں آسٹریلوی کھلاڑیوں نے جب پاکستانی کپتان سلیم ملک پر الزامات لگائے، تو ان کی انکوائری فخرو بھائی ہی نے کی۔ 2006 میں پاکستان کرکٹ بورڈ نے اینٹی ڈوپنگ کمیٹی بنائی، تو وہ ان کے چیئرمین تھے۔ 14 جولائی

2012 کو وہ الیکشن کمیشن پاکستان کا سربراہ مقرر ہوئے۔ 2013 کے عام انتخابات ان ہی کی سربراہی میں ہوئے۔ مبصرین کے مطابق ان کی کوششیں مخلص تھیں، مگر بدحال نظام کے باعث وہ اس ذمے داری کو احسن طور پر نہیں نبھا سکے۔ صدارتی انتخابات کے فوری بعد 31 جولائی 2013 کو انھوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

☆اسفندریار ولی

عوامی نیشنل پارٹی کے موجودہ سربراہ اسفندیار ولی کی کہانی ان کے والد اور دادا کے تذکرے کے بنا ادھوری ہے۔ وہ خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان کے پوتے ہیں، جنھوں نے خدائی خدمت گار تحریک کی بنیاد رکھی اور سرحد (موجودہ کے پی کے) کے گاندھی کہلائے، ان کے والد ولی خان کا شمار تقسیم کے بعد سرحد کے اہم ترین سیاست دانوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے بحالی جمہوریت کے لیے طویل جدوجہد کی، کتنے ہی برس پابند سلاسل رہے۔ اس گھرانے نے سیاست کو بیگم نسیم ولی خان جیسی خاتون دیں۔ ترقی پسند افکار کی حامل نیپ جیسی جماعت کی تشکیل اور ترقی میں اس خاندان کا کردار کلیدی رہا۔ یہی جماعت بعد میں عوامی نیشنل پارٹی میں تبدیل ہوئی۔ جب عوامی نیشنل پارٹی بنی، تو ولی خان ہی پہلے سربراہ تھے۔ دیگر پاکستانی سیاسی جماعتوں کے مانند یہ بھی الزامات کی زد میں رہی۔

اسفند یار ولی 19 فروری 1949 کو چھ سدہ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد جیل میں تھے۔ انھیں جنم دیتے ہوئے ان کی والدہ چل بسیں۔ انھوں نے لاہور اور پشاور سے تعلیمی مدارج طے کیے۔ خاندانی روایت پر عمل کرتے ہوئے نوجوانی میں سیاست میں قدم رکھ دیا۔ ایوب خان کے خلاف شروع ہونے والی طلبا تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مخالفین ان پر افغان حکمران داؤد خان کی حمایت میں عسکری جدوجہد کا بھی الزام عائد کرتے ہیں۔ 1975 میں ان پر حیات شیر پاؤ کے قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ وہ گرفتار ہوئے۔ ان پر تشدد کیا گیا۔ حیدر آباد ٹریبونل نے انھیں قصور وار ٹھہرایا۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد 1978 میں وہ رہا ہوئے۔ اگلے چند برس انتخابی سیاست سے دور رہے۔ 1990 میں وہ صوبائی اسمبلی کے رکن بنے۔ 1993 میں نیشنل اسمبلی تک پہنچے۔ 1997 میں پھر منتخب ہو کر نیشنل اسمبلی کا حصہ بنے۔ 1999 میں وہ اے این پی کے صدر بنے۔ البتہ 2002 کے انتخابات میں انھیں خلاف توقع شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اگلے برس وہ سینیٹر ہوگئے۔ 2008 کے انتخابات اُن کے لیے اہم ثابت ہوئے۔ ان کی پارٹی نے خیبر پختون خوا میں حکومت بنائی۔ سندھ میں وہ حکومت کے اتحادی تھے۔

پانچ برس وہ آصف علی زرداری کی حکومت میں شامل رہے، اس دوران انھیں شدید مشکلات درپیش تھیں۔ سرحد بدترین دہشت گردی کی لپیٹ میں تھا۔ دھماکوں کا نہ رکنے والا سلسلہ، ٹارگیٹ کلنگ، ان کے رہنما اور کارکن قتل کیے گئے۔ خود اسفندیار پر بھی حملے ہوئے۔ کرپشن کی بازگشت الگ۔ ادھر کراچی میں لسانی فسادات کے الزامات کا سایہ ان کی پارٹی پر پڑا۔ ناقص کارکردگی کا اثر 2013 میں نظر آیا، جہاں ان کی پارٹی کو بدترین شکست ہوئی۔

☆عبدالرب نشتر

تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے میں شامل یہ کارکن ایک مخلص اور دیانت دار انسان تھا، جس کی سیاست خدمت کے جذبے سے سرشار تھی۔ مخالفین بھی ان کے ایثار کی مثال دیتے تھے۔ ذاتی رائے پر وہ جمہوری فکر اور دلائل کو ترجیح دیتے۔

یہ ذکر ہے سردار عبدالرب نشتر کا، جنھوں نے 13 جون 1899 کو پشاور کے ایک کاکڑ خاندان میں آنکھ کھولی۔ نشتر ان کا تخلص تھا، ان کا مطمع نظر تنقید برائے اصلاح رہا۔ خود احتسابی کو فوقیت دیتے تھے۔ میٹرک کا مرحلہ 1918 میں مشن ہائی اسکول سے طے کیا۔ گریجویشن کے لیے انھوں نے ایڈورڈ کالج، لاہور کا رخ کیا۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی پہنچے، جہاں سے 1925 میں ایل ایل بی کی ڈگری

لی۔ سیاست کی سمت آنا لگ بھگ طے تھا۔ اس وقت کانگریس سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ 1928 سے 1931 تک وہ اس جماعت سے وابستہ رہے۔ 1929 تا 1938 انھوں نے پشاور میونسپل کمیٹی کے کمشنر کی حیثیت سے ذمے داری نبھائی۔ جلد انھیں احساس ہو گیا کہ کانگریس برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ 1932 میں وہ مسلم لیگ کی سمت چلے آئے۔ جلد اُن کا شمار نمایاں سیاست دانوں میں ہونے لگا۔ قرارداد مقاصد کی منظوری ان کا اصل کارنامہ ہے۔ یہ قرارداد پاکستان کے آئین کا حصہ ہے۔ سیالکوٹ کے سالانہ اجلاس میں قائداعظم محمد علی جناح نے انگریزی میں تقریر کی، تو اس کا ترجمہ سردار عبدالرب نشتر ہی نے کیا۔ مسلمانوں کو ہندو بنانے کی شدھی اور سنگھٹن تحریکیں شروع ہوئیں، تو آپ نے ان سے مقابلے کے لیے ادارہ تبلیغ اسلام بنایا۔

قیام پاکستان کے بعد وہ پہلی کابینہ میں وزیر مواصلات بنے۔ اسی کابینہ نے میانوالی ہائیڈل پاور پراجیکٹ کی منظوری دی تھی، جو آج کالا باغ ڈیم کا منصوبہ کہلاتا ہے۔ سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے دوسرے گورنر تھے۔ انھوں نے اگست 1949 تا نومبر 1951 یہ ذمے داری نبھائی۔

شاہی قلعہ لاہور کا مرکزی دروازہ طویل عرصے سے بند تھا، اس کے پیچھے شاید انگریزوں کا متعصبانہ رویہ تھا، قیام پاکستان کے بعد سردار عبدالرب نشتر نے اِسے کھلوایا۔ 14 فروری 1958 کو کراچی میں فوت ہوئے۔ آپ کو مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے کہنے پر مزار قائد کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

☆ راشد منہاس

"تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر" شاعر مشرق کا یہ مصرع شاید راشد منہاس جیسے نوجوانوں کے لیے تھا۔ نوجوان، جو ستاروں پر ڈالتے ہیں کمند۔ نشانِ حیدر حاصل کرنے والے سب سے کم عمر پاکستانی اور پاک فضائیہ کے پہلے آفیسر کی محبت کا نشان پاکستان کے اٹھارہ کروڑ عوام کے دلوں پر ثبت ہے۔

راشد منہاس نے 17 فروری 1951 کو کراچی میں آنکھ کھولی۔ راولپنڈی کے میری کیمبرج اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور سینئر کیمبرج کراچی سے کیا۔ سترہ سال کی عمر میں پاک فضائیہ کی رسالپور اکیڈمی میں بہ طور فلائنگ کیڈٹ داخلہ لیا۔ 1971 میں گریجویشن کیا۔ لڑاکا پائلٹ کی تربیت حاصل کرنے کے لیے کراچی میں پی اے ایف بیس مسرور میں پوسٹنگ ہوئی۔

بظاہر اس نوجوان کی زندگی معمول کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی، وہ وجیہہ اور زندگی سے بھرپور تھا۔ البتہ اُس میں کچھ ایسا تھا، جس کی اوروں کو خبر نہیں تھی۔ ایک خواہش اس کے سینے میں پنپتی تھی۔ حب الوطنی کا جذبہ دل میں جوش مارتا تھا۔ یہ نوجوان اپنے بہنوئی میجر ناصر احمد خان سے

بہت زیادہ متاثر تھا، جنھیں ستارۂ جرأت سے نوازا گیا تھا۔ اس کے مطالعے کا محور بھی جنگ پر تحریر کردہ کتب تھیں۔ وہ نڈر انسانوں کے اقوال ڈائری میں محفوظ کر لیا کرتا، جن میں یہ قول بھی شامل تھا۔ "ایک شخص کے لیے سب سے بڑا اعزاز اپنے ملک کے لیے خود کو قربان کر دینا اور قوم کی اُمیدوں پر پورا اترنا ہے۔"

سچ تو یہ ہے کہ قدرت نے اسے ایک عظیم کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ پھر مقررہ دن آن پہنچا۔ 20 اگست 1971 کو زیرتربیت پائلٹ کی حیثیت سے راشد منہاس ٹی 33 جیٹ ٹرینر کو اڑانے کی تیاری میں تھے، جب ایک بنگالی انسٹرکٹر مطیع الرحمان غیر متوقع طور پر اُن کے ساتھ سوار ہوا۔ دورانِ پرواز مطیع الرحمان نے راشد منہاس کو سر پر شدید ضرب لگا کر پرواز کا کنٹرول سنبھالنے کی کوشش کی اور جہاز کا رخ ہندوستان کی جانب موڑ دیا۔

دشمن ملک کچھ میل دور تھا کہ نڈر راشد منہاس نے اپنے حواس پر قابو پالیا۔ نوجوان پائلٹ کے پاس اپنے طیارے کو ہندوستان لے جانے سے روکنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ راشد منہاس نے ہندوستانی سرحد سے محض 32 میل دور طیارہ گرا کر اپنی جان وطن کے لیے قربان کر دی۔

ماں کے لیے بیٹے کی جدائی بڑا کرب ہے، مگر راشد منہاس کی دلیری نے ہر ماں کا سر بلند کر دیا۔ وہ نشانِ حیدر کے حق دار ٹھہرے۔ اُنھیں 21 اگست 1971 کو مکمل فوجی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔

☆ آغا طالش

نگار ایوارڈ ایک زمانے میں سب سے بڑا فلمی اعزاز تھا، یہ نشان سپاس فن کار کو مستند ٹھہراتا، اس کا قد بڑھاتا، جن صاحب کا ہم اب تذکرہ کر رہے ہیں، انھیں ایک دو نہیں، پورے سات ایوارڈ ملے۔ مگر یہ امر حیران کن نہیں۔ ان کی صلاحیتیں حق دار تھیں کہ انھیں بھرپور انداز میں خراجِ تحسین پیش کیا جائے۔ وہ ایک سچے فن کار تھے، جو کریکٹر ایکٹر کے طور پر ایک طویل عرصے انڈسٹری پر چھائے رہے۔ ان کے انتقال کو دو عشرے ہونے کو ہیں، مگر ان کی آواز اب بھی سماعتوں میں گونجتی ہے، ان کا انداز اب بھی لوگوں کو یاد ہے۔

ان کا اصل نام آغا علی عباس قزلباش تھا۔ وہ 10 نومبر 1927 کو لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی فن کار تھے۔ شعور کی دہلیز عبور کرتے ہی اس سمت چلے آئے۔ تقسیم سے قبل اس میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔ بمبئی میں بننے والی فلم ''سرائے سے باہر'' سے فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر ہجرت کر کے

پاکستان چلے آئے۔ لاہور انھیں راس آگیا۔ آغا طالش کا نام اختیار کیا۔ پہلے ریڈیو پاکستان پشاور سے منسلک ہوئے، پھر فلم انڈسٹری کی سمت آگئے۔ وہ سنہری دور تھا۔ باصلاحیت لوگوں کو شناخت کیا جاتا، انھیں موقع ملتا۔ پاکستان میں ان کی پہلی فلم ''نتھ'' تھی۔ پھر وہ ''جبرو'' میں بہ طور ولن نظر آئے۔ اس فلم نے انھیں شناخت عطا کی۔ شہرت انھیں فلم ''سات لاکھ'' سے ملی۔ 1962 میں ریلیز ہونے والی فلم ''شہید'' نے آغا طالش کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ دیگر اہم فلموں میں باغی، سہیلی، فرنگی، زرقا، وطن، نیند، کنیز، لاکھوں میں ایک، زینت اور امراؤ جان ادا شامل ہیں۔

آغا طالش کا 19 فروری 1998 کو انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے احسن طالش بھی اس شعبے میں آئے۔ انھوں نے خود کو بہ طور ڈائریکٹر اور پروڈیوسر منوایا اور ٹی وی کو نم، راکھ، اعتراف، محبت کرنے والوں کے نام جیسے ڈرامے دیے۔

☆ اجمل خٹک

اُن کے کئی حوالے ہیں۔ ایک جانب سیاست میں جھنڈے گاڑے، دوسری سمت ادب کے میدان میں خود کو منوایا، پھر ترقی پسند دانشور کی حیثیت سے کارکنوں کی تربیت کی۔

اجمل خٹک 15 ستمبر 1925 کو اکوڑہ خٹک کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکمت خان بھی علاقے کی جانی مانی شخصیت تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ تدریس کی سمت آئے، مگر علمی استعداد بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ منشی فاضل، ایف اے، بی اے کیا۔ پشاور یونیورسٹی سے انھوں نے فارسی میں ایم اے کیا۔ اسلامیہ کالج پشاور کے زمانے میں پشتو ادب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ ان کی بیرونی ادب پر گہری نظر تھی، ادب کو زندگی کے قریب لانے کی خواہش تھی، ان کا اظہاریہ پروگریسو تھا۔ ان کے سفرِ زندگی میں ریڈیو پاکستان پشاور سے بطور اسکرپٹ رائٹر وابستگی کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ ایک عرصے روزنامہ انجام پشاور کے ایڈیٹر رہے۔

انقلابی مزاج تھا۔ قوت پرست سیاست توجہ کا محور رہی۔ باچا خان سے متاثر تھے۔ انگریز سرکار کے خلاف تمام تحاریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اِس سفر میں اگلے پانچ عشروں میں بے تحاشہ قربانیاں دیں۔

اوائل میں وہ صوبائی خود مختاری کے حق میں تھے۔ خان عبدالغفار خان کے زیر اثر پختونستان کی بھی حمایت کی۔ اِن نظریات کے باعث قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہوئے۔ ولی خان کے زمانے میں وہ نیشنل عوامی پارٹی کے سیکریٹری جنرل بنے۔

1973 میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے نیپ کو غیر قانونی جماعت قرار دیا اور پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کرنا شروع کیا، تو اجمل خٹک روپوش ہو کر افغانستان چلے گئے۔ کچھ برس جلاوطن رہے۔ وہاں بھی نچلے نہیں بیٹھے۔ کہا جاتا ہے، افغانستان میں کمیونسٹ حکومت کے قیام میں ان کا

بھی کردار رہا۔ یہ سرکار زیادہ عرصے قائم نہیں رہی۔ سویت یونین کی افغانستان میں شکست کے بعد حالات تبدیل ہوگئے۔ 1989 میں وہ واپس پاکستان لوٹ آئے۔ 1990 تا 1993 میں وہ قومی اسمبلی کے رکن رہے۔ مارچ 1994 میں سینیٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ ولی خان کے بعد انھوں نے عوامی نیشنل پارٹی کی صدارت بھی سنبھالی۔ اپنے طور پر نظام کی بہتری کی کوشش کی، مگر حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ ترقی پسند نظریات متروک ٹھہرے۔ زمانہ تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ پھر بیماریوں نے انھیں گھیر لیا اور دھیرے دھیرے وہ سیاست سے دور ہوگئے۔

شعروادب کا سفر ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ آخر تک اس سے منسلک رہے۔ البتہ جدید فکر کو بھی قبول کیا۔ وہ اردو اور پشتو دونوں زبانوں پر گرفت رکھتے تھے، جس کے طفیل ان کے کلام میں تنوع بھی آیا اور رسائی بھی بڑھی۔ ان کی شاعری جلاوطنی، بے گھری جیسے المیوں کی کمال مہارت سے عکاسی کرتی ہے۔ ان کے کام کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔ انھوں نے اپنی ادبی خدمات کے لیے کمال فن ایوارڈ تو قبول کیا، مگر حکومت کی جانب سے ستارۂ امتیاز لینے سے معذرت کرلی۔ طویل علالت کے بعد 7 فروری 2010 کو پشاور میں ان کا انتقال ہوا۔

☆ شہزاد رائے

اِس گلوکار کو صحیح معنوں میں ''آئی کون'' کہا جاسکتا ہے۔ اس کا فن فقط تفریح کا ذریعہ نہیں بنا، بلکہ اس نے ایک مثبت پیغام کی شکل ڈھال لی۔ آگاہی کا ذریعہ بنا۔

شہزاد رائے کے کیریر کے پہلے حصے پر تو گائیکی کا غلبہ نظر آتا ہے، مگر دھیرے دھیرے ان کے گانوں میں سماج پر طنز بڑھنے لگا۔ ایک وقت میں یہ اتنا واضح اور سخت ہوگیا کہ ان کے گیتوں پر پابندی لگی۔ شہزاد رائے نے فقط اپنے نظام کی خامیوں کی نشان دہی نہیں کی، بلکہ امریکی پالیسیوں اور ڈرون حملوں کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایک پہلو اور ہے، اس فن کار نے تعلیم کے میدان میں بھی حیران کن کام کیا۔

16 فروری 1977 کو کراچی میں پیدا ہونے والے اس فنکار کا 1995 میں پہلا البم ''زندگی'' ریلیز ہوا، جسے بہت پسند کیا گیا۔ دو برس بعد ''درشن'' منظر عام پر آیا۔ 1999 میں اپنے تیسرے البم ''تیری صورت'' میں وہ مشرقی موسیقی کی سمت جاتے ہوئے محسوس ہوئے۔ ''رب جانے'' اور ''بری بات ہے'' اس کے بعد ریلیز ہوئے اور لوگوں کے معیار پر پورے اترے۔ البتہ 2008 میں اس کلاکار نے ایک دھماکا کر دیا۔ یہ ان کا چھٹا البم ''قسمت اپنے ہاتھ میں'' تھا، جس نے ہمیں رومانوی گیت گانے والے اس فن کار کے نئے روپ سے متعارف کروایا۔

اس البم کو کراچی جیل میں لانچ کیا گیا۔ اس کی پہلی ویڈیو ''لگا رہے'' جمود پرست سماجی رویوں پر گہری چوٹ کی تھی۔ اس میں سیاسی صورتِ حال کو بھی منظر کیا گیا۔ اس البم کا ٹائٹل ٹریک ''قسمت اپنے ہاتھ میں'' پر بھی بہت لے دے ہوئی، کچھ حلقوں نے اسے بہت بولڈ ٹھہرایا۔ ادھر مغربی میڈیا نے اس پر اعتراض اٹھایا کہ پاکستان کا پڑھا لکھا، باشعور طبقہ بھی دہشت گردی کے خلاف امریکی کوششوں کی منفی منظرکشی کر رہا ہے۔ مذکورہ گانوں کا ملاپ ایک بھارتی فلم کا ''کھٹا میٹھا'' کا بھی حصہ بنا۔

شہزاد رائے نے مختلف منصوبوں کے تحت عابدہ پروین، برین ایڈمز اور سکھبیر جیسے مختلف نوعیت کے کلاکاروں کے ساتھ کام کیا۔ عائشہ عمر کے ساتھ یوم شہدا پر ریلیز ہونے والا ان کا گیت ''ڈھول سپاہیا'' کو ملک گیر توجہ ملی۔

شہزاد رائے نے 2002 میں قائم کردہ اپنی تنظیم ''زندگی ٹرسٹ'' کے تحت سماجی شعبے میں بھی خاصا کام کیا۔ اس کے زیر اہتمام چائلڈ لیبر کے خاتمے کے لیے ایک ایسا پروگرام شروع کیا گیا، جس میں محنت کش بچوں کو پڑھنے کے عوض پیسے دیے جاتے تھے۔ اس کے تحت دو ہزار سے زاید بچوں کو پڑھایا گیا۔ اسکولوں میں اصلاحات کے پروگرام شروع کیے۔

2011 میں بلوچستان سے تعلق رکھنے والے واسو خان کی یوٹیوب پر ایک ویڈیو دیکھ کر شہزاد نے اس کی تلاش شروع کی۔ اس ویڈیو میں واسو نے گیت کے انداز میں، دلچسپ پیرائے میں پاکستان کی تاریخ بیان کی تھی۔ بعد میں انھوں نے واسو کے اس آئٹم کو اپنے گانے ''اپنے الّو'' میں شامل کیا۔ یہ گانا ایک دلیرانہ کوشش تھی، سراہنے والے بہت ملے، چند نے تنقید

کی۔ واسو کے ساتھ انھوں نے ''واسو اور میں'' کے نام سے ایک ٹی وی پروگرام بھی کیا، یہ ایک مختلف کوشش تھی۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔

2013 میں 22 اقساط پر مشتمل ڈاکومینٹری سیریز ''چل پڑھا'' میں وہ نظر آئے، جس میں انھوں نے دو سو سے زاید سرکاری اسکولوں کے دورے کیے۔ اس کو علمی اور سماجی حلقوں کی جانب سے بھرپور پزیرائی ملی۔ اپنی خدمات کے لیے شہزاد رائے ملکی اور بین الاقوامی اداروں سے کئی اعزازات حاصل کر چکے ہیں۔

☆عطاء الحق قاسمی

اُن کا شمار پاکستان کے مقبول اور بااثر قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ ادب کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی، سب میں کامیاب رہے، ہاں زیادہ شہرت کالم نگاری اور سفرنامہ نویسی میں ملی۔ حکومتی حلقوں، بالخصوص ن لیگ کے قریب تصور کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ناروے اور تھائی لینڈ میں پاکستانی سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ان کے ایک بیٹے یاسر پیرزادہ نے بھی کالم نویسی میں نام پیدا کیا۔

عطاء الحق قاسمی یکم فروری 1943 کو پنجاب میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے ایم اے اردو کیا۔ پھر گورنمنٹ ایم اے او کالج لاہور سے وابستہ ہوگئے۔ طویل عرصہ اس تعلیمی ادارے میں پڑھایا۔ 2000 میں ایف سی کالج سے ایسوی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ صحافت میں ان کی شہرت کا آغاز ''نوائے وقت'' میں چھپنے والے کالموں سے ہوا۔ 32 برس تک اس اخبار سے کالم نگار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ لوگ بے صبری سے ان کے کالموں کا انتظار کیا کرتے۔ ادبی صفحے کے نگراں بھی رہے۔ 2001 میں روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوگئے اور آج بھی ''روزنِ دیوار سے'' کے عنوان سے کالم لکھ رہے ہیں۔ اے پی این ایس کی طرف سے بہترین کالم نویس کا ایوارڈ اُنھیں مل چکا ہے۔ کالموں اور مضامین کے مجموعے ''روزنِ دیوار'' پر آدم جی ادبی ایوارڈ بھی حاصل کیا۔ اُن کے کالموں کے کئی مجموعے شائع ہوکر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں، جن میں آپ بھی شرمسار ہو، ڈھول ڈھپا، حبس معمول، بازیچۂ اعمال، روزنِ دیوار سے، جرم ظریفی، خندمکرر، شرگوشیاں، بارہ سنگھے، وصیت نامے سمیت دیگر شامل ہیں۔

اردو ادب میں ان کی شناخت ''شوق آوارگی'' سے ہوئی، جس کو اردو کے بہترین سفرناموں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ یہ سفرنامہ کتابی صورت میں سامنے آنے سے قبل ''فنون'' میں قسط وار چھپتا رہا۔ ان کی کتاب ''غیر ملکی سیاح کا سفرنامہ'' پُرلطف طرز بیان کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ ''گوروں کے دیس میں''، ''دنیا خوب صورت ہے'' اور ''دلی دور است'' بھی ان کے مقبول سفرنامے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ ''ملاقاتیں ادھوری ہیں'' کے نام سے چھپا۔ خاکوں کی کتاب کا نام ''مزید گنجے فرشتے'' ہے۔ ٹی وی کے لیے انھوں نے جو ڈرامے لکھے انھیں بے حد مقبولیت ملی، خاص طور سے ''خواجہ اینڈ سن'' بہت مشہور ہوا۔ ''شب دیگ'' کو بہترین ڈراما سیریل کا گریجویٹ ایوارڈ ملا۔ دیگر ڈراموں میں علی بابا چالیس چور، آپ کا خادم (شیدا ٹلی)، اپنے پرائے، حویلی، الیکشن الیکشن اور ہرفن مولا نمایاں ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کو 1998 میں حکومتِ پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز کا ایوارڈ دیا گیا۔

1979 میں انھوں نے ''معاصر'' کے نام سے ادبی جریدہ نکالا تھا، جو بہت مقبول ہوا۔ گذشتہ چند برس سے وہ لاہور آرٹس کونسل (الحمرا) کے چیئرمین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ گذشتہ برس کے آخر میں انھیں پی ٹی وی کے چیئرمین کا اہم عہدہ سونپا گیا۔ جہاں ان کے چاہنے والے کئی، وہاں ناقدین کی بھی کمی نہیں۔

☆عتیقہ اوڈھو

عتیقہ اوڈھو کا شمار باصلاحیت فنکاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ٹی وی اور فلم، دونوں ہی شعبوں میں خود کو منوایا۔ ٹی وی میزبان کی حیثیت سے بھی نام کمایا۔ میک اپ مصنوعات کے کاروبار میں کامیابی حاصل کی۔ البتہ سیاست انھیں زیادہ راس نہیں آئی۔ ایک ایسی جماعت سے وابستہ ہوئیں، جو پاکستان میں مقبول تو تھی، مگر جڑیں نہیں رکھتی تھی۔ پھر تنازعات میں بھی الجھی رہیں۔ انور مقصود کے

ڈرامے ''ستارہ اور مہر النسا'' سے انھوں نے کیریر شروع کیا۔ ان کی اداکاری نے ناقدین کو متوجہ کیا۔ عوام نے انھیں سراہا۔ عابد علی کے ڈرامے ''دشت'' میں انھوں نے مرکزی کردار نبھایا۔ بلوچستان کی معاشرت کے گرد گھومتے اس ڈرامے نے ناظرین کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کے دیگر مقبول ڈراموں میں نجات اور ہم سفر نمایاں ہیں۔ مقبولیت انھیں فلموں کی سمت بھی لے گئی۔ وہ ''جو ڈر گیا وہ مر گیا'' اور ''مجھے چاند چاہیے'' میں نظر آئیں۔

وہ 12 فروری 1968 کو شکار پور، سندھ میں پیدا ہوئیں۔ کراچی میں شعور کی آنکھ کھولی۔ 1989 میں انھوں نے میک اپ آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنا کیریر شروع کیا۔ مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کے لیے کام کیا۔ اسی زمانے میں وہ انور مقصود کی نظروں میں آئیں۔ 1993 میں ستارہ اور مہر النسا نے انھیں مقبول چہرہ بنا دیا۔ دو برس بعد ان کی پہلی فلم ریلیز ہوئی۔ 1997 میں وہ فلم ''ممی'' میں نظر آئیں، شان کی فلم ''مجھے چاند چاہیے'' میں ان کے کام کو سراہا گیا۔ مگر وہ فلموں کے لیے کٹھن زمانہ تھا۔ انڈسٹری دھیرے دھیرے مر رہی تھی، ان کی زیادہ توجہ ٹی وی پر رہی۔ انھوں نے انگار وادی، تلاش، تم ہی تو ہو جیسے ڈرامے کیے۔

سماجی کارکن کی حیثیت سے انھوں نے خاصا کام کیا۔ مختلف این جی اوز کے پلیٹ فورم سے آگاہی مہمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ سیاست میں بھی آئیں۔ وہ پرویز مشرف کی جماعت آل پاکستان مسلم لیگ کی عہدے دار رہیں۔ اس عرصے میں اسکینڈلز ان کا تعاقب کرتے رہے۔ ایئرپورٹ پر سامان سے شراب کی بوتل برآمد ہونے کے واقعے نے خاصے تنازع کو جنم دیا۔

☆ بدر میاں داد

یہ پاکپتن ہے۔ اس کے جنوب میں دریائے ستلج بہتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے پہلی حکومت یہیں قائم کی، یہیں مشہور صوفی بزرگ بابا فرید گنج شکر کا روضہ ہے اور اسی

انفرادیت (خودی)

انفرادیت کے مسئلے میں اس امر کا تیقن ہوتا ہے کہ لوگ اپنے مفادات کو خود ہی بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ ان کو فکر و عمل کی آزادی ہونی چاہیے۔ اس نظریے کے ارتقاء میں ایک طرف یہ یقین کہ فرد انتہائی قدر و قیمت کا حامل ہے اور دوسری طرف ایک ایسے اقتصادی نظام کا اجراء جس کی بنیاد جائیداد کے حق ملکیت اور آزادانہ تبادلے پر قائم تھی بہت ممد اور معاون ثابت ہوئے۔ انفرادیت کے جدید نظریے کے سرگرم مبلغ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے درمیان فرانس، انگلستان اور امریکا میں سرگرم عمل رہے ان میں چند ایک یہ ہیں۔ جان لاک، ایڈم سمتھ، جیریمی بینتھم، جان سٹوارٹ مل فرینکلن، تھامس جیفرسن۔ یہ اس نظریے کے قائل تھے کہ حکومت کو اپنی رعایت پر کوئی یکساں ضابطۂ اخلاق مسلط نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے انفرادی حقوق اور آزادیوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ اقتصادی دائرہ عمل میں نظریہ انفرادیت اس امر کا متقاضی ہے کہ آزادانہ تجارت، رضاکارانہ تقسیم کار اور آزادانہ تبادلہ اشیاء کی بدولت ہر شخص خوش حال ہو جاتا ہے۔ بسا اوقات انفرادیت کی انتہا لاقانونیت اور طوائف الملوکی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور انفرادی حقوق اور فرد کے شخصی وقار سے چشم پوشی ظلم اور استبداد پر منتج ہوتی ہے۔ اسلام نے بھی انفرادیت پر زور دیا ہے اور شاعر مشرق علامہ اقبال نے انفرادیت کی اخلاقی اقدار پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ ان کا نظریہ خود فرد کی شخصیت کو انتہائی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کے تمام خیالات کی بہترین تفسیر اس شعر میں مضمر ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

مرسلہ: نگار تسلیم۔ پشاور

شہر میں قوالی کی دنیا میں خود کو منوانے والے بدر میاں داد نے 17 فروری 1962 کو آنکھ کھولی۔ ہجرت کے بعد ان کے خاندان نے اسی علاقے کو مسکن بنایا۔ ان کے والد رشید میاں داد اور دادا دین محمد اپنے وقت کے معروف قوال تھے۔ ان کا گھرانہ سیکڑوں سال سے موسیقی کے فن سے وابستہ ہے۔ بدر میاں داد معروف قوال نصرت فتح علی خان کے ماموں زاد بھائی تھے۔

گائیکی تو جیسے گھٹی میں پڑی تھی، پھر ماحول بھی میسر تھا۔ تربیتی مراحل تیزی سے طے کیے۔ آغاز نجی محافل سے ہوا۔ کم عمری میں ریڈیو تک رسائی حاصل کر لی۔ ملتان ریڈیو سے انھیں شہرت ملی۔ وہیں سے ان کی قوالیاں پورے ملک میں پھیل گئیں۔ بدر میاں داد نے اپنے بھائی شیر میاں داد کے ساتھ مل کر گائیکی کا آغاز کیا تھا۔ ایک عرصے تک وہ ساتھ گاتے رہے۔ مگر پھر وہ الگ ہو گئے۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ یہ علیحدگی بدر میاں داد کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ ان کا فن نکھر کر سامنے آیا۔ ان کے البمز کی مانگ بڑھنے لگی۔ اندازے کے مطابق ان البمز کی تعداد سو کے قریب ہے۔ ان کی آواز بھارتی فلموں میں بھی سنائی دی۔ انھوں نے گلوکار سریش بابا اور ما کے ساتھ مل کر کلاسیکی اور جدید طرز کی موسیقی کے فیوژن کا بھرپور تجربہ کیا تھا، جسے بہت پسند کیا گیا۔

لوگوں کی ان سے بہت اُمیدیں تھیں، مگر دل کے عارضے کی وجہ سے لاہور میں مارچ 2007 میں فقط 45 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

☆ شفقت امانت علی

گزشتہ دو عشروں میں پاپ اور کلاسیکی موسیقی کے فیوژن کا ہمارے ہاں خاصا چرچا رہا، کئی تجربات ہوئے، اس کے طفیل فن گائیکی کو جو اچھے فنکار میسر آئے، ان میں شفقت امانت علی کا نام سرفہرست ہے۔ ایک ایسا گلوکار، جسے قدیم اور جدید دونوں طرز کی موسیقی پر خوب گرفت تھی، جس کی پُرقوت آواز پاکستان سے ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی اور بولی ووڈ پر چھا گئی۔ اور یہ حیران کن نہیں۔ وہ دنیائے موسیقی کو لازوال گیت اور غزلیں عطا کرنے والے استاد امانت علی کے سپوت ہیں۔ یعنی جیسا باپ، ویسا بیٹا۔

26 فروری 1965 کو لاہور میں پیدا ہونے والے شفقت امانت علی کا تعلق پٹیالہ گھرانے سے ہے۔ وہ نویں پیڑی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ تربیت کے مراحل گھر میں طے ہوئے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور سے انھوں نے گریجویشن کیا۔ وہاں کی میوزک سوسائٹی کی شہرت میں شفقت نے مہمیز کا کام کیا۔

اوائل میں میوزک بینڈ ''فیوژن'' کے ذریعے ان کی سریلی آواز لوگوں تک پہنچی۔ پہلی ویڈیو ''آنکھوں کے ساگر'' نے سب کو چونکا دیا۔ بینڈ نے سب کی توجہ حاصل کر لی۔ ''انکھیاں'' کو بھی بہت مقبولیت ملی۔ ''کھماج'' نے نئی تاریخ رقم کی۔ نہ صرف یہ گیت لازوال ٹھہرایا، بلکہ اس کے ڈائریکٹر ثاقب ملک پر بھی تعریف کے ڈونگرے برسے۔ ہندوستانی فلم نگری نے بھی ان کی صلاحیتوں کو شناخت کیا۔ اس کا سہرا معروف سنگر اور موسیقار شنکر کے سر ہے، جنھوں نے ریڈیو پر ''آنکھوں کے ساگر'' سن کر شفقت کو تلاش کیا تھا۔

2006 میں شاہ رخ خان کی فلم ''کبھی الوداع نہ کہنا'' میں ''متوا'' گا کر انھوں نے تہلکہ مچا دیا۔ اگلی بار فلم ''ڈور'' میں ''یہ حوصلہ'' جیسا متاثر کن گاتے دکھائی دیے۔ ''مائی نیم از خان'' میں ''تیرے نینا'' کا بھی بڑا چرچا ہوا۔ 2011 میں ''را۔ون'' میں ان کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد انھوں نے کئی فلموں کے لیے گایا۔ ایک معنوں میں وہ بولی ووڈ کا مستقل حصہ بن گئے۔

فیوژن اور ان کا ساتھ 2006 رہا۔ پھر انھوں نے سولو کیریر شروع کیا۔ اس میں ان کی توجہ صوفی اور لوک گائیکی پر مرکوز رہی۔ 2008 میں تعبیر کے نام سے ان کا البم آیا، جسے خاصی پزیرائی ہوئی۔

نظریے

شیراز خان

بے راہ روی کا دور دورہ نہ ہو، عمدہ معاشرہ تشکیل پائے ایسا معاشرہ جس میں امن و امان کا سایہ رہے، لوگ راست باز اور اعلیٰ نظریے کے حامل رہیں۔ اس سلسلے میں ابتدائے آفرنش سے سعی مسلسل جاری ہے۔ جہاں جہاں الہامی مذہب کے پیغام پہنچے وہاں وہاں مذہب کی بنیاد مضبوط رہی لیکن کچھ علاقوں میں مخصوص لوگوں نے الہامی احکامات کو اپنے طور پر اپنے انداز میں ملغوبہ بنا کر کے ایک نیا نظریہ سامنے لائے۔

انسان کے لیے اہمیت صرف روٹی، کپڑا اور مکان کی نہیں ہے۔ بلکہ انسان کو روحانی خوراک بھی چاہیے۔ ایک ایسا مضبوط سہارا بھی چاہیے جو ہر پریشانی میں اس کا ساتھ دے سکے۔ جس سے وہ فریاد کر سکے، جس سے دعائیں مانگ سکے، جس سے وہ اپنی امیدیں وابستہ کر سکے۔

ایسی ذات صرف خدا کی ہوتی ہے۔ اور خدا کا تصور انسان کو مذہب نے دیا ہے۔

مذہب کا احترام اور مذہب سے وابستگی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ مذہب کے بغیر رہ نہیں سکتا۔

مذہب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم انسان کی تاریخ ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مذہب انسان کے ساتھ ہی وجود میں آیا ہے۔

خود مختار انسان جب بھی بے بس ہوا ہے اس نے آسمان کی طرف دیکھا ہے۔ اس نے جس چیز سے خوف محسوس کیا یا جس سے اسے فائدہ پہنچا اسے اپنا خدا تسلیم کرلیا۔ چاہے وہ سورج ہو یا درخت، دریا ہو یا پہاڑ، سانپ ہو یا گائے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب خدا کا تصور اس کے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ اس زمانے میں اخلاقی اقدار نہ ہونے کے برابر تھیں۔

بس انسانی آبادی تھی، بغیر کسی اصول کے زندگی گزارنے والی۔ اس وقت ہر وہ چیز اور ہر وہ عمل جائز تھا جو کسی کو فائدہ پہنچا سکے۔ اس سلسلے میں انفرادیت یا اجتماعیت کی بھی تخصیص نہ تھی۔

کبھی کبھی تو ایک بستی کے ہر فرد کا اپنا اپنا خدا ہوتا تھا۔ ایسے میں ضرورت محسوس ہوئی کہ کچھ ایسے لوگ آئیں جو انسان کو اس پستی سے نکال کر خدائے واحد کی امان میں لے آئیں۔

لہٰذا پیغمبر آتے رہے، انسان کو راہ راست پر لانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اس طرح انسانی تاریخ میں کئی مذاہب سامنے آئے۔

ان میں سے کچھ بڑے مذاہب تھے (جن کو الہامی مذاہب کہا جاتا ہے) جیسا کہ اسلام، یہودیت اور عیسائیت۔

ان کے علاوہ بھی سینکڑوں مذاہب اور نظریات تھے اور ہیں۔

ہم نے اس مضمون میں ان ہی مذاہب کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مذاہب آج بھی موجود ہیں اور ان پر عمل کرنے والے بھی ہیں۔

اُمید ہے کہ یہ مختصر سا مضمون ایسے مشہور مذاہب کا ایک تعارف تو ضرور کروا دے گا۔

الاڈورا Aladura

جی ہاں یہ بھی ایک مذہب (یا نظریہ) ہے۔ اس کا وجود مغربی نائجیریا میں یوروبا لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد 1918ء میں پڑی۔

اس زمانے میں ایک اور نظریہ انجلی ازم اپنے عروج پر تھا۔ یہ تحریک زور پکڑتی جا رہی تھی۔ الاڈورا انجلی ازم کے رد کے طور پر سامنے آئی تھی۔

اس مذہب کو ماننے والوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔

عام طور پر یہ لوگ کئی خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ جیسے موت کا خدا، زندگی کا خدا، صحت اور دولت کا خدا وغیرہ۔

یہ مذہب افریقی قبائل کی بہت سی رسومات اور کچھ باہر کی رسومات کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ عبادات کے نام پر ان کے یہاں مراقبہ وغیرہ ہوتا ہے۔ جو ان کا کوئی مذہبی پیشوا اپنی نگرانی میں کرواتا ہے۔ ان کے یہاں حیات بعد موت کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی ان کے پاس ان کی کوئی مذہبی کتاب ہے۔

آمش Amish

اس مذہب کی بنیاد 1693ء میں سوئٹزر لینڈ میں ڈالی گئی۔ اس کو رائج کرنے والا جیکب آمان نام کا ایک شخص تھا۔ جس کی تعلیمات تو بہت سخت تھیں۔ دنیا میں اس کے ماننے والے تین چار لاکھ کے قریب ہیں۔

تعلیمات: آمش کی تعلیمات کی خاص خاص باتیں یہ ہیں، سادگی، سچائی اور انسانی ہمدردی۔ برے کاموں سے بچو اور خدا کی اطاعت کرو۔ ان کے یہاں خدا، جنت، دوزخ اور حیات بعد از موت کا تقریباً وہی تصور ہے جو عیسائیت میں ہے۔

رسومات: ان کے ہاں ایک سال میں دو بڑے اجتماعات ہوتے ہیں۔ اجتماع میں شریک ہونے سے پہلے یہ اپنے پیروں کو خوب اچھی طرح دھو لیتے ہیں تاکہ دنیا کے سفر کی کثافت کو ختم کر سکیں۔ جرمن اور ڈچ بولنے والے لوگ زیادہ پیروکار ہیں۔ یہ موجودہ دور کی سہولیات سے فائدہ نہیں اٹھاتے جیسے بجلی وغیرہ۔

ان کے لباس بھی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے سترہویں صدی کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ 17 سے 20 سال کی عمر تک مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ یعنی نوجوان کو مکمل طور پر اس فرقے میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ ان کی کتاب بائبل ہے۔

آساترو Asatru:

یہ بھی ایک مذہبی فرقہ ہے۔

1970ء میں اس کی بنیاد اسکنڈے نیوین ممالک اور امریکا میں ڈالی گئی۔ قدیم رومن مذاہب کے خداؤں کا تصور ان کے یہاں موجود ہے اور تقریباً اس قسم کی روایات ہیں جو روایات قدیم رومن مذاہب کی ہیں۔ ان کے یہاں جنت اور دوزخ کا تصور ہے لیکن تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

جنت کے لیے یہ وہیل یاہ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اعلیٰ ترین جنت، لیکن یہ جنت صرف ان کے حصے میں آتی ہے جو جنگ میں مارے گئے ہوں۔

عام اور اچھے لوگوں کے لیے ہیل کا لفظ ہے۔ یعنی بہت پُرسکون جگہ اور خراب اور بدکار لوگوں کے لیے ہائی فل (یعنی دوزخ)۔

رسومات: ان کے یہاں مشروبات اور مختلف اجناس نذرانے کے طور پر دیے جاتے ہیں۔ ان کے اپنے تہوار ہیں۔ جن میں یہ اپنی رسومات ادا کرتے ہیں اگر ان کو مذہبی رسومات کہا جائے تو۔

لادینیت Atheism:

اس نظریے کا وجود قدیم زمانے سے رہا ہے۔ خاص طور پر یونانی فلسفے میں۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز سے جب علم کی روشنی پھیلی تو اس کے ساتھ ساتھ اس نظریے کو بھی تقویت ملتی چلی گئی۔

اس نظریے کو ماننے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور یہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

ان کے نظریے کے مطابق خدا اور خداؤں کا کوئی وجود نہیں ہے اور جب وہ ان باتوں پر یقین ہی نہیں رکھتے تو حیات بعد از موت اور جنت یا دوزخ کا تصور بھی ان کے یہاں نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ اسی دنیا میں ہے۔

ان کے خیال کے مطابق یہ کائنات ایک بڑے سائنسی حادثے کا نتیجہ ہے۔ اس میں کسی کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس نظریے کی کوئی خاص کتاب نہیں ہے۔ جہاں بھی اور جس زبان میں بھی لادینیت کے موضوع پر کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کا ہے۔ اس کو ماننے والوں میں بہت مشہور لوگ بھی ہوئے ہیں۔ جیسے کارل ساگان، رچرڈ ڈاکنسن اور مشہور فلسفی۔ برٹینڈرسل وغیرہ۔

بہائی:

یہ فرقہ ایران کے شہر حران سے 1863ء میں شروع ہوا۔

اس کی بنیاد علی محمد باب نے ڈالی تھی اور اسے بہاءاللہ نے پھیلایا۔ اس عقیدے کے ماننے والے 50 لاکھ کے قریب ہیں۔ یہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتے ہیں جو واحد تو ہے لیکن اس نے انسان کی اصلاح کے لیے خود کو مختلف مذاہب کے دیوی دیوتاؤں کے روپ میں ظاہر بھی کیا ہے۔

روح غیر فانی اور بنیادی طور پر پاکیزہ ہوتی ہے۔ روح کے کثیف کرنے سے انسانی خیالات ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے جسم گناہ آلود ہو جاتا ہے۔ زندگی کا مقصد روحانی طور پر خود کو اس سے اعلیٰ ترین کرتے رہنا ہے۔ روح جسم سے الگ ہو کر مرکزِ اوّل (خدا) کی طرف اپنا سفر شروع کر دیتی ہے اور یہ سفر اس وقت ختم ہوتا ہے جب وہ اپنے مرکز سے جا کر مل جائے۔

ان کے فرقے کے عقیدے کے مطابق انسان کو تعلیم حاصل کرنا، اپنی روح کو پاکیزہ رکھنا، عبادت کرنا، فلاح و بہبود کے کام کرنا اور نشے سے بچنا چاہیے۔

کتابیں: ان کی مذہبی اور مقدس کتابوں میں "کتاب مقدس" اور ہائیڈن ورڈز شامل ہیں جو خطبات پر مشتمل ہیں یا دوسرے بہائی مذہبی پیشواؤں نے لکھی ہیں۔

بون Bon:

یہ تبت کا ایک مذہب یا عقیدہ ہے۔ اس کے ماننے والوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔

بدھ ازم سے بڑی حد تک مماثلت ہے۔ ان کے یہاں عبادت کے طور پر مراقبے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مراقبہ روح اور جسم کی صفائی کے لیے کیا جاتا ہے۔

ان کے عقیدے کے مطابق انسان کے پیدا ہونے اور مرنے اور پھر پیدا ہونے کا یہ چکر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ مکمل مکتی یا نجات حاصل نہ کر لے۔

ان کے یہاں ستارہ شناسی کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ تبت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

بدھ ازم:

سدھارتھ گوتھا (بدھا) کی تعلیمات پر مشتمل جو 520 بی سی لومبنی (نیپال کی ترائی) یوپی کے ضلع بستی میں ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ بہت بڑی آبادی اس مذہب کے ماننے والوں کی ہے۔

بدھ ازم کے عقیدے کے مطابق انسان اگر اچھے عمل نہ کرے تو وہ بار بار پیدا ہونے اور بار بار مرنے کے جال میں پھنسا رہتا ہے۔

مکمل نجات کے لیے اسے چند پاکیزہ اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ان کے یہاں جو آوا گون کا تصور ہے وہ ہندوؤں کے آوا گون کے عقیدے سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں کتاب کوئی ایسی تو نہیں ہے جس کو مذہبی کتاب کہا جاسکے لیکن مہاتما بدھ کے خطابات ضرور ہیں جو اس مذہب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ان کے یہاں مختلف فرقے ہیں اور یہ فرقے، مراقبے اور مذہبی رسومات کے طریقے ایک دوسرے سے الگ رکھتے ہیں۔

تبت کے بدھسٹ کے مقدس الفاظ پالی تہذیب کے الفاظ سے مختلف ہیں۔ عام طور پر اس مذہب کے ماننے والوں کو امن پسند سمجھا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے واقعات میں ان کے تشدد آمیز رجحانات بھی سامنے آئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک بڑا مذہب ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اور اس کو ماننے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔

کوادائی Coa Dai:

اس عقیدے کی بنیاد 1926ء میں پڑی۔ اس کو رائج کرنے والے کا نام نو وان چیو تھا۔ اس فرقے کی ابتدا ویت نام سے ہوئی ہے۔ اس کو ماننے والے اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق خدا دنیا کے نیک اور برگزیدہ لوگوں کے ذریعے اپنی جھلک دکھلاتا رہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تاؤازم، ہندوازم، بدھ ازم، اسلام، عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سب کے سب سیدھے راستے ہیں۔ خدا کے ولی دنیا میں آکر نیک تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں۔ جیسے وکٹر ہیوگن وغیرہ۔ اس نظریے کی تعلیمات کا نچوڑ اور مقصد یہ ہے کہ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر ہر شخص اور پوری دنیا میں امن وسکون ہو۔

خدا کو باہر کی دنیا میں اور اپنے اندر تلاش کرتے رہو۔ وہ مل ہی جائے گا۔ ان کے خیال کے مطابق نیک لوگ اس دنیا میں دوبارہ جنم لیتے ہیں اور برے لوگوں کو کسی بھیانک دنیا میں پیدا ہونے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔

ان کے یہاں نروان یا نجات حاصل کرنے کا سسٹم وہی ہے جو رومن کیتھولک میں پایا جاتا ہے۔ روزانہ کی عبادات میں مراقبہ کو خاص اہمیت ہے۔ ان کی مقدس کتاب 'کوڈائی قوانین' ہے۔

چوپرہ سینٹر:

جی ہاں، یہ بھی ایک مذہبی فرقہ ہے۔

اس کی ابتدا کیلی فورنیا میں 1971 میں ہوئی تھی اور اسے دیپک چوپڑہ نام کے ایک شخص نے قائم کیا تھا۔ ان کے نظریے کے مطابق ایک سپریم پاور ضرور ہے جو پوری کائنات کو چلا رہی ہے۔ انسان کے پاس لامحدود توانائی اور حرارت ہے لیکن وہ اس کا ادراک نہیں کر پایا ہے۔ ذہن، جسم اور روح کو یکساں کر کے صحت اور کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔

ان کے عقیدے اور عبادات میں نظریہ تناسخ، یوگا، مراقبہ، مساج، صحت مند اور صاف ستھری خوراک، ذہن کی پاکیزگی، نشے سے دوری وغیرہ شامل ہیں۔

دیپک چوپڑہ کی بہت سی کتابیں بھی ہیں۔ ان میں سب سے مشہور ''کامیابی کے سات روحانی اصول ہیں''۔

کرسچین سائنس:

یہ بھی ایک عقیدہ ہے۔

اس عقیدے کی بنیاد میری بیکر ایڈی نے میاچوسٹس میں 1879ء میں ڈالی تھی۔

ان کے ماننے والوں کی تعداد چار پانچ لاکھ کے قریب ہے۔

ان کے یہاں صرف ایک خدا کا تصور ہے۔ (عیسائیوں کے نظریہ تثلیث کے برعکس)۔

مادے اور برائیوں کا کوئی وجود نہیں ہے (یہ انسانی ذہن کا ایک واہمہ ہے) زندگی میں سچائی اور پیار کی سب سے زیادہ اہمیت ہے۔

گناہ، بیماریاں اور موت ساری اقدار اور خوبصورتی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ جنت یا دوزخ کسی مقامات کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ذہن کی دو مختلف حالتیں ہیں اگر ذہن پرسکون ہو تو جنت ہے اگر پراگندہ اور پریشان ہو تو دوزخ ہے۔

عبادات میں روحانی Healing اور علم کا حصول بہت ضروری ہے۔ ان کے یہاں ہر اتوار کو عبادت ہوتی ہے۔ کتاب کے طور پر ان کے یہاں بائبل ہی پڑھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سائنسی علوم کا بھی مطالعہ کیا جاتا ہے۔

عیسائیت:

ایک مشہور مذہب، اس کی ابتداء حضرت عیسیٰ سے ہوئی۔ آپ فلسطین میں پیدا ہوئے۔ حضرت مریم آپ کی

والدہ تھیں۔ (چونکہ ہم سب حضرت عیسیٰ کے حوالے سے سب کچھ جانتے ہیں اس لیے یہاں زیادہ تفصیل نہیں دی جارہی۔)

عیسائیت کے عقیدے یا نظریے کے مطابق مقدس تثلیث ہے۔ عیسیٰ بطور خدا، عیسیٰ بطور باپ اور روح اللہ۔

گناہ کے سبب تینوں روپ خدا سے الگ ہوگئے۔ پھر آپ کو مصلوب کردیا گیا (ان کے نظریے کے مطابق) اور انہوں نے مصلوب ہوکر سارے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کردیا۔ صلیب کی بہت زیادہ اہمیت ہے کہ اس کا نشان ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔

جنت اور دوزخ پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی عبادتوں میں ہر اتوار کو چرچ جانا۔ بائبل کی تلاوت، روزہ وغیرہ ہیں۔

ان کی مذہبی اور مقدس کتاب بائبل (انجیل) ہے۔

شیطان کا چرچ:

30 اپریل 1966ء میں انٹن لاویل نے امریکا کے شہر سان فرانسسکو سے اس عقیدے کی ابتداء کی۔ یہ فرقہ نہ تو خدا پر اور نہ ہی شیطان پر عقیدہ رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شیطان کسی ہستی کا نام نہیں۔ بلکہ وہ صرف ایک انسانی تخلیق ہے اور جس طرح نیچر نے لاکھوں کروڑوں جرثوموں اور مخلوق کو پیدا کیا ہے اسی طرح انسان بھی وجود میں آگیا۔ یہ ایک طرح سے جانور ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ان کے چرچ کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہوا ہے۔ جانوروں کا مارنا غلط ہے۔ سوائے اپنے دفاع کے یا شدید بھوک کی صورت میں۔

ان پر مہربانی کرو جو اس قابل ہوں اور نا اہلوں پر مہربان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ان کی کتاب شیطان بائبل ہے۔

کنفیوشس ازم:

یہ عقیدہ چین کے کنفیوشس کی تعلیمات اور ان کے نظریات پر قائم ہے۔

کنفیوشس پانچویں صدی بی سی میں تھے۔ سات کروڑ کے قریب لوگ آج بھی اس ازم کے پیروکار ہیں۔

کنفیوشس نے خدا کا کوئی واضح تصور نہیں دیا ہے لیکن اس نے زندگی کو سلیقے سے گزارنے کا درس ضرور دیا ہے۔

اس مفکر کو ہم مذہبی رہنما کی بجائے ایک عظیم اخلاقی رہنما کہہ سکتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد معاشرے کے لیے مفید ثابت ہونا ہے اور وہ مفید اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ پُرخلوص، سچا، دوسروں کا ہمدرد، نرم گفتار اور مہربان ہو۔ اس کو اپنے گھر، اپنے دوستوں اور اپنے معاشرے کی پروا ہو۔ کنفیوشس کے حکیمانہ اقوال آج بھی دہرائے جاتے ہیں۔

ڈی ازم:

یہ اٹھارہویں صدی کی ایک فلسفیانہ تحریک یا نظریہ ہے جو بعد میں باقاعدہ عقیدے یا فرقے کی صورت اختیار کرگئی۔

مشہور فلاسفر کانٹ نے اس نظریے کو پیش کیا تھا۔ اس کے پیروکاروں میں والٹیر، پائن، جیفرسن اور دوسرے فلاسفر بھی شامل ہوتے گئے۔

اس کے مطابق اس میں کوئی شک نہیں کہ کائنات کا خالق ایک خدا ہے لیکن اب اس خدا کو کائنات سے دلچسپی نہیں رہی۔ دلیل ہر علم کی بنیاد ہے۔

ان کے یہاں کوئی مخصوص عبادتیں نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی مخصوص کتاب ہے۔ البتہ تھامس پائن کی کتاب The age of reeson اس عقیدے کو سمجھنے کے لیے ہوسکتی ہے۔

ایک کانکر Eckankar:

اس کی بنیاد 1965ء میں لاس ویگاس میں رکھی گئی تھی۔

اس فرقے کی بنیاد رکھنے والا جان پال ٹیچ ویل تھا۔ مرکزی روح یا مرکز اولیٰ کو Eck کا نام دیا گیا۔

بھوک بھی کیا چیز ہے۔ یہ کچھ نہیں دیکھتی، نہ اپنا نہ پرایا۔ اب اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ جب دو منہ والے سانپ پیدا ہوتے ہیں تو خوراک کے لیے ایک دوسرے کو کھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

آپ دن بھر میں کتنا پیدل چل لیتے ہیں۔ میں ان کی بات نہیں کررہا جو باقاعدہ واک کرتے ہیں بلکہ ان کی بات ہو رہی ہے جو عام طور پر چلتے ہیں۔ گھر سے بازار چلے گئے۔ بچوں کو لینے اسکول چلے گئے یا اس طرح کی کوئی اور سرگرمی۔ ایک اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک عام آدمی اپنی پوری زندگی میں اتنی واک ضرور کرتا ہے کہ پوری دنیا کے گرد تین بار چکر لگائے۔

مرسلہ: نومی۔ کراچی

ہم میں سے ہر ایک، ایک ایسی روح ہے جس کے وجود میں خدا کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ جسے روحانی تجربات کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

روح لافانی ہے اور اپنی نجات کے لیے سفر کرتی رہتی ہے۔ اس کا یہ سفر مختلف جسموں میں بھی نجات کی صورت میں ہوسکتا ہے اور اگر کسی کے اعمال اچھے ہیں تو اس کا پہلا جنم ہی اس کی نجات کے لیے کافی ہے۔ ان کی عبادات میں Eck کی خفیہ عبادات (جس کے بارے میں باہر والوں کو بہت کم معلوم ہے) مراقبہ اور خواب دیکھتے ہیں (یہ عمل کس طرح ہوتا ہوگا اس کے بارے میں نہیں معلوم)۔ ہارولڈ کی لکھی ہوئی مذہبی کتابیں ان کے لیے مقدس کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں۔

اپی کیورین ازم Epicureanism:

بہت لمبا چوڑا نام ہے لیکن اس نام کی اصل یہ ہے کہ اس فرقے کی بنیاد اپی کیوریس نے یونان میں نے 300 بی سی میں رکھی تھی (یعنی بہت قدیم ہے)۔

خدا کا تصور ان کے یہاں مختلف ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ خدا کا وجود ہے لیکن وہ انسانوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا۔

ان کا خیال ہے کہ مادہ ہی اصل ہے اور یہ چیز ایٹم (مادے) سے بنا ہے۔ خدا اور روح تک مادے کی پیداوار ہے۔

جنت دوزخ کا کوئی تصور ان کے یہاں نہیں ہے۔ یہ حیات بعد از موت پر یقین نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ موت کے بعد انسانی جسم اور روح دونوں فنا ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی اس مختصر زندگی میں زیادہ سے زیادہ خوشیاں حاصل کرے اور دکھوں سے بچے۔

اپی کیوریس کے خطوط کا مجموعہ ان کی مذہبی کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔

فالون گینگ Falun gang:

چین میں اس فرقے کی بنیاد 1992ء میں لی یونگ زمانے میں ڈالی تھی۔ ان کے یہاں دس لاکھ کے قریب خداؤں کا تصور ہے۔

خداؤں کے علاوہ یہ ان گنت روحانی قوتوں پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ماورائی مخلوق، ان کا کہنا ہے کہ توانائی ایک پہیے کی طرح ہے جو چلتی رہتی ہے اور انسانی جسم میں اس توانائی کا مرکز ناف ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ریاضتوں کے ذریعے ماورا ہو جائے اور یہ مقصد ان کی عبادات سے حاصل ہوسکتا ہے۔

ان کے یہاں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پانچ ورزشیں (یا عبادت ہیں) انسان کی سب سے بڑی خوبی اس کی سچائی ہے۔

اس کو پُرخلوص اور پُریقین ہونا چاہیے۔ یعنی وہ جو ریاضتیں کر رہا ہے اس کا ضرور فائدہ ہوگا۔

گوشت کھانا ان کے یہاں سختی سے منع ہے ان کی کتاب ماسٹر لی نے لکھا ہے۔ یہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ناسٹی سی ازم Cnosticism:

یہ بھی بہت قدیم فرقہ ہے۔

اس کی بنیاد دوسری یا پہلی صدی میں یونان میں ڈالی گئی۔ اس کے بہت سے رہنما تھے۔ دراصل یہ فرقہ اس وقت وجود میں آیا جب یونان میں دیوی دیوتاؤں کے نظریات تھے۔ بے شمار دیوی اور دیوتا ہوا کرتے تھے۔

یہ فرقہ ان سبھوں کی رد میں آیا تھا اور اس نے آتے ہی خدا کے بارے میں کہہ دیا کہ خدا ایک عظیم طاقت تو ہے لیکن انسان کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ جب کہ ان گنت شیطانی طاقتیں اور ان کے آلہ کار ہمارے سامنے ہیں (ہوسکتا ہے کہ ان گنت دیوی دیوتاؤں کے بارے میں کہا گیا ہو)۔

انسان کائنات کے راز معلوم کر کے روحانی دنیا میں جا کر اصل مقام حاصل کر سکتا ہے۔

ان کی عبادتوں میں مراقبہ اور دھیان گیان ہے اور کچھ ایسی ورزشیں ہیں جن کے ذریعہ کائنات کی خفیہ طاقتوں کے راز جان سکیں۔

مذاہب کے تعارف کا یہ پہلا حصہ تھا۔ اب اور کچھ باقی ہے۔ اس چھوٹی سی تحریر سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان اور مذہب کا کتنا گہرا رشتہ ہے۔ اس نے ہر دور میں خود کو کسی نہ کسی مذہب سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ اور بات ہے کہ وہ جعلی اور مصنوعی مذاہب ہوں لیکن اس کی بے چین طبیعت کسی بھی دور میں خاموش ہو کر نہیں بیٹھی۔

اس نے خدا کے وجود کو یا تو رد کیا ہے یا تسلیم کیا ہے (کسی بھی شکل میں سہی) یہ ایک دل چسپ معاملہ ہے۔ کہ نہ جانے ہم جس ماحول میں رہ رہے ہیں وہاں کتنے خفیہ مذاہب ہوں۔

رسم شادی

ثناء ثاقب

جیون ساتھی کے انتخاب کی رسم کا نام شادی ہے جو شاہراہ زیست کو اپنے انداز سے تسخیر کرنے کے لیے ضروری ہے۔ نسل کو مہمیز کرنے کی خاطر بہت اہم ہے۔ یہ رسم دنیا کے مختلف حصوں میں الگ الگ انداز میں ادا کی جاتی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور عجیب بھی۔ معلومات کے خزینے کو وسیع کرنے کے لیے آپ بھی ملاحظہ کریں۔

مختلف علاقوں میں رائج رسم عروسی کا بیان

شادی ایک مبارک مقدس اور خوب صورت فریضہ ہے۔ دو دل ایک ہو جاتے ہیں۔ زندگی بھر کا بندھن ہو جاتا ہے۔ لڑکیاں اپنے اپنے ساجنوں کے سپنے اپنی آنکھوں میں بسائے رکھتی ہیں۔ شادی کے بعد زندگی ایک نئے انداز سے سفر کرنے لگتی ہے۔ بابل کا آنگن چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ لڑکوں کے لیے جدوجہد کے نئے راستے سامنے آجاتے ہیں۔ کیسی کیسی حسرتیں اور تمنائیں اس لفظ سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اسلام اور دنیا کے ہر

مذہب میں شادی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس مقدس فریضہ کو انجام دینے کے لیے کیسے کیسے طریقے کار کیسی کیسی رسومات رائج ہیں۔ آئیے ہم آپ کو دنیا کی چند دل چسپ رسومات کے بارے میں بتاتے ہیں۔

یہ رسومات، خوشی اور تہذیب کی علامت ہوتی ہیں۔

ہمارے یہاں ہفتوں پہلے سے ڈھول بجنے شروع ہو جاتے ہیں اس سلسلے میں ایک قطعہ سن لیں

ملتے تھے دونوں روز کسی ایک مقام پر
پھر جانے کیوں بدل گئے ملنے کے راستے
ڈھولک بجی پڑوس میں تو بھید یہ کھلا
لڑکی پرائی ہو گئی لڑکے کے واسطے

یعنی ڈھولک بجا کر اس بات کا اعلان کیا جاتا ہے کہ اس گھر میں رہنے والا کوئی لڑکا یا لڑکی شادی کے مضبوط رشتے سے منسلک ہونے جارہی ہے۔

بات رسومات کی ہے۔ تو ذرا دیکھیں تو سہی کہ کیسی کیسی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

لڑکی کے لیے یہ سوچا جاتا ہے کہ اگر وہ غصے کی تیز ہے یا اس میں قوتِ برداشت کی کمی ہے تو ایسی صورت میں شوہر کے گھر جا کر اس کو پریشانیاں اٹھانا پڑیں گی۔ اس لیے کہ ماں باپ تو نخرے برداشت کر لیتے ہیں پتا نہیں سسرال والے برداشت کریں یا نہ کریں۔

اس لیے اسکاٹ لینڈ کی دلہنوں کے چہرے سیاہ کر دیے جاتے ہیں۔ ان پر غلاظت پھینکی جاتی ہے۔ ان کو اس حد تک پریشان کیا جاتا ہے کہ وہ رونے لگتی ہیں لیکن یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔

انہیں غصہ یا ناراضگی کا اظہار نہیں کرنا پڑتا۔ ورنہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑکی غصے کی تیز اور زبان دراز ہے۔

جس وقت اس بے چاری کے ساتھ یہ ناروا سلوک ہو رہا ہوتا ہے۔ اس وقت شاید ہونے والی سسرال کے لوگ بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں اور وہ مجبوراً مسکرا رہی ہوتی ہے۔

دلہن کی رخصتی سے پہلے رونے کا رواج بہت سے ملکوں میں ہے۔ یہ رونا رخصتی کے وقت کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن سب سے انوکھا مظاہرہ چین کے Tujia لوگوں کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔

ان کے یہاں ایک مہینا پہلے سے رونا دھونا شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے دلہن روتی ہے۔ دلہن کے رونے کے بعد بھائیوں اور بہنوں کے رونے کی باری آتی ہے۔

ان کے بعد گھر کے بڑے بوڑھے روتے ہیں۔

اور اصل میں یہ رونا واقعی کوئی رونا نہیں ہے بلکہ صدیوں پرانا ایک گیت ہے۔ اس گیت کو اس انداز سے گایا جاتا ہے جیسے سب رو رہے ہوں اور جو لوگ زبان سے واقف نہیں ہیں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ سب مل کر رو رہے ہیں۔

منگولیا کے ایک قبیلے ''راورا'' کی ایک عجیب رسم ہے۔ اس رسم کو دل چسپ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن بے رحمانہ ضرور کہہ سکتے ہیں۔

شادی ہونے سے پہلے لڑکا اور لڑکی کے ساتھ مرغیوں کے ننھے ننھے چوزے رکھ دیے جاتے ہیں اور ایک بڑا سا چاقو ان دونوں کے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا ہے۔ دونوں مل کر ایک چوزے کو ذبح کر کے اس کی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔

اس عمل کے دوران میں خاندان کے بزرگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ پھر اس چوزے کے جگر کا معائنہ کیا جاتا ہے اگر اس کے جگر میں کسی بھی قسم کا نقص ہو تو پھر دوسرا چوزہ ذبح کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک مکمل صحت مند جگر سامنے نہ آ جائے۔

الٹی سیدھی رسومات کے حوالے سے ہندوستان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بلکہ یہاں کی رسومات شاید تمام دنیا کی رسومات سے زیادہ ہی ہوں گی۔

پنڈت حضرات شادی کا زائچہ دیکھتے ہیں۔ مہورت نکالتے ہیں۔ اگر یہ شبہ ہو جائے کہ شادی کے بعد ستاروں کے منفی اثرات ہوں گے تو پھر کسی درخت کو قربانی کا بکرا بنا دیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ لڑکی کی شادی پہلے اس درخت سے کر دی جاتی ہے۔ باقاعدہ شادی کی رسومات ہوتی ہیں، دعوت ہوتی ہے۔

اس کے بعد پھر اصل شادی لڑکے سے ہوتی ہے۔

اس دوران میں ان کے خیال کے مطابق نجس اثرات دور ہو چکے ہوتے ہیں۔

پھر اس درخت کو کاٹ کر اس کی لکڑیاں جلا دی جاتی ہیں۔ بے چارہ درخت۔

قوت برداشت کا اندازہ لگانے کے لیے بورویٹو میں ایک حیرت انگیز رسم ہے۔ خود اندازہ کریں کہ بے چارے دولہا پر کیا گزرتی ہوگی۔

شادی کے تین دنوں تک انہیں واش روم جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

فجی ایک بہت خوب صورت جزیرہ ہے اور دنیا کے ہر

جمے کی طرح وہاں بھی اے محبت زندہ باد کے نعرے گونجتے رہتے ہیں۔ رومانس کی کہانیاں سامنے آتی رہتی ہیں۔

لیکن وہاں کی ایک اچھی بات ہے کہ ظالم سماج یا بے رحم باپ جیسی کوئی چیز سامنے نہیں آتی۔ البتہ لڑکی کے باپ کی طرف سے ایک چھوٹی سی شرط ضرور ہوتی ہے اور وہ شرط یہ ہوتی ہے کہ لڑکا، لڑکی کے باپ کو کسی وہیل مچھلی کا ایک دانت تحفے میں لا کر دے۔ شرط یہی ہوتی ہے کہ وہ دانت اس نے نہ تو خریدا ہو اور نہ کسی نے اسے تحفے میں دیا ہو۔ بلکہ اس نے خود ہی وہیل مچھلی کے جبڑے سے توڑا ہو۔

آپ خود ہی اندازہ لگالیں کہ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے لڑکے پر کیا گزرتی ہوگی۔

آپ نے سوڈان کا نام تو ضرور سنا ہوگا۔

بہت مشہور ملک ہے۔ وہاں ہمارے مسلمان بھائی رہتے ہیں لیکن وہاں کے ایک قبیلے کی رسم بہت انوکھی ہے۔ شادی تو ہو جاتی ہے لیکن لڑکا اور لڑکی کے لیے اصل کہانی شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔

اور وہ امتحان یہ ہے کہ شادی کے ایک یا دو سال کے اندر لڑکی کو ماں بننا ہے اور وہ بھی جڑواں بچوں کی (جیسے یہ اس بے چاری کے ہاتھ میں ہو) اگر ایسا نہیں ہو سکے تو دونوں میں علیحدگی ہو جاتی ہے۔

ایک اور عجب اور گھناؤنی رسم کا حال سنیں۔ یہ رسم ہے مسائی قبیلے کی۔

رخصتی سے پہلے باپ اپنی بیٹی کے چہرے اور سر پر تھوکتا ہے۔ جتنا تھوک سکے۔ لڑکی اتنی خوش نصیب سمجھی جاتی ہے۔

(کاش کسی مسائی کا باپ ہمارے یہاں ہوتا تو اس کو تھوکنے کے بعد دن میں تارے نظر آجاتے)۔

ایک قدیم کلچر تھا۔ اسپارٹا والوں کا۔ اس پر کئی فلمیں بھی بنی ہیں۔ شادی سے پہلے لڑکی کو جنگ کے میدان میں جا کر بہادری کے جوہر دکھانے ہوتے تھے۔

اس سلسلے میں وہ سر کے بال منڈا کر اور پورے جنگی لباس کے ساتھ میدان میں جایا کرتی تھی۔

جدید دنیا میں الٹی سیدھی رسومات آج تک ادا کی جاتی ہیں۔ جیسے فرانس میں۔

کموڈ کو خوب اچھی طرح صاف کر کے اس میں مشروب بھر کر دولہا دلہن کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ اس مشروب کو پی کر دکھائیں (توبہ)۔

آج کل کموڈ میں چاکلیٹ وغیرہ بھر دی جاتی ہے۔

توہم پرستی دنیا کے ہر ملک میں ہے۔ خاص طور پر شادی کے وقت نیک شگون کے لیے اور نظر بد سے بچانے کے لیے دولہا دلہن کو رقص کرنے کے لیے کہا جاتا ہے اور اس میں اہتمام یہ ہوتا ہے کہ دولہا کے پاؤں کسی صورت فرش سے اٹھنے نہ پائیں۔ ورنہ برا شگون سمجھا جاتا ہے۔

تنکوں کا کرتہ

یہ رسم آئر لینڈ کی ہے۔ شادی کے موقع پر نوجوان لڑکے تنکوں سے بنے ہوئے لباس پہن کر دلہن کے گھر جاتے ہیں اور دلہن کو ان کے ساتھ رقص کرنا پڑتا ہے۔

تیر اندازی

یہ بھی ایک رسم ہے۔ اس رسم کا تعلق چین کے جوگر کلچر سے ہے۔ اس میں بے چاری دلہن کو چوٹ برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ شادی کے فوراً بعد دلہن کو کچھ فاصلے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اور دولہا تیروں سے اس کا نشانہ لیتا ہے۔ تین تیر مارے جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تیروں کی نوک نہیں ہوتی۔ نوک کی جگہ ربڑ لگایا جاتا ہے لیکن چوٹ تو بہر حال لگتی ہی ہوگی۔ جیسے ربڑ کی گولی ماردی گئی ہو۔

آپ ایسی رسموں کو کیا کہیں گے۔

ہمارے یہاں بھی معاملہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ ایک رسم ہے جو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں ہے۔

اس رسم سے ہم سب ہی واقف ہیں اور وہ ہے جوتے چھپائی کی رسم۔ ہوتا یہ ہے کہ بے چارے دولہا کے جوتے چرا کر چھپا دیئے جاتے ہیں، اب وہ ننگے پاؤں تو شادی میں شریک ہونے سے رہا۔ اس لیے وہ جوتوں کی واپسی کا تقاضا کرتا ہے اور جوتوں کی واپسی کے عوض اسے اچھی خاصی رقم دینی پڑ جاتی ہے۔

جو جوتے چرانے یا چھپانے والوں میں برابر برابر تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اب ڈھیٹ قسم کا دولہا ہو تو وہ پیسے دینے کے بجائے ننگے پاؤں ہی گھومتا رہے۔

فرانس کی ایک رسم ملاحظہ فرمائیں۔ یہ وہ رسم ہے جس کا جواب نہیں ہے۔

شادی کی رسومات ختم ہو جانے کے بعد دولہا کے رشتے دار پہلو بہ پہلو اوندھے ہو کر گھاس پر لیٹ جاتے ہیں اور دولہا، دلہن ان کے جسموں کے اوپر سے گزرتے ہوئے دوسری طرف چلے جاتے ہیں۔

اس میں قباحت یہ ہے کہ دولہا یا دلہن میں سے اگر کوئی بہت وزنی ہوا تو بے چارے لیٹنے والے یا لیٹنے والی کا کچومر ہی نکل جاتا ہوگا لیکن کیا کریں رسم تو رسم ہی ہے۔

بہت سے ملکوں میں برے شگون سے بچنے کے لیے ارواحوں کو دھوکا دینے کے لیے اصل شادی سے پہلے جانوروں سے شادی کا ناٹک رچایا جاتا ہے (ہندوستان سمیت)۔

کیا ستم ظریفی ہے۔ نحوست تو دولہا دلہن کی ہوتی ہے اور ساری مصیبتیں جانوروں کے حصے میں آجاتی ہیں یعنی نحوستیں ٹرانسفر ہوجاتی ہیں۔

ایک بہت دل چسپ اور انوکھی رسم کانگو میں ہوتی ہے۔

دولہا دلہن کی قوتِ برداشت اور سنجیدگی آزمانے کے لیے کسی کامیڈین کو بلایا جاتا ہے۔ وہ لطیفے سناتا ہے۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرتا ہے۔ پوری محفل ہنس رہی ہوتی ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ دولہا اور دلہن کو مسکرانے تک کی اجازت نہیں دی جاتی۔

اگر وہ کسی بات پر مسکرا بھی دیں تو ان پر جرمانہ ہوجاتا ہے۔ ہے نا دل چسپ۔

اغوا کرنا بہت بڑا جرم ہے اور خاص طور پر لڑکیوں کا اغوا۔ اس بھیانک جرم پر کڑی سے کڑی سزائیں دی جاتی ہیں لیکن روانڈہ میں ایسا نہیں ہوتا۔

اغوا کرنے والے کو انعام کے طور پر وہی لڑکی دلہن بنا کر دے دی جاتی ہے۔ جی ہاں یہ وہاں کا دستور ہے کہ اگر شادی کرنی ہے تو دلہن کو باقاعدہ اغوا کرکے لانا ہوگا۔

یہ رسم شادی سے دو ایک روز پہلے ادا کی جاتی ہے۔ دولہا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر باقاعدہ پلاننگ کرتا ہے اور لڑکی کو اغوا کرلیتا ہے۔

اس کے بعد شادی کی رسومات کی ابتدا ہوتی ہے۔

اسی قسم کی رسم ہند میں بھی رائج تھی۔ جس کی مثال پرتھوی راج چوہان اور سنجوگتا کی شادی ہے۔ ناطقہ سربہ گریبان ہے ایسے کیا کہیے۔

اب فرانس کی ایک رسم کے بارے میں سن لیں۔

یہ رسم دولہا دلہن کو تنگ کرنے کی رسم ہے۔ ان بے چاروں کو رومانٹک موڈ میں آنے ہی نہیں دیتے۔

حجلۂ عروسی کے باہر زبردست قسم کا شور برپا کیا جاتا ہے۔ ڈرم، گٹار، توا، برتن جو بھی ہاتھ میں ہو اسے زور زور سے بجایا جاتا ہے۔ آخر کار تنگ آکر دولہا کمرے سے باہر آتا ہے اور کچھ دے دلا کر یہ سلسلہ ختم کیا جاتا ہے۔

(اسی قسم کی ایک رسم ہمارے یہاں بھی ہے، گو کہ ذرا مختلف ہے کہ لڑکے کی بھابی یا بہنوئی گیٹ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے کچھ رقم دے کر رخصت کیا جاتا ہے)۔

کوریا میں شادی کی رسومات کے خاتمے کے بعد دولہا کو ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے ٹخنوں کو باندھ کر اس پر موٹی موٹی مچھلیوں سے ضربیں لگاتے ہیں۔ دھڑا دھڑ اور اس بے چارے کو یہ مار برداشت کرنا پڑتی ہے۔

یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ آیندہ زندگی کی سختیاں برداشت کرسکے۔

بھارت کے صوبہ مہاراشٹر میں شادی مندروں میں کی جاتی ہے۔ منتر جاپ کے پہلے لڑکی پنڈت کے بائیں جانب بیٹھتی ہے۔ منتر پورا ہوتے ہی لڑکی پنڈت کے داہنے اور لڑکا بائیں جانب بیٹھ جاتا ہے۔ پنڈت لڑکی سے پوچھتا ہے ''کی پائی جے؟'' (کیا چاہیے) لڑکی گھریلو اشیا کا نام بتاتی جاتی ہے۔ مہمان وہ اشیا فراہم کرتے جاتے ہیں۔

بمبئی کو ہلیو کی رسم ہے کہ دلہن کو پہلی صبح اٹھنے کے بعد آس پڑوس کے گھروں کے جوٹھے برتن دھونا پڑتے ہیں۔ بمبئی کے گجراتیوں میں رسم ہے کہ دلہن کو رخصت کرا کر گھر لانے کے بعد اسے ایک جلوس کی شکل میں محلے کی گلیوں میں گھمایا جاتا ہے۔ آگے آگے دولہے کی بھابی یا بڑی بہن ایک چھلنی کے پلیٹ میں دیپ جلا کر چلتی ہے۔ دلہن کے ساتھ تلوار کو بلند کیے دولہا چلتا ہے اور پیچھے پیچھے عورتیں گیت گاتی چلتی ہیں۔ دولہا کا باپ ایک رجسٹر کھولے ساتھ ہوتا ہے.... ہر گھر کے سامنے رک کر دولہے کا باپ دستک دیتا ہے اور رجسٹر دیکھ کر کہتا ہے۔

''آپ کے ہاں کی شادی میں ہم نے دو سو روپے دیے تھے۔ آپ چار سو واپس کریں۔'' محلے بھر سے وصولی کر کے یہ جلوس گھر لوٹتا ہے۔ بنگال کے ڈھاکا کے مسلمانوں میں رسم ہے کہ دولہا راستے میں ملنے والے ہر شخص کو بلند آواز میں سلام کرے گا۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ دنیا بے کیف ہونے کے باوجود بہت دل چسپ بھی ہے اور اس قسم کی رسومات نے اسے اور بھی دل چسپ بنا دیا ہے۔

قدیم تہذیب

طارق عزیز خان

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب نے ہمارے خطۂ ارض پر جنم لیا، یہیں پھلی پھولی اور دنیا کو مہذب بنانے کے اصول کی ترسیل کا باعث بنی۔ اس کا ثبوت ہڑپہ موئن جو دڑو کے کھنڈر ہیں جہاں سائنسی بنیادوں پر زندگی گزارنے کے طریقے ہزارہا سال قبل بھی رائج تھے۔

دنیا سے مٹ گئی تہذیب پر ایک مختصر مگر جامع تحریر

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق دنیا میں پانچ ہزار سال پہلے تین نمایاں تہذیبوں کا جنم ہوا۔ان میں ایک دریائے نیل کے کنارے واقع قدیم مصری تہذیب (3300 سے 30 قبل از مسیح)، دوسری دریائے دجلہ وفرات کے کنارے میسو پوٹیمیا (Mesopotamia) (7000 سے 600 قبل از مسیح)اور تیسری برصغیر پاک و ہند میں دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے کناروں پر وادیٔ سندھ کی تہذیب (3300 سے 1700 قبل از مسیح) تھی۔ وادیٔ سندھ کی

تہذیب کشمیر میں کوہ ہمالیہ سے لے کر بحیرہ عرب کے ساحلوں تک اپنی ہمعصر تہذیبوں کے مقابلے میں دگنے یعنی لگ بھگ چار لاکھ مربع کلومیٹر علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ آج تک اس تہذیب کے پاکستان اور بھارت میں چار سو سے زائد آثار دریافت ہو چکے ہیں۔ جن میں موہن جودڑو (Mohenjo-Daro) اور ہڑپہ (Harappa) نمایاں ہیں۔ وادی سندھ کے آثارِ قدیمہ سے متعلق پہلی معلومات 19ویں صدی کے آخر میں منظرِ عام پر آئیں جبکہ 20 ویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں موہن جودڑو اور ہڑپہ کے آثار کو باقاعدہ دریافت کیا گیا۔ ابتداء میں ماہرین کا خیال تھا کہ وادی سندھ کی تہذیب کی بنیاد 1500 قبل مسیح میں مغربی ایشیا سے آئے آریاؤں نے ڈالی تھی لیکن 1950ء میں سندھ کے مقام کوٹ ڈیجی میں ہوئی کھدائی نے یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔ اس کھدائی کے دوران نئی چیزیں سامنے آئیں جنھوں نے پرانے تصورات کو تبدیل کر دیا۔ کوٹ ڈیجی میں ہڑپہ سے بھی 800 سال پرانی تہذیب کے آثار ملے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ آریاؤں کے آنے سے پہلے وادی سندھ، تہذیب و تمدن کا گہوارا بن چکا تھا اور اس تہذیب کے سرچشمے اسی سرزمین سے پھوٹے تھے اور یہ مقامی سماج کے ارتقاء کا نتیجہ تھی۔ جبکہ بیرونی اثرات کم اور ثانوی اہمیت کے حامل تھے۔

وادی سندھ کی تہذیب کے باسی پکی اینٹوں سے مکان بناتے تھے۔ ان کے پاس بیل گاڑیاں تھیں۔ وہ چرخے اور کھڈی سے کپڑا بننا جانتے تھے۔ سوتی کپڑا انھی لوگوں نے پہلے پہل تیار کیا۔ وہ کپڑا بننے کے اس فن کو ''کاتنا'' کہتے تھے جس سے انگریزی لفظ ''کاٹن'' بنا ہے۔ شکر اور شطرنج دنیا کے لیے وادی سندھ کے انمول تحفے ہیں۔ شطرنج کا کھیل پہلے پہل اسی تہذیب میں کھیلا گیا جو 600 عیسوی میں برصغیر کی بدولت دنیا میں متعارف ہوا۔ وادی سندھ کی تہذیب کے علاوہ شمالی پاکستان میں دریائے سواں کے کنارے گندھارا تہذیب کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم پاکستان میں واقع تین نمایاں آثارِ قدیمہ اور ان کی باقاعدہ دریافت کا احوال پیش کرتے ہیں۔

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے 20 کلومیٹر مغرب میں گندھارا تہذیب کے مرکز ٹیکسلا کے آثارِ قدیمہ واقع ہیں۔ یہ شہر 600 قبل از مسیح سے آٹھویں صدی عیسوی تک موجود رہا۔ 326 قبل از مسیح میں مقدونیہ (یونان) کے حکمران سکندرِ اعظم نے ٹیکسلا کو فتح کیا۔ اس نے شہر میں قیام کے دوران ہندو راجا پورس سے لڑنے کی منصوبہ بندی کی۔ 190 ق م میں سکندر کے جانشینوں نے شمالی پنجاب کو فتح کرنے کے لیے ٹیکسلا کو اپنا بیس کیمپ بنایا۔ ہندوستان کی ماوریان سلطنت (Maurayan Empire) کے تیسرے بادشاہ مہاراجا اشوک اعظم (269-232 ق م) کے دور میں ٹیکسلا شہر بدھ مت کی تعلیم کا اہم مرکز تھا۔ ساتویں صدی عیسوی کے دوران چینی سیاح ہیونگ سانگ نے شہر کی سیاحت کی اور اپنے سفر نامے میں شہر کی شان و شوکت کا ذکر کیا۔ آج ٹیکسلا میں واقع عجائب گھر میں رکھے گندھارا آرٹ کے نمونے، دس ہزار سکے اور دیگر نوادرات سیاحوں کی کشش کا باعث ہیں۔

موہن جودڑو کے آثارِ قدیمہ پاکستان کے صوبہ سندھ میں لاڑکانہ شہر سے 20 کلومیٹر اور سکھر سے 80 کلومیٹر جنوب مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہیں۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کے مطابق موہن جودڑو کا شہر 2600 سے 1500 قبل از مسیح کے دوران موجود تھا۔ اندازہ ہے کہ یہ شہر دریائے سندھ کے رخ میں تبدیلی، بیرونی حملہ یا پھر زلزلے کی وجہ سے ویران ہوا۔ موہن جودڑو، سندھی زبان کا لفظ ہے۔ جس کا مطلب ''مردوں کا ٹیلہ'' ہے۔ ماہرین کے مطابق اپنے دورِ عروج پر موہن جودڑو کے شہر میں 35 ہزار کے لگ بھگ لوگ آباد تھے محتاط اندازے کے مطابق یہ دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ تین ہزار سال قبل مسیح یا اس سے کچھ پہلے مغربی ایشیا سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے۔ شہر کے زوال کے ساتھ یہ نسل معدوم نہیں ہوئی بلکہ بار بار سیلاب کی تباہ کاریوں نے انھیں مجبور کر دیا کہ وہ جنوب مشرق کی طرف ہجرت کر جائیں۔ شہر کے کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر بڑی ترتیب سے بنا ہوا تھا۔ اس کی گلیاں سیدھی اور کھلی تھیں اور پانی کی نکاسی کا مناسب انتظام موجود تھا۔ اپنی تعمیر کے بعد سے یہ شہر سیلاب کی وجہ سے سات مرتبہ اجڑا اور پھر دوبارہ بسایا گیا۔ یہ شہر دریائے سندھ کے اندر ایک جزیرہ نما جگہ پر آباد تھا۔ جس کے دو اطراف میں دریا جبکہ ایک طرف دریا سے نکلنے والا نالا نارا بہتا تھا۔ جبکہ چوتھی طرف خشکی تھی۔ شہر کی حفاظت کے لیے دو کلومیٹر لمبا ایک بند بھی تعمیر کیا گیا تھا تاہم سیلاب کے دنوں میں اس بند میں بار بار شگاف پڑ جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موہن جودڑو کی تہذیب میں بار بار سیلاب کی تباہ کاریوں کے آثار ملتے ہیں۔

موہن جودڑو کا عمومی پلان ہڑپہ جیسا ہی تھا۔ شہر کے مغرب میں ایک بلند ٹیلے پر قلعہ ہے۔ جس کے گرد گلیاں ایک

جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ قلعے کی بیرونی دیواروں اور گلیوں کے درمیان ایک چوڑی خالی جگہ موجود ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قلعے کو محفوظ بنانے کے لیے اس کے چاروں طرف پانی چھوڑا جاتا تھا۔ تہذیب کے عروج کے دنوں میں دریائے سندھ کی ایک ذیلی شاخ قلعے سے محض تین کلومیٹر کے فاصلے پر بہتی تھی۔ شہر کی گلیوں کی ترتیب، مکانات اور اناج گھر سب ہڑپہ جیسا ہی ہے۔ البتہ یہاں کی سب سے نمایاں منفرد عمارت ایک بڑا ''اشانان گھر'' ہے۔ بڑا غسل خانہ بڑی باؤلی یا عظیم حمام۔ تمام عمارت کے بیچوں بیچ پانی کا ایک بڑا تالاب بھی ہے۔ جس کی لمبائی قریب 39 فٹ چوڑائی 23 فٹ جبکہ گہرائی 8 فٹ ہے۔ تالاب کے اندر رسائی کے لیے دو متوازی کناروں پر سیڑھیاں اندر کی طرف اترتی ہیں۔ موہن جودڑو... کی شہری گلیاں کچی تھیں تاہم ان کے نیچے زمین دوز پکی نالیاں بنائی گئی تھیں جبکہ مناسب مقامات پر پکے مین ہول بھی تعمیر کیے گئے تھے۔ موہن جودڑو... میں کل نو رہائشی پرتیں دریافت کی گئیں جن میں کئی جگہ سیلاب کی تباہ کاریوں کے آثار ملتے ہیں۔ موہن جودڑو ... کے لوگ زراعت پیشہ تھے۔ وہاں کی زمین میں تل مٹر اور کپاس کی کاشت کے ثبوت دریافت ہوئے ہیں۔ وہاں دھاگے کا بنا کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی ملا ہے جس پر موجود گہرا سرخ رنگ آج کے زمانے کی سندھی اجرک کے مخصوص رنگوں سے میل کھاتا ہے۔ شہر کے باسی زرعی اجناس کے علاوہ جانوروں کی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ کھنڈرات سے ملی ہڈیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہاں کوہان والا بیل، بھیڑ بکری اور خنزیر پالے جاتے تھے۔ جبکہ محدود پیمانے پر گھوڑے اور گدھے کے پالے جانے کے آثار بھی ملتے ہیں۔ موہن جودڑو تہذیب کا مذہب توہم پرستی تھا۔ مقامی لوگ مظاہر فطرت یعنی سورج چاند کے علاوہ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ جبکہ مذہبی پیشواؤں کو بھی مقدس درجہ دیا جاتا تھا۔ شہر کی کھدائی کے دوران بارہ سو کے قریب مہریں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ یہ مہریں عمدہ دستکاری کے شاندار نمونے ہیں جن پر پالتوں جانوروں کی حقیقی تصاویر کھدی ہوئی ہیں۔ یہاں سے ملی بیشتر مہروں کی حیثیت دستخطی ہے جنہیں سرکاری عہدے دار اپنی اتھارٹی کے اظہار کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وادی سندھ کی قدیم تہذیبوں کا ایک سربستہ راز وہاں کا عجیب وغریب رسم الخط ہے۔ ماہرین آثار قدیمہ نے اسے پڑھنے کی کوششیں کی ہیں لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ہے۔

پوری تہذیب کی تباہی کسی بڑے بیرونی حملے یا عظیم

انفراریڈ (شعاعیں)

شعاعوں کی ایک خاص قسم جن کا طول موج بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اسے غیر مرئی روشنی بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ انسانی آنکھ ان شعاعوں کو نہیں دیکھ سکتی۔ ان سے حرارت خارج ہوتی ہے اور ان کی موجودگی کا اندازہ حرارت ناپنے والے آلات یا فوٹو گرافی کی حساس پلیٹوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ شعاعیں سالموں (Molecules) کی ترتیب اور ساخت کا پتا چلانے، انسانی آنکھ کی رسائی سے دور کے فاصلوں سے تصاویر لینے اور مختلف امراض کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

مرسلہ: نعمان اصغر۔ جہلم

الیگزینڈر بانومگارٹین

کانٹ کے عہدے سے پہلے کا جرمن فلسفی جس نے پہلی بار فلسفے کی اس شاخ کو جو حسن اور فن سے تعلق رکھتی ہے جمالیات کا نام دیا۔ اس کی ایک کتاب ''جمالیات'' (ایستھ ٹیکا) کافی مشہور ہوئی۔ اس میں اس نے حسن کے مسئلے کا تجزیہ کیا ہے جو اس کے نزدیک کلیت اور جامعیت کی شناخت کا دوسرا نام ہے۔

Bicycle

دو پہیوں کی وہ ہلکی سواری جسے پاؤں سے چلایا جاتا ہے۔ بائیسکل کی یہ ترقی یافتہ صورت کئی مدارج طے کرنے کے بعد اس کو میسر آئی ہے۔ سب سے پہلی بائیسکل 1816ء میں پیرس کے ایک شخص نے بنائی۔ یہ لکڑی کی تھی اور سوار اس کو پاؤں سے دھکیل کر چلاتا تھا۔ 1840ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک لوہار کرک پیٹرک میکیلن نے اس میں کئی تبدیلیاں کیں اور اس کو ایک آرام دہ سواری بنا دیا۔ 1885ء میں اس میں فری ویل اور پیڈل کا اضافہ کر کے اس کو اور آرام دہ بنا دیا گیا۔ 1888ء میں اس کے لیے ربر کا ٹائر استعمال کیا جانے لگا۔ 1953ء میں پاکستان میں بھی بائیسکلوں کی تیاری شروع ہوگئی اور رستم، سہراب، پیکو کے نام سے بائیسکل بننے لگے۔ چینی سائیکل فونیکس کا شمار دنیا کے بہترین سائیکلوں میں ہوتا ہے۔

مرسلہ: اریبہ شکیل۔ سیالکوٹ

طوفان کی وجہ سے نہیں ہوئی جیسا کہ پہلے اندازہ لگایا گیا تھا۔ کھنڈرات سے ملے پختہ ثبوتوں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ موہن جودڑو شہر بتدریج زوال پذیر ہوا۔ شہر کی تباہی کی سب سے بڑی وجہ بار بار آنے والا سیلاب تھا۔ بدقسمتی سے سیلاب کے بعد ہر بار ہونے والی نئی تعمیرات کا معیار پہلے سے پست ہوتا چلا گیا۔ بغیر کسی منصوبہ بندی کے پہلے سے موجود ملبے پر نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں جو پائیدار ثابت نہیں ہوئیں اور پورا شہر بتدریج کھنڈرات میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ شہر کی کھدائی کے دوران ملے بعض ڈھانچوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں قتل کیا گیا تھا۔ تاہم یہ ڈھانچے کسی بیرونی حملے کے نتیجے میں ہونے والے قتل عام کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ انگریز ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر جارج ایف ڈیلز نے 1942ء کی ایک کھدائی کے دوران موہن جودڑو سے پانچ انسانی ڈھانچے دریافت کیے۔ ان میں تین مرد ایک عورت اور ایک بچے کا ڈھانچا ہے۔ ڈاکٹر ڈیلز کا خیال ہے کہ انھیں گھات لگا کر قتل کیا گیا تھا۔ بعد کی کھدائیوں سے تین درجن سے زیادہ انسانی ڈھانچے مزید دریافت ہوئے۔ جن کی ٹوٹی ہڈیاں قتل کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔ تاہم ماہرین متفق ہیں کہ یہ بیرونی حملے کی وجہ سے ہونے والا قتل عام نہیں تھا بلکہ سیلاب کی تباہ کاریوں کے بعد شہر میں بس رہے یہ لوگ مسلح آریائی لٹیروں کا نشانہ بنے تھے۔ قتل کے یہ واقعات 1700 قبل مسیح میں پیش آئے جو موہن جودڑو تہذیب کی آخری تباہی کا باعث بنے۔ اس تباہی کے بعد یہ شہر دوبارہ کبھی آباد نہیں ہوا۔

موہن جودڑو سے 588 کلومیٹر شمال میں وادی سندھ کی تہذیب کا ایک اور نمایاں مرکز ہڑپہ واقع ہے۔ ہڑپہ کے کھنڈرات پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ساہیوال شہر سے 35 کلومیٹر جنوب مغرب میں واقع ہیں۔ یہ شہر 3500 قبل از مسیح سے 1600 ق م تک موجود رہا۔ اپنے دورِ عروج میں شہر کی آبادی 24 ہزار کے لگ بھگ تھی۔ قدیم شہر 150 ایکڑ رقبے پر مشتمل تھا جس میں سے موجودہ کھنڈرات 176 ایکڑ رقبے پر موجود ہیں۔ ہڑپہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ مکانوں کی تعمیر میں چوڑی اصول اینٹیں استعمال کی گئی تھیں چوڑی گلیاں، منظم انداز میں کھودے گئے کنویں، ڈھکی ہوئی نالیوں پر مشتمل نکاسیٔ آب کا انتظام، اناج گھر، برتن بنانے کی بھٹیاں اور مذہبی مقامات اس شہر کی شان تھے۔

یہاں سے اوزان پیمائش، مرجان و یاقوت سے بنے ہوئے ہار، تانبے اور پتھر کی مہریں، جانوروں کے مجسمے اور برتن مل چکے ہیں۔ ہڑپہ سے دریافت ہونے والی مختلف انجانے حروف پر مشتمل تختیاں آج بھی ماہرین آثار قدیمہ کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ آج تک ان حروف کو سمجھا اور پڑھا نہ جاسکا ہے۔

ہڑپہ کی ابتدائی حادثاتی دریافت 1890ء میں ہوئی جب ملتان، لاہور ریل ٹریک کے لیے سپلائی مہیا کرنے والے مقامی ٹھیکیدار نے ساہیوال کے قریب مٹی ڈھونے کے دوران ہڑپہ کے آثار قدیمہ کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ زمین میں دفن لاکھوں اینٹوں کے خزانے کو دیکھ کر حیران ہوا، تاہم اینٹوں کے ساتھ قیمتی دھاتوں اور جواہرات نکلنے کے بعد اس نے زمین میں دفن قدیم شہر کی خبروں کو صیغہ راز میں رکھا۔ ٹھیکیدار نے اینٹوں کی سپلائی کا کام جاری رکھا اور یوں ہڑپہ شہر اپنی دریافت سے پہلے ہی اجڑنے کی اقدار پر پہنچ گیا۔ اس دوران بعض افسران اینٹوں کی مخصوص ساخت کو دیکھ کر حیران ہوئے۔ تاہم ٹھیکیدار نے انھیں یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ اس نے کئی سال پہلے شہر کے قریب مخصوص سانچے کی اینٹوں کے بھٹے لگائے تھے جنھیں اب استعمال کیا جا رہا ہے۔

ریلوے ٹریک کا کام جاری تھا کہ 1921ء کے موسم بہار میں ایک مقامی ہندو رائے بہادر دیا رام سنی نے ساہیوال کے انگریز حکام کو اطلاع دی کہ اس نے ہڑپہ کے قریب کھنڈرات پر مشتمل قدیم آثار دیکھے ہیں۔ مقامی افسران کے لیے اب ان خبروں سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں تھا۔ انھوں نے تحقیق شروع کی اور بہت جلد یہ کھوج لگانے میں کامیاب رہے کہ لاہور خانیوال ریلوے اسٹیشن کی تعمیر میں استعمال ہونیوالی اینٹیں ہڑپہ کے قدیم آثار قدیمہ سے چرائی گئی تھیں۔ ضلع ساہیوال سے تعلق رکھنے والے افسران کے توسط سے ہڑپہ کے آثار سے متعلق خبریں متحدہ ہندوستان کے دارالحکومت دہلی پہنچیں۔

جس کے بعد انگریز حکومت کی طرف سے سر جون مارشل نے دریائے سندھ کی وادی میں آثار قدیمہ کی دریافت کے لیے سروے کا کام شروع کروایا۔ سر جون مارشل 19 مارچ 1876ء کو انگلینڈ کی بندرگاہ لیورپول کے قریب واقع شہر چیسٹر (Chester) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے لندن کے ڈلوچ کالج سے گریجویشن کیا اور کنگز کالج کیمبرج سے ارضیات میں ڈگری حاصل کی۔ سر جون مارشل نے بطور ماہر آثار قدیمہ اپنی پہلی خدمات بحیرہ روم کے یونانی جزیرے کریٹ (Crete) میں سرانجام دیں۔ انھوں نے کریٹ کے جزیرے

میں 1899ء سے 1901ء کے دوران Aegean تہذیب (3000 سے 1200 ق م) سے تعلق رکھنے والے آثار قدیمہ دریافت کیے جن میں کنوسس (Knossos) کے کھنڈرات نمایاں ہیں۔ 1902ء میں سر جون مارشل (Sir John Marshall) کو برطانوی ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کردیا گیا۔ اس زمانے میں لارڈ کرزن (1859-1925) ہندوستان کا گورنر جنرل (1899-1905) تھا۔ سر جون مارشل نے موجودہ پاکستان کی حدود میں دریائے سندھ کی وادی کے سروے کا کام شروع کروایا۔ ان کا پہلا نمایاں کارنامہ شمالی پاکستان میں گندھارا تہذیب کے مرکز ٹیکسلا کی دریافت ہے۔

سر جون مارشل نے 1913ء میں ٹیکسلا میں کھدائی کا کام شروع کروایا، جو اگلے بیس سال جاری رہا۔ انھیں 1914ء "سر" کا خطاب دیا گیا۔ انھوں نے 1918ء میں ٹیکسلا میوزیم کی بنیاد رکھی۔ سر جون مارشل کی کوششوں کے نتیجے میں 1920ء میں ہڑپہ اور موہن جودڑو میں کھدائی کے کام کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ موہن جودڑو کی دریافت کے حوالے سے ایک مکتبہ فکر کی رائے یہ ہے کہ اسے 1911ء میں غیر منقسم ہندوستان کے ماہر آثار قدیمہ آر کے بھنڈر نے دریافت کیا تھا۔ اس سلسلے میں موئن جودڑو کنزرویشن سیل کے سابق ڈائریکٹر مسٹر حاکم شاہ بخاری کا کہنا ہے کہ آر کے بھنڈر نے بدھ مت کے مقدس مقام کی حیثیت سے اس جگہ کی تاریخی حیثیت کی جانب توجہ مبذول کروائی، جس کے لگ بھگ ایک عشرے بعد سر جون مارشل یہاں آئے اور انھوں نے اس جگہ کی کھدائی شروع کروائی۔ 1931ء میں سر جون مارشل کی وادی سندھ کی تہذیب سے متعلق کتاب Mohenjo-Daro and the Indus Civilization شائع ہوئی۔ اسی سال فنڈ کی کمی کی وجہ سے کھدائی کا کام روک دیا گیا۔ تاہم سر جون مارشل کی ٹیم نے اپنے طور پر سروے کا کام جاری رکھا اور بہت جلد یہ انکشاف ہوا کہ قدیم تہذیب کے آثار ہڑپہ اور موہن جودڑو کے مقامات تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اس تہذیب کے ذیلی سلسلے سندھ میں چنہودڑو، جھوکر، علی مراد اور پنجاب میں روپڑ اور بلوچستان میں نال اور کلی کے مقام پر بھی پائے گئے ہیں۔

سر جون مارشل کی کوششوں سے موہن جودڑو... اور ہڑپہ میں کھدائی کا کام دوبارہ شروع کیا گیا اور اس بار ابتدائی کھدائی کا کام مکمل کیا گیا۔ 1936ء میں اسے برٹش اکیڈمی کا فیلو منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جون مارسل نے اپنی باقی زندگی انگلینڈ میں گزاری، جہاں 17 اگست 1958ء کو ان کا لندن میں انتقال ہوگیا۔

پاکستان میں وادی سندھ کی تہذیب کو منظر عام پر لانے کے حوالے سے سر جون مارشل کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ بہت ممکن ہے کہ 19ویں صدی کے آخر میں متعدد مقامی لوگ دریائے سندھ کی وادی میں واقع آثار قدیمہ سے متعلق سن گن رکھتے ہوں، تاہم سر جون مارشل ہی وہ پہلا شخص تھا جس کی کوششوں کے نتیجے میں بیرونی دنیا پاکستان میں واقع قدیم تاریخی ورثے سے روشناس ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے دریافت کردہ مقامات کی نگرانی اور دیکھ بھال کا فریضہ محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرد کیا گیا۔

آج موہن جودڑو اور ٹیکسلا کے معاملات کو کسی حد تک تسلی بخش قرار دیا جاسکتا ہے لیکن متعلقہ محکموں کی عدم توجہی مقامی لوگوں میں شعور کی کمی اور مناسب فنڈ نہ ہونے کی وجہ سے ہڑپہ کی قدیم ترین تہذیب کی باقیات زبوں حالی کا شکار ہیں۔ ماضی قریب میں کی گئی کھدائیوں کے دوران ہڑپہ سے ملنے والے قیمتی نایاب نوادرات چوری ہونے کی خبریں بھی گردش کرتی رہی ہیں۔ تاہم اس سب کے باوجود کچھ مخلص لوگ اور ادارے پاکستان کے قدیم تاریخی ورثے کی حفاظت کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں نام پاکستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ مؤرخ اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی کا ہے۔ وہ 20 جون 1920ء کو ہندوستان کے شہر چھتیس گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1944ء میں جامعہ بنارس ہندو سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ وہ اس درس گاہ سے ڈگری حاصل کرنے والے پہلے مسلمان تھے۔ احمد حسن دانی 1945ء میں محکمہ آثار قدیمہ سے منسلک ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے ٹیکسلا، موہن جودڑو اور ہڑپہ میں کھدائی کے کام میں حصہ لیا۔ ان کی نگرانی میں پشاور اور لاہور کے عجائب گھروں کی تزئین و آرائش کی گئی۔ ان کی علمی خدمات پر حکومت پاکستان نے انھیں ستارۂ امتیاز اور ہلال امتیاز کے اعزازات سے نوازا۔ ان کا 26 جنوری 2009ء کو اسلام آباد میں انتقال ہوگیا۔ احمد حسن دانی اور ان جیسے جواں ہمت لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، سائنس و ثقافت یونیسکو کی جانب سے پاکستان میں واقع ٹیکسلا، موہن جودڑو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ کو عالمی ورثہ قرار دیا گیا۔

م الف

لڑائی بھڑائی انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ یہی لڑائی جب بڑی قوتوں میں بڑے پیمانے پر ہو تو جنگ کہلاتی ہے۔ تاریخ کے دامن میں ایسے بہت سے نام ہیں جنہوں نے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے جنگ کا بازار گرم کیا۔ انسانیت کا خون پانی کی طرح بہایا۔ بستی کی بستیاں تاراج کیں۔

انا کی خاطر انسانی خون کو مباح قرار دینے والوں کا ذکر

کائنات کی سب سے عجیب مخلوق انسان ہے۔

کسی میں بھی اتنا تضاد نہیں ہے۔ جتنا انسان میں ہے۔ ایک طرف انتہائی رحم دل۔ دوسری طرف انتہائی بے رحم۔ ایک طرف محبت کا دیوتا تو دوسری طرف نفرت کا شیطان۔ ایک طرف بلا کا وفادار تو دوسری طرف انتہائی دھوکے باز۔ غرض یہ کہ جتنی بھی انسانی خوبیاں ہوسکتی ہیں ان کا تضاد بھی انسان میں ہی ہے۔

آپ نے انسانی تاریخ کے رحم دل انسانوں کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا جو کسی کو تکلیف میں دیکھ کر خود تڑپ جاتے تھے۔ کوئی آنسو بہاتا تو چوٹ ان کے دلوں پر لگتی تھی۔ کوئی مصیبت میں گھرا ہوتا تو اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتے۔

ایسے لوگ انسانیت کا زیور ہوا کرتے۔ تاریخ ایسے ناموں اور ان کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ سارے پیغمبر، انبیاء، اولیا، مفکر، دانش ور سب اسی مزاج کے لوگ تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو جلتی دھوپ میں سائے کی طرح ہوا کرتے۔ جنہوں نے انسان کو گلے سے لگا رکھا تھا۔ دنیا بھر کی فلاحی تنظیمیں ان ہی کے دم سے وجود میں آئیں جنہوں نے خدمتِ خلق کرکے اپنے رب کو راضی کیا ہے۔

یہ انسان کا ایک رخ ہے۔ اور دوسرا رخ یہ ہے کہ یہی انسان انتہائی بے رحم، جابر، ظالم اور سنگ دل بھی ہے۔ اس نے انسان کو اذیت دینے اور اسے تباہ کرنے کے ایسے ایسے طریقے استعمال کیے کہ زمین کانپ اٹھی۔ آسمان لرز کر رہ گیا۔

یہ موت، تباہی، خونریزی اور تشدد کے دیوتا ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے انسانی تاریخ میں اپنے نام شامل تو کیے ہیں لیکن انتہائی بے رحمی سے۔

آئیں آپ کو تاریخ کے ایسے چند کرداروں سے ملواتے ہیں جن کے ظلم و تشدد کی داستانیں بے رحمی کی داستانیں بن کر رہ گئی ہیں۔

ڈریکولا

یہ نام ظلم کی تاریخ میں امر بن کر رہ گیا ہے۔

کاؤنٹ ڈریکولا۔ یہ شخص تین بار ولاچیا کا بادشاہ مقرر ہوا۔ اس کی ریاست خودمختار ریاست تھی۔ اس کا زمانہ 1428 سے 1476 تک کا ہے۔

اس کا نام ڈریکولا نہیں ولاڈ تھا۔ یہ نام مؤرخوں نے

اسے دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے چھوٹا شیطان اور یہی نام اس کی پہچان بن گیا ہے۔

اگر کسی سے کہا جائے کہ یہ داستان کاؤنٹ ولاڈ کی ہے۔ تو کسی کو اندازہ نہیں ہوگا کہ یہ کاؤنٹ ولاڈ کون تھا لیکن جب ڈریکولا کہا جائے تو ایک بچہ بھی اس کو پہچان لے گا۔

یہ شخص خون بہانے میں بے پناہ لذت محسوس کیا کرتا۔ بہتا ہوا انسانی خون اس کے لیے لذت کا سبب بنتا۔

اقتدار پر آنے کے بعد جب اس کو طاقت بھی مل گئی تو اس نے اپنے کھیل اور بے رحمی کا دائرہ وسیع کر دیا۔ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو کر کسی کا بھی خون کروا دیتا۔

انسانوں کو مارنے کے اس نے نئے نئے وحشیانہ طریقے اختیار کیے۔ اس کے کئی طریقے بہت پسندیدہ تھے۔

وہ انسان کی ٹانگیں باندھ کر دو مختلف سمتوں کی طرف جانے والے گھوڑوں سے باندھ دیتا اور جب وہ گھوڑے پوری طاقت سے مختلف سمت کو جاتے تو وہ بے چارہ آدھے دھڑ سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔

ولاڈ اس منظر کو دیکھ کر جنونیوں کی طرح ہنستا۔ شراب پیتا اور اپنے ساتھیوں کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتا۔

اس کے ساتھی اس موقع پر کانپ کر رہ جاتے ہوں گے کہ کہیں کل ان کا بھی یہی حشر نہ ہو۔ اپنے خلاف ذرا سی بات بھی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

انسانوں کے ساتھ اس کے بے رحمانہ سلوک کا ایک اور طریقہ تھا۔ لکڑی کی چھڑیاں آگے سے بے انتہا نوکیلی کر دی جاتیں۔ وہ چھڑیاں کسی مظلوم انسان کے جسم میں اس طرح پرو دی جاتیں کہ اس کا دوسرا حصہ پیٹ سے ہوتا ہوا حلق اور منہ سے باہر نکل آتا۔ یا پھر سپاہیوں کو حکم دیتا کہ وہ کسی کو فرش پر لٹا کر اس کے سر پر وزنی ہتھوڑے ماریں۔ اس طرح اس کا بھیجا تک باہر آجاتا۔

ولاڈ ان سب ستم کے ساتھ ساتھ انسانی خون بھی پیا کرتا۔ کہانیوں اور فلموں سے قطع نظر وہ ایک بے رحم ترین انسان تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس نے ایک لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

جوزف اسٹالن

1922ء سے 1953ء تک روس کا ڈکٹیٹر رہا ہے۔

اس کا تیس سالہ دورِ حکومت ظلم، تشدد اور جبر کی علامت بن کر رہ گیا ہے۔ جو بھی اس کے خلاف آواز اٹھاتا کچھ بولتا یا کچھ لکھتا اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا جاتا۔

ایک بہت بڑا ستم یہ تھا کہ اس نے اپنی مملکت میں ذہین انسان کو نہیں رہنے دیا۔ کیوں کہ وہ لوگ جو کچھ سوچ اور سمجھ سکتے یا اس کے خلاف کچھ کہہ سکتے انہیں گیس چیمبر میں ڈال

دیا جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے تیس لاکھ انسانوں کو مروایا تھا۔ تیس لاکھ بہت بڑی تعداد ہوتی ہے۔ اس میں دس لاکھ کے قریب یہودی تھے۔

ہم جب تاریخ کے کسی ایسے کردار کے بارے میں ریسرچ کرنا چاہتے ہیں تو ان ہی معلومات پر اکتفا کرنا ہوتا

ہے جو کتابیں دستیاب ہیں یا جو معلومات انٹرنیٹ کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں۔

تاریخ کے ایسے کرداروں کے بارے میں ہمیشہ سے تصویر کے دو رخ رہے ہیں۔ اگر کوئی مخالف ہے تو وہ اپنی مخالفت میں اس کا چہرہ اس طرح مسخ کر دیتا ہے کہ اس کی اچھائیاں تک چھپ جاتی ہیں اور اگر کوئی اس کے حق میں ہے تو وہ اسے فرشتہ بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔

ایڈولف ہٹلر

یہ مشہور زمانہ کردار ہے۔ اس شخصیت کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ میرے اضافہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہولو کاسٹ والے واقعے نے اسے پوری دنیا میں بدنام کر دیا ہے۔ اس کی بے پناہ سفاکی کی داستانیں ہر

وہ شخص جانتا ہے جو ذرا بھی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہو۔ اس کی شخصیت کے منفی پہلوؤں کو اس طرح اجاگر کیا جاتا ہے کہ یہ کردار روز مرہ بن کر رہ گیا ہے کہ فلاں شخص تو ہٹلر بن کر رہ گیا ہے۔ بہرحال اس کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ رومان پسند اور بہت اچھا مصور بھی تھا۔

پول پاٹ

کمبوڈیا کا وزیراعظم 1975ء سے 1979ء تک برسرِ اقتدار رہا۔ اس کے ساتھ بھی اس کی بے پناہ بے رحمیوں کی داستانیں موجود ہیں۔ اس نے بھی ہزاروں افراد کو مروا دیا۔ ایک اہم بات ان تمام لوگوں میں یہ رہی ہے کہ وہ اپنی اذیت پسندی میں اتنے شدید ہوا کرتے کہ اپنے مخالفین کو ہلاک کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے۔

ہر ڈکٹیٹر اپنے ساتھ اپنا خود ساختہ نظریہ یا فلسفہ بھی لے کر آتا ہے۔

پول پاٹ کا یہ خیال تھا کہ کمبوڈیا اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک پرانی اقدار، معاشرے اور مذہب کو

بدل کر کمبوڈیا کو جدید نہ بنا دیا جائے۔

اس کے ذہن پر صنعتی انقلاب کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس نے صنعتی انقلاب برپا کرنے کے لیے ایسے ایسے مظالم کیے کہ تاریخ شرمندہ ہے۔

اس کے عہد میں لاکھوں افراد سے جبری بے گار لیا جاتا۔ کام کام اور صرف کام۔ اگر کوئی بدقسمتی سے بیمار پڑ جاتا یا کسی اور وجہ سے کام نہیں کر پاتا تو عورت اور مرد کی تخصیص کیے بغیر اسے انتہائی ٹھنڈے پانی میں اس طرح کھڑا کر دیا جاتا کہ پانی اس کی گردن تک آنے لگے۔ اس بے رحم عمل کے وقت اس بدنصیب کے جسم سے سارے کپڑے اتار لیے جاتے۔ حاملہ عورتوں کو بھی نہیں چھوڑا جاتا۔ سخت سردی میں ان کے جسم اکڑ جاتے اور وہ موت کے گھاٹ اتر جاتے۔

لفظ ویت نام اس کے لیے گالی کی طرح تھا۔ اگر اس کے ملک کا کوئی مرد یا عورت ویت نام کی کسی لڑکی یا مرد سے شادی .... کرتا تو دونوں کو مار دیا جاتا۔

اس نے جتنے لوگوں کو ہلاک کروایا تھا ان کا پورا حساب کتاب (تصویروں کے ساتھ) اس کے پاس محفوظ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے انسانی کھوپڑیاں بھی جمع کر رکھی تھیں۔

آئی وان

یہ ماضی کا ایک کردار ہے۔

1533 سے 1584 تک یہ شخص روس کا زار رہا ہے۔ یعنی پورے روس کی تقدیر کا مالک۔ یہ شخص بھی اپنی ایذا پسندی اور بے رحمی میں اپنی مثال آپ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ تو یہ بچپن ہی سے ایسا تھا۔

اس کا پسندیدہ مشغلہ یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کو بلندی پر لے جا کر نیچے پھینک دیتا اور ان کے تڑپنے اور مرنے کا تماشا دیکھتا رہتا۔

اس کو ایک وہم یہ ہو گیا تھا کہ ہر شخص اس کا دشمن ہے۔ اگر کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو اس کے ارادے خطرناک ہیں۔

اگر کسی نے اونچی آواز میں بات کی ہے تو آگے چل کر وہ اس کے لیے پرابلم پیدا کر دے گا۔ لہٰذا اس وہم میں مبتلا ہو کر اس نے ہزاروں افراد کو بے دردی سے مروا دیا۔

اس نے اپنے محل ہی میں اپنا تشدد کا چیمبر بنا رکھا تھا۔ اس کی ایک تفریح یہ بھی تھی کہ وہ والدین کے سامنے اولاد کو اور اولاد کے سامنے والدین کو ہلاک کروایا کرتا۔

انسان کتنا وحشی اور کتنا بے رحم ہے۔ اس کا اندازہ ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ 1584ء میں اس کی موت اس وقت ہوئی جب وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔

اٹیلا

اس کا زمانہ 434 سے 453 تک کا ہے۔ اس کی سلطنت جرمنی سے لے کر دریائے ڈینوب تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ اتنے بڑے علاقے کا سب سے طاقت ور انسان

تھا۔ وہ ایک ایسا بے رحم شخص تھا کہ اس کی بے رحمی کی وجہ سے اسے اٹیلا کہا جاتا یعنی خدا کا شیر۔ وہ رومن کا دشمن تھا۔ اس کے یہاں کسی کو معاف کر دینے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہ اذیتیں دے دے کر مارا کرتا اور خوشی محسوس کرتا۔ اس کے زمانے میں ارسلانا کی ایک پارسا خاتون تھی۔ بہت خوب صورت، عیسائی اس کو سینٹ ارسلا کہا کرتے۔ اٹیلا نے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا اور ارسلا کے انکار کرنے پر اس نے ارسلا اور اس کے بارہ ہزار حواریوں کو جلا کر مار دیا۔

تاریخ نے اسے دنیا کا سنگ دل ترین وحشی خونی قرار دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جوان عورتوں کو بے دردی سے مار کر ان کا خون پیا کرتا تھا۔ اس کی سنگ دلی اور بے حسی کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہوگی کہ وہ اپنے ایک بھائی اور دو چھوٹے بیٹوں کو مار کر کھا گیا تھا۔ اس کی موت 453 میں ہوئی تھی۔

کالی گولا

یہ بھی دنیا کی قدیم تاریخ کا ایک مکروہ اور بے رحم کردار ہے۔

کالی گولا روم کا تیسرا بادشاہ تھا۔ اس نے 37 اے ڈی سے 43 اے ڈی تک روم پر حکومت کی۔

یہ شخص بلا کا جنسی وحشی تھا۔ اس کے مظالم کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ جب وہ تخت نشین ہوا

تو دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ڈیڑھ لاکھ جانوروں کی قربانیاں دی گئی تھیں۔ وہ دماغ کی ایک ایسی بیماری میں مبتلا ہوگیا تھا جس سے ہر وقت اس کو تکلیف رہا کرتی۔ اس نے اپنے آپ کو خدا سمجھنا بھی شروع کردیا تھا۔ وہ انسانوں کو تفریحاً مارا کرتا۔ خاص طور پر بچوں کو، وہ انہیں روتا بلکتا اور تڑپتا دیکھ کر خوشی محسوس کیا کرتا۔

اس نے بہت سے خونخوار درندے پال رکھے تھے۔ شیر اور چیتے وغیرہ، وہ اپنے قیدیوں کو ان درندوں کے آگے ڈال دیا کرتا اور ان کی چیر پھاڑ ہوتے دیکھ کر خوشی محسوس کرتا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے دلی مسرت اس وقت ملتی ہے جب اس کے سامنے کسی قیدی کو اذیت دے کر مارا جائے۔

اس کے ذہن میں یہ بات سما گئی تھی کہ بچوں کا خون اس کے لیے آبِ حیات ہے۔ اس لیے اس نے نہ جانے کتنے بچوں کو ہلاک کروادیا اور ان کا خون پی گیا۔

143 اے ڈی میں اس کا قتل ہو گیا تھا اور لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔

نیرو

تاریخ کا ایک بدترین اور ظالم کردار۔ اس کی بربریت اور بے حسی کے حوالے سے پوری دنیا میں یہ کہاوت مشہور ہو گئی ہے کہ روم جلتا رہا اور نیرو بانسری بجاتا رہا۔

جی ہاں یہ وہی نیرو ہے جو تقریباً پورے کا پورا شہر جلوا

دیتا اور خود تماشا دیکھا کرتا۔ اسے لوگوں کی چیخنے چلانے اور فریادیں سن کر لذت محسوس ہوا کرتی۔

نیرو نے مارنے کے لیے کوئی ایک طریقے کو مستقل اختیار نہیں کیا۔ بلکہ مختلف انداز سے لوگوں کو مارا جیسے پھانسی دے کر، آگ میں پھینک کر، اونچی پہاڑی سے گرا کر، تلوار سے گردن اڑا کر، زہر دے کر یا خونخوار جانوروں کے آگے ڈال کر۔

موت دینے کے سلسلے میں وہ طرح طرح کے تجربے کیا کرتا اور اپنے شکار کے مرجانے کی خوشی میں موسیقی سے لطف اندوز ہوا کرتا۔ اس نے تجربے کے طور پر اپنے گھر والوں کو بھی ہلاک کروا دیا۔ اس کی بیوی، اس کی ماں، اس کے بھائی سب کے سب اس کی بربریت کا شکار ہو گئے۔

نیرو کا زمانہ 54 اے ڈی سے 68 اے ڈی تک ہے۔ تاریخ اس شخص کو بھی ظالم ترین افراد کی فہرست میں سب سے اوپری درجے پر رکھتی ہے۔

جوزف مینگلے

کہنے کو ایک ڈاکٹر تھا۔ ایک پڑھا لکھا شخص ایک مسیحا لیکن یہ اپنی بربریت اور بے رحمی کی وجہ سے موت کے فرشتہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے ایسے ایسے انداز سے لوگوں کو مارا ہے کہ تاریخ حیران ہے کہ دنیا میں ایسے بھی سنگ دل ہو سکتے ہیں۔ اس شخص کے سینے میں شاید دل ہی نہیں تھا۔

جوزف مینگل نازیوں کا ڈاکٹر تھا۔ نازی اپنے قیدی اس کے حوالے کر دیتے کہ وہ ان سے جو چاہے وہ کرے اور یہ جنونی قاتل وہی کرتا رہا جو اس کے دل میں آتا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا ڈاکٹر، سائنس داں اور سرجن ہے۔

وہ قیدیوں پر طرح طرح کے تجربات کیا کرتا۔ انہیں بے ہوش کیے بغیر ان کی چیر پھاڑ کرتا رہتا۔ وہ بے چارے میز سے بندھے ہوئے تڑپتے رہتے۔ چیختے رہتے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

ایک بار اس پر خبط سوار ہوا کہ وہ جڑواں بچوں پر تجربات کرے۔ یہ دیکھا جائے کہ اگر ایک کو تکلیف پہنچائی جائے تو دوسرے پر اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس خبط میں مبتلا ہو کر اس نے بارہ ہزار کے قریب جڑواں بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بہت سے بچے تو قیدیوں کے کیمپ میں موجود تھے اور بہت سوں کو اس کے ہرکارے ملک کے مختلف علاقوں سے اٹھا اٹھا کر لاتے رہے۔

ایک بار اس نے دو جڑواں بچوں کو الگ الگ میز پر لٹا دیا اور ایک کی آنکھوں میں تیزاب ڈال کر اسے اندھا کر دیا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اگر ایک کی آنکھیں چلی جائیں تو دوسرا دیکھ سکتا ہے یا نہیں۔ اس بے رحم ڈاکٹر نے موت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

جرمنی کی شکست کے بعد وہ اپنے گھر والوں کو لے کر جنوبی امریکا فرار ہو گیا تھا۔ 1985ء میں تیراکی کرتے ہوئے اس کی موت واقع ہو گئی۔

الزبتھ باتھونی

یہ مقام شکر ہے کہ وحشیوں اور خونیوں کی اس فہرست میں عورتوں کے نام بہت کم ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ عورت نے یہ میدان بالکل ہی خالی رہنے دیا ہو۔ تاریخ میں ایسی کئی عورتوں کا ذکر ہے۔

قلوپطرہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر شب ایک غلام کے ساتھ شب بسری کرنے کے بعد دوسری صبح اسے مروا دیتی تھی۔

ایسی ہی ایک ظالم عورت الزبتھ باتھونی تھی۔ یہ اپنے علاقے کی کاؤنٹیس تھی۔ انتہائی بااختیار عورت، وہ اپنے

آپ کو عورتوں کی ڈریکولا کہلوایا کرتی۔ اس کو یہ گمان ہو گیا تھا کہ اگر کسی جوان لڑکی کا گرم گرم تازہ تازہ خون پیا جائے تو جسم کی شادابی اور خوب صورتی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔

اس کے حکم پر اس کے کارندے جوان یا کم عمر لڑکیوں کو مختلف علاقوں سے اغوا کر کے لاتے۔ الزبتھ انہیں اپنے ذاتی قید خانے میں قید کر دیتی۔

وہ دن اس کے لیے بہت خوشی کا ہوتا جب کوئی جوان لڑکی اس کے ہاتھ لگتی۔ وہ دن بھر خوش گوار موڈ میں ہوتی۔ اپنے ان کارندوں کو انعامات دیتی جو اس کے لیے لڑکی اٹھا کر لاتے تھے۔ رات کے وقت وہ اس بدنصیب لڑکی کے پاس پہنچ جاتی۔ جسے ایک ستون کے ذریعے باندھ دیا جاتا تھا۔ الزبتھ کے پاس ایک تیز دھار چاقو رہتا تھا۔ اب اس کا گھناؤنا اور وحشیانہ کھیل شروع ہو جاتا۔ وہ جسم کے مختلف حصوں میں چاقو کے ذریعے زخم لگا کر اپنے ہونٹ اس زخم پر لگا کر خون چوسنا شروع کر دیتی۔

اس بے چاری کی تکلیف اور اذیت کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس لڑکی کے جسم پر کئی زخم لگائے جاتے اور الزبتھ اس کا خون پیتی رہتی۔ اور جب اس کا پیٹ بھر جاتا اور دوسری طرف وہ لڑکی بھی مر چکی ہوتی تو پھر یہ اپنے کپڑے اتار کر پورے قید خانے میں وحشیانہ رقص کیا کرتی۔

اس وقت اس کی سرشاری دیکھنے والی ہوا کرتی تھی۔

اس عورت پر جب زوال آیا تو اسے تنہائی کی سزا دی گئی۔

جی ہاں یہ تھا انصاف، صرف سزائے تنہائی۔ اتنی بے درد اور درندہ صفت خاتون کی سزا صرف ایک کمرے میں رہنا تھا۔ اس نے اکیلے کمرے میں چار سال گزارے پھر اس کی موت واقع ہو گئی۔

میں نے دنیا کے چند کرداروں پر اکتفا کیا ہے ورنہ دنیا کی تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ ہوں گے، جنہیں شیطان نے خاص اپنی تفریح کے لیے منتخب کیا ہوگا۔

یہ وحشی درندے آج بھی ہیں یہ اور بات ہے کہ آج خون بہانے کے انداز بدل چکے ہیں۔ آج گولیاں ماردی جاتی ہیں۔ چہرے پر تیزاب پھینک دیتے ہیں۔ بوریوں میں بند کر کے تشدد کر کے مار دیتے ہیں۔

آخر کیا ہے یہ سب؟ کیوں ہے؟ کیا انسان کبھی جنگلی پن کے حصار سے باہر نہیں آسکا ہے۔ کیا وہ کبھی آئیڈیل انسان بن سکے گا یا نہیں۔

یہ ایک سوال ہے اور اس سوال کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں ہے۔ سوچنے والے ذہن اور محسوس کرنے والے دل صرف سوچتے اور محسوس کرتے رہ جاتے ہیں۔

ختم

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر: 106

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ
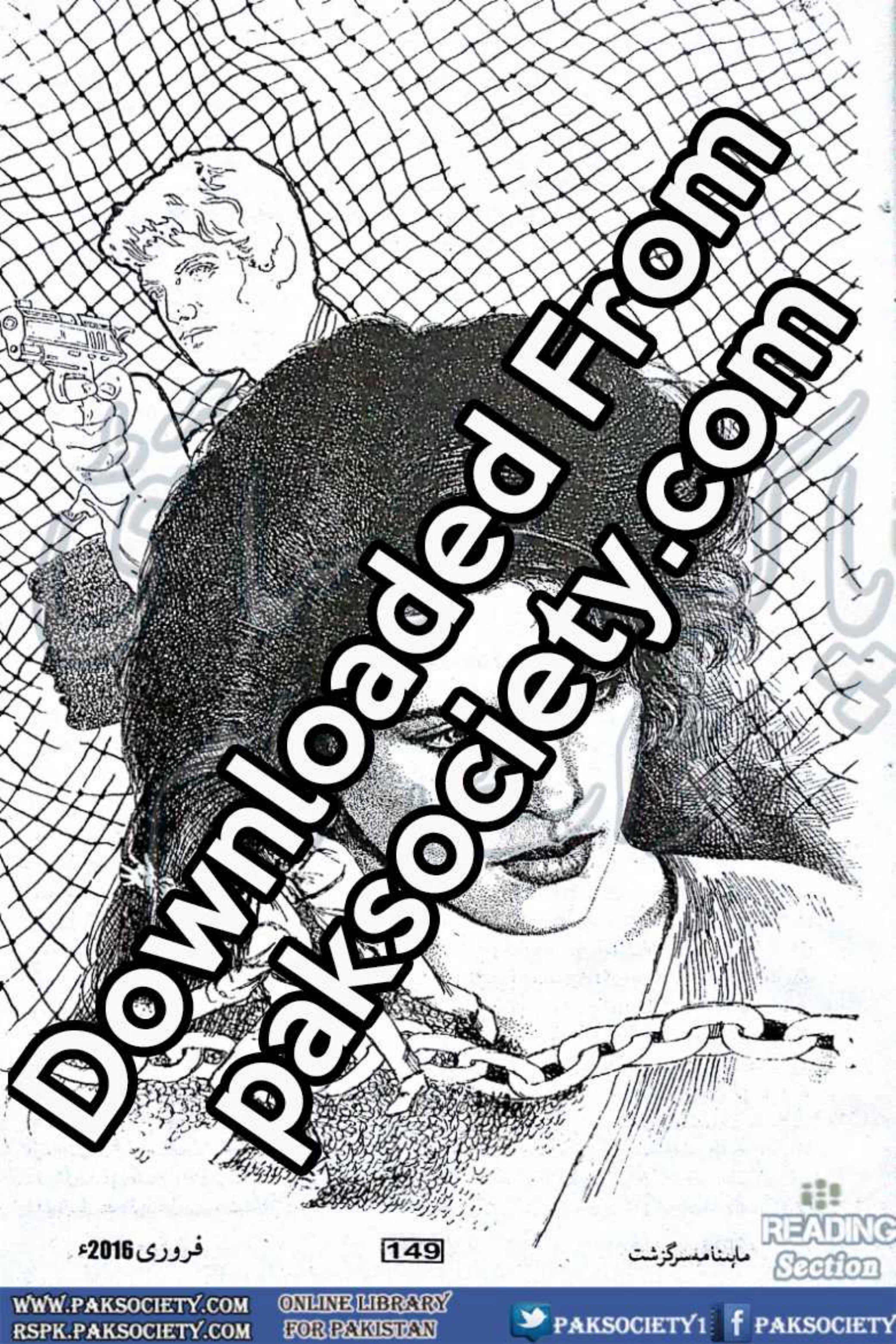
میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زروسکی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائیرپورٹ سے سی آف کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی ہنی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالتِ مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور پیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکرو فون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی ”شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔“ ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کردیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ”کنور ہوشیار“ سادی کو لے کر چیمبر...... ”مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو جیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا جیتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہوگیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہوگیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی ماردی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آگئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہوگیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ڈیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ڈیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا ”پاپا“ تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا ڈیوڈ نے اوشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو انہیں کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کردیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہوگیا۔ ہم... چلے جارہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا تھا کہ زینی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچالیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے کنپٹی دبا کر بے ہوش کردیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے

گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریناٹ کی قید میں پہنچا دیا، وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو از سر نو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریناٹ کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِ لب کہا ''اعلان جنگ'' میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنہ کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے منہ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحہ کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ تبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا ابھی نہیں تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زادِ راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے ربیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے..... ساشا ملی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں، میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد، عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے لائحہ عمل تبدیل کر دیا۔ ایزارٹ نے نیا دستہ تیار کرا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریناٹ کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریناٹ اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ڈیوڈ شاباسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرل نے ڈسک بچا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا مصنوعی رن وے بنا دیا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑکے اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔

(اب آگے پڑھیں)

میں نے بہ مشکل خود کو روکا ورنہ میں ایمار کو آواز دینے جا رہا تھا۔ وہ گرا تھا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ شاخوں میں سنبھل گیا ہے۔ اس نے بھی سوائے پہلی چیخ کے اور کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔ میں احتیاط سے چند شاخیں نیچے آیا اور میں نے ایمار کے حرکت کرتے ہیولے کو دیکھ لیا وہ خاموشی سے واپس اوپر آ رہا تھا اور شاخوں کو مضبوطی سے پکڑ رہا تھا۔ اس کا پورا امکان تھا کہ ہارن پھر درخت کو ٹکر مارے گا اور ایسا ہی ہوا۔ درخت پھر ہلا تھا مگر ہم سب ہوشیار تھے۔ اپنی جگہ قائم رہے اور کوئی آواز بھی نہیں نکالی تھی۔ ہارن اب بھاگ دوڑ کر رہے تھے کیونکہ ان کی ٹاپوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انہیں چیخ سے یقین آ گیا تھا کہ اوپر انسان تھے۔ مگر جب چند اور ٹکریں مارنے کے بعد اوپر سے کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو ان کی وحشت کم ہوئی تھی اور اسی لحاظ سے ان کی بھاگ دوڑ بھی کم ہوئی تھی۔

اس دوران میں تاریکی مکمل ہو گئی تھی اور اب اوپر نیچے ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ شام کے چھ یا ساڑھے چھ بج گئے تھے۔ ایمار اوپر آیا اور میں اس کے ساتھ واپس اوپر کی طرف آیا۔ کوئی اسی یا نوے فٹ کی بلندی پر ہم سب آ گئے تھے۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''وہ ہماری موجودگی سے تقریباً واقف ہو چکے ہیں اور اب یہاں سے نہیں ٹلیں گے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔''

''کیا؟'' ربیک نے سوال کیا۔

''ہم تیروں کی مدد سے اتنے ہارنوں سے نہیں نمٹ سکتے اس لیے ایک ہی طریقہ سمجھ میں آ رہا ہے۔ ہم تیروں کو آگ لگا کر ان کے جسم کے ایسے حصوں پر ماریں جہاں سے یہ الگ نہ کر سکیں اور جب جلتے تیر ان کا جسم جلائیں گے تو اس کے بعد یہ یہاں سے بھاگیں گے۔''

''ترکیب اچھی ہے۔'' ایرٹ نے کہا۔ ''لیکن تیر مارنے کے لیے نیچے جانا ہوگا اور یہ آگ اور ہمیں دیکھتے ہی درخت گرانے کی کوشش کریں گے۔''

''اس کام کے لیے ہم میں سے دو سے تین افراد نیچے جائیں گے۔ خود کو رسی سے درخت کے ساتھ یوں باندھ لیں گے کہ جھٹکے سے نیچے نہ گریں۔ ایک آدمی آگ سے تیر جلائے گا اور ایک یا دو افراد ان تیروں کو ہارنوں پر آزمائیں گے۔ جیسے یہ ہی بھاگیں گے ہم بھی یہاں سے نکل جائیں گے۔''

میں نے اپنا منصوبہ بیان کیا تو ربیک نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ''بہ شرط کہ مزید ہارن نہ

آ جائیں۔ موجودہ صورت میں اس سے بہتر منصوبہ اور کوئی نہیں ہوسکتا ہے۔''

میں، مارٹ اور ربیک نیچے آئے۔ طے پایا تھا کہ میں آگ تیروں کو دکھا کر انہیں تھماؤں گا اور وہ ہارنوں کو تیر ماریں گے۔ ہم نے خود کو مختلف شاخوں پر رسی سے باندھ لیا میں ذرا اوپر تھا اور وہ دونوں ذرا نیچے تھے اس دوران میں ہارنوں کو یہاں ہماری موجودگی کا علم ہوگیا تھا اور وہ مسلسل درخت کے تنے پر زور آزمائی کر رہے تھے۔ میں نے ایک مشعل جلائی اور روشنی ہوتے ہی نیچے جیسے قیامت برپا ہوگئی تھی۔ غراہٹوں اور حیوانی چیخوں کا ایسا طوفان آیا تھا کہ درخت بغیر کسی ضرب کے ہی کانپنے لگا تھا۔ لیکن یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہارن انسانوں کی موجودگی دیکھ کر یوں ہی بھڑکیں گے۔ میں نے دو تیروں کے سرے سے ذرا اوپر والا حصہ مشعل پر رکھا اور چند لمحوں میں لکڑی نے آگ پکڑ لی۔ میں نے تیر مارٹ اور ربیک کو پکڑائے جب تک انہوں نے انہیں کمان پر چڑھایا ان کی آگ پوری طرح بھڑک اٹھی تھی اور جب انہوں نے تیر مارے تو ہوا کے زور سے آگ بجھی نہیں تھی۔

میں کیونکہ مزید دو تیر اسی طرح آتش گیر کر رہا تھا اس لیے دیکھ نہیں سکا کہ کس کا چلایا ہوا تیر ایک ہارن کی پشت میں یوں اتر گیا کہ وہ ہاتھ پیچھے لے جا کر اسے نکال بھی نہیں سکتا تھا تیر کی آگ اس کے سر اور پشت کے طویل بال جلانے لگی تھی۔ ہارن اب اذیت ناک انداز میں چلّا رہا تھا۔ ایک ہارن اس کے گرد ناچ رہا تھا مگر وہ جلتا تیر نکالنے کے لیے کچھ نہیں کر رہا تھا۔ دوسرا تیر دوسرے ہارن کے شانے پر لگا۔ اسے زخم آیا تھا مگر اس نے ہاتھ مار کر نکال دیا۔ مارٹ نے میرا دیا ہوا دوسرا تیر اس کے سر پر مارا اور تقریباً تیس فٹ کے فاصلے سے تیر اس کی ایک آنکھ سے ہوتا ہوا کھوپڑی کی پشت سے نکل گیا۔ ظاہر ہے تیر میں لگی آگ بجھ گئی تھی مگر تیر نے ہارن کا کام تمام کر دیا تھا۔ وہ ایک دھماکے سے نیچے گرا اور موت کے کرب میں اس کا دیوہیکل جسم تھرتھرانے لگا تھا۔ ربیک کا چلایا ہوا تیر اس ہارن کی گردن میں اتر گیا جو جلتے تیر کا شکار ہارن کے گرد ناچ رہا تھا۔

میں تیروں کا تیسرا سیٹ مشعل پر رکھے ہوئے تھا کہ چوتھا ہارن موقع کی نزاکت دیکھ کر فرار ہوا اور باقی دو اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ ان کی غراہٹیں اور دور جاتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ صرف درخت سے دور نہیں گئے تھے بلکہ یہاں سے دوڑتے ہی چلے گئے تھے۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ اتنی بڑی بلا سے اتنی جلدی اور آسانی سے نجات مل جائے گی اور اب ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ میں پہلے نیچے اترا اور مردہ ہارن کا معائنہ کیا۔ اس کے جسم کی تھرتھراہٹ اب رک گئی تھی۔ میں نے پہلے بڑی مشعل جلانے کا ارادہ کیا مگر پھر ملتوی کر دیا۔ بڑی مشعل کا مطلب ہوتا زیادہ روشنی اور یہ زیادہ دور سے جانوروں کو متوجہ کر سکتی تھی۔ میرے بعد مارٹ اور ربیک نیچے آئے۔ ایرٹ اور ایمار سامان نیچے لا رہے تھے۔ انہوں نے رسیاں کھولنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں کاٹ دیا اور سامان نیچے پھینکنے لگے۔ آخر میں وہ خود بھی نیچے آئے تھے۔ مردہ ہارن کو دیکھ کر سب نے مارٹ کی پیٹھ ٹھپکی۔ اس کے بعد سب نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور ہم آگے روانہ ہوگئے۔ جھاڑیوں کے نزدیک آ کر میں نے ان سے کہا۔

''دوستو، ہماری خوش قسمتی کہ ہم ایک بہت مشکل صورتِ حال سے نکل آئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہارن جلد اور زیادہ تعداد میں یہاں کا رخ کریں گے اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ ان سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم فصیل پار کر کے معبد میں داخل ہوجائیں۔''

''اس کے لیے ہمیں جھاڑیوں سے گزرنا ہوگا اور یہاں زہریلے کانٹوں والا پرندہ ہوگا۔'' ربیک نے تشویش سے کہا۔

''ہم ڈھالوں سے اپنا دفاع کریں گے اور چاروں طرف ڈھال کر کے ان کے درمیان میں رہ کر فصیل تک جائیں گے۔'' میں نے تجویز پیش کی۔ ''ہم بڑی مشعلیں روشن کرلیں گے۔ یقیناً یہ پرندہ بھی آگ سے گھبراتا ہوگا۔ شاید آگ دیکھ کر وہ نزدیک آنے سے گریز کرے۔''

ہمارے پاس موجود ڈھالیں چار فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی تھیں۔ ہم نے جھاڑیوں میں داخل ہونے سے پہلے بڑی مشعلیں جلالیں اور ان کی تیز روشنی میں آس پاس کا منظر واضح نظر آنے لگا۔ اس کے بعد ہم یوں پاس آگئے کہ ہم میں سے دو کا رخ سامنے کی طرف تھا اور دو الٹے قدموں چلتے اور ایک درمیان میں رہ کر صرف مشعلیں اٹھاتا۔ اس کی ڈھال دوسرا اٹھاتا اور یوں ہم چاروں طرف سے ڈھالوں کی پناہ میں آجاتے۔ زہریلا پرندہ دیکھتے ہی ہم گھٹنوں کے بل جھک کر پوری طرح ڈھالوں کی آڑ میں آجاتے۔ بڑی مشعلیں جلانا اب مجبوری تھی۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم آسانی سے فصیل تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ہم ہر ممکن

تیزی سے جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔میرا رخ سامنے کی طرف تھا اور میں راستے کا تعین کر رہا تھا۔شروع میں جھاڑیاں اتنی گھنی نہیں تھیں مگر ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے یہ گھنی اور زیادہ نزدیک ہوتی جا رہی تھیں اور ان کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔اچانک عقب سے ایک بلند چیخ سنائی دی اور یہ کسی حد تک انسانی چیخ سے مشابہہ تھی۔

''ہارن۔'' ربیک نے کہا۔''وہ آگئے ہیں۔''

''مشعلیں نیچے اور ڈھالوں سے باہر کر لو۔'' میں نے حکم دیا۔مشعلیں مارٹ نے تھام رکھی تھیں اور اس نے آگے پیچھے کر کے دونوں مشعلیں ڈھالوں سے باہر نکال لیں۔اس سے راستہ زیادہ واضح ہو گیا اور اب مشعلوں کو دور سے دیکھ لینا آسان نہیں تھا۔ہم اب گھنی اور اونچی جھاڑیوں کے درمیان تھے۔یہاں سے فصیل نظر نہیں آرہی تھی اور ہم اندازے سے فصیل کی طرف جا رہے تھے۔پہلی چیخ کے بعد بین نما چیخیں رہ رہ کر بلند ہو رہی تھیں اور یہ رونا پیٹنا یقیناً مارے جانے والے ہارن کے لیے تھا۔شاید اس کے لواحقین آن پہنچے تھے اور جلد وہ جوش انتقام میں بھرے ہوئے ہماری تلاش شروع کر دیتے۔اچانک ہی جھاڑیوں میں ہل چل سی مچی اور میں نے رکنے کا حکم دیا۔فوراً ہی جھاڑیوں سے دو عدد خوش رنگ پرندے نکلے اور ان کے آنے سے پہلے ہی ہم گھٹنوں کے بل جھک کر ڈھالیں سامنے کر چکے تھے اس لیے جب انہوں نے رقص کے انداز میں کانٹے برسانے شروع کیے تو سارے کانٹے آکر ڈھالوں پر لگے۔

میں اس پرندے کا یہ رقصِ مرگ پہلے بھی دیکھ چکا تھا بلکہ اس کا زہریلا کانٹا بھی بھگت چکا تھا۔وہ مشکل سے چند سیکنڈ رقصاں رہے اور دوبارہ جھاڑیوں میں گھس گئے۔ان کے جاتے ہی میں نے سب کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا اور ہم سرعت سے پیچھے گئے تھے۔یہ تو واضح تھا کہ ان جھاڑیوں میں شاید ان پرندوں کا گھونسلا اور انڈے بچے تھے تب ہی انہوں نے آگ اور زیادہ لوگوں کی پرواہ کیے بغیر حملہ کیا تھا۔اس تنگ جگہ سے باہر آکر ہم دوسرے راستے سے آگے بڑھے۔اس دوران میں سب نے تصدیق کر دی تھی کہ وہ ٹھیک ہیں اور کسی کو زہریلا کانٹا نہیں لگا تھا۔ایک کسی قدر کھلی جگہ میں نے ڈھالوں کا معائنہ کیا تو ان پر کئی زہریلے کانٹے پیوست پائے۔مجھے حیرت ہوئی کہ یہ پرندے کس قوت سے کانٹے برساتے تھے کہ وہ سخت لکڑی والی ڈھال میں بھی پیوست ہو گئے۔

شاید ان کے پروں میں کوئی ایسا میکنزم تھا جو کانٹوں کو اتنی قوت سے پھینک سکتا تھا کہ وہ بیس فٹ کے فاصلے پر سخت لکڑی میں پیوست ہو سکیں۔شاید یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہاں پائے جانے والے بیشتر جانوروں کی کھال بہت سخت تھی اور زور سے پھینکا گیا زہریلا کانٹا ہی اس میں اندر تک پیوست ہو سکتا تھا۔قدرت نے بعض ایسے ہی نرم و نازک جانداروں کو جو دوسروں کا آسانی سے نشانہ بن سکتے ہیں زہر کی مدافعت سے مسلح کیا ہے جیسے جیلی فش کے لیے دھاگے نما حصوں میں زہریلے ڈنک اس طرح موجود ہوتے ہیں کہ وہ جیسے کمان پر چڑھے ہوں اور جیسے ہی کوئی جیلی فش کے ان دھاگوں کو چھوتا ہے ڈنک اتنی قوت سے چھوٹتے ہیں کہ جسم میں انچ بھر تک اتر جاتے ہیں۔اس کے لیے جیلی فش کو خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کا خودکار نظام یہ ڈنک پھینکتا ہے۔

بدقسمتی سے ہم جس راستے پر گئے تھے وہ آگے سے بند ثابت ہوا۔ہمیں واپس آنا پڑا تھا۔ہم پہلے ہی ایک طویل راستے سے یہاں تک آئے تھے اور یہ راستہ آگے دوراہے میں بدل گیا تھا پہلے ہم پرندوں کے سامنے جا نکلے اور جب واپس آئے تو دوسرا راستہ آگے سے بند نکلا تھا۔ہمارے پاس واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر واپسی کی راہ پر ہارن سے ملاقات کا بہت زیادہ امکان تھا کیونکہ ہمیں اسی سمت جانا تھا۔ان کی رہ رہ کر ابھرنے والی چیخیں اب زیادہ نزدیک سے سنائی دے رہی تھیں۔ہم دوہری مشکل میں پڑ گئے تھے۔شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا جاتا ہے کہ آگے کنواں تو پیچھے کھائی۔زہریلا پرندہ اور ہارن دونوں ہی خطرناک تھے اور ان سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ہم فصیل پار کر جائیں۔اگرچہ وہاں بھی ہمارے لیے کم خطرہ نہیں تھا بلکہ شاید زیادہ ہی تھا مگر ہم اسی خطرے سے نمٹنے کے لیے نکلے تھے۔

''اب ہم کہاں جائیں؟'' یہ سوال ایرٹ نے کیا اور میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ہم اسی راستے پر خاصا پیچھے ہٹ آئے تھے اور میں جھاڑیوں سے باہر نکلنے کی بجائے کوئی متبادل راستہ دیکھ رہا تھا۔مگر یہاں چاروں طرف دس بارہ فٹ اونچی جھاڑیاں تھیں اور ان کے پار کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔راستہ تلاش کرنا ضروری تھا۔ایک چھوٹا درخت آیا تو ربیک اس پر چڑھا۔چھوٹے سے مراد یہاں کے درختوں کے مقابلے میں چھوٹا تھا ورنہ یہ بھی کوئی پچاس فٹ اونچا تھا۔وہ فصیل کی سمت کا تعین کرنے گیا تھا مگر اسے راستہ بھی

نظر آگیا۔ جیسے آگ لینے جائیں اور پیغمبری مل جائے۔ اس نے نیچے اتر کر جوش سے کہا۔

''جناب ادھر راستہ ہے اور وہ فصیل تک جا رہا ہے۔''

ایرٹ نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''تمہیں کیسے نظر آیا۔ یہاں تو اندھیرا ہے۔''

''اب مکمل اندھیرا نہیں ہے اور تم جانتے ہو میری نگاہ سب سے تیز ہے۔'' ربیک نے جواب دیا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

''لیکن اسی ترتیب سے۔'' میں نے کہا۔ ''پرندوں کو مت بھولو۔ یہ ہارن سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر ہم ذرا بھی بے احتیاطی کرتے تو ان کا نشانہ بن جاتے۔''

انہوں نے اتفاق کیا اور ہم نے پھر اسی ترتیب و تنظیم کے ساتھ سفر شروع کیا۔ ربیک نے جو راستہ دیکھا تھا اس تک جانے کے لیے ہمیں ایک دس فٹ طویل مگر بہت تنگ راستے سے گزرنا پڑا تھا اور ہم جھاڑیوں سے رگڑ کھاتے اور انہیں کچلتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اگر ان جھاڑیوں میں پرندہ نکل آتا تو ہم اس کا بہت آسان شکار ثابت ہوتے۔ کیونکہ یہاں سے گزرتے ہوئے ڈھالیں ہٹ گئی تھیں اور ہماری ترتیب ٹوٹ گئی تھی۔ مگر ہم بخیریت دوسری طرف پہنچ گئے اور یہاں آتے ہی ہم نے پھر سے ڈھالیں اپنے سامنے کر لی تھیں۔ ربیک نے درست کہا تھا کہ راستہ نہ صرف کشادہ تھا بلکہ فصیل تک جا رہا تھا۔ تقریباً بیس سے پچیس فٹ چوڑے اس راستے پر بڑی جھاڑیاں نایاب تھیں اور چھوٹے پودے اور گھاس وغیرہ اگی ہوئی تھی۔ جب میں نے اس پر قدم رکھا تو مجھے لگا کہ میں ڈھلان کی طرف گیا ہوں۔ شاید یہ کوئی نالا یا نشیبی جگہ تھی۔

یہ نشیبی جگہ فصیل کی طرف سے آرہی تھی اور یہاں پانی بہنے کی وجہ سے جھاڑیاں پنپ نہیں سکی تھیں مگر وہ پودے تھے جو زیادہ پانی برداشت کر لیتے تھے۔ فی الحال نالے یا نشیبی جگہ میں پانی نہیں تھا کیونکہ بارش نہیں ہوئی تھی اس میں یقیناً بارش کا پانی آتا ہوگا۔ ہماری خوش قسمتی کہ ربیک نے یہ راستہ دیکھ لیا ورنہ ہم اب تک جھاڑیوں میں بھٹک رہے ہوتے۔ فصیل کے پاس کچھ جھاڑیاں تھیں مگر وہ زیادہ گھنی اور اونچی نہیں تھیں اور ان میں زہریلے پرندے کے پائے جانے کا امکان کم ہی تھا۔ اس کے باوجود ہم ڈھالوں سے اپنا ہی محاصرہ کیے ہوئے چل رہے تھے۔ جھاڑیوں سے باہر آتے ہی بڑی مشعلیں بجھا کر ایک چھوٹی مشعل جلائی تھی جو اس جگہ کے لیے کافی تھی۔ اس سے زیادہ روشنی کرنا مناسب نہیں تھا۔ باہر آنے پر ہمیں ہارن نظر نہیں آئے تھے اور اب ان کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ یہاں سے دور ہیں۔

ہم کچھ دیر میں فصیل کے پاس پہنچ گئے تھے اور اس کی روشنی محدود کر لی کیونکہ اس کا امکان تھا معبد کے اندر احاطے میں کوئی موجود ہو اور وہ اس روشنی کو محسوس کر لے۔ ہم راستہ تلاش کرنے کے چکر میں گھومتے ہوئے معبد کے مشرقی سمت نکل آئے تھے۔ یہاں سے وادی کی اونچی ہوتی دیوار زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اسی میں کہیں وہ راستہ تھا جو اوپر جاتا تھا۔ ربیک کے پاس مضبوط دی نما لکڑی کی وہ کمند تھی جسے فصیل پر پھنسا کر ہم اس پر چڑھ سکتے تھے۔ میں نے ربیک سے کہا۔ ''اگر اوپر دیوار چوڑی ہوئی تو یہ کام نہیں کرے گی یہ صرف پتلی دیوار میں پھنس گئے۔''

''مجھے امید ہے دیوار اوپر سے پتلی ہوگی۔'' ربیک نے کہا اور رسی گھما کر کمند اوپر پھینکی وہ دیوار کے دوسری طرف چلی گئی اور جب ربیک نے اسے واپس کھینچا تو وہ آرام سے واپس آگئی۔ اس نے پھر کوشش کی اور میں نے اسے کوشش کرتا چھوڑ کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ یہاں جھاڑیاں دائیں بائیں قریب تھیں اور ان کے درمیان صرف پندرہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس کے بعد پھر گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو فصیل کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے تھا۔ جائزے کے دوران مجھے دائیں طرف کی جھاڑی جو دیوار سے ذرا سی ہٹی تھی وہاں دیوار کے ساتھ کوئی چیز اوپر جاتی دکھائی دی۔ مشعل ایمار کے پاس تھی جب کہ مارٹ اور ایرٹ تیر کمان سنبھالے مستعد کھڑے تھے۔ یہ ضروری تھا زہریلے پرندے کے جھاڑی سے نکلتے ہی اسے نشانہ بنانا ضروری تھا اس سے پہلے کہ وہ زہریلے کانٹے برسائے۔ میں نے ایک مشعل لے کر ایمار کی مشعل سے اسے جلایا اور جھاڑی کی طرف بڑھا۔ ربیک نے مضطرب ہو کر کہا،

''یہ کیا کر رہے ہیں ان میں پرندہ ہو سکتا ہے۔''

''میں محتاط ہوں۔'' میں نے ڈھال آگے کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ایک چیز دیکھنا چاہ رہا ہوں۔''

''کیا چیز؟'' ایرٹ نے آگے آنا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

''اپنی جگہ رہو میں ابھی بتاتا ہوں۔'' میں نے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھایا اور روشنی میں اس چیز کو دیکھا۔ یہ ایک بڑی اور مضبوط ڈنٹھل والی بیل تھی جو فصیل کے اوپر تک

گئی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر جھٹکا دیا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے پلٹ کر ان سب کو پاس بلایا۔ ''یہ چیز دیکھنا چاہ رہا تھا۔''

ربیک نے بیل کا معائنہ کیا اور وہ فوری سمجھ گیا کہ میں کیا چاہ رہا تھا اس نے سر ہلایا۔ ''یہ تو قدرتی کمند مل گئی ہے۔''

''ہمیں اسے استعمال کرنا ہوگا۔'' میں نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ربیک پہلے تم جاؤ گے اور اگر یہ گر جائے یا بوجھ سہارنے کے قابل نہ رہے تو تم ہمیں اوپر کھینچو گے۔''

ربیک نے سر ہلایا اور اپنا سامان اتار کر نیچے رکھ دیا۔ وہ سب سے ہلکا تھا۔ اوپر چڑھنے سے پہلے اس نے بیل کی مضبوطی جانچی اور پھر اس کی موٹی رسی نما ڈنٹھل پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا۔ نیچے یہ کام آسان تھا کیونکہ یہاں صرف خشک ڈنٹھل تھے لیکن جب وہ اوپر پہنچا تو بیل پھیل گئی تھی اور اس کے ڈنٹھل نازک اور ہرے ہو گئے تھے جن پر زور آتا تو وہ آسانی سے ٹوٹ سکتے تھے۔ اس دوران میں ربیک کو دیکھ رہا تھا اور اس کے نیچے گرنے کی صورت میں اسے سنبھالنے کے لیے بھی تیار تھا باقی تین اپنی ڈیوٹی پر تھے۔ وہ تیر کمان سنبھالے ہوئے آس پاس سے چوکنا تھے۔ ربیک ہوشیاری اور عقل مندی سے اوپر جا رہا تھا وہ اوپر جانے سے پہلے بیل کے ہاتھ میں آنے والے حصے کی جانچ کرتا اور جب مطمئن ہو جاتا تب اوپر جاتا تھا۔ اب وہ فصیل سے مشکل سے پانچ فٹ نیچے رہ گیا تھا اور یہی سب سے مشکل حصہ تھا۔ یہاں بیل پھیل کر دیوار سے ہٹ رہی تھی۔

میری نظر اس پر مرکوز تھی اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ اس آخری مرحلے کو کسی نہ کسی طرح عبور کر لے۔ اس نے اوپر ہاتھ مار کر بیل کے کچھ حصے پکڑے اور ان کی مدد سے خود کو اوپر کر رہا تھا کہ وہ ٹوٹ گئے اور وہ جھٹکے سے نیچے آیا تھا خوش قسمتی سے اس کا پاؤں ایک جگہ پھنسا ہوا تھا اور اس نے فوری ہاتھ مار کر خود کو سہارا دے لیا۔ چند لمحے وہ اسی جگہ چپکا رہا اور پھر اس نے بتدریج خود کو پاؤں کے بل اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس کے ہاتھ فصیل کے پاس ہوتے جا رہے تھے مگر اب مزید اوپر ہونے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ فصیل ڈیڑھ فٹ اوپر تھی اور اس موقع پر ربیک نے وہ کیا جو خطرات سے بے پرواہ لوگ ہی کرتے ہیں اس نے پاؤں کو پوری قوت سے بیل پر مارا اور دوسری طرف اس کے ہاتھ مسلسل چل رہے تھے وہ جو ہاتھ میں آ رہا تھا اس کی مدد سے خود کو اوپر کھینچ رہا تھا۔

یہ ایک مشکل ترین اسٹنٹ تھا جو شاید ربیک ہی دکھا سکتا تھا۔ آخری موقع پر ایسا لگا کہ وہ پلٹ کر نیچے آنے والا ہے کیونکہ اس کا جسم پیچھے کی طرف مڑا تھا۔ میں اسے پکڑنے کے لیے تیار تھا کیونکہ تیس فٹ سے گر کر اسے شدید چوٹ لگ سکتی تھی اور ہم اس وقت کسی کے ایسے زخمی ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ ناکارہ ہو جائے۔ مگر پیچھے آتے آتے اس کا جسم رکا اور پھر اس نے خود کو آگے کھینچ لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ فصیل پر تھا۔ مگر وہ کھڑا نہیں ہوا بلکہ فصیل پر لیٹ گیا اور اس کے لیٹنے کا انداز بتا رہا تھا کہ فصیل اتنی چوڑی ہے کہ ایک آدمی آرام سے اس پر لیٹ سکتا ہے۔ میں نے درخت کی بلندی سے فصیل کو بہت دور سے دیکھا تھا اور مجھے اس کی چوڑائی کا درست طور پر علم نہیں تھا۔ مگر اب لگ رہا تھا کہ اس کی چوڑائی اندازے سے زیادہ تھی اور اسی وجہ سے اس پر ربیک کی تیار کردہ کمند نہیں پھنس رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''اندر کوئی ہے؟''

ربیک اندر کا معائنہ ہی کر رہا تھا اور اس نے منہ اس طرف کر کے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے مگر یہاں مشعلیں روشن ہیں۔''

''رہائشی عمارت روشن ہے؟''

''ہاں اس میں بھی روشنی نظر آ رہی ہے۔'' ربیک نے جواب دیا۔ اس دوران میں، میں نے اندر جانے کا طریقہ سوچ لیا تھا جو آسان تھا اور سادہ بھی۔ میں نے رسی اس کی طرف اچھالی۔

''میں پکڑتا ہوں تم اندر اتر کر پکڑ لینا پھر یہاں سے ہم ایک ایک کر کے اندر آئیں گے۔''

ربیک نے سر ہلایا۔ ''اور سامان؟''

میں نے سوچا اور اس سے کہا۔ ''پہلے سامان اندر اتارو پھر خود اترنا۔''

اسے رسی میں باندھ کر سامان دینے لگے اور وہ اسے فصیل کے اندر یوں پھینکنے لگا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ ہم رسک لے رہے تھے عین ممکن تھا کہ ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی نے اندر برقی نگرانی کا کوئی سسٹم لگا رکھا ہو اور ہماری کارروائی کا مشاہدہ کر رہے ہو اور جیسے ہی ہم اندر پہنچیں وہ ہمیں ہینڈز اپ کرا لیں۔ تقریباً سارے ہتھیار اور دوسرا سامان اندر اتار دینے کے بعد ربیک خود بھی اندر اتر گیا۔ ادھر سے میں نے رسی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈھیلی ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ اتر گیا ہے۔ پھر ربیک نے اندر سے رسی پکڑ لی اور پہلے ایرٹ گیا۔

جب وہ فصیل کے اوپر پہنچا تو رسی میں نے تھام لی اور وہ دوسری طرف اتر گیا۔ اس کے بعد ایمار گیا اور آخر میں مارٹ تھا اس نے کہا۔

''آپ جائیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اسی لمحے ہمیں عقب سے ہارن کی خوفناک غراہٹ سنائی دی اور پھر ٹاپوں کی آواز ابھری۔ ہارن نے روشنی دیکھ لی اور وہ اسی طرف آرہا تھا۔ اس دوران میں ہم ہارن کے خطرے سے تقریباً بے نیاز ہو گئے تھے۔ شاید اسی غفلت کی وجہ سے اس ہارن نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ میں نے مارٹ کو اوپر دھکیلا اور وہ تیزی سے چڑھنے لگا میں نے چلا کر کہا۔ ''ادھر سے دوسری رسی پھینکو۔''

ان تینوں نے بھی ہارن کی غراہٹ کے ساتھ اس کی ٹاپیں سن لی تھیں۔ کسی نے رسی پھینکی اور میں نے اسے تھامتے ہوئے دیوار پر پاؤں ٹکائے اور تیزی سے اوپر جانے لگا۔ میں نے ہارن کو دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا اس لیے مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھ سے کتنا دور ہے مگر اس کی ٹاپیں اور غراتی سانسیں بتا رہی تھیں کہ وہ زیادہ دور نہیں ہے اور بہت تیزی سے آرہا ہے۔ مارٹ ہلکے جسم کا تھا اور مجھ سے پہلے چڑھنا شروع کیا تھا اس لیے وہ آگے تھا اور تقریباً فصیل تک پہنچ گیا تھا جب کہ میں ابھی درمیان میں تھا۔ مارٹ کی پھینکی مشعل زمین پر پڑی جل رہی تھی اور اس کی روشنی میں یقیناً ہم ہارن کو صاف دکھائی دے رہے تھے اور اس نے بجا طور پر ہاتھ سے نکل جانے والے شکار کے بجائے اسے منتخب کیا جو اس کی دسترس میں تھا یعنی کہ میں۔ مجھے لگا جیسے عقب سے تند ہوا کا کوئی جھونکا آیا ہو اور پوری قوت سے مجھ سے ٹکرایا ہو اور اس نے مجھے اڑا کر جھاڑیوں پر پھینک دیا ہو۔

یہ ہارن کا بیلچہ نما ہاتھ تھا جو عقب سے میری کمر پر لگا۔ اس میں اتنی قوت تھی کہ رسی میرے ہاتھ سے نکلی اور میں ہوا میں اڑ کر اس جھاڑی پر گرا جس کے ساتھ بیل تھی۔ ہارن کا ہاتھ انسان جیسا ہوتے ہوئے بھی اس سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھی طرح گرفت میں نہیں لے سکتا ہے شاید اسی وجہ سے ہارن نے مجھے پکڑنے کے بجائے ہاتھ مار کر گرانا مناسب سمجھا کہ ایک بار میں نیچے گر جاتا تو پھر اس سے بچ کر کہاں جاتا۔ درد کی ایک لہر اٹھی تھی مگر مجھے اس وقت فکر اس کی تھی کہ میں کہاں گرنے جا رہا تھا اور کسی چیز سے تصادم کی صورت میں مجھے کیا نقصان ہوتا۔ فطری طور پر میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور میرا جسم سکڑنے لگا۔ مگر میں سیدھا نرم اور بنا کانٹوں یا سخت شاخوں والی جھاڑی پر جا گرا اور اس سے غالباً مجھے خراش بھی نہیں آئی تھی۔

مگر میری جان شدید خطرے میں تھی۔ ہارن جیسا خطرناک درندہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں جھاڑی پر گرا اور ہارن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ بہت تیزی سے آیا تھا اور مجھے پکڑنے کے لیے اس نے دیوار کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ نتیجے میں مجھے گراتے ہی وہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہ تصادم خاصی قوت سے ہوا تھا اور چند لمحے کے لیے وہ خود کو سنبھال نہ پایا اور گیا۔ اسی بنا پر وہ دیکھ نہیں سکا کہ میں کہاں گرا تھا۔ وہ اب پاگلوں کی طرح جھاڑیوں کو جھنجھوڑ رہا تھا اور ان میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نیچے یہ کہیں گھنی اور زیادہ سخت شاخوں والی تھیں۔ میں اس کے درمیان میں پھنسا ہوا تھا اور جھاڑی ہلنے کے ساتھ رفتہ رفتہ نیچے جا رہا تھا۔

میں از خود حرکت نہیں کر رہا تھا کہ اس سے ہارن کو پتا چل جاتا کہ میں کہاں ہوں اور پھر وہ اسی حصے پر ہاتھ مارتا۔ وہ جھاڑی کو ہلا رہا تھا اور میں اسی وجہ سے نیچے جا رہا تھا۔ دیکھا جائے تو وہ میری مدد کر رہا تھا۔ کیونکہ یہاں جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ میں ان کے جال میں پھنس کر رہ گیا تھا اور اگر ہارن نہ بھی ہوتا تو ان سے نکلنا بھی کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔ نیچے آتے ہوئے میری کوشش تھی کہ جھاڑی کے اندر والے حصے کی طرف جاؤں اور ہارن سے دور رہوں۔ ایک طرح میں اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا دوسری طرف میرے ساتھی بھی مجھے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مارٹ اوپر پہنچ گیا تھا اور وہ اندر والوں سے تیر کمان مانگ رہا تھا۔

بالآخر میں ہارن کے تعاون سے زمین تک پہنچا۔ اس نے اس دوران میں جھاڑیوں کا حشر کر دیا تھا۔ ان کا بیشتر حصہ اپنی جناتی قوت سے اکھاڑ پھینکا تھا اور باقی ماندہ کا حشر کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں مارٹ کی طرف سے چلایا ہوا پہلا تیر اس کے جسم میں اتر گیا اور وہ غرا کر ذرا پیچھے ہوا۔ میں رینگ کر دوسری جھاڑی تلے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ وہاں کیا ہے۔ اس لیے جب میرے ہاتھ پہلے سوکھی گھاس اور پھر اس کے اندر موجود انڈوں سے ٹکرائے تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ یہ یقیناً اسی زہریلے کانٹوں والے پرندے کا گھونسلا تھا اور وہ بھی آس پاس کہیں موجود تھا۔ میں نے معبود حقیقی سے فریاد کی کہ یہ میں

کہاں پھنس گیا ہوں جہاں آگے پیچھے ہر طرف موت ہے۔ کچھ دیر ساکت رہنے کے بعد میں سست روی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس دوران میں مارٹ ہارن کو کئی تیر مار چکا تھا۔

میں اب فصیل کی طرف سرک رہا تھا۔ ہارن اکیلا تھا مگر اس کا پورا امکان تھا کہ اس کی چیخم دھاڑ سن کر دوسرے ہارن بھی دوڑے چلے آئیں ۔ میں نے اندھیرے میں دیوار ٹٹولی اور کھڑا ہوا میں اندازہ لگا رہا تھا کہ ہارن کی ضرب نے مجھے کس حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ تکلیف تھی مگر میں حرکت کرنے سے معذور نہیں ہوا تھا۔ ہارن مجھے جھاڑی میں نہ پا کر پہلے حیران تھا جب مارٹ نے اس پر تیر اندازی شروع کی تو اس کا اشتعال بڑھ گیا تھا مگر وہ مارٹ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ہاں میں خطرے میں تھا اگر وہ جھاڑی میں مزید گھستا تو مجھے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا یا وہ اپنے بھاری وجود سے جھاڑی کچلتا تو گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح میں بھی پس جاتا۔ مارٹ تیر اندازی کے ساتھ مجھے آوازیں دے رہا تھا اور میں خاموش تھا اس موقع پر بول کر میں فوت ہونا نہیں چاہتا تھا۔

مگر صرف خاموش رہنا مسئلے کا حل نہیں تھا جب کہ دیگر نئے مسائل بھی جنم لے رہے تھے۔ جھاڑیاں ٹوٹنے اور ان کے ذرات کے اڑنے سے وہاں ایک غبار سا چھا گیا تھا جو ناک کے راستے دماغ میں جا کر ان حصوں میں تحریک پیدا کر رہا تھا جو چھینک لانے کے ذمے دار تھے۔ اگر میں اس وقت چھینک مار دیتا تو میری فوتگی کی وجہ یقیناً چھینک قرار دی جاتی۔ اس لیے میں نے ناک بند کر لی تھی اور منہ سے سانس لے رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مشکل سے کیسے نکلوں۔ رسیاں جہاں تھیں وہاں ہارن موجود تھا اور تیر کھانے کے باوجود وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے فصیل پر چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک کوئی نرم سی چیز مجھے چھوتی ہوئی گزری تھی۔ میں بدکا تھا مگر اپنی جگہ سے ہلا نہیں اور یہ اچھا ہوا۔

کیونکہ چھونے والی چیز وہی خوش نما پرندہ تھا اور غالباً اندر کی جھاڑی میں اسی کا گھونسلا و انڈے تھے جنہیں بچانے کے لیے وہ جان پر کھیل کر ہارن کا سامنا کرنے نکلا تھا۔ میری موجودگی کا اسے علم نہیں تھا اور وہ ہارن کو ہی در انداز سمجھ رہا تھا۔ اس کی جھلک مجھے اس وقت دکھائی دی جب وہ گری مشعل کے پاس سے گزرا۔ مشعل بدستور روشن تھی۔ ہارن نے بھی اسے دیکھ لیا اور وہ عجیب سے آواز نکالتا ہوا پیچھے ہٹتا تھا۔ اسے بھڑکنا بھی کہا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی جانتا تھا کہ یہ پرندہ کتنا ہلاکت خیز ہے اور اس کے کانٹے ہارن جیسے دیوہیکل جانور کو بھی فنا کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ ہارن بدحواسی میں پیچھے ہو رہا تھا اور پرندہ کریہہ سی آوازیں نکال کر اسے ڈرا رہا تھا مگر اس نے ابھی رقص مرگ شروع نہیں کیا تھا۔ شاید وہ بھی اس سے ڈر رہا تھا کہ کہیں کانٹے بازی کے جواب میں ہارن حملہ کرے تو اس کے بچنے کا امکان نہیں تھا اس لیے وہ ڈرا دھمکا کر کام نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ جنگل کے دو جانوروں کی باہمی آویزش تھی جو جانتے تھے کہ انہیں اسی جنگل میں ساتھ رہنا ہے اس لیے وہ لڑائی سے حتیٰ الامکان گریز کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہو رہا تھا۔

پھر کسی طرف سے ایک پرندہ اور آیا اور آکر پہلے والے کے ہمراہ اسی کی طرح دھمکی آمیز آوازیں نکالنے لگا یہ یقیناً جوڑا تھا۔ ہارن پیچھے ہٹ رہا تھا اور وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں ہارن فصیل سے خاصا پیچھے ہٹ گیا تھا اور اسی مناسبت سے پرندے بھی دور ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے موقع تھا۔ اگرچہ پرندوں کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی کانٹے نہ برسانا شروع کر دیں۔ ہارن پر تیر برسانے والے مارٹ نے بھی دم سادھ لیا تھا اور یہ اچھا ہی کیا تھا ورنہ پرندے اس کی اور فصیل کی طرف متوجہ ہوتے تو شاید میں ان کی نظروں میں آ جاتا۔ ہارن اب فصیل سے کوئی تیس پینتیس گز دور چلا گیا تھا اور پرندے دس بارہ گز دور تھے۔ میں نے چند گہری سانسیں لیں اور اچانک بھاگا۔ رسیوں کے پاس آتے ہوئے میں نے چلا کر کہا۔ ”رسی پکڑ لو میں آ رہا ہوں۔“

مجھے خطرہ تھا کہ ان لوگوں نے رسیاں چھوڑ نہ دی ہوں اور میں رسی پکڑ کر فصیل پر چڑھنے کی کوشش میں منہ کی کھاؤں۔ پرندے جو پوری طرح ہارن کی طرف متوجہ تھے اور اسے ڈرا رہے تھے میری آواز سن کر خود بھڑک کے اور ہارن کی طرف ہی بھاگے۔ میں ان کے عقب میں تھا۔ میں نے وہ رسی پکڑی جس سے مارٹ چڑھا تھا۔ وہ میری مدد کے لیے دوبارہ سے حرکت میں آ گیا تھا۔ اس نے تیر کمان سنبھال لیے۔ میں نے رسی پکڑی اور دونوں پاؤں دیوار سے ٹکاتے ہوئے اوپر چڑھنے لگا۔ اس وقت میں اپنی پوری قوت، صلاحیت اور مہارت استعمال کر رہا تھا۔ غلطی کی گنجائش نہیں تھی اور اگر میں غلطی کرتا تو وہ میری زندگی کی

آخری غلطی ہوتی۔ پرندوں کی طرف توجہ دینے یا ان کی طرف سے ہوشیار رہنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ ناقابلِ بیان تیزی سے میں نصف سے زیادہ دیوار چڑھ گیا اور تب مارٹ نے تیر اندازی شروع کر دی۔ مجھے عقب سے پرندے کی زخمی آواز سنائی دی۔ اسے تیر لگا تھا۔

شاید انہوں نے مجھ پر کانٹے برسانے کی کوشش کی تھی اور مارٹ نے تیر مار کر انہیں روکا۔ فصیل کے نزدیک آنے سے میرا جسم اب بینڈ ہو رہا تھا اور مجبوراً مجھے اب ٹانگوں کے بجائے ہاتھوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔ میں لٹک گیا تھا۔ عقب سے ہارن کی ٹاپوں کی آواز نزدیک آ رہی تھی اور اوپر سے مارٹ دبی آواز میں مجھے جلدی آنے کو کہہ رہا تھا پھر اس نے تیر مارا اور ہارن غرّایا۔ غراہٹ زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں فصیل سے دو فٹ نیچے تھا اور میں نے پاؤں سمیٹتے ہوئے تیزی سے یہ دو فٹ کا فاصلہ طے کیا اور فصیل پکڑنے والا تھا کہ رسی کو شدید جھٹکا لگا۔ میں نیچے گیا تھا۔ ایک لمحے کو میرا دل رک گیا کہ رسی ٹوٹ گئی تھی مگر وہ اپنی جگہ قائم تھی۔ دوسرا جھٹکا لگا اور میں مزید نیچے گیا تو انکشاف ہوا کہ رسی ہارن نے پکڑ لی تھی اور وہ اسے کھینچ رہا تھا۔ میں فصیل سے ڈھائی تین فٹ نیچے آ گیا تھا۔ ہارن کی جناتی قوت کے سامنے اندر موجود تینوں افراد بھی کچھ نہیں تھے اور وہ اسے رسی کھینچنے سے نہیں روک سکتے تھے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہارن کے ہاتھ میرے پیروں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رسی پکڑ لی تھی۔ ایک جھٹکے کی اور دیر تھی کہ میں اس کی حد میں پہنچ جاتا اور وہ جھٹکا دینے جا رہا تھا کہ میری نظر دیوار پر گئی اور ہمیشہ کی طرح مشکل ترین لمحات میں اوپر والے نے میرے ذہن میں جان بچانے کی ترکیب نازل کی، شاید اس لیے کہ میں بھی اس کی ذات سے مایوس نہیں ہوا۔ میں نے جھٹکے کا انتظار کیا اور جیسے ہی نیچے گیا۔ میں نے اپنے پاؤں ہارن کے سر پر ٹکائے اور رسی چھوڑتے ہوئے خود کو پوری قوت سے بائیں طرف اچھالا۔ ہارن اس ضرب سے بوکھلایا تھا۔ اسے توقع تھی کہ میں نیچے گروں گا مگر میں اس کے سر پر لرا۔ شاید اسے ضرب سے چکر بھی آیا ہو اس لیے جب تک وہ سنبھلتا میں نے دوسری رسی پکڑ لی تھی۔ یہ اصل میں میری رسی تھی جس پر چڑھتے ہوئے ہارن نے ہاتھ مار کر مجھے جھاڑی میں پھینک دیا تھا۔

میں نے اندھی چال چلی تھی یہاں روشنی کم تھی اور رسی برائے نام ہی نظر آ رہی تھی اگر میرا ہاتھ ذرا بھی غلط پڑتا تو میں نیچے گرتا جس کے بعد شاید اٹھنا نصیب نہ ہوتا کیونکہ ہارن اتنا پاس تھا کہ وہ پاؤں رکھ کر مجھے وہیں دبا دیتا۔ مگر رسی میرے ہاتھ میں آئی اور میں ذرا بلندی تک بھی پہنچا تھا۔ رسی پر گرفت مضبوط کرتے ہی میں نے پاؤں اوپر کرتے ہوئے خود کو ہارن کی پہنچ سے دور کیا اور اس کے بعد پھرتی سے نیچے رہ جانے والی رسی بھی سمیٹ لی۔ جب تک ہارن سنبھل کر میری طرف آتا میں یہ دونوں کام کر چکا تھا۔ اس نے ہاتھ چلائے اور اوپر کی طرف بھی اچھلا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ مجھ سے چند انچ ہی دور رہ گئے تھے۔ میں نے مارٹ سے کہا۔ ''اس مصیبت کو دور کرو، میں اوپر نہیں چڑھ سکتا جب تک یہ نیچے ہے۔''

مارٹ نے تیر کمان پر کھینچا ہوا تھا۔ میری بات سن کر اس نے تاک کر ہارن کی گردن کا نشانہ لیا اور تیر اس کی گردن سے ذرا نیچے اترا تھا۔ ہارن نے ڈکرانے کی بھیانک آواز نکالی اور ذرا پیچھے ہوا تھا۔ مجھے موقع ملا تو میں اوپر گیا اور اب میں ہارن کی پہنچ سے باہر تھا مگر مزید اوپر چڑھنے کے لیے مجھے سیدھا ہونا تھا اور اس صورت میں وہ میری ٹانگ پکڑ کر کھینچ سکتا تھا۔ مارٹ نے کہا۔ ''آپ حرکت مت کریں...... تم تینوں مل کر رسی کھینچو۔'' دوسرا جملہ اس نے فصیل کے اندر والی پارٹی سے کہا تھا۔ وہ رسی کھینچنے لگے اور میں آسانی سے اوپر جانے لگا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میرے ہاتھ فصیل تک پہنچ گئے تھے۔ میں ہارن سے محفوظ ہو گیا تھا مگر اس دوران میں اس نے ایک اور زاویے سے حملہ کیا تھا۔ مارٹ نے بروقت مجھے ہوشیار کیا۔ ''بچیں وہ پتھر مار رہا ہے۔''

میں نے ہاتھوں کے بل خود کو پوری قوت سے اوپر اچھالا اور پتھر نیچے فصیل سے ٹکرایا۔ دھماکے کی آواز نے بتایا کہ پتھر خاصا بڑا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور پاؤں دوسری طرف کرتے ہوئے میں لٹک گیا تھا۔ مارٹ بھی پھرتی سے نیچے لٹک گیا تھا۔ اس کا خطرہ تھا کہ ہارن مزید پتھر پھینک سکتا تھا اس لیے میں نے اندر والوں سے کہا۔ ''دیوار کی آڑ میں آ جاؤ۔''

وہ سب دیوار کی آڑ میں ہو گئے تھے۔ میں نے نیچے دیکھا یہاں ہلکی سی روشنی تھی اور ہم ایک چھوٹے سے باغ میں تھے۔ یہ باغ چھوٹے درجے کے پجاریوں اور ملازمین کی رہائش گاہ والی عمارت کے پیچھے تھا۔ یہاں پھلدار درخت اور پھولدار پودے لگے ہوئے تھے۔ زمین پر نفیس گھاس تھی۔ میں ایک پودے کے عین اوپر لٹک رہا تھا اس

لیے میں نے فصیل چھوڑ دی اور پودے پر آرام سے اتر گیا۔ خوش قسمتی سے اس میں کانٹے نہیں تھے۔ مارٹ بھی نیچے آگیا تھا۔ فصیل کے باہر سے ہارن کے غرانے اور ڈکرانے کی آواز آرہی تھی مگر فصیل کی بلندی کی وجہ سے یہ آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ میں نے سرگوشی میں سب کی خیریت دریافت کی۔ ربیک میرے پاس آیا اور مجھے ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ''خیریت تو آپ کی پوچھنی چاہیے۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی ؟''

جہاں ہارن نے ہاتھ مارا تھا وہ جگہ دکھ رہی تھی مگر یہ دکھن اتنی نہیں تھی کہ میں بے قرار ہو جاتا۔ میں اسے نظر انداز کر رہا تھا اور مجھے اُمید تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کم ہو جائے گی۔ جھاڑی پر گرنے اور پھر اس کے بعد کی کشمکش میں کچھ چوٹیں اور خراشیں آئی تھیں مگر یہ قابلِ ذکر نہیں تھیں۔ البتہ حلیہ خراب ہو گیا تھا۔ مارٹ بھی بہ خیریت نیچے اتر آیا تھا۔ انہوں نے رسیاں اور اپنا سامان سمیٹ لیا تھا۔ ذرا سی دیر کی اس کشمکش نے میرا گلا خشک کر دیا تھا۔ میں نے چھاگل سے چند گھونٹ لیے اور عمارت کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ تین منزلہ عمارت تھی جو تقریباً سو فٹ چوڑی تھی اور اس کا عرض شاید چالیس فٹ تھا۔ کھڑکیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہر فلور پر پیچھے کی طرف دس کمرے تھے اگر سامنے بھی اتنے ہی کمرے تھے تو یہاں کل ساٹھ کمرے ہو سکتے تھے۔ اگر ایک کمرے میں دو افراد رہائش رکھتے تھے تو کل تعداد ایک سو بیس یا سو تو بنتی تھی۔ مگر مسئلہ یہاں موجود افراد نہیں تھے بلکہ ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی تھی۔ ان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اہرام نما معبد میں ہوں گے۔ میں نے کہا۔

''ہمیں معبد تک جانا ہے لیکن اس سے پہلے اس عمارت کا جائزہ لینا ہے اور ممکن ہو تو اس پر قبضہ کرنا ہے۔''

''اس میں موجود افراد کا کیا کرنا ہے؟'' ربیک نے سوال کیا۔

''ہمیں فی الحال ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں سے غرض ہے۔'' میں نے پالیسی واضح کی۔ ''ان کے علاوہ صرف اس سے نمٹنا ہے جو ہمارے راستے میں آئے۔ مگر نہ تو کسی کو چھیڑنا ہے اور نہ ہی کسی کی مدد کرنی ہے۔ اصل افراد پہنچنے تک خاموش رہنا لازمی ہے۔ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہے۔''

''ہم سمجھ گئے جناب۔'' ایرٹ نے میری بات کا ترجمہ کر کے کہا۔ ''ہمیں ڈیوڈ شا اور اس کے آدمیوں کا حلیہ بتائیں تاکہ سامنا ہونے پر انہیں پہچان سکیں۔''

ایرٹ نے اچھا نقطہ اٹھایا تھا۔ میں نے انہیں تفصیل سے ڈیوڈ شا، کرنل جونز، زیبی اور باسو کا حلیہ بتایا۔ پھر ان کے پاس موجود ممکنہ ہتھیاروں کی ساخت اور ان کی تباہ کاری کے بارے میں بتایا۔ وہ حیرت سے ان ہتھیاروں کے بارے میں سن رہے تھے جو ان کے نقطۂ نظر سے جادوئی تھے۔ بم کے بارے میں وہ سن کر خوف زدہ ہوئے تھے۔ مگر یہ عمومی خوف تھا۔ میں نے احتیاطی تدابیر بھی بتائیں۔ وہ سن رہے تھے اور ذہن نشین کر رہے تھے۔ میرا کرتہ اس کشمکش کے دوران جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ خاص طور سے ایک آستین یوں بیکار ہوئی تھی کہ بس لٹک رہی تھی میں نے اسے کھینچ کر نکال دیا۔ ایک آستین کے ساتھ میں عجیب لگ رہا تھا۔ کرتے کا دامن بھی سامنے سے یوں چاک تھا کہ اس کے دو حصے ہو گئے تھے۔ مگر میں کسی تقریب میں نہیں آیا تھا جو لباس کی پروا کرتا۔

باہر سے ہارن کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ مارٹ نے مجھے بتایا کہ جب میں پرندوں کے پیچھے سے دیوار پر چڑھ رہا تھا تو انہوں نے مجھ پر کانٹے برسانے کی کوشش کی تھی اور مارٹ نے ان میں سے ایک کو تیر سے نشانہ بنایا تو وہ دونوں ہی ڈر کر جھاڑیوں میں گھس گئے تھے۔ لیکن وہ ٹلے تو ہارن کو حملہ کرنے کا اسے بھی مارٹ نے عین موقع پر نشانہ بنایا۔ درحقیقت اس نے دو بار میری جان بچائی تھی۔ دونوں مواقع پر میں مارا جاتا اگر وہ بروقت تیر نہ چلاتا۔ مگر یہ شکریے کا موقع نہیں تھا ہم سب ایک دوسرے کے لیے یہی کرتے جو مارٹ نے کیا تھا۔ ہم دبے قدموں اور پودوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے عمارت کی طرف بڑھے۔ ساری کھڑکیاں بند تھیں مگر چند ایک کی جھریوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اگر اندر روشنی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ کچھ لوگ بھی تھے ورنہ روشنی کون کرتا۔

سوال یہ تھا کہ یہ لوگ وہاں کس صورت میں تھے؟ یعنی آزاد تھے یا پھر یہاں قید کیے گئے تھے؟ یہاں عمارت کے پہلوؤں والے حصے میں مشعلیں روشن تھیں اور ان کی روشنی کسی قدر پیچھے بھی آرہی تھی۔ مجھے ڈیوڈ شا سے اس رحم کی توقع نہیں تھی کہ اس نے کسی کو زندہ چھوڑا ہوگا اور اگر اس نے زندہ چھوڑا ہوگا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی مقصد ہوگا۔ معبد کے احاطے میں رن وے بنانے سے یہ تو واضح تھا کہ جلد یا بدیر باہر سے ڈیوڈ شا کے مزید ہرکارے یہاں آنے والے تھے۔ اگرچہ وہ چار ہی کم نہیں تھے لیکن مزید

کمک آنے کے بعد اس کا مقابلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں رہ جائے گی۔ اس عمارت کے سامنے ایک چھوٹے باغ اور روش کے بعد اہرام نما معبد تھا۔ اس کے عقب میں وہ طویل اور مستطیل میدان تھا جو ہمارے دائیں طرف تک آرہا تھا۔ سامنے معبد کا خوب صورت اور وسیع باغ تھا جس کے پاس گودام اور قید خانے والی عمارت تھی جس میں ہارن بھی موجود تھا۔ باغ کے سامنے آرگون سے آنے والی سرنگ کا دہانہ تھا۔

اب میں کسی قدر سمجھ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ریناٹ اور اس کے آدمیوں کو کیوں ہمارے رحم وکرم پر چھوڑا اور وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس نے معبد کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ یہاں وہ خاموشی سے رن وے تیار کرا سکتا تھا جب کہ آرگون میں یہ کام ممکن نہیں تھا وہاں اسے بہت سے افراد کا سامنا کرنا پڑتا جب کہ معبد میں بہت کم لوگ تھے اور وہ زیادہ تر زندگی سے پیار کرنے والے، ان میں مرنے مارنے والے کم تھے اور ایسے لوگوں سے نمٹنا مشکل کام نہیں تھا۔ یہاں کے حالات سے لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کو سچ مچ کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی اور اس کا بھی امکان تھا کہ پجاری اور دوسرے لوگ لائن بدل کر ڈیوڈ شا کی طرف ہو گئے ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے یہاں مارا ماری کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ جس حد تک بھی میں نے درخت کے اوپر سے اور پھر اندر آنے کے بعد دیکھا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ یہاں شرافت سے ہتھیار ڈالے گئے تھے اور اگر یہاں موجود افراد مارے بھی گئے تھے تو ڈیوڈ شا نے نہایت سکون سے ان کا خاتمہ کیا ہوگا۔

میں اور میرے ساتھی عمارت کی پہلی منزل کی عقبی کھڑکیوں کو دیکھ رہے تھے اگر ان میں سے کوئی کھلی ہوتی تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ بہ ظاہر ساری ہی کھڑکیاں بند تھیں۔ مگر مجھے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی کھڑکی کھلی مل جائے گی اس کے لیے ہم زور آزمائی بھی کر رہے تھے مگر اس طرح کہ آواز پیدا نہ ہو۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب ایک کھڑکی بغیر زور آزمائی کے بعد باآسانی کھل گئی۔ کیونکہ اس کی چٹخنی اندر سے ٹوٹ گئی تھی اور اس کے کواڑ پھنستے تھے اس لیے بہ ظاہر وہ مضبوطی سے بند تھی۔ کسی نے چٹخنی ٹھیک کرنے پر توجہ بھی نہیں دی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا۔ ’’کام بن گیا ہے پہلے میں جاتا ہوں جب تک میری طرف سے اجازت نہ ملے کوئی اندر نہ آئے اور پوری طرح ہوشیار رہنا۔‘‘

ربیک نے سر ہلایا۔ میں اچک کر کھڑکی پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ اندر تاریکی تھی مگر فوراً ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کوئی تھا۔ سانس کی آواز آرہی تھی اور پھر ایک سہمی نسوانی آواز نے کہا۔ ’’کون ہے۔‘‘

’’روبیر۔‘‘ میں نے بے ساختہ کہا تو کمرے کے تاریک گوشے سے ایک بگولہ سا اٹھا اور مجھ سے آکر لپٹ گیا۔ وہ روبیر ہی تھی جو رو رہی تھی اور مجھے ٹٹول رہی تھی۔

’’شہباز...... شہباز...... یہ آپ ہیں؟‘‘

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ’’ہاں لیکن آہستہ بولو۔ کسی تک آواز نہ جائے۔‘‘

ہیجان سے اس کا نازک جسم کانپ رہا تھا اور وہ مجھ سے لپٹی جا رہی تھی۔ اس وقت میں اس کا فطری ردِعمل سمجھا تھا کہ اتنے دن بعد دشمن کی قید میں اسے کوئی اپنا ملا تھا۔ میں نے تسلی دینے کے لیے اس کی پشت کو تھپکا اور سرگوشی میں کہا۔ ’’خود پر قابو پاؤ۔‘‘

مگر اس نے قابو پانے کے بجائے یہ کیا کہ بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور میرے کان کے قریب ہونٹ لا کر بولی۔ ’’نہیں پا سکتی، میری خواہش تھی کہ ایک بار آپ کو دیکھ لوں اس کے بعد بے شک مجھے موت آجائے۔‘‘

حالات کی سنگینی اور موقع کی نزاکت نہ ہوتے ہوئے بھی میں روبیر کے الفاظ، اس کے لہجے اور خود میں پیوست لرزتے بدن میں چھپے پیغام کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے دل ہی دل میں بے ساختہ لاحول پڑھی۔ زمانے کے سرد وگرم نے مجھے بہت سے دوسرے معاملات کی طرح عورت کے معاملے میں بھی تجربہ کار کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب عورت کسی مرد کو یوں اپنے وجود سے روشناس کراتی ہے تو اس کے پس پشت کیا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا انداز بہت بے ساختہ تھا، مگر ساتھ ہی خود سپردگی کا بہت طاقتور جذبہ بھی کارفرما تھا۔ میں نے اسے خود سے جدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ’’فی الحال مرنے کی بات مت کرو۔ ہم نے بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے اور امید ہے کہ جلد وادی کے حالات ہمارے قابو میں ہوں گے۔‘‘

میری کوشش سے زیادہ الفاظ نے اسے مجبور کیا اور وہ بادل ناخواستہ مجھ سے الگ ہوئی تھی۔ ’’آپ یہاں کیسے آئے؟‘‘

’’یہ لمبی کہانی ہے مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آئیں اور کیا تم یہاں قید ہو؟‘‘

''ہاں۔'' وہ مغموم ہو گئی اور پھر سسکی سی لی۔ ''میں نے دھوکا کھایا۔ جسے محبوب سمجھا تھا وہ مکار نکلا اس نے مجھے استعمال کیا۔''

''شامین۔'' میں نے افسوس سے کہا۔ ''اس نے تم جیسی معصوم لڑکی کو دھوکا دیا۔''

''ہاں وہی ان سپاہیوں کو لایا تھا جنہوں نے حملہ کر کے ہمارا ٹھکانہ تباہ کیا اور مجھے زبردستی ساتھ لے گئے۔ تب مجھے پتا چلا کہ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اپنی اس خدمت گزاری کے صلے میں وہ ریناٹ کی خاص فوج میں اعلیٰ افسر بن گیا ہے۔''

اگرچہ مجھے پہلے بھی اس فلمی قسم کی محبت پر یقین نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے اندر کھٹک سی تھی کہ شامین شاید روبیر سے مخلص نہ ہو جو اس کے وہ کچھ کر گزری تھی جو کوئی لڑکی شاید ہی کر سکے۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ''تم پر جو گزری میں بعد میں سنوں گا پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کے حالات سے واقف ہو؟''

''کسی حد تک۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کل یہاں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ باہر شور ہوا تھا اور بہت ہنگامہ ہوا پھر خاموشی چھا گئی۔ ایسا لگا جیسے بہت سے لوگوں کو لا کر اس جگہ بند کیا گیا ہو۔''

''آرگون پر ہمارا یعنی میرا اور شہر کے اندر موجود حریت پسندوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ لیکن معبد پر ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کا قبضہ ہے۔ وہ کل یہاں آئے تھے۔''

''آپ کے دشمن؟'' روبیر حیران ہوئی تھی۔

''ہاں اور اب وہ یہاں باہر سے مزید آدمی اور اسلحہ منگوائیں گے جن سے مقابلہ کرنا یہاں کے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہو گی۔''

''وہ لوگ کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ معبد میں ہیں۔''

''مگر وہ باہر سے لوگ اور اسلحہ کیسے منگوائیں گے؟''

''یہ بات تم نہیں سمجھو گی۔ مگر وہ منگوا سکتے ہیں اور انہوں نے اسی لیے معبد پر قبضہ کیا ہے۔'' میں نے کہتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے بند تھا۔ لازمی بات ہے اسے بند ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ کھڑکی کھلی تھی میں نے روبیر سے پوچھا۔ ''تمہیں پتا نہیں تھا کہ کھڑکی کھل سکتی ہے؟''

''مجھے معلوم ہے لیکن میں یہاں سے کہاں جا سکتی تھی۔ کوئی یہاں سے فرار ہو کر کہاں جا سکتا ہے۔ میں نے دو بار کوشش کی مگر پکڑی گئی اور مجھے سزا ملی تھی۔ انہوں نے میری پشت ادھیڑ دی تھی، یہ دیکھیں......'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی پشت پر رکھا جہاں مندمل ہوتے زخموں کا کھردرا پن موجود تھا۔ میں نے ہاتھ واپس کھینچا اور نرم لہجے میں کہا۔

''تم فکر مت کرو جب ہم ان پر حاوی ہوں گے تو سب سے حساب لیا جائے گا۔'' میں نے کہا اور اس کا بازو پکڑ کر کھڑکی تک آیا۔ ریبک پہلے ہی اندر جھانک رہا تھا اور اس نے روبیر کو دیکھ لیا۔ اسی نے سہارا دے کر اسے نیچے اتارا۔ جب میں کود کر باہر آیا تو وہ سب گرم جوشی سے اس سے مل رہے تھے اور اس کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ روبیر خوش تھی پھر اس نے رائٹوں کا پوچھا اور اس کی موت کا سن کر وہ دکھی ہو گئی تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر انہیں یاد دلایا۔ ''ہمیں عمارت کے اندر جانا ہے۔''

''حکم کریں جناب۔'' ایرٹ نے مستعد ہو کر کہا۔ وہ روبیر کو زندہ دیکھ کر زیادہ ہی خوش ہو رہا تھا۔ خاصی کم روشنی میں بھی اس کی خوشی بہت واضح تھی۔ میں نے باقی رہ جانے والی دو کھڑکیاں چیک کیں اور وہ اندر سے بند ملی تھیں۔ ریبک نے تجویز پیش کی۔

''ہم آگے سے جا سکتے ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس طرف سے جانا مناسب نہیں ہو گا۔ وہاں نگرانی کا خطرہ ہے۔''

''ہم دیکھ کر جائیں گے اور نگرانی کرنے والوں کو قابو کیا جا سکتا ہے۔''

''تم نہیں جانتے ہو یہ اس قسم کی نگرانی ہو گی جو بغیر آدمی کے ہی کی جا سکتی ہے۔ ہمیں دیکھ لیا جائے گا اور ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا۔''

انہیں میری بات پر تعجب ہوا تھا مگر انہوں نے اسے تسلیم کر لیا کہ میں کہہ رہا تھا۔ میں نے دیوار کے کنارے سے جھانک کر دیکھا۔ اس عمارت کے پہلو میں ایک چھوٹی سی خالی جگہ تھی اور پھر سپاہیوں کے لیے بیرک نما رہائش تھی۔ اس کے سامنے وسیع احاطہ تھا جس کے بیچ میں گول یا بیضوی باغ تھا اور اس باغ کے ایک طرف سرنگ سے آنے والا راستہ نکل رہا تھا اور دوسری طرف اہرام نما معبد تھا۔ اسی اہرام نما معبد تلے نہ صرف بڑے قید خانے تھے بلکہ یہیں اعلیٰ پجاریوں کی رہائش کا انتظام بھی تھا۔ سب سے خوفناک عمارت وہ تھی جو اصل میں گودام بھی تھی اور اس کے نیچے تہہ خانے کے اندر ایک کنوئیں میں ہارن قید تھا جس کے سامنے پجاریوں کے معتوبوں کو پھینکا جاتا تھا اور وہ انہیں چیر پھاڑ کر

رکھ دیتا تھا۔ یہ سب یہاں سے نظر آ رہا تھا۔
مگر جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں لکڑی کے کھمبے نصب تھے جن پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ ان مشعلوں کی روشنی سے ظاہر تھا کہ وہاں نگرانی کا کوئی بندوبست کیا گیا ہے۔ ورنہ جیسے یہاں روشنی نہیں کی گئی تھی وہاں بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ روشنی کرنے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ کوئی ان کی نظروں میں آئے بغیر معبد کی عمارت میں داخل نہ ہو سکے۔ اس لیے میں پہلے اس عمارت کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ مگر یہاں ایک ہی کھڑکی کھلی تھی اور اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے روبیر سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں مستقل بند رکھا جاتا ہے؟''

''نہیں دروازہ صرف رات میں باہر سے بند ہوتا ہے۔ صبح اسے کھول دیا جاتا ہے۔''

''تم دن میں باہر آ جا سکتی ہو؟''

''نہیں یہاں ہر راہداری میں ایک نگران ہوتا ہے اگر مجھے کہیں جانا ہوتا ہے تو اس کی نگرانی میں جاتی ہوں۔ مگر عمارت سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''فرض کرو تمہیں رات کو جانا ہو کسی ضروری وجہ سے تب تم کیا کرو گی؟''

روبیر میری بات کا مفہوم سمجھ گئی تھی اس نے جھینپ کر کہا۔ ''میں دروازہ بجا کر رات کے نگران کو بلاتی ہوں اور وہ مجھے اپنی نگرانی میں لے جاتا ہے۔''

میں نے فوری فیصلہ کیا۔ ''تب تم یہی کرو گی۔ اندر چلو۔''

میں اور روبیر دوبارہ کمرے میں آئے۔ یہ رہائشی عمارت تھی قید کے لیے مخصوص نہیں تھی اس لیے یہاں خاص انتظامات بھی نہیں تھے۔ قید خانے والی عمارت میں اتنے لوگ نہیں آ سکتے تھے اور پھر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی کے خیال میں یہ خطرناک لوگ نہیں تھے۔ دوسرے وہ اس جگہ سے نکل کر کہاں جاتے۔ پھر سب کو دو یا تین عمارتوں میں رکھنے کے بجائے انہوں نے بہتر سمجھا کہ انہیں ایک ہی عمارت میں رکھا جائے۔ میں نے کھڑکی بند کر کے سرگوشی میں پوچھا۔ ''رات کو یہاں روشنی نہیں کی جاتی ہے؟''

''کی جاتی ہے دیوار میں ایک لیمپ لگا ہوا ہے مگر آج اسے جلانے کے لیے کوئی نہیں آیا۔''

''یہ اچھی بات ہے۔ اندھیرا مناسب ہے۔ جب تم اس کے ساتھ باہر جاتی ہو تو کیا وہ دروازہ پھر بھی باہر سے بند کرتا ہے؟''

''نہیں میرے باہر ہونے کی وجہ سے اسے ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔'' روبیر نے جواب دیا۔ میں سوچ رہا تھا اور ایک لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم دروازہ بجاؤ۔''

میں کھڑکی پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ جب میں دروازے کے عقب میں دیوار سے لگ گیا تو روبیر نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد اس نے دوسری دستک دی تو باہر سے کرخت آواز آئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے حاجت ہو رہی ہے۔'' روبیر نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ پٹ میری طرف آیا تھا اس سے پہلے کہ نگران اندر آتا یا جھانکتا روبیر خود باہر نکل گئی۔ اس نے دروازہ کھینچ کر بھیڑ لیا اور نگران سے بولی۔ ''جلدی کرو۔''

روبیر نے ظاہر کیا تھا کہ اسے عجلت ہے۔ نگران اسے لے گیا۔ ان کے قدموں کی چاپ مدھم ہوئی تو میں نے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ وہ بائیں طرف ایک راہداری میں مڑ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئے۔ میں باہر آ گیا۔ یہاں راہداری میں آمنے سامنے کمرے تھے۔ دونوں طرف سروں پر مشعلیں روشن تھیں۔ میں نے ایک دروازے پر طبع آزمائی کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ چند دروازے دیکھنے کے بعد میں نے بہتر سمجھا کہ اس پلان پر عمل کروں جو میں نے سوچا ہوا تھا۔ میں راہداری کے سرے تک آیا اور اس سمت میں جھانکا جہاں روبیر اور نگران گئے تھے۔ یہ راہداری عمارت کے باہر کی طرف ایک دروازے پر کھل رہی تھی۔ مگر نگران اس سے پہلے ہی ایک جگہ کھڑا ہوا تھا اور یہ غالباً اس عمارت کا واش روم والا حصہ تھا۔ میں نے آرگون کے قید خانے کا واش روم دیکھا تھا اور وہ خاصا صاف ستھرا اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق تھا۔ یہ رہائشی عمارت تھی اس لیے یہاں کا بھی کم سے کم اس معیار کا ہونا چاہیے تھا۔

خوش قسمتی سے نگران باہر کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے جھانکتے نہیں دیکھ سکا۔ نگران کی یہاں موجودگی ثابت کر رہی تھی کہ ڈیوڈ شا نے مقامی نظام کو اپنا تابعدار بنا لیا تھا اور اب معبد کے لوگ اس کے لیے کام کر رہے تھے۔ اگر سب نہیں تھے تب بھی کچھ لوگ اب ڈیوڈ شا کے ساتھ تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے گنے چنے

افراد کو ساتھ ملایا ہوگا اور باقی افراد فی الحال قید میں تھے۔ اگر زیادہ لوگ اس کے ساتھ ہوتے تو احاطے میں ویرانی نہ ہوتی۔ اس نے یقیناً اکثر افراد کو قید کر دیا تھا یا پھر ان سے مستقل چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ وہ اس فطرت کا آدمی تھا جسے انسان صرف اپنی غلامی کے لیے ہی زندہ درکار ہوتے تھے ورنہ ان کا وجود بیکار تھا۔ روبیر کچھ دیر بعد واش روم سے نکلی اور اس کے ساتھ اس طرف آنے لگی۔ میں تیار تھا۔ روبیر آگے تھی۔

جیسے ہی وہ ذرا آگے نکلی میرا گھومتا ہوا ہاتھ اس کے پاس سے گزرا اور نگران کے حلق سے ٹکرایا۔ فطری طور پر اس کی سانس اور آواز دونوں بند ہو گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ گلے پر رکھا اور میں نے اطمینان سے اس کی کنپٹی پر گھونسا مار کر اسے لٹا دیا۔ اس کے پاس ایک عدد نیزہ تھا جو میں نے گرنے سے پہلے پکڑ لیا۔ اس کی بے ہوشی کا اطمینان کر کے میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور کھینچ کر روبیر والے کمرے میں لے آیا۔ روبیر ذرا پریشان ہوئی تھی مگر اب مطمئن تھی۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھا۔ پشت کے زخموں سے قطع نظر وہ ٹھیک ٹھاک دکھائی دے رہی تھی اور اس کا لباس بھی مناسب تھا اگرچہ اس کا کرتہ طویل نہیں تھا بلکہ بہ مشکل اس کے کولہوں تک آرہا تھا۔ آستین بھی کہنیوں سے اوپر تھی۔ اسے کرتے کے بجائے قمیص کہنا زیادہ مناسب تھا۔

پھر بھی یہ روبیر کی ستر پوشی کے لیے کافی تھا۔ شاید یہاں قیدیوں کو اتنا ہی لباس دیا جاتا تھا۔ اس کے پیروں میں چمڑے سے بنی ہوئی فیتوں والی چپل تھی جو اس کے گلابی پیروں میں اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے ریشمی بال ایک ریشمی کپڑے سے پونی ٹیل کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ خود پر پڑنے والی صعوبتوں سے قطع نظر اس کی صحت اچھی تھی۔ میں نے کمرے میں آنے سے پہلے اس کا معائنہ کر لیا اگرچہ یہ سرسری تھا مگر اس نے محسوس کر لیا اور اندر آنے کے بعد سرگوشی میں بولی۔ ”مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔“

”دیکھ رہا ہوں کہ تم ٹھیک ہو یا نہیں۔“

”تو پھر کیسی لگی؟“ اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی آگئی۔

”اچھی لگ رہی ہو۔“ میں نے نگران کو فرش پر لٹایا اور پھر ربیک سے رسی لے کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اسے بنڈل کی صورت میں کھڑکی سے باہر پارسل کیا۔

روبیر میرے عام سے لہجے پر خاموش ہو گئی تھی شاید اسے اتنے سپاٹ سے جواب کی توقع نہیں تھی۔ مگر میں یہاں اس کی توقعات پوری کرنے نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں رکنے اور یہاں کی نگرانی کرنے کو کہا۔ اگر عمارت میں کوئی ہنگامہ ہو تو وہ فوری ہمیں مطلع کر سکے۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

”اس سے پوچھ گچھ کرنے اور یہ کام یہاں نہیں ہو سکتا ہے۔“ میں نے نگران کی طرف اشارہ کیا جو اب خود ہمارا قیدی بن گیا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر نکلا تو روبیر نے کھڑکی بند کر لی۔ ہم نگران کو لے کر باغ کے بعید ترین حصے میں آئے اور پہلے اس کے منہ میں بھی ایک کپڑا ٹھونس دیا۔ وہ تقریباً تیس بتیس برس کا جوان آدمی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے وار کا اس پر زیادہ اثر نہیں ہوا تھا اور میں نے قوت بھی کم رکھی تھی اس لیے اب وہ کسمسانے لگا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی مشعل جلا لی اور ان چاروں سے کہا کہ وہ ہمیں گھیر لیں تاکہ مشعل کی روشنی دور سے نظر نہ آئے۔ انہوں نے یوں ہمارا احاطہ کر لیا کہ اب آسمان بھی مشکل سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے مشعل کے شعلے پر نگران کے ایک ہاتھ کی انگلی رکھی تو وہ بلبلا کر ہوش میں آگیا۔ اس نے رسی سے بندھے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر میری گرفت کمزور نہیں تھی۔ چند سیکنڈ اور اس کی انگلیوں نے براہ راست حرارت محسوس کی تو وہ تڑپنے لگا تھا۔ میں نے بُو آنے پر اس کا ہاتھ چھوڑا اور ربیک کے توسط سے کہا۔

”تم سمجھ گئے ہو کہ تم مکمل طور پر ہمارے قبضے میں ہو اور ہم چاہیں تو اسی طرح تمہیں تھوڑا تھوڑا جلا کر مار سکتے ہیں۔“

اس خوفناک دھمکی پر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں کیونکہ وہ اس سزا کو تھوڑا سا بھگت چکا تھا۔ وہ زور و شور سے سر اثبات میں ہلانے لگا اور اس کا انداز التجا آمیز تھا۔ ربیک نے اس کا منہ کھولنے سے پہلے اپنا سنگی خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا اور بولا۔ ”اگر تمہاری آواز ذرا بھی بلند ہوئی تو دوسرے لمحے تمہاری گردن کٹ جائے گی۔“

اس بار اس نے احتیاط سے نفی میں سر ہلایا یعنی وہ آواز نہیں نکالے گا اس کے باوجود ہم پوری طرح محتاط تھے آدمی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ کب وہ احمقانہ انداز میں خودکشی پر تل جائے۔ میں نے اس کے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالا۔ اس نے چند گہرے سانس لیے اور بولا۔ ”میں بتاؤں گا مجھے مت مارنا۔“

"تم عقل مند آدمی ہو۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کو اس عمارت کا نگران کس نے مقرر کیا۔"

"مہا پجاری آئی زور نے۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ کب سے مہا پجاری بنا ہے؟"

"مہا پجاری فیرون کے مرنے کے بعد۔" اس نے جواب دیا۔

میرے پاس جاننے کا ذریعہ نہیں تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں اس لیے میں نے سوالات جاری رکھے۔ "کل یہاں کچھ اجنبی لوگ آئے اور اس کے بعد یہاں گڑبڑ ہوئی تھی۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں نے ایسے لوگ کبھی نہیں دیکھے ان کے پاس آگ اگلنے والے ہتھیار تھے اور انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے معبد کے تمام سپاہیوں کو ختم کر دیا۔"

یعنی یہاں ہنگامہ ہوا تھا۔ مگر وہ بہت مختصر وقت کے لیے ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اس کے بعد کیا ہوا؟"

"پھر مہا پجاری آئی زور کے حکم پر سب نے ہتھیار ڈال دیئے اور ان لوگوں کی اطاعت قبول کر لی۔ مرنے والوں کو دفنا دیا گیا اور اس کے بعد تمام لوگوں کو اس عمارت تک محدود کر دیا گیا۔ کوئی باہر نہیں جا سکتا ہے۔ میں بھی اس عمارت سے باہر نہیں جا سکتا۔"

"یہاں اکثر کمروں کے دروازے باہر سے بند ہیں کیا ان میں موجود لوگ قید ہیں۔"

"قید نہیں ہیں مگر انہیں باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ رات کے وقت ان کے کمرے باہر سے بند کر دیئے جاتے ہیں۔"

میرا اندازہ درست نکلا تھا کہ پجاری ٹولہ ڈیوڈ شا کے ساتھ مل گیا تھا اور اسے ایسا ہی کرنا تھا وہ ہر کمزور کے لیے فرعون مگر ہر طاقتور کے آگے جھک جانے والے تھے۔ معبد کے ناکارہ سپاہی مارے گئے تھے۔ ڈیوڈ شا نے شاید انہیں زندہ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مگر باقی افراد زندہ اور قید میں تھے۔ قید میں رکھنے کی وجہ بھی تھی۔ ڈیوڈ شا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے اصل عزائم سے واقف ہوں کہ وہ باہر سے کمک منگوانے جا رہا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کمک کب یہاں آئے گی؟ کیا آج ہی رات طیارے اس وادی میں داخل ہوں گے اور یہاں اتریں گے؟ جب ہم فصیل کے پار آئے تو ساڑھے سات کا وقت تھا اور اب آٹھ بجے ہوں گے۔ پوری رات پڑی تھی میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں علم ہے کہ معبد کو آرگون سے ملانے والی سرنگ تباہ کر دی گئی ہے۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "وہ کیسے؟"

ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں کے لوگ اس سے ناواقف تھے۔ "یہاں کل کسی وقت بہت بڑا دھماکا سنائی دیا تھا؟"

"بہت بڑا تو نہیں مگر دھماکا ہوا تھا۔"

"اسی دھماکے نے سرنگ تباہ کر دی۔ اب سرنگ سے کوئی آ سکتا ہے اور نہ جا سکتا ہے۔"

نگران کا نام نارَس تھا۔ اس سے سوالات سے جو صورت حال سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ کل صبح اچانک ہی آسمان سے وہ چار افراد نازل ہوئے اور انہوں نے اترتے ہی یہاں موجود سپاہیوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ انہوں نے ستر کے قریب سپاہی اور کچھ دوسرے افراد کو ہلاک کیا اور یہ سلسلہ اس وقت رکا جب آئی زور نے آ کر ان کی اطاعت قبول کر لی۔ ان چاروں نے پجاریوں کو اپنے قبضے کر لیا اور باقی افراد کے لیے حکم دیا کہ وہ اس عمارت تک محدود رہیں جو شخص باہر نکلا اسے ان دیکھی موت ملے گی۔ روشنی ہونے کے بعد انہوں نے اپنی نگرانی میں لاشیں اٹھوا کر ٹھکانے لگوائیں اور اس کے بعد تمام عمارتوں کا جائزہ لیا۔ انہوں نے سپاہیوں کی بیرک اور گودام کو بند کرا دیا۔ نارَس جس عمارت میں نگران تھا وہاں سو کے قریب افراد رہتے تھے اور یہ سب ہی خادم اور خادمائیں تھیں۔ مارے جانے والوں میں کچھ خادم بھی شامل تھے اور کچھ بچنے والے سپاہی یہاں آئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ پجاری بھی تھے جنہیں یہاں رکھا گیا تھا۔ اس لیے اب بھی یہاں موجود افراد کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی۔

گویا معبد میں موجود تمام افراد جو ڈیوڈ شا کے لیے فی الحال بیکار تھے مگر خطرہ بھی نہیں تھے ان کو یہاں محدود کر دیا گیا تھا۔ جب کہ تمام اعلیٰ پجاری، درمیانے درجے کے پجاری اور خادمائیں اور باہر سے آنے والے سب معبد میں تھے۔ اس طرف جانے کی بھی سختی سے پابندی تھی اور ایسا کرنے والے کو سزائے موت کی دھمکی دی گئی تھی۔ لیکن یہ دھمکی نہ بھی دی جاتی تو ان میں سے کوئی اس طرف جانے کی ہمت نہ کرتا۔ اول وہ لوگ آنے والوں کی سفاکی دیکھ چکے تھے اور دوسرے اب مہا پجاری بھی ان کے ساتھ تھا اور مہا پجاری جس کے ساتھ ہوتا وہ اس کے خلاف کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حالات ڈیوڈ شا کے لیے نہایت سازگار تھے۔ مگر اسے علم

نہیں تھا کہ میں یہاں آگیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''روبیر یہاں کیوں قید ہے؟''

''یہ بات صرف شامین جانتا ہے۔ وہ اب مہا پجاری کا قریبی آدمی ہے۔''

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شامین یہاں موجود تھا اور وہ مہا پجاری یا دوسرے لفظوں میں ڈیوڈ شا کے ساتھ تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو ڈیوڈ شا کے ساتھ ساتھ اس سے حساب برابر کرنے کا موقع مل سکتا تھا مگر سب سے پہلے ہمیں ڈیوڈ شا کی سازش ناکام بنانا تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کو بلوا رہا تھا اور اسے ہر صورت روکنا تھا۔ آرگون میں اگرچہ ہمارا قبضہ ہو گیا تھا مگر آرگون کی اصل فوج باہر تھی اور اگر وہ واپس آجاتی تو ایزارٹ کے لیے چند سو سپاہیوں کے ساتھ ان ہزاروں سپاہیوں کو روکنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد ریناٹ تک رسائی حاصل کر کے اس کا خاتمہ کر دے۔ ایک کانٹے نکلے گا تب ہی وہ دوسرا قدم اٹھا سکے گا۔ ایزارٹ کی طرف سے مجھے مدد کی اُمید نہیں تھی۔ اسی طرح سامیرا کی طرف سے مدد کا آنا محال تھا۔ برف والے کے توسط سے اسے شاید میرے حالات کا علم ہو سکتا تھا مگر وہ خود اس وقت محاصرے کی کیفیت میں تھی۔

گویا یہاں جو کرنا تھا وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو کرنا تھا۔ میں نے سوچ کے اس وقفے کے بعد سوالات کا نیا سلسلہ شروع کیا اب میں اس سے اس عمارت میں موجود ان افراد کے بارے میں پوچھ رہا تھا جن پر اعتبار نہیں تھا اور انہیں خاص طور سے یہاں قید کیا گیا تھا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس نے دس ایسے افراد کی نشان دہی کی جن کے بارے میں حکم تھا کہ انہیں کڑی قید میں رکھا جائے اور انہیں نقل و حرکت کی آزادی نہ دی جائے چاہے دن ہو یا رات ہو۔ وہ عمارت کی سب سے اوپر کی منزل میں قید تھے۔ پوری عمارت کے ایک درجن نگران تھے جو چوبیس گھنٹے کو تین حصوں میں تقسیم کر کے ڈیوٹی دیتے تھے۔ ہر منزل کا ایک نگران تھا اور ان تینوں کا ایک نگران اعلیٰ ہوتا تھا۔ گویا وہ ان کا افسر ہوتا تھا۔ سو افراد میں صرف تین عورتیں تھیں اور یہ سب قیدی تھیں۔ تمام خادمائیں اس وقت معبد میں تھیں۔ جب کہ مرد خادموں کے وہاں داخلے پر پابندی تھی اور وہ اسی عمارت میں تھے۔ یہ ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی کی چالاکی تھی کہ انہوں نے مردوں کی صورت میں خطرے کو دور کر دیا تھا اور اپنے گرد عورتوں کو رکھا تھا جن سے نمٹنا نسبتاً آسان تھا۔ تائرس کے منہ میں دوبارہ کپڑا ٹھونس کر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک طرف آیا۔ میں نے کہا۔

''اب سب سے پہلے ہمیں اس عمارت پر قبضہ کرنا ہے مگر اس طرح سے کہ عمارت سے باہر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔''

ربیک نے سر ہلایا۔ ''اس کے لیے ہمیں ایک ایک کر کے تمام منزلوں پر خاموشی سے قبضہ کرنا ہوگا۔''

''اس کے لیے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ایک درجن نگران کہاں مقیم ہیں؟''

یہ سوال تائرس سے کیا تو اس نے بتایا کہ تمام نگران جن کی ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی وہ نچلی منزل کے مختلف کمروں میں آرام کرتے ہیں۔ میں نے مٹی پر عمارت کا لے آؤٹ اور کمرے بنا کر اس سے پوچھا کہ نگران کن کمروں میں ہیں؟ اس نے نشان دہی کی۔ پھر اس نے اسی پیٹرن پر اوپری منزلوں کا لے آؤٹ اور کمرے بنا کر نشان دہی کی کہ کڑی نگرانی والے قیدی کن کمروں میں تھے۔ ہم دیکھ رہے تھے اور ذہن نشین کر رہے تھے۔ آخر میں تائرس کو خبردار کیا گیا کہ اس کی ایک بات بھی غلط نکلی تو اسے اذیت ناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے ابھی وقت ہے اگر اس نے کوئی غلط بیانی کی ہے تو بتا دے۔ بعد میں معافی نہیں ملے گی۔ اس نے یقین دلایا کہ اس نے ایک لفظ بھی غلط نہیں کہا ہے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے وہیں ایک درخت سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ وہ از خود حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی کسی کو مدد کے لیے پکار سکتا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر ہم عمارت کے اندر آئے جہاں روبیر بے تابی سے ہمارا بلکہ میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی میرا بازو پکڑ لیا۔

''اب میں آپ کے ساتھ رہوں گی مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔''

''تم ایک بہادر لڑکی ہو اور یہ وقت حرکت کا ہے اس لیے اگر کبھی الگ ہو جاؤ تو حوصلہ مت ہارنا۔ جیسے اب ملیں ہیں ایسے ہی آئندہ بھی ملیں گے۔''

''وعدہ کرتے ہیں۔'' اس نے یوں کہا کہ میرے اندر پھر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

''زندگی و موت کی اس جنگ میں میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ دوسرے ہمیں اس عمارت پر قبضہ کرنا ہے اس لیے تم میرے ساتھ ہی رہو گی۔''

وہ فکر مند ہو گئی۔ ''یہاں بہت سے لوگ ہیں صرف

چار افراد کے ساتھ آپ کیسے یہاں قبضہ کریں گے؟''
''تم دیکھتی جاؤ۔'' میں نے کہا۔ وہ چاروں بھی اندر آ گئے تھے۔ مارٹ اور ایمار نے تیر کمان سنبھال لیے تھے جب کہ میں، ایرٹ اور ربیک نے نیزے ہاتھ میں رکھے تھے۔ روبیر کو کمرے میں رکنے کا کہہ کر ہم باہر آئے۔ پلان سادہ تھا کہ ایک ایک کر کے ان لوگوں کو قابو کیا جائے اور باندھ دیا جائے۔ پہلا کمرا روبیر والے کمرے کی قطار میں ایک کمرے کے بعد تھا اور نائرس کے مطابق اس میں دو افراد تھے۔ میں نے دروازہ چیک کیا تو وہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ دونوں نگران بے خبری کی نیند سو رہے تھے اور سر پڑنے والی ضربوں نے ان کی نیند کو بے ہوشی میں بدل دیا تھا۔ صرف ایک کراہا تھا مگر اس کی آواز بھی زیادہ بلند نہیں تھی۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے تھے۔ اگلے کمرے میں موجود نگران اعلیٰ بھی آسانی سے ہمارے قابو میں آ گئے۔ انہیں باندھنے کے بعد ہمارے پاس رسی اب ختم ہونے والی تھی اور ہمیں مزید رسی کی ضرورت تھی۔

اس سے اگلے کمرے میں آخری دو عام نگران تھے جب کہ رات کا نگران اعلیٰ عمارت کے سامنے والے حصے میں دفتر میں موجود تھا۔ نائرس نے بتایا کہ ان تین نگران اعلیٰ کو ہنگامی صورت میں معبد جانے اور مہا پجاری سے رابطہ کرنے کی اجازت تھی۔ ان کے علاوہ کسی کو عمارت سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے عام نگرانوں سے نمٹنے کی ذمے داری ایمار، مارٹ اور ربیک پر چھوڑی اور خود ایرٹ کو لے کر نگران اعلیٰ کے دفتر تک آیا۔ اندر روشنی تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا میں نے اسے دھکیل کر اندر جھانکا اور پھر لاحول پڑھی کیونکہ نگران اعلیٰ ایک عورت کے ساتھ بستر پر مدہوش پڑا ہوا تھا۔ عورت کا اوپری جسم چادر سے باہر تھا اور نگران اعلیٰ کی ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں اس نے غالباً سردی لگنے پر چادر اوپری جسم پر کھینچ لی تھی۔

ہم قریب آئے تو عورت کی چھٹی حس نے اسے چونکایا۔ وہ اٹھی تھی کہ میں نے نیزہ اس کی شفاف گلابی گردن پر رکھ دیا اور وہ ساکت ہو گئی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر بستر سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی عمر زیادہ تھی شاید چالیس کے آس پاس تھی مگر صورت وشکل اور جسمانی لحاظ سے وہ دلکش تھی۔ وہ چادر تلے سے نکلی تو میں نے ایک بار پھر لاحول پڑھی اور اسے ایک طرف پڑا ہوا لباس پہننے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں ایرٹ نے نگران اعلیٰ کے سر سے چادر ہٹائی اور پھر ہم دونوں ہی چونک گئے تھے۔ اس کی دائیں آنکھ میں ایک چھوٹی پینسل نما لکڑی گھسی ہوئی تھی اور اس کی بائیں کھلی آنکھ میں مرنے کے بعد تعجب تھا۔ عورت سمجھی کہ ہم لاش کی طرف متوجہ ہیں اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے بر وقت اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا اور گھماتے ہوئے اس کی گردن اپنے بازو میں یوں دبائی کہ اس کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے ابھی تک لباس نہیں پہنا تھا۔ میں نے ایرٹ کے توسط سے پوچھا۔

''اسے تم نے قتل کیا ہے؟''

میں نے گرفت بس اتنی نرم کی کہ وہ جواب دے سکے اور اس نے کہا۔ ''ہاں اسے میں نے مارا ہے۔''

''اور تم اس کے ساتھ اس حالت میں سو رہی تھیں۔''

''یہ کون سی نئی بات ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ میری گرفت میں آنے کے بعد اس نے مزاحمت ترک کر دی تھی۔ ''میں اس گھٹیا شخص کے ساتھ لاتعداد راتیں سو چکی ہوں۔''

''قتل کی وجہ۔''

''بتایا تو ہے کہ گھٹیا ترین شخص تھا۔ جان بوجھ کر مجھے اذیتیں دیتا تھا۔ اس لیے آج میں نے غصے میں آ کر اسے قتل کر دیا۔ میں نے پہلے سے نہیں سوچا تھا بس آج خیال آیا تو یہ لکڑی اس کی میز سے اٹھا کر اس کی آنکھ میں گھونپ دی۔''

''تم نے اچھا کام کیا ہے اب غور سے سنو۔ ہم باہر سے آئے ہیں ہمارے آدمیوں نے آرگون پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ جلد یہاں بھی آئیں گے۔''

''تم سامیرا کے آدمی ہو...... لیکن یہاں کیسے آئے؟...... سرنگ والا راستہ تو بند ہو گیا ہے۔'' وہ چالاک عورت تھی اور خاصی باخبر تھی۔ مجھے اس کے اعصاب کی مضبوطی پر رشک آیا کہ اس نے جسے قتل کیا تھا اسی کی لاش کے ساتھ سو رہی تھی۔

''ہم جنگل کی طرف سے آئے ہیں۔ سرنگ کا راستہ کھولنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بہرحال جلد یہاں بھی ہمارا قبضہ ہو گا۔''

''تب میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''معاف کرنا میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہوں گا۔''

ایرٹ کو میری بات کا ترجمہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور وہ بے ہوش ہو گئی تو میں نے اسے نگران اعلیٰ کی لاش

برقرار رکھ [illegible] کی ضرورت نہیں تھی اس پر صرف [illegible] واحد کر ام باہر نکل آئے۔ پیچھے کے راہ خاص لوگ ہمارے قابو میں آچکے تھے اب اوپر کے نگرانوں کو قابو کرنا تھا۔ نگرانوں کو قابو کرنے کے بعد ہمیں ان لوگوں کو آزاد کرنا تھا جو شاید یہاں ہونے والی تبدیلیوں کے مخالف تھے۔ مگر ہم فوری ان پر بھی بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا فیصلہ بعد میں کرنا تھا۔ باقی افراد کے لیے طے ہوا کہ انہیں آخری منزل کے عقبی کمروں میں بند کیا جائے گا تاکہ وہ نہ وہاں سے فرار ہوسکیں اور نہ ہی کسی کو متوجہ کر سکیں۔ میں اور ربیک دوسری منزل پر آئے۔ سیڑھیاں نگران اعلیٰ کے دفتر کے پاس سے شروع ہو رہی تھیں۔

ہم دبے قدموں اوپر آئے تھے اور یہاں کے نگران نے ہماری مشکل خود آسان کر دی تھی۔ وہ ایک طرف دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا سو رہا تھا۔ میں نے ربیک کو اس سے نمٹنے کا اشارہ کیا اور خود آخری منزل کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے ہی سیڑھیاں ختم ہوئیں میرا سامنا غیر متوقع طور پر نگران سے ہو گیا۔ میں تو محتاط تھا ہی وہ بھی دبے قدموں چل رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے پاس موجود لاٹھی استعمال کرنے کی کوشش کی۔ سنگی رنگز لیے اس لاٹھی کی ضرب خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ میں نے بروقت جھکائی دی اور اسی طرح جھکے جھکے سر اس کے پیٹ میں مارا۔ لاٹھی کا وار خالی جانے سے اس کا جسم غیر متوازن ہو رہا تھا۔ میں باآسانی اسے دھکیلتا ہوا راہداری تک لایا اور دیوار سے ٹکرا دیا۔

اس نے سنبھل کر اوپر سے میری پشت پر کہنیاں ماریں اور میں نیچے گرا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا میں نے اس کی ٹانگیں کھینچ لیں۔ یہاں جگہ نہیں تھی اور وہ دیوار سے ٹکا ہوا تھا اس لیے گرا نہیں مگر توازن کھو دیا۔ اس کی مزاحمت توڑنے کے لیے میں نے نیچے سے اس کی ٹانگوں کے درمیان مکا مارا اور اس ضرب نے اسے پہلی بار منہ کھولنے پر مجبور کیا۔ اس نے چیخ ماری تھی میں نے اس کی پروا کیے بغیر دوسرا اور پھر تیسرا وار زیادہ قوت سے کیا۔ وہ بھی کراہتا ہوا نیچے ڈھیر ہو گیا۔ اس کی تکلیف ختم کرنے کے لیے میں نے دو بار اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ابھی تک اس کی چیخ کا کہیں سے کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ میں اٹھا اور اس کا کرتہ اتار کر اس کی پٹیاں کرکے اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ربیک نے سیڑھیوں کی طرف سے جھانک کر کہا۔ ”سب ٹھیک ہے نا؟“

”ہاں، اب باقی کمروں کو دیکھنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں اسلحہ خانہ بھی ہوگا وہ ہمارے قبضے میں ہونا چاہیے۔“

ہم نیچے آئے تو ایمار اور روبیر پہلے ہی یہ کام کر چکے تھے۔ اسلحہ نگران اعلیٰ کے کمرے میں ایک الماری میں تھا۔ جب میں دفتر میں داخل ہوا تو روبیر اپنے لیے اسلحہ نکال رہی تھی۔ اس نے تیر کمان اور ایک چھوٹے سائز کی لاٹھی منتخب کی تھی۔ اسے نیزہ استعمال کرنا نہیں آتا تھا مگر وہ اچھی تیر انداز تھی۔ اس نے چادر تلے موجود عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس کا کیا کرنا ہے؟“

”میرا خیال ہے اسے بھی قید کر دیا جائے۔“

روبیر کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ”یہ بہت خراب عورت ہے مردوں سے بہت کھلے انداز میں ملتی ہے۔“

”وہ ابھی یہاں موجود ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایسا کرو تم اسے لباس پہناؤ پھر اسے یہاں سے منتقل کرتے ہیں۔“

روبیر نے سر ہلایا تو میں کمرے سے نکل گیا۔ ایمار، مارٹ اور ایرٹ نگرانوں اور اعلیٰ نگرانوں کو دو کمروں میں منتقل کر دیا تھا جہاں سے وہ نکل نہیں سکتے تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر ابھی ان کے ہاتھ پاؤں بندھے رہنے دیئے گئے تھے۔ نارس کو بھی باہر سے لے آئے تھے اور اسے بھی اس کے ساتھیوں کے ساتھ بند کر دیا۔ اس کے بعد اوپری منزل پر موجود ان دس افراد کو کمروں سے نکالا گیا جن کے بارے میں نگرانوں کو ہدایت تھی کہ ان کی سختی سے نگرانی کی جائے اور ان کے کمرے دن رات بند رہتے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کچھ حیران تھے۔ میں نے ربیک کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ ان سے بات کرے گا اس موقع پر میں ایک اجنبی زبان بول کر اور سربراہ بن کر ان کو بدکانا نہیں چاہتا تھا۔ ربیک نے ان سے کہا۔ ”ہم سامیرا کے لوگ ہیں اور جنگل کی طرف سے یہاں آئے ہیں۔ یہاں باہر سے آنے والے لوگ معبد پر قابض ہو گئے ہیں۔“

ان میں سے ایک جوان آدمی نے سر ہلایا۔ ”ہاں اور یہ بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ مہا پجاری آئی زوران کے ساتھ مل گیا ہے اور جب ہم نے احتجاج کیا تو اس نے ہم سب کو قید کرا دیا۔“

ربیک نے کہا۔ ”تم سب اپنا تعارف کراؤ اور یہاں اپنی حیثیت بھی بتاؤ۔“

وہ تعارف کرانے لگے۔ ان میں سے چھ کا تعلق پجاریوں سے تھا اور جوان آدمی جس کا نام کورن تھا وہ

مہا پجاری کے نائبین میں سے ایک تھا۔ باقی چار افراد یہاں موجود سپاہ کے افسران تھے اور وہ اس بات پر کبیدہ خاطر تھے کہ ان کے آدمیوں کا بے دریغ قتل عام ہوا اور مہا پجاری نے قاتلوں سے دوستی کر لی۔ وہ بھی احتجاج کی وجہ سے معتوب قرار دے کر یہاں قید کیے گئے تھے۔ ربیک نے تعارف کے بعد کہا۔ ''اب تم لوگ فیصلہ کرلو کہ ہمارا ساتھ دینا ہے یا پھر غیر جانبدار رہنا ہے کیونکہ ہم ان غیر لوگوں کا خاتمہ کرنے آئے ہیں جو ہمارے راستے میں آئے گا وہ بھی ہمارا دشمن ہوگا۔ چاہے وہ مہا پجاری کیوں نہ ہو۔''

ربیک کی بات پر کورن کسی قدر مضطرب ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے ربیک کی بات بری لگی تھی مگر اس نے کہا۔ ''آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ بہت خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں جو آگ اگلتے ہیں اور آدمی کے جسم میں سوراخ ہو جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔''

''ہم جانتے ہیں وہ کیسے ہتھیار رکھتے ہیں لیکن تم فکر مت کرو ان سے نمٹنا ہمارا کام ہے۔''

ایک فوجی افسر بولا۔ ''انہوں نے ہمارے درجنوں سپاہی لمحوں میں مار دیے تھے۔ تم چند افراد کیا کرلو گے۔''

ربیک نے بے پروائی سے کہا۔ ''تمہیں کیا معلوم کہ ہم کتنے ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے۔ ہم جنگل سے گزر کر آئے ہیں جو ہارن اور اسمار سے بھرا ہوا ہے۔ کیا کوئی عام دستہ وہاں سے گزر سکتا ہے؟''

فوجی افسر اپنے طنز پر شرمندہ ہو گیا تھا۔ کورن نے کہا۔ ''میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔''

''ضرور کرو۔''

کورن اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ ایک کونے میں چلا گیا اور وہ آپس میں سر جوڑ کر سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ فوجی افسران کسی قدر بے چین تھے۔ ایک فوجی نے کہا۔ ''کیا ہم بھی مشورہ کر سکتے ہیں؟''

ربیک نے میری طرف دیکھا تو میں نے خفیف سا اثبات کا اشارہ کیا اور اس نے انہیں بھی مشورے کی اجازت دے دی۔ جب میرے ساتھی ان لوگوں کو نکال رہے تھے اور نگرانوں کو قید کیا جا رہا تھا تو باقی افراد جو غیر متعلقہ تھے ان کے کمرے باہر سے بند کر دیے گئے تھے تاکہ کوئی نکل کر غیر ضروری مداخلت نہ کرے۔ بے ہوش عورت کو روبیر نے لباس پہنا دیا تھا مگر فی الحال وہ وہیں تھی۔ پجاری اور فوجی افسران روبیر کو ہمارے ساتھ دیکھ کر کسی قدر حیران ہوئے تھے۔ چند منٹ میں پجاری ہماری طرف آئے اور کورن نے کہا۔ ''ہم تمہارے ساتھ ہیں مگر ہم لڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔''

''اگر تم ہمارے ساتھ ہو تو تمہیں لڑنا تو پڑے گا۔'' ربیک نے کہا۔ ''صرف جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے۔''

''وہ ہم کریں گے میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ہم تربیت یافتہ نہیں ہیں۔''

ربیک مجھے لے کر کمرے سے باہر آیا ہم اس وقت اوپری منزل پر تھے۔ ''اب کیا کرنا ہے جناب؟''

''سب سے پہلے یہاں کے لوگوں کو چھانٹنا اور انہیں عقبی سمت والے کمروں میں بند کرنا ہے۔ خطرناک افراد کو اسی منزل پر اور کم خطرناک افراد کو نچلی منزل پر۔'' میں نے منصوبہ سمجھایا اور ربیک فوری حرکت میں آگیا۔ اس نے کمرے میں آکر بتایا کہ کس کس نے کیا کرنا ہے۔ کورن اور فوجی افسران اس لحاظ سے ہمارے لیے کارآمد تھے کہ وہ قیدیوں کے بارے میں بتا سکتے تھے کہ کون ہمارے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔ ویسے میرا ارادہ مزید افراد لینے کا نہیں تھا، یہ دس افراد بھی کافی تھے۔ اوپری منزل پر کل بتیس افراد تھے جن میں سے دس تو یہی تھے۔ باقی بائیس عام خادم تھے۔ ان کو دس دس کر کے دو کمروں میں بند کر دیا۔ اس کے بعد پہلی منزل پر آئے یہاں تیس افراد تھے ان میں سے اٹھارہ افراد کو اوپر پہنچایا گیا اور باقی کو اسی فلور پر عقبی کمروں میں بند کر دیا گیا۔

نیچے کل چوبیس افراد تھے۔ ان میں تین عورتیں بھی تھیں۔ ایک وہی تھی جو نگران اعلیٰ کے ساتھ سو رہی تھی۔ باقی اکیس افراد خدام میں سے تھے انہیں اور باقی عورتوں کو بھی اوپری منزل پر بند کرنے کا حکم دے کر میں دفتر والے کمرے میں آیا تو چونک گیا کیونکہ بے ہوش عورت غائب تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور یہ سامنے والے حصے میں کھلتی تھی۔ میں نے احتیاط سے ادھ کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا تو عورت اپنے سفید لباس کی وجہ سے فوراً ہی نظر میں آگئی۔ وہ جھکی ہوئی پودوں اور درختوں کی آڑ لیتی ہوئی سرنگ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بے خبر تھی کہ سرنگ بند ہے اور شاید وہ فرار ہو کر آرگون جانا چاہتی تھی۔ وہ زیادہ مضبوط نکلی تھی اور اسی وجہ سے اسے جلد ہوش آگیا تھا۔ اس کے پیچھے جانا حماقت ہوتی اس لیے میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ باہر نکلی تھی اور اب مجھے اندازہ ہوتا کہ ڈیوڈ شا نے نگرانی یا حفاظت کے لیے کیا

انتظامات کر رکھے ہیں۔عورت نے باغ کراس کیا اور بھاگتی ہوئی سرنگ کی طرف چلی گئی۔شاید وہ تصدیق کرنے گئی تھی کہ سرنگ بچ تباہ ہوگئی ہے یا کوئی راستہ ہے۔جلد وہ ناکام واپس آتی۔اسی اثنا میں روبیر کمرے میں آئی اور عورت کو غائب اور مجھے کھڑکی کے ساتھ لگے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی۔

''کیا ہوا یہ کہاں گئی؟''اس نے کہتے ہوئے باہر جھانکا۔

''وہ دیکھو۔'' میں نے تاریکی میں غائب ہوتی عورت کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ نے اسے جانے دیا۔''

''فکرمت کرو۔وہ سرنگ میں نہیں جاسکتی ہے سرنگ آگے سے بند ہے۔اسے واپس آنا پڑے گا۔''

روبیر نے سرنگ کی بندش پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا اس کا مطلب تھا کہ کوئی اسے بتا چکا تھا۔یہ جگہ چھوٹی سی تھی اس لیے وہ مجھ سے لگ کر کھڑی تھی۔اس نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا۔''مجھے شاہین کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔وہ یہیں ہے۔''

''آئی زور کے خاص آدمیوں میں شامل ہو گیا ہے۔''

''اگر وہ ہاتھ آیا تو کیا آپ اسے میرے حوالے کریں گے۔''

''یقیناً وہ تمہارا مجرم ہے اور تم اس کے بارے میں فیصلہ کروگی۔''

روبیر نے گہری سانس لی۔''اس شخص کی محبت نے مجھے بہت دکھ دیئے۔میں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔''

اس کی بات سن کر مجھے خیال آیا اور میں نے جھجک کر پوچھا۔''تمہیں لانے والوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی میرا مطلب ہے......''

اس کا رنگ گلابی ہوا تھا اس نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔''نہیں اس حوالے سے میں محفوظ ہوں۔میں اپنی جذباتی کیفیت کی بات کر رہی ہوں۔''

''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔''

وہ میری طرف پلٹ گئی مگر دور نہیں ہوئی تھی بلکہ کچھ اور پاس آگئی تھی۔اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔''صرف ہمدردی؟''

''تم میری ساتھی ہو اور تم سے مجھے انسیت ہے۔انسان اسی سے ہمدردی یا اپنائیت کا اظہار کرتا ہے جسے اپنا سمجھتا ہے۔''

یہاں ایک عدد لاش تھی اور اس کے ساتھ سونے والی عورت یہاں سے فرار ہوگئی تھی۔اگرچہ ہم نے تسلی بخش انداز میں عمارت پر قبضہ کرلیا تھا مگر عورت کے فرار نے کسی قدر مشکل کو بھی جنم دیا تھا۔ان تمام باتوں سے قطع نظر روبیر مجھ سے کسی اور موضوع پر بات کرنا چاہ رہی تھی۔میں اس سے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔مگر یہ آفاقی حقیقت ہے کہ زبان اور رویے سے عورت پہل کرتی ہے اور مرد کو متوجہ کرتی ہے پھر عملی پہل مرد کرتا ہے اور اپنے سر پیش قدمی کی تہمت لیتا ہے۔اس وقت وہ زبان اور رویے سے پہل کر رہی تھی۔اس نے میرے بازوؤں پر ہاتھ رکھ دیئے۔''شہباز میں اندر سے خالی ہوگئی ہوں۔مجھے لگتا ہے میں بالکل اکیلی ہوں اور جب سوچتی ہوں کہ میرا کون ہے تو میرے ذہن میں ایک ہی نام آتا ہے۔''

''کس کا نام؟''میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

''آپ کا نام۔''اس نے کہا اور اس دوران میں اس کی بانہیں میرے گلے تک پہنچ گئی تھیں۔اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔''شہباز میں نے آپ کے ساتھ خود کو ہمیشہ محفوظ سمجھا ہے جب آپ سے دور ہوئی مجھ پر کوئی نہ کوئی آفت آئی۔مجھے خود سے دور مت کیجیے گا۔''

اسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی اور ایرٹ اندر آیا تھا۔میں نے روبیر سے دور ہونا چاہا مگر اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی اور اسی انداز میں مجھ سے لگی رہی۔حالانکہ اسے پتا چل گیا تھا کہ کوئی اندر آیا ہے۔ایرٹ چونکا تھا اور اس کا چہرہ متغیر ہوا تھا۔چند لمحے ساکت رہنے کے بعد وہ تیزی سے واپس چلا گیا۔میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔اگرچہ یہ روبیر کا اپنا فعل تھا مگر ایرٹ مجھے برابر کا شریک سمجھتا اور وہ حق بہ جانب ہوتا میں نے روبیر کو چھوٹ دی تھی۔میں نے آہستہ سے اس کی بانہیں گلے سے الگ کیں اور باہر جھانک کر دیکھا۔میں نے بروقت دیکھا تھا کیونکہ عورت واپس آرہی تھی۔اس نے سرنگ بند پائی ہوگی اور اب وہ باغ کے دوسری طرف سے پودوں اور درختوں کی آڑ لیتی ہوئی معبد کی طرف بڑھ رہی تھی۔اگر میں ذرا تاخیر سے دیکھتا تو پھر اسے پانا مشکل کام ہوتا۔وہ نظروں میں آگئی تھی اس لیے اس کی معمولی لحاتی جھلکیاں بتا رہی تھیں کہ وہ کہاں تھی اور کس طرف بڑھ رہی تھی۔

''یہ کہاں جارہی ہے؟''

''معبد کی طرف اور اب ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ حفاظت کے لیے...کیا گیا ہے۔''

عورت باغ کے ساتھ گھومتی ہوئی معبد کی طرف بڑھ رہی تھی جس کا داخلی راستہ اس قطعے کے عین وسط میں تھا۔ ایک ڈھلان سی اوپر جا رہی تھی اور یہی کوئی دس بارہ فٹ اوپر پہنچ کر اہرام نما معبد میں داخل ہو رہی تھی۔ وہاں تیز روشنی والی مشعلیں لگی تھیں اور سب سے زیادہ روشنی وہیں تھی۔ عورت معبد کے ساتھ آئی تو روش چھوڑ کر دوبارہ باغ میں داخل ہوگئی اور پودوں و درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے لگی۔ اپنی ابتدائی جذباتیت کے بعد روبیر اب شاید شرمندہ ہو رہی تھی اور اس نے کہنا چاہا۔ ''شہباز مجھے معاف کردیں میں......''

''دشش۔'' میں نے کہا میری توجہ پوری عورت کی طرف تھی۔ وہ اب معبد کے داخلی راستے سے کوئی پچاس گز دور تھی۔ وہ یہاں قیدی تھی اس لیے اس کا اہرام میں جانے کا کوئی تک نہیں بنتا تھا۔ صرف ایک صورت تھی کہ وہ ہمارے بارے میں ان لوگوں کو اطلاع دے کر فائدہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اب وہ راستے کے سامنے تھی۔ روش بیس گز سے زیادہ چوڑی تھی۔ یہاں باغ سے باقاعدہ ایک راستہ نکل رہا تھا۔ مگر عورت چھوٹے درخت کی آڑ سے نکل کر روش پر آئی اور مجھے لگا کہ اہرام کے راستے کے عین اوپر سے کوئی شعلہ سا نکلا تھا جو مشعلوں کی تیز روشنی میں غائب ہوگیا۔ دھماکے کی دبی ہوئی آواز ذرا دیر سے آئی اور عورت لہرا کر گری تھی۔ گرتے ہوئے اس کا کرتہ سینے سے رنگین ہو رہا تھا۔ روبیر کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔ اس نے میرا بازو دبوچ لیا۔

''یہ کیا ہوا ہے؟''

''پھندہ جو وہاں لگا ہوا ہے اور عورت اسی کا شکار ہوئی ہے۔'' میری نظر اس جگہ مرکوز تھی جہاں سے شعلہ نکلا تھا۔ وہ داخلی راستے کے اوپر نکلے چھجے کے پیچھے تھی۔ وہاں تک مشعلوں کی روشنی براہِ راست نہیں جا رہی تھی صرف انعکاس وہاں تک پہنچ رہا تھا۔ میں بصارت پر زور دے کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مجھے واضح نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے ربیک کی مدد حاصل کی۔ اسے بلایا اور اسے جگہ کی نشان دہی کر کے کہا۔

''وہاں دیکھو کچھ نظر آ رہا ہے؟''

اس نے کمرے میں جلنے والا لیمپ بجھا دیا اور نظر جما کر دیکھنے لگا کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''وہاں ایک عجیب سی چیز ہے۔ اس میں لمبی سی ڈنڈی نکلی ہے۔ پیچھے والا حصہ چوکور سا ہے اور وہ تین ٹانگوں پر رکھی ہے۔''

میں سمجھ گیا تھا یہ خودکار اسنائپر رائفل تھی جو اپنی حد میں آنے والی ہر حرکت کرتی شے پر فائر کرتی تھی اسے ریموٹ کی مدد سے بھی آپریٹ کیا جاسکتا تھا۔ اس مہم پر آنے سے پہلے ڈیوڈ شا نے مجھے جہاں قید رکھا تھا وہاں نگرانی کے لیے یہی ہتھیار لگایا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے مجھے عقل دی اور میں خود یا اپنے ساتھیوں کو لے کر اس طرف نہیں گیا۔ درحقیقت میں ڈیوڈ شا کی ذہنیت سمجھتا تھا اور سوچ سکتا تھا کہ کس صورتِ حال میں وہ کیا کر سکتا ہے؟ معبد کے احاطے کو خالی پا کر مجھے خدشہ ہوا تھا کہ اس نے کوئی نہ کوئی ٹریپ یا نگرانی کا سسٹم لگایا ہے تب ہی اس جگہ کو خالی چھوڑا ہوا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اس نے صرف داخلی راستے پر ہی یہ ٹریپ لگایا تھا یا اہرام نما معبد کی مزید سمتوں میں بھی یہ ٹریپ تھا۔

میں نے یہ گن دیکھی تھی اور یہ خاصی بھاری ہوتی ہے۔ ڈیوڈ شا کے سامان میں ایک سے زیادہ ایسی رائفلوں کی گنجائش ممکن نہیں تھی۔ لیکن کوئی بھروسا نہیں تھا کہ نیچے اترنے سے پہلے اس نے کمک حاصل کرلی۔ طیارے اس جگہ تک رسائی حاصل کر سکتے تھے اور وہ پیراشوٹ سے کچھ بھی نیچے پہنچا سکتے تھے۔ اس صورت میں وہ زیادہ سامان کے ساتھ بھی نیچے پہنچ سکتا تھا۔ بہرحال عورت کی موت سے ثابت ہوگیا تھا کہ معبد میں داخلے کا مطلب خودکشی بھی ہوسکتا تھا۔ عورت ساکت تھی اور اس کا کرتہ تقریباً پورا ہی سرخ ہو گیا تھا۔ اتنا خون نکلنے کے بعد اس کا زندہ رہنا محال تھا۔ اگر اس میں جان تھی تو بس چند لمحے کی تھی۔ ربیک نے یہ جان کر اطمینان کا سانس لیا کہ ماری جانے والی عورت وہی تھی جو یہاں سے فرار ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اس کا مر جانا ہی بہتر ہے اگر یہ دشمن کے ہاتھ لگتی تو فوراً ہمارے بارے میں بک دیتی۔''

''میرا خیال ہے یہ بکنے کی نیت سے وہاں جا رہی تھی۔''

ربیک نے تجسس سے پوچھا۔ ''یہ کیا چیز ہے جناب، یہ عورت اسی سے مری ہے؟''

''ہاں یہ خود بہ خود حملہ کرنے والا ہتھیار ہے۔ جیسے ہی اس کی حد میں کوئی حرکت کرتی چیز آتی ہے یہ اس پر فائر کر دیتا ہے۔''

ربیک کے حد، حرکت کرتی چیز کی شناخت اور فائر نامانوس چیزیں تھیں اس نے سوالات کرنے چاہے لیکن

میں نے کہا۔ ''جب ہم کامیاب ہوں گے اور یہ ساری چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں گی تو میں تمہیں ٹھیک سے سمجھا سکوں گا کہ یہ کیا چیز ہے؟''

روبیر اس دوران میں باہر جا چکی تھی۔ ربیک نے سر ہلایا اور پھر پوچھا۔ ''یہ ایرٹ کچھ دیر پہلے یہاں آیا تھا اور واپس نکلا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''اس کی وجہ ہے۔''

مجھے ربیک پر پورا اعتماد تھا اور وہ مجھے سمجھتا تھا اس لیے میں نے اسے کسی قدر تفصیل سے روبیر کی کیفیت اور اپنی طرف اس کا جھکاؤ واضح کیا۔ ''وہ اس کیفیت میں ہے کہ میں اسے سختی سے پیچھے نہیں دھکیل سکتا۔ میں اسے سمجھا رہا ہوں۔ وہ خود سے میرے پاس آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایسے وقت ایرٹ نے اتفاق سے دیکھ لیا۔ میں کسی حد تک سمجھ رہا ہوں کہ ایرٹ اسے پسند کرتا ہے شاید اسی وجہ سے اسے دھچکا لگا۔''

ربیک نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھ گیا ہوں جناب۔ ایرٹ کو بھی سمجھا سکتا ہوں لیکن روبیر کو سمجھانا مشکل ہے۔''

''مجھے لگ رہا ہے یہ مشکل کام مجھے ہی کرنا پڑے گا۔''

ربیک آہستہ سے ہنسا۔ ''میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ عورتوں سے دور بھاگتے ہیں۔''

''اس کے باوجود یہ صنف آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی ہے۔'' مجھے کہتے ہوئے زریں کا خیال آیا اس نے بھی زندگی میں میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا شاید زندہ ہوتی تو مجھے بہت مشکل پیش آتی۔ مگر قدرت نے اس کی اور میری مشکل آسان کر دی تھی۔ میں سوچ میں گم تھا کہ ربیک کی آواز پر چونکا۔

''کیا کہہ رہے ہو؟''

''یہی کہ اب کیا کرنا ہے؟''

''اس پر غور کرنا ہوگا۔ اس ہتھیار کے ہوتے ہوئے ہم معبد تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔''

''میں روبیر کی بات کر رہا ہوں۔''

''فی الحال ہمیں دشمن پر توجہ مرکوز رکھنی چاہیے۔'' میں نے ملائمت سے کہا اور لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''اسے ٹھکانے لگاؤ۔ ہمیں شاید کچھ وقت یہاں رہنا پڑے اور یہ کل تک بو دینے لگی۔''

ربیک باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دو فوجی افسران کے ساتھ آیا۔ انہوں نے اسے اسی چادر میں لپیٹا اور اٹھا کر لے گئے۔ کیونکہ زخم اس کی آنکھ میں آیا تھا اس لیے خون بہت کم نکلا تھا اور بستر پر چند ایک دھبے آئے تھے جو روبیر نے کپڑا گیلا کر کے صاف کر دیے۔ اس نے ایک صاف چادر لا کر بستر پر بچھا دی۔ میرا اندازہ تھا کہ رات کے نو بج چکے ہیں۔ اس لحاظ سے خاصا وقت تھا۔ اگر طیارے آج رات آنے تھے تو وہ صبح چھ بجے سے پہلے کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ شاید اسی لیے کرنل جونز نے آج ہی رن وے لائٹس لگائی تھیں۔ اگر طیارے کل رات آنے ہوتے تو یہ لائٹس کل شام میں بھی لگائی جا سکتی تھیں۔ مگر اس عمارت اور معبد کے باہر کسی قسم کی سرگرمی نہیں تھی۔ اس لیے ہمارے لیے ایک موقع تھا کہ کچھ آرام کر لیں اور کھا پی لیں۔ روبیر وہیں موجود تھی اس نے کہا۔ ''آپ آرام کر لیں، بہت دیر سے جاگ رہے ہیں اور مسلسل حرکت میں ہیں۔''

''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' میں نے زرہ بکتر الگ کرتے ہوئے کہا۔ ہتھیار رکھ کر میں بستر پر بیٹھا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں کتنا تھکا ہوا ہوں۔ میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت سے جاگ رہا تھا اور اس دوران میں بس چلتے پھرتے کھا لیا تھا۔ مسلسل جدوجہد اور قتل و غارت گری نے جسم سے زیادہ ذہن کو تھکا دیا تھا اور چوٹوں نے میرے پورے وجود کو درد کے ہلکے سے سمندر میں بدل دیا تھا۔ مجھے چند گھنٹے کی بے ہوشی کی نیند کی ضرورت تھی۔ روبیر کھانے کے لیے کچھ لینے گئی تھی۔ مگر میں لیٹا تو مجھے بے خبر ہونے میں چند منٹ بھی نہیں لگے تھے۔ روبیر آئی تو میں سو چکا تھا۔ اس نے جگانے کے بجائے مجھے سونے دیا اور ایک چادر اوڑھا دی۔ میری آنکھ کھلی تو رات کا دوسرا پہر تھا میرا اندازہ تھا کہ دو یا تین بجے تھے۔ میں شاید پانچ یا چھ گھنٹے سویا تھا اور تھکن اتر چکی تھی مگر پیٹ میں جیسے بل پڑ رہے تھے۔ روبیر کھانے کو جو لائی تھی وہ وہیں میز پر رکھا تھا۔

ٹرے میں وہی کھیر نما میٹھا دلیہ جو یہاں کی عام خوراک تھی ایک بڑے سائز کے پیالے میں خاصی مقدار میں تھا۔ پھل اور پینے کے لیے پھلوں کے رس کی کاک ٹیل تھی۔ میں نے تاخیر کیے بغیر ان سب نعمتوں سے استفادہ شروع کر دیا اور میرا ہاتھ اس وقت رکا جب ٹرے خالی ہو چکی تھی۔ سیری نہیں ہوئی تھی مگر تشنگی مٹ گئی تھی۔ میں نے شربت کا گلاس خالی کیا تھا کہ روبیر اندر آئی۔ اس نے شاید غسل کیا تھا کیونکہ اس کے بال نم ہو رہے تھے اور چہرہ گلاب کی طرح کھلا ہوا تھا۔ پانی یقیناً خاصا سرد تھا کیونکہ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی۔ اس نے خالی ٹرے دیکھ کر

پوچھا۔ ''اور لاؤں...... اتنے میں آپ کا پیٹ نہیں بھرا ہو گا؟''

''نہیں اتنا کافی ہے۔'' میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ ''صاف ستھری ہو رہی ہو۔''

''ہاں جب سے یہاں آئی ہوں مجھے ایک بار بھی نہانے کا موقع نہیں ملا اس لیے ٹھنڈے پانی کے باوجود خود کو روک نہ سکی۔'' اس نے بال گھما کر آگے کرتے ہوئے کہا اور انہیں جھٹک کر خشک کرنے لگی۔ اس کا بدن شاخِ گل کی طرح لچک گیا اور ایسے زاویے میں آ گیا کہ میں نے بے اختیار نظریں چرا لیں۔ پتا نہیں یہ قدرت کی عطا تھی یا آزمائش کہ میری طرف آنے والی تمام ہی عورتیں حسن و جمال کا شاہکار ہوتی تھیں اور آدمی کے لیے ان کی پیش قدمی سے بچنا اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا کہ بارش کے بعد کیچڑ زدہ راستے پر پھسلنے سے بچنا۔ آزمائش میں نے اس لحاظ سے کہا کہ یہ عورتیں محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری طرف آتی تھیں اور آدمی محبت سے لڑ نہیں سکتا ہے۔ ورنہ زینی جیسی ہوس کی ماری عورتوں سے نمٹنا میرے لیے نہایت آسان تھا۔ جنگل میں ہونے والی گھمسان کی جدوجہد نے میرا حلیہ بھی خراب کر دیا تھا۔ اس لیے میں بھی نہانا چاہتا تھا۔ میں نے روبیر سے کہا تو اس نے سر ہلایا۔

''میں سمجھ گئی تھی۔ آپ کے لیے دوسرا لباس بھی نکال دیا ہے۔''

''جب تک میں سوتا رہا حالات میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟''

''نہیں ہم پوری طرح چوکنا تھے اور میں خود نگرانی کرتی رہی جب نہانے گئی تو ایمار کو نگرانی پر لگا دیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس دوران میں کوئی معبد سے باہر نہیں آیا نہ ہی اندر گیا۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اس طرح سے غفلت کی نیند سو جانا اور وہ بھی ایسے حالات میں مناسب نہیں تھا۔ واش روم میں نے دیکھ لیا تھا جہاں نہانے کا مکمل بندوبست تھا۔ اس میں مقامی طرز کا صابن بھی تھا جو بال اور جسم یکساں صاف کرتا تھا۔ مٹی کے پائپوں میں پانی نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ واش روم کی سہولت صرف گراؤنڈ فلور پر تھی۔ شاید یہیں تک پانی پائپوں سے پہنچایا جا سکتا تھا۔ غسل اور دوسری ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد میں باہر آیا تو صاف ستھرا لباس پہن کر میں نے خود کو خاصا بہتر محسوس کیا تھا۔ نہا دھو کر مجھے پھر بھوک لگنے لگی تھی۔ مگر میں پہلے اپنے ساتھیوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ لڑائی کے فیصلہ کن مرحلے سے پہلے یہ ایک وقفہ تھا جس سے میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میرے تھکے ساتھی بھی یقیناً آرام کر رہے تھے اور کھا پی رہے تھے۔ میں نے واش روم سے نکل کر پہلے تینوں منزلوں کا ایک چکر لگایا تھا۔ ربیک نے فوجی افسروں کو ایک ایک کر کے ہر منزل پر گارڈ لگا دیا تھا۔ وہ مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔ کورن سمیت تمام پجاری نچلی منزل کے ایک کمرے میں تھے۔

ربیک اور اس کے ساتھی دو دو کر کے آرام کر رہے تھے۔ پہلے ایمار اور مارٹ نے آرام کیا، اب ربیک اور ایرٹ کر رہے تھے کیونکہ میں نے کوئی حکم نہیں دیا تھا اس لیے انہوں نے آرام کر لیا تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر میں دفتر والے کمرے میں آیا جو فی الحال میرا کمرا بھی تھا۔ وہاں روبیر کھڑکی سے لگی ہوئی جھری سے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹرے میں دوبارہ پھل اور رس لے آئی تھی۔ میں خوش ہو گیا شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ کھانا میرے لیے کافی نہیں ہو گا اس لیے وہ مزید لے آئی تھی۔ میں نے ایک پھل اٹھا کر کھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''وہ اسے لے گئے ہیں اور اب وہاں کی صفائی کر رہے ہیں۔'' روبیر نے اشارہ کیا مگر جب میں دیکھنے کے لیے کھڑکی کے پاس آیا تو اس نے جگہ نہیں دی تھی۔ غالباً وہ چاہتی تھی کہ اس کے پاس آ کر باہر دیکھوں۔ مجبوراً مجھے یہی کرنا پڑا تھا۔ میرے لیے یہ حربے نئے نہیں تھے میں پہلے بھی بارہا ان کا سامنا کر چکا تھا۔ لڑکی کہیں کی بھی ہو اگر وہ کسی سے محبت کرنے لگے اور اسے ہی اپنا سب کچھ سمجھنا شروع کر دے تو اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایسے ہی حربے استعمال کرتی ہے۔ روبیر میں یہ تبدیلی مجھ سے بچھڑنے اور یقیناً شامین کا اصل روپ دیکھنے کے بعد آئی تھی۔ مگر مجھ میں اس کے حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ میرے لیے پہلے کی طرح ایک ساتھی تھی۔ بات کہیں اور نکل گئی۔ میں کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا جہاں نچلے درجے کے پجاریوں کے لباس میں دو افراد اس جگہ پہلے خون کی صفائی کر رہے تھے جہاں کچھ دیر پہلے عورت کی لاش پڑی تھی۔ لاش غائب تھی۔ میں پُرتشویش ہو گیا۔ اگر یہ باہر آئے تھے تو یقیناً احوال جاننے کے لیے وہ یہاں بھی آتے کہ عورت باہر کیسے نکلی۔ میں نے روبیر سے کہا۔

''ایمار کو بلاؤ۔''

وہ گئی اور اسے بلا لائی۔ میں نے روبیر کی مدد سے

اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نگران اعلیٰ کو قید سے نکال لایا۔ ایمار نے اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے اگر وہ زندہ اور سلامت رہنا چاہتا ہے تو۔

اس نے یقین دلایا کہ وہ بالکل زندہ رہنا چاہتا ہے۔

کھڑکی سے نگرانی کرتے ہوئے میں ٹرے کے پھلوں اور رس سے بھی انصاف کرتا رہا تھا اور جب ایک پجاری نے اس طرف کا رخ کیا تو میں اور روبیر واش روم کی طرف آئے۔ نگران اعلیٰ اور ایمار جس نے اب نگران کی وردی پہن لی تھی داخلی دروازے کے پاس تھے۔ مارٹ دفتر میں تھا اور پوری طرح چوکس تھا۔ میں اور روبیر بھی کسی ہنگامی صورتِ حال میں حرکت میں آنے کو تیار تھے۔ آنے والا ایک عام سا اور کسی قدر موٹی توند والا پجاری تھا۔ میں نے یہاں سب سے بے ہنگم جسم والے افراد پجاریوں میں دیکھے تھے۔ کیونکہ وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور شاید چلتے پھرتے بھی بادل ناخواستہ تھے۔ شاہی خاندان کے بعد وہ واحد طبقہ تھا جو بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا ورنہ یہاں پیدل چلنے کا رواج تھا۔ اس نے اندر آتے ہی ایمار سے کرخت لہجے میں رات کے نگران اعلیٰ کے بارے میں پوچھا۔ ”وہ اندر ہیں جناب۔“

ایمار نے کہا تو پجاری اس کی طرف توجہ دیے بغیر کمرے میں پہنچا اور نگران اعلیٰ پر گرجنا برسنا شروع کر دیا کہ وہ کیسے نگرانی کر رہا ہے۔ ایک قیدی عورت یہاں سے نکل کر باہر گئی اور معبد کے باہر ماری گئی۔ نگران اعلیٰ نے فوری ایمار کو طلب کیا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں روبیر قید تھی۔ اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ نگران اعلیٰ نے صفائی پیش کی کہ وہ سخت نگرانی والی قیدی نہیں تھی اس لیے اسے نیچے رکھا گیا اور وہ کھڑکی سے نکل گئی۔ پجاری نے آئی زور کا حکم گوش گزار کیا کہ اب نچلی منزل میں کوئی قیدی نہیں رکھا جائے گا سب کو اوپر منتقل کر دیا جائے۔ شکر ہے اس نے شک نہیں کیا اور نگران اعلیٰ کی سنائی اسٹوری آسانی سے تسلیم کر لی حالانکہ اس نے بہت بھونڈی اداکاری کی تھی۔ مگر لگ رہا تھا کہ پجاری کے سر پر غنیدیا کچھ اور سوار تھا اور وہ بہت عجلت میں دورہ کر کے واپس روانہ ہو گیا۔ واش روم کے پاس سے جاتے ہوئے وہ میرے اتنے پاس سے گزرا کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ اس کے پاس سے وہ مخصوص بو آرہی تھی جو یہاں شراب سے آتی تھی۔ وہ یقیناً پیے ہوئے تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے سکون کا سانس لیا اور روبیر بولی۔

”شکر ہے یہ دفع ہوا۔“

میں نے روبیر سے کہا۔ ”کیا خیال ہے باہر کا ایک چکر نہ لگایا جائے۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”میں بھی باہر جانا چاہتی ہوں قید میں رہ کر میں گھٹ گئی ہوں۔“

ہم اسی کمرے کی کھڑکی سے باہر آئے جہاں روبیر قید تھی۔ اس نے ایک چادر لے لی تھی جو گہرے سرمئی رنگ کی تھی اور اس میں اس کا سفید لباس چھپ گیا تھا۔ ورنہ ہلکی تاریکی میں یہ بہت نمایاں ہوتا۔ مگر گہرے رنگ کی چادر میں اس کا رخ روشن بھی بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ چادر کا کچھ حصہ چہرے پر بھی کر لے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں معبد کے عقبی حصے کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ میرے جسم پر بدستور خاص سپاہیوں والی سرمئی وردی تھی جو نیم تاریکی میں گھل مل جاتی تھی۔ ہم عقبی باغ سے ہوتے ہوئے دیوار تک آئے۔ میں نے روبیر کو وہ جگہ دکھائی جہاں سے ہم آئے تھے اور اس سے پہلے ہارن نے مجھے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی پھر زہریلے کانٹوں والے پرندے بھی نکل آئے تھے اور بس زندگی تھی جو بچ کر میں فصیل کے اس طرف آیا۔ روبیر اگرچہ میرے ساتھ بہت سے مشکل مواقعوں سے گزر چکی تھی مگر یہ سب اس کے لیے بھی حیران کن تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ اتنی مشکلوں سے گزرے اور میں سمجھ رہی تھی کہ میں ہی مشکل میں ہوں۔“

”ہم سب مشکل میں ہیں جب تک ان لوگوں پر قابو نہیں پا لیتے۔“ میں نے معبد کی طرف اشارہ کیا۔ ”تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو کہ وادی کے لوگ اس وقت کتنے سنگین خطرے سے دوچار ہیں۔“

”ڈیوڈ شا یہاں کیوں آیا ہے؟“

”میں نے بتایا نا کہ وہ باہر سے اپنے ساتھیوں کو بلوانا چاہتا ہے۔ وہ اڑنے والی مشین میں بیٹھ کر براہِ راست یہاں پہنچ جائیں گے۔ معبد کا پچھلا حصہ اتنا بڑا ہے کہ وہ مشین آرام سے یہاں اتر سکتی ہے۔ اس میں بیک وقت کئی افراد آسکتے ہیں۔“

”ویسی ہی اڑنے والی مشین جو میرے باپ نے بچپن میں دیکھی تھی جب وادی والے ایک تھے؟“ روبیر نے کہا اس کا اشارہ یقیناً ولیم شا اور راجا عمر دراز کے طیارے کی طرف تھا جو انجن بند ہونے سے اتفاقیہ اس وادی میں آیا تھا

اور انہوں نے اس وادی کو دیکھ لیا تھا اسی طرح وادی کے لوگوں نے بھی اس پُراسرار ہوائی چیز کو دیکھا ہوگا۔ میں نے سر ہلایا۔

''بالکل وہی مشین، پھر اس مشین میں آنے والے چار افراد دوسرے طریقے سے وادی میں اترے تھے اور ان میں سے ایک میرا دوست راجا عمر دراز بھی ہے وہ اس بار بھی آیا ہے۔''

''یہ ڈیوڈ شا پہلے بھی آیا تھا؟''

''نہیں پہلے آنے والا اس کا باپ ولیم شا تھا۔ وہ مر چکا ہے۔ اس کی جگہ ڈیوڈ شا نے لی ہے۔''

گفتگو کے دوران ہم چلتے ہوئے معبد کے عقبی سمت آنکلے تھے مگر اب بھی ہم دیوار کے ساتھ تھے۔ یہاں تاریکی تھی اور کوئی مشعل بھی روشن نہیں تھی۔ مگر سامنے باغ میں جلنے والی مشعلوں کی روشنی کسی قدر یہاں بھی پہنچ رہی تھی۔ میں نے میدان کی طرف اشارہ کیا۔ ''اڑنے والی مشینیں یہاں اتریں گی اور رات میں اترنے کے لیے یہاں روشنیاں لگائی گئی ہیں۔''

''کیسی روشنیاں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''وہ آگ والی روشنی نہیں ہیں بلکہ دوسری طرح کی روشنیاں ہیں۔ انہیں یہاں قطار میں لگا دیا گیا ہے اور جب یہ جلیں گی تو گھپ اندھیرے میں بھی اڑنے والی مشین آرام سے یہاں اتر جائے گی۔''

روبیر تجسس ہوگئی تھی اس نے کہا۔ ''کیا ہم پاس جا کر دیکھیں؟''

میں بھی سوچ رہا تھا اور کسی قدر ہچکچا رہا تھا۔ اس کا امکان تھا کہ یہاں نگرانی کا نظام نہ ہو لیکن وہ ہو بھی سکتا تھا۔ کسی قدر سوچ بچار کے بعد میں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کیا۔ میدانِ جنگ میں ضرورت سے زیادہ احتیاط بھی بعض اوقات شکست کا سبب بن جاتی ہے۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ''تم یہیں رکو۔''

''میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بہرصورت میرے ساتھ چلے گی۔ اگر اس کی جگہ ربیک یا کوئی اور مرد ہوتا تو میرا ایک بار کہنا کافی ہوتا مگر وہ اپنے عورت ہونے اور حسین عورت ہونے کا فائدہ اٹھا رہی تھی جسے یقین تھا کہ اس کے ناز نخرے اٹھائے جائیں گے۔ اس کی ضد مانی جائے گی۔ میں نے گہری سانس لی۔

''چلو لیکن میرے ساتھ رہو گی اور میری مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاؤ گی۔''

''یہی تو میں چاہتی ہوں۔'' اس نے شوخی سے کہا۔ ''ہمیشہ آپ کے ساتھ رہنا اور آپ کی مرضی سے سب کرنا۔''

میں نے اس کا جملہ نظر انداز کر کے آگے قدم بڑھایا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا تھا۔ دور سے دیکھنے پر میرا اندازہ تھا کہ احاطہ پانچ سو گز طویل ہے مگر عملی طور پر اس کے اندر آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یہ چھ یا ساڑھے چھ سو گز طویل ہے اور اس پر کوئی چھوٹا طیارہ جو چھ یا آٹھ نشستوں والا ہو با آسانی اتر سکتا ہے اور پرواز بھی کر سکتا ہے۔ یہاں اتنی جگہ تھی کہ درجن بھر طیارے اتر کر آرام سے پارک ہو سکتے تھے۔ میرے حساب سے ڈیوڈ شا کم سے کم اتنے طیارے تو منگواتا۔ اتنے بڑے طیارے مکمل ایندھن کے ساتھ تین سو میل کے دائرے میں کہیں سے بھی نہ صرف یہاں آسکتے تھے بلکہ واپس بھی جا سکتے تھے۔ پریشرائزڈ کیبن والے طیارے بیس ہزار فٹ کی بلندی پر بھی پرواز کر سکتے تھے۔ اس وادی تک آنے کے لیے طیاروں کو اتنی بلندی پر اڑنا پڑتا۔ جن طیاروں کے کیبن پریشرائزڈ نہیں ہوتے وہ عام طور سے دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر نہیں جاتے ہیں۔ ان کا فلائٹ لیول تین چار ہزار فٹ ہوتا ہے۔

کرنل جونز کی پارٹی انڈیا میں موجود تھی اور اگر نہیں بھی تھی تو چوبیس گھنٹے کے نوٹس پر وہ دنیا کے کسی بھی حصے سے وہاں پہنچ سکتی تھی اس کے بعد یہاں آنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ یونیورسل سولجر قسم کے اعلیٰ تربیت یافتہ کرائے کے سپاہی تھے جن کا کام ہی قتل و غارت گری تھی۔ وہ ڈیوڈ شا کے مقاصد کے لیے نہایت موزوں تھے۔ ان سب امکانات کے بارے میں سوچتے ہوئے میری فکر بڑھ گئی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے ڈیوڈ شا کے عزائم کا درست اندازہ نہیں لگایا تھا میں نے اسے بہت سطحی لیا تھا اور وہ اصل میں کہیں زیادہ بڑے تھے اور وہ اس وادی کے لوگوں کے لیے بھیانک عزائم رکھتا تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہ وادی تک رسائی حاصل کر کے یہاں کے عجائبات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے جیسے وہ معجزہ اثر پتھر جو گہرے سے گہرے زخم بھر کر انسان کو حیرت انگیز قوت مدافعت دیتا ہے۔ اس طرح یہاں اور بھی چیزیں تھیں۔

ڈیوڈ شا صرف انہیں حاصل کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ ان پر مکمل قبضہ چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ وادی پر اپنا جنگی و

سیاسی تسلط قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ طاقت کے بل بوتے پر یہاں کے لوگوں کو اپنا مطیع بنا کر ان پر کوئی پٹھو حکمران مسلط کر دے اور اس کی مدد سے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کرے۔ اس کے آباؤ اجداد نے ایسی ہی پالیسیوں سے دنیا کے بہت بڑے حصے کو اپنا غلام بنالیا تھا اور ایک وقت تھا کہ سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ ان میں کامیاب ہو جاتا تو یہ نہ صرف بدنصیبی ہوتی بلکہ میں اور میرے ساتھی شدید خطرے سے دوچار ہو جاتے تھے۔ ڈیوڈ شا ہم میں سے کسی کو نہیں بخشتا۔ راجا عمر دراز اور اوشا جو فی الحال برف والے کے پاس تھی وہ دونوں بھی محفوظ نہ رہتے۔ ان سب کو بچانے کے لیے ڈیوڈ شا کے عزائم کو ناکام بنانا ضروری تھا۔ اسے قابو کرنا ابھی محال تھا کیونکہ وہ معبد کے محفوظ قلعے میں گھس کر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے وہاں کی حفاظت کا یقینی بندوبست کر رکھا تھا۔

مفروضہ ایک درجن طیاروں میں ستر اسی تربیت یافتہ جنگجو اور جدید ترین بھاری اسلحہ آسکتا تھا۔ ڈیوڈ شا معبد میں بیٹھ کر اسی کمک کا انتظار کر رہا تھا۔ کمک آنے کے بعد وہ حرکت میں آتا اور پہلے معبد پر اپنا قبضہ مستحکم کرتا اور اس کے بعد وہ آرگون کی طرف جاتا۔ جدید ترین آتشیں اسلحے اور اس سے زیادہ سفاکی اور بے رحمی سے لیس ڈیوڈ شا کے آدمیوں کے ہزاروں مقامی جنگجوؤں سے نمٹنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ قتل عام کر سکتے تھے۔ بلکہ ایسا ہی کرتے۔ وہ اپنی طاقت اور دہشت بٹھانے کے لیے ایک بڑا قتل عام ضرور کرتے۔ وہ لڑنے والوں کو مار دیتے تو عام افراد از خود ان کی اطاعت قبول کر لیتے۔ چھوٹے پیمانے پر اس کا تجربہ وہ معبد میں کر چکا تھا جب اس نے سپاہیوں کا قتل عام کرایا اور پجاریوں سمیت باقی افراد اب اس کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔

”کیا سوچ رہے ہیں۔“ روبیر نے مجھے ہلایا۔ میں چونکا۔ خاصی دیر سے میں ایک ہی جگہ ساکت کھڑا ہوا تھا اور خیالات ذہن میں منڈلا رہے تھے۔ ابھی ہم معبد سے کچھ دور تھے۔ میں نے سر جھٹکا۔ ”کچھ نہیں۔“

”تو رک کیوں گئے؟“ اس نے پیچھے سے مجھ سے لگتے ہوئے کہا تو مجھے آگے بڑھنا ہی پڑا تھا۔

”میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کو کیسے ناکام بناؤں؟“

”آپ سوچ لیں گے۔“ اس نے یقین سے کہا۔ ”میں نے دیکھا ہے آپ جس کام کے پیچھے پڑ جائیں اسے کر کے رہتے ہیں۔ آپ کے دشمن ناکام رہیں گے۔“

”ان شاء اللہ۔“ میں نے کہا۔ اب ہم معبد کے عقبی حصے کے کنارے تک آ گئے تھے لیکن وسط سے خاصا دور تھے۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ دیوہیکل عمارت کیسے بنائی گئی ہوگی اور اس کی تعمیر میں کتنے سال لگے ہوں گے۔ مصر کے لوگ فولاد سے ناواقف تھے اور ان کے پاس کانسی جیسی ہلکی اور کمزور دھات تھی جس کی مدد سے انہوں نے اہرام مصر کے لیے پتھر تراشے۔ مگر ان لوگوں کے پاس تو کانسی بھی نہیں تھی پھر انہوں نے اس معبد کے لیے پتھر کیسے تراشے تھے۔ اگر صرف گھسائی سے یہ کام کیا تھا تو یہ اتنا ہی مشکل کام تھا۔ جتنا ایک بچے کا پتھر جمع کر کے کوئی عظیم الشان ڈیم تیار کر لینا۔

اب ہم معبد کے وسطی حصے کے بالکل سامنے تھے۔ یہاں کوئی دو سو گز چوڑا میدان تھا اور اسی میدان میں کرنل جونز نے رن وے والی لائٹس لگائی تھیں۔ میں ان لائٹس کو دیکھنا چاہتا تھا اور اس میں خطرہ تھا۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ”تم یہیں رکو میں ابھی آتا ہوں۔“

اس نے سہمے انداز میں پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہیں؟“

”سامنے تک، تم دیوار کے ساتھ لگ کر رہو اور جب تک میں نہ کہوں یہاں سے حرکت مت کرنا۔“

روبیر بادل ناخواستہ وہیں رکی رہی اور میں جھک کر میدان کی طرف بڑھا۔ یہاں روشنی بہت کم تھی اور زمین پر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے مجھے جھک کر اور غور سے دیکھتے ہوئے چلنا پڑ رہا تھا کہ بے خیالی میں میرا پاؤں کسی لائٹ پر نہ آ جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی لائٹ اپنی جگہ سے ہلی ہوئی پائی جائے اور یہ لوگ چوکنا ہو جائیں۔ جب میں اس جگہ کے نزدیک آیا جہاں میرے خیال میں لائٹس ہونی چاہیے تھیں تو میں پنجوں کے بل بیٹھ گیا اور اسی طرح زمین ٹٹول کر آگے جانے لگا مگر لائٹ مجھے ویسے ہی نظر آ گئی۔ اس کا شیشہ چمکا تو میں نے اسے پہلے ٹٹولا کہ یہ زمین میں نصب تو نہیں ہے مگر وہ صرف رکھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی تار یا کوئی اور چیز بھی منسلک نہیں تھی۔ ورنہ مجھے خوف تھا کہ کوئی ایسی چیز نہ ہو کہ میں اسے اٹھاؤں اور الارم بج جائے۔ اگرچہ جب کرنل جونز اسے لگا رہا تھا تو وہ صرف انہیں زمین پر رکھ رہا تھا اس نے کوئی تار یا کوئی اور چیز منسلک نہیں کی تھی۔

میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ یہ تقریباً تین انچ قطر کی اور ایک ایک انچ موٹی سیاہ رنگ کی گول ڈسک تھی جو نیچے سے پلاسٹک اور اوپر سے شفاف شیشے جیسی پلاسٹک کی تھی اور

اس کے اندر ایل ای ڈیز تھیں جو سرخ رنگ میں جلتی تھیں۔ اس کا وزن پچاس گرام سے زیادہ نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کرنل تقریباً ہر دس گز کے بعد انہیں زمین پر رکھ رہا تھا۔ چار سو گز کی لمبائی میں اس نے چالیس چالیس سو ڈسک رکھی ہوں گی۔ پھر چوڑائی میں دونوں طرف دس دس ڈسک رکھی تھیں۔ گویا اس نے ایسی سو سے زیادہ ڈسک یہاں رکھی تھیں۔ ان کی روشنی سے چھوٹے طیاروں کے لیے بہترین قسم کا نائٹ رن وے بن گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ موقع ہے میں انہیں لے جا کر ضائع کر دوں۔

مگر پھر یہ خیال مسترد کر دیا کیونکہ اس کا بھی امکان تھا کہ ان کے پاس ایسی مزید لائٹ ڈسک ہوں اور وہ دوسری بار مکمل حفاظتی انتظامات کے ساتھ انہیں یہاں لگائیں۔ کرنل نے انہیں سورج غروب ہوتے ہی لگا دیا تھا اس لیے پہلے میرا خیال تھا کہ طیارے آج رات ہی آئیں گے۔ مگر طیارے اب تک نہیں آئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ صبح ہونے میں کچھ ہی وقت باقی رہ گیا تھا۔ شاید پانچ بجے تھے اور یہاں روشنی سات بجے کے آس پاس ہو رہی تھی۔ اب زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ اصولاً تو طیاروں کو پہلے پہر یا زیادہ سے زیادہ دوسرے پہر آ جانا چاہیے تھا۔ اگرچہ صبح نزدیک تھی اور وقت اب بھی تھا لیکن اطمینان سے لینڈنگ کا وقت نہیں تھا۔ پہاڑوں کے اوپر پو پھٹنے کا عمل شروع ہو گیا ہو گا وادی کے کناروں سے دھند اترنا شروع ہو گئی ہو گی۔

رات کے وقت طیاروں کی آمد میں یہی رمز ہو سکتا تھا کہ رات کے وقت آسمان صاف ہوتا ہے اور نیچے دھند نہیں ہوتی ہے۔ طیاروں کو تقریباً چودہ ہزار فٹ کی گہرائی میں اندھے کنویں میں اترنا پڑتا اور یہ بہت بڑا رسک ہوتا۔ باوجود اس کے کہ وادی کا قطر تقریباً تین میل تھا۔ اگر چھوٹے طیارے جو سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے نیچے اتر رہے ہوں تو ان کے لیے معمولی سی غلطی بھی حادثے کا سبب بن جاتی اور پھر کئی طیارے ہوتے تو ان کا آپس میں ٹکرانے کا امکان بھی ہوتا۔ اس لیے رات کے وقت اترنا ہی مناسب تھا۔ جب طیارے اپنی لائٹس کی روشنی میں وادی کی دیواروں کو اور ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

اگر طیارے آج نہ آتے تو مجھے ایک دن کی مہلت اور مل سکتی تھی۔ میں نے ڈسک واپس رکھتے ہوئے دعا کی کہ ایسا ہی ہو مگر ساتھ ہی میں عمل کے لیے بھی تیار تھا۔ میں واپس آیا اور روبیر کے ساتھ واپس عمارت کا رخ کیا۔ میں نے احتیاطاً کھڑکی بھیڑ دی تھی مگر جب ہم واپس آئے تو وہ کھلی ہوئی تھی۔ میں ٹھٹکا اور آس پاس دیکھا۔ مجھے خدشہ ہوا کہ کوئی قیدی یہاں سے نکل تو نہیں گیا ہے۔ میں اندر آیا تو ربیک اور ایرٹ بھی جاگ گئے تھے۔ مگر ایرٹ وہاں نہیں تھا۔ میں نے ربیک سے کھڑکی کا پوچھا اور اس نے لاعلمی ظاہر کی تو اسے تمام قیدیوں کو چیک کرنے کو کہا۔ اس کے ساتھ ہی حکم دیا۔ ”سب تیار ہو جائیں۔“

ربیک چونکا۔ ”کوئی خطرہ ہے؟“

”نہیں لیکن ہو سکتا ہے۔“ میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ راہداری میں آتے ہی مجھے اسی کمرے سے ایرٹ نکلتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور پھر جیسے جھینپ گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”تم کہاں تھے؟“

”میں کمرے میں دیکھنے گیا تھا کہ آپ لوگ آئے یا نہیں۔“ اس نے جھوٹ کہا۔ اسے جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا اس لیے لہجہ صاف چغلی کھا رہا تھا۔ وہ کمرے میں نہیں بلکہ میرے اور روبیر کے پیچھے گیا تھا اور چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ ہماری واپسی اتنی تیزی سے ہوئی کہ اسے اندر آنے کا موقع نہیں ملا تھا اور وہ ہمارے پیچھے آتے ہوئے بے خیالی میں کھڑکی کھلی چھوڑ آیا تھا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ روبیر کے پیچھے تھا اور روبیر میرے پیچھے تھی۔ میں کسی کے پیچھے نہیں تھا مگر ایک بلاوجہ کی تکون میں پھنسا ہوا تھا۔ میں نے اس کی بات تسلیم کی اور اسے بھی تیار ہونے کو کہا۔ میرا ارادہ تھا کہ ربیک اور ایرٹ کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ایمار اور مارٹ یہیں رہیں گے۔ میں فی الحال پجاریوں اور فوجی افسران پر پورا اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ ربیک چیک کر کے آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ قیدی پورے ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کھڑکی کس طرح کھلی رہ گئی تھی۔ اس لیے میں نے بے پروائی سے کہا۔

”شاید میں ہی کھلی چھوڑ گیا ہوں گا۔“

ایمار اور مارٹ کو پتا چلا تو انہوں نے بھی ساتھ چلنے کو کہا میں نے انکار کیا۔ ”یہاں کسی کا رہنا ضروری ہے۔“

”مارٹ اور روبیر رہ سکتے ہیں۔“ ایمار نے جلدی سے کہا۔

”میں کیوں تم بھی رہ سکتے ہو۔“ مارٹ نے کہا لیکن مجھے ایمار کی تجویز اچھی لگی تھی۔ روبیر کا لباس سفید تھا۔ وہ کسی عملی صورت حال میں چادر اوڑھ کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے ایمار کو لے جانا مناسب سمجھا۔ لہجہ میں نے ایسا رکھا کہ اس کے بعد کسی نے اعتراض کی جرأت نہیں کی۔ ہم پوری طرح تیار ہو کر کھڑکی سے باہر نکلے۔ قتل ہونے والے

نگران کی لاش کچھ ہی دور زمین میں گڑھا کھود کے دفنا دی گئی تھی۔ زمین کھدی ہوئی صاف نظر آرہی تھی پہلے اس جگہ گھاس تھی۔ یہ ان فوجی افسران کی غلطی تھی انہیں لاش ایسی جگہ دفنانی چاہیے تھی جہاں پہلے سے زمین خالی ہو۔ یہاں تو صاف پتا چل رہا تھا۔ میں نے ربیک سے کہا۔ ''واپس آنے کے بعد اس پر کچھ گھاس وغیرہ لگا دینا تاکہ تازہ کھدی ہوئی نہ لگے۔''

ربیک نے سر ہلایا اور پوچھا۔ ''خطرہ کیا ہے جناب؟''

''میں نے بتایا تھا کہ ڈیوڈ شا باہر سے کمک منگوا رہا ہے۔ شاید وہ کمک ابھی آجائے اور ہمیں اس سے نمٹنے کے لیے تیار چاہیے۔''

اگرچہ یہ تو میرے ذہن میں بھی واضح نہیں تھا کہ ابھی طیارے آگئے تو میں ان کو روکنے کے لیے کیا کرسکوں گا۔ مجھے سوچنے کے لیے مہلت درکار تھی اس لیے میں چاہ رہا تھا کہ طیارے آج نہ آئیں۔ لیکن میرے چاہنے سے سب کچھ نہیں ہوتا اگر طیارے آجاتے تو انہیں لینڈنگ سے روکنے کے لیے مجھ سے جو ہوتا میں کر گزرتا۔ اسی سوچ کے ساتھ میں باغ کے عقبی حصے تک آیا اور ہم نے یہاں درختوں کے پیچھے مورچے لگا لیے تھے۔ یہ لازمی تھا کہ طیاروں کی آمد سے پہلے ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی باہر آتی۔ طیارے ان کی مدد کے بغیر لینڈ نہیں کرسکتے تھے۔ اس صورت میں ہمارا نشانہ وہ ہوتے۔ مجھے اپنے ساتھیوں کے حوصلے اور بہادری پر ذرا بھی شک نہیں تھا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں انہوں نے جس طرح سے دشمن کو زیر کیا تھا اور میرا ساتھ دیا تھا وہ صرف بے خوف لوگوں کا کام ہی ہوسکتا تھا مگر دوسری طرف ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھی جدید ترین اسلحے سے لیس تھے۔

منطقی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہمارا ان سے کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ دوسری طرف یہ بھی آفاقی حقیقت ہے کہ اگر صرف منطق کو مدنظر رکھا جاتا تو نوے فیصد جنگیں سرے سے نہ ہوتیں۔ کیونکہ متحارب فوجوں میں توازن نہیں تھا۔ میں نے مارٹ سے کہا تھا کہ کسی غیر معمولی صورت حال میں ہمیں متوجہ کرنے کے لیے کھڑکی سے مشعل کی مدد سے اشارہ کرے۔ ربیک کی ڈیوٹی تھی کہ وہ عمارت کے عقبی حصے پر بھی نظر رکھے اور اگر کوئی اشارہ نظر آئے تو مجھے خبردار کرے۔ ہمیں باغ میں آئے ہوئے نصف گھنٹا ہی ہوا تھا اور اوپر آسمان پر ستارے غائب ہوگئے تھے۔ وادی کے اوپری حصے میں دھند چھانا شروع ہوگئی تھی اور مشکل سے نصف گھنٹے میں یہ دھند نیچے تک پہنچ جاتی۔ اچانک ربیک نے کہا۔ ''جناب عمارت کی طرف سے اشارہ مل رہا ہے۔''

میں نے دیکھا کہ کھڑکی سے مشعل نکلی ہوئی تھی اور وہ لہرا رہی تھی۔ میں نے ان سب کو اسی جگہ رکنے کو کہا اور خود تیزی سے عمارت تک آیا۔ اشارہ کرنے والی روبیر تھی اور خاصی بے تاب تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''سامنے والے حصے میں کچھ لوگ باہر آئے ہیں۔''

میں کھڑکی سے اندر گھسا اور روبیر کے ساتھ اوپری منزل کے ایک کمرے میں آیا جس کی کھڑکی عین وسطی باغ اور معبد کے سامنے کھل رہی تھی۔ دفتر کی کھڑکی کے بجائے اب اسے آبزرویشن پوسٹ بنا لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ پجاریوں کے لباس میں کوئی ایک درجن افراد باہر آئے تھے ان کے ساتھ ایک درجن ہی عورتیں یا لڑکیاں تھیں۔ پجاری ترتیب سے اپنا منہ اہرام کی طرف کرکے کھڑے ہوگئے اور خادمائیں ان کے پیچھے تھیں۔ میں نے مارٹ اور روبیر سے پوچھا۔ ''یہ کیا کررہے ہیں؟''

مگر وہ دونوں ہی ناواقف تھے۔ بہرحال پجاریوں کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی مذہبی رسم ادا کررہے ہیں جو شاید اسی وقت ادا کی جاتی ہوگی۔ کیونکہ وہ اس وقت تک ساکت کھڑے رہے جب تک دن کی روشنی نمودار نہیں ہونے لگی تھی۔ صبح کے تقریباً چھ بجے تھے۔ وادی کے اوپر ہمالیہ پر سورج نکل آیا ہوگا مگر یہاں صرف ہلکی سی روشنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی باغ میں موجود مشعلیں بجھائی جانے لگیں۔ یہ کام خادمائیں کررہی تھیں۔ وہ قافلے کی صورت میں چلتی ہوئی ایک مشعل تک جاتیں اور اسے بجھا کر دوسری مشعل کی طرف جاتی تھیں۔ وہاں جلنے والی مشعلوں کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی اور ان سب کو بجھانے میں شاید آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت لگتا۔ پجاری اندر جا چکے تھے۔ ان میں سب سے آگے ایک عمر رسیدہ اور کسی قدر دبلا سا آدمی تھا۔ شاید وہی آئی زور تھا۔ روبیر نے بھی اسے نہیں دیکھا تھا البتہ اس نے تصدیق کی کہ ان میں شامین نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ خادماؤں نے بالکل سفید رنگ کا حریری سا لبادہ پہنا ہوا تھا۔ جوان کے جسم کے تناسب پر یوں ڈھلک رہا تھا کہ اگر جسم چھپا رہا تھا تو ساتھ ہی جسمانی ساخت نمایاں بھی کررہا تھا۔ کمر سے یہ کسی قدر تنگ تھا اور پیروں کے پاس آکر فراک کی طرح پھیل رہا تھا۔ میں غور کررہا تھا کہ روبیر نے بے چین ہوکر پوچھا۔

''اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟''

"میں سوچ رہا ہوں کہ ان خادماؤں نے جیسا لباس پہنا ہوا ہے کیا ایسا یہاں سے مل سکتا ہے۔"
مارٹ چونکا۔ "بالکل مل سکتا ہے، لیکن اس کا کیا کریں گے؟"
میں نے روبیر کی طرف دیکھا۔ "اگر تمہیں ایسا لبادہ پہنا دیا جائے تو تم ان خادماؤں جیسی ہو جاؤ گی۔"
"ہاں۔" اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ "کیا میں اس لباس میں زیادہ اچھی لگوں گی؟"
میں نے اصل افادیت واضح کی۔ "اس طرح تم آزادی سے باہر گھوم سکو گی اور معبد میں بھی جا سکو گی۔"
اب روبیر سمجھ گئی۔ اس نے سر ہلایا۔ "ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ایسا کروں؟"
"میں نہیں چاہتا کہ تمہیں خطرے میں بھیجوں لیکن ہمیں معبد کے اندر کے حالات کا علم ہونا چاہیے۔" میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ "ہم سب ایک مقصد کے تحت یہاں ہیں اور اپنی مرضی سے ہیں۔"
روبیر نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ "میری وہی مرضی ہوگی جو آپ کی ہے۔"
"اگر تم میری مرضی پوچھو گی تو میں کہوں گا کہ مت جاؤ۔ میں کسی ایسے فرد کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا جسے میں اپنا سمجھتا ہوں۔"
"میں جاؤں گی۔" روبیر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور مارٹ کی طرف دیکھا۔ "ایسا لباس کہاں ہے؟"
"یہاں ایک کمرے میں کپڑے ہیں۔" مارٹ بولا۔
"مجھے دکھاؤ۔" روبیر نے کہا تو میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔
"اتنی عجلت مت کرو اچھی طرح سوچ لو۔"
"میں نے سوچ لیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وقت نہیں ہے کیونکہ خادمائیں کچھ دیر میں اندر چلی جائیں گی۔ یہی وقت ہے کہ میں ان میں شامل ہو جاؤں۔"
میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ روبیر مارٹ کے ساتھ چلی گئی۔ باہر تقریباً نصف مشعلیں بجھا دی گئی تھیں اور باقی بجھانے کا عمل جاری تھا۔ نہ جانے کیوں خادمائیں یہ کام الگ الگ ہو کر نہیں کر رہی تھیں۔ ان کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ تھی اور الگ الگ وہ یہ کام مشکل سے تین منٹ میں کر سکتی تھیں مگر اس طرح باجماعت کام کرنے سے دیر لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس طرح جب تک وہ ساری مشعلیں بجھاتیں تو دن کی روشنی اتنی ضرور ہو جاتی کہ آس پاس صاف نظر آنے لگتا۔ اب اس کا امکان باقی نہیں رہا تھا کہ طیارے یہاں آئیں کیونکہ دھند تیزی سے نیچے آ رہی تھی۔ کسی حد تک اوپر کا منظر دھندلا گیا تھا۔ میں نے سوچا اور واپس آ کر کھڑکی سے ربیک کو واپسی کا اشارہ کیا۔ وہ سب چند منٹ میں اندر آ چکے تھے۔ میں نے انہیں روبیر کے جانے کے بارے میں بتایا تو ایرٹ فکر مند ہو گیا۔
"یہ ٹھیک نہیں ہوگا جناب اسے وہاں بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ شامین بھی وہیں ہے۔"
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں خطرہ تو مول لینا ہے۔"
"روبیر کو خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایرٹ کا لہجہ کسی قدر تیز ہو گیا۔ "اس کے لیے ہم ہیں نا۔"
ربیک نے اس کی طرف دیکھا۔ "مگر جو کام روبیر کر سکتی ہے وہ میں یا تم نہیں کر سکتے۔"
"ہمیں معبد کے اندرونی حالات کا علم ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ویسے میں نے روبیر کو خود فیصلہ کرنے کو کہا ہے اور وہ رضاکارانہ طور پر جا رہی ہے۔"
"آپ کے چاہنے پر وہ آنکھ بند کر کے آگ میں بھی چھلانگ لگا دے گی۔" ایرٹ نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ اسے روک سکتے ہیں۔"
"وہ فیصلہ کر چکی ہے اور میرا نہیں خیال کہ میں اسے حکم دوں تو وہ رک جائے گی۔"
"شہباز ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" روبیر کمرے میں آتے ہوئے بولی۔ اس نے خادماؤں جیسا حریری لبادہ پہن لیا تھا۔ یہ ریشم جیسا نرم اور ڈھلک جانے والا کپڑا تھا۔ اس لیے ڈھیلا ہونے کے باوجود اس میں روبیر کا جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ "یہ ہماری جنگ ہے۔"
"لیکن......" ایرٹ نے کہنا چاہا۔
"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" روبیر بولی۔ "میں فیصلہ کر چکی ہوں اور میں ضرور جاؤں گی۔"
"وہاں تمہارے لیے خطرہ ہے۔" ایرٹ تیز لہجے میں بولا۔ "اگر تمہیں پہچان لیا گیا تو......"
"تو کچھ بھی نہیں۔" روبیر نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ مجھے سزائے موت نہیں دیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ میں فرار ہو کر وہاں آئی ہوں اور مجھے دوبارہ یہاں پہنچا دیا جائے گا اور نگرانوں کو جھاڑ پڑے گی۔"
"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ اسے ہمارا جاسوس سمجھ کر اس پر تشدد کریں۔" ایرٹ کی مزاحمت جاری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میں نے فیصلہ نہیں کیا تو میری حیثیت اور ساکھ متاثر ہوگی۔ میں نے کہا۔

"ایرٹ تم جذباتی ہو رہے ہو، اس وقت صرف روبیر نہیں ہم سب اور پوری وادی خطرے میں ہے۔ بچیں گے تو سب بچیں گے ورنہ سب مارے جائیں گے۔ ایسے موقع پر ہر فرد کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔ نہ کہ کسی دوسرے کو فرض ادا کرنے سے روکا جائے۔"

ایرٹ پھر ہونٹ کاٹنے لگا اور پھر سر جھکا کر کمرے سے چلا گیا۔ سب خاموش تھے اور یہ خاموشی بوجھل لگ رہی تھی۔ میں نے اسے توڑتے ہوئے روبیر سے کہا۔ "سامنے سے جانا مناسب نہیں ہوگا۔"

"میں پیچھے کھڑکی سے نکلوں گی۔" اس نے کہا۔

مارٹ جو کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا اس نے کہا۔

"اب وہ اسی طرف آرہی ہیں۔"

خادماؤں نے باغ کی بیشتر مشعلیں بجھادی تھیں اور اب اس عمارت کے سامنے اور کسی قدر دائیں طرف موجود مشعلیں باقی رہ گئی تھیں۔ میں روبیر کے ساتھ تھا۔ ہم کھڑکی سے باہر آئے اور گھوم کر عمارت کے دائیں پہلو پہنچ گئے۔ یہاں فی الحال تاریکی تھی۔ ذرا آگے پھولدار پودوں کا ایک تختہ تھا۔ ہم جھکے ہوئے اس تک آئے اور اس کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ یہاں سے روش کوئی دس قدم کے فاصلے پر تھی اور پندرہ یا بیس فٹ چوڑی روش کے پار باغ شروع ہو رہا تھا۔ روبیر کو یہ بیس پچیس مشکل قدم طے کرنا تھے ایک بار وہ باغ میں داخل ہو جاتی تو پھر آسانی سے خادماؤں میں شامل ہو جاتی۔ وہ اس وقت عمارت کے سامنے سے مشعلیں بجھاتی اس طرف آرہی تھیں۔ مشکل سے دس بارہ مشعلیں رہ گئی تھیں۔ روبیر جو میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ اچانک اس نے گھوم کر اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ میں شاید اسے دھکیل دیتا مگر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں نے مجھے روک دیا۔ وہ رو رہی تھی۔ پھر بھرائے لہجے میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے مجھے کبھی آپ کی محبت نہیں ملے گی۔ آپ کبھی مجھے محبوبہ کا درجہ نہیں دیں گے۔ مگر مجھے آپ سے محبت ہے۔"

"روبیر......" میں نے کہنا چاہا مگر اس نے میرے ہونٹوں پر اپنا نازک ہاتھ رکھ دیا۔

"کچھ مت کہیں کوئی وضاحت نہ دیں۔ میں سمجھتی ہوں۔ قصوروار آپ نہیں میں ہوں۔" اس نے کہا اور حسرت سے مجھے دیکھا۔ "شہباز آپ مجھے یاد رکھیں گے نا؟"

"میں کبھی تمہیں بھول سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"بس میں یہی چاہتی ہوں آپ سے۔" اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا یا... کچھ کہتا وہ اچانک اٹھ کر سبک قدموں سے باغ کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے ہوا کے جھونکے کی طرح روش پار کی اور میں صرف دعا کر کے رہ گیا کہ اگر ڈیوڈ شا کا نگرانی کا نظام یہاں تک رسائی رکھتا بھی تھا تو اس وقت وہ اسے نہ دیکھ سکے۔ خادمائیں مشعلیں بجھاتی ہوئی اسی طرف آرہی تھیں۔ انہوں نے روبیر کو باغ میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ روبیر نے عجلت کی تھی شاید وہ جذباتی ہو رہی تھی اور مزید میرے پاس نہیں رکنا چاہتی تھی۔ چند منٹ بعد خادماؤں نے آخری مشعل بھی بجھائی تو اس کے بعد وہ بکھر گئیں۔ یہ وقت روبیر کے لیے زیادہ موزوں تھا کہ وہ ان میں شامل ہو جاتی۔ بہرحال وہ جا چکی تھی۔ خادمائیں کچھ دیر باغ میں چہل قدمی اور آپس میں چہلیں کرتی رہیں روبیر کے اضافے کا انہیں پتا نہیں چلا تھا۔ ان میں کچھ ٹولیوں کی صورت میں تھیں اور کچھ الگ تھیں۔

ٹولیوں والی آپس میں ہنس بول رہی تھیں اور ان پر بہ ظاہر حالات کا کوئی اثر نظر نہیں آرہا تھا شاید اس لیے کہ ان کے آقا پجاری ہوں یا کوئی اور، انہیں بہرصورت ان کی خدمت کرنا تھی۔ پھر وہ اندر جانے لگیں اور ان کے درمیان روبیر کو دیکھ لینا مشکل تھا کیونکہ وہ سب ایک جیسے لباس میں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ پھر وہ سب سمٹ کر معبد کے داخلی دروازے کے اندر چلی گئیں۔ روبیر کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ ہجوم کے درمیان میں رہے۔ روشنی تیز ہو رہی تھی اور مناسب یہی تھا کہ میں اب اندر چلا جاؤں۔ ممکن ہے خادماؤں کے بعد یہاں کوئی اور نکل آئے۔ میں لیٹے لیٹے پیچھے سرکا اور عمارت کی آڑ میں آکر اٹھا۔ کھڑکی سے اندر آیا۔ وہ سب اوپری کمرے میں تھے اور ان کے چہرے اداس تھے۔ خاص طور سے ایرٹ زیادہ اداس تھا۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ "روبیر محفوظ رہے گی۔"

ربیک نے کہا۔ "میں نے نارس سے معلوم کیا ہے۔ شام کے وقت بھی خادمائیں مشعلیں جلائیں گی۔"

"تب تک روبیر اندر کے حالات جان لے گی اور اسی طرح واپس آجائے گی۔"

یہ سن کر ایرٹ کے چہرے پر ذرا رونق آئی تھی۔ ایمار اور مارٹ آرام کرنے لگ گئے۔ فوجی افسران بھی اب آرام کر رہے تھے اور ان کی جگہ پجاری نگرانی کا فرض انجام دے رہے تھے۔ میں نے ایرٹ اور ربیک کو روک لیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آنے والی رات فیصلہ کن ہے اور ہمیں رات سے پہلے پہلے ایک قابلِ عمل منصوبہ تیار کر لینا ہے۔''

''آپ جو حکم دیں۔'' ربیک نے مستعدی سے کہا۔

''ہم چار افراد کیا کر سکیں گے؟'' ایرٹ نے بجھے انداز میں پوچھا۔

''تم بھول رہے ہو ہم چار افراد اب تک بہت کچھ کرتے آئے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''دوسری طرف بھی اصل میں چار ہی لوگ ہیں اور ہمیں ان ہی سے نمٹنا ہے۔''

ربیک نے ایرٹ کو گھورا تو اس نے جھرجھری سی لی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ بھی چار ہیں۔''

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہوگا۔ کل رات کے تجربے سے یہ تو میرے علم میں آگیا تھا کہ معبد کے عقبی حصے میں نگرانی نہیں کی جارہی تھی۔ ہمیں اسی سے فائدہ اٹھانا تھا۔ لیکن کیسے؟ یہ طے ہونا باقی تھا۔ ایک چیز میں نے سوچ لی تھی کہ طیارے یا طیاروں کو کسی صورت یہاں اترنے نہیں دینا ہے کیونکہ ایک طیارے کی آمد کا مطلب بھی ہوگا ڈیوڈ شا کی طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ میں نے انہیں اپنے اوّل فیصلے سے آگاہ کیا تو ربیک نے سوال کیا۔ ''یہ چیز کس طرح کی ہوتی ہے اور ہم اسے کس طرح روک سکتے ہیں۔''

میں نے پہلے زبانی اور پھر ایک خالی کمرے کی دیوار پر سفید چاک نما پتھر سے طیارے کی تصویر بنا کر دکھائی۔ پھر اس کے مختلف حصوں کے بارے میں وضاحت کرنے لگا کہ وہ کیا کام کرتے تھے۔ ان کے لیے یہ دیومالائی شے تھی۔ مگر میں نے واضح کیا کہ اس میں کچھ بھی دیومالائی نہیں ہے یہ وادی میں بننے والے مختلف استعمال کی چیزوں کی طرح ایک مکمل انسانی تخلیق ہے اور اس کے پیچھے منطق کام کرتی ہے۔ وہ اس کی رفتار کا اندازہ نہیں کر پا رہے تھے کیونکہ یہاں پرندے کم تھے اور جو تھے وہ اتنی تیزی سے نہیں اڑتے تھے۔ کچھ تو سرے سے نہیں اڑتے تھے جیسے زہریلے کانٹوں والا پرندہ۔

''یہ جتنی مضبوط ہوتی ہے اتنی ہی آسانی سے تباہ بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی پرواز اور زمین پر اترنا سب توازن کا کام ہے۔ جیسے تم لوگ کسی پتلی سی لکڑی پر چلنے کی کوشش کرو تو توازن رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی رفتار کی وجہ سے حادثہ پیش آنے کی صورت میں تباہی اور اس میں سوار افراد کی ہلاکت تقریباً یقینی ہوتی ہے۔''

ایرٹ نے کہا۔ ''اگر ہم کوئی ایسا بندوبست کریں کہ یہ زمین پر اتر نہ پائیں تو......''

''بالکل ہمیں یہی کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کے خاتمے سے زیادہ ضروری یہ کام ہے۔ ایک بار وہ ناکام ہو جائے تو اس کے حوصلے خود پست ہو جائیں گے اور تب ہم اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

ربیک نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا، اصل کام باہر سے مدد آنے سے روکنا ہے۔''

میرے ساتھی رفتہ رفتہ معاملے کی نزاکت سے باخبر ہو رہے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے انہیں آتشیں ہتھیاروں اور بم کی ساخت کے بارے میں بتایا کہ یہ کس طرح کام کرتے اور نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ حیران رہ گئے کیونکہ دونوں چیزوں کی منطق بہت آسان اور سمجھ میں آنے والی تھی۔ البتہ وہ بارودی مواد کی نوعیت نہیں سمجھ سکے تھے۔ مگر وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ ہمارے ہتھیار اور حفاظتی انتظامات ان کے خلاف بیکار تھے۔ میں اب سوچ میں مصروف تھا۔ ان لوگوں سے بات کرتے اور طیارے کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ رن وے ناکارہ کرنے کا آسان طریقہ تو یہ کہ کسی طرح لائٹس آن نہ ہونے دی جائیں مگر مسئلہ وہی تھا کہ یہ ریموٹ سے آن ہونے والی لائٹس تھیں اور اگر میں موجودہ لائٹس اٹھا لیتا یا تباہ کر دیتا تب بھی اس کا امکان تھا کہ ان کے پاس اضافی لائٹس ہوں۔

اس میں زیادہ خطرہ یہ تھا کہ یہاں ہماری موجودگی کا راز فاش ہو جاتا اور فی الحال میری کامیابی تھی کہ ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی میری آمد سے بے خبر تھی۔ غور کرتے ہوئے اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں نے ربیک سے کہا۔ ''یہاں بڑی رسیاں ہیں؟''

''بالکل ہیں جناب۔'' ربیک نے کہا۔ ''کیا لے کر آؤں؟''

''ہاں لے آؤ جتنی بھی ہیں سب لے آؤ۔''

ربیک ایمار کے ساتھ گیا اور کچھ دیر رسیوں کے کئی بنڈل لے آیا۔ میں نے ایک بنڈل لے کر دیکھا۔ اس میں شاید دو سو فٹ رسی تھی۔ باقی بنڈل اس سے چھوٹے

تھے۔ رسی پون انچ موٹی اور متعدد چھوٹی ڈوریوں کو بانٹ کر بنائی گئی تھی۔ یہ اتنی مضبوط تھی کہ ہارن جیسا طاقتور جانور بھی اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔ رسی سفیدی مائل سرمئی رنگ کی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہاں سیاہ رنگ ہوگا۔ یہ لازمی چاہیے۔ کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے رسی کا رنگ سیاہ ہو جائے۔''

''میں معلوم کرتا ہوں۔'' ربیک نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ ایرٹ متجسس تھا۔ اس نے پوچھا۔

''آپ کیا کرنا چاہتے ہیں جناب؟''

''تم نے کہا تھا کہ کچھ ایسا... کرنا چاہیے کہ طیارے زمین پر نہ اترنے پائیں تو میں اسی کی کوشش کرنے جا رہا ہوں۔''

ربیک کچھ دیر بعد آیا۔ اس نے بتایا۔ ''یہاں ان لوگوں کے پاس وہ سفوف ہے جسے پانی میں گھول کر بالوں میں لگاتے ہیں تو سفید بالوں کا رنگ سیاہ ہو جاتا۔''

''وہی لے آؤ۔ بلکہ یہ رسیاں لے جاؤ اور سفوف کا محلول بنا کر اس میں ڈبو۔ جب رنگ اچھی طرح چڑھ جائے تو رسیاں نکال کر کہیں لٹکا دینا کہ پانی نکل جائے۔ یہ کام جتنی جلدی ہو اتنا اچھا ہے۔''

ربیک اور ایمار رسی کے بنڈل لے کر چلے گئے۔ ایرٹ اور مارٹ عمارت کا چکر لگانے چلے گئے۔ میں نے کھڑکی کی جھری سے باہر جھانکا جہاں روشنی تقریباً مکمل ہو گئی تھی اور معبد کے سامنے والا باغ اور احاطہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ جیسا کہ نائرس نے بتایا تھا کہ دن میں عمارت کے لوگ باہر جا سکتے تھے۔ یعنی دن میں خودکار گن بند کر دی جاتی تھی۔ نائرس نے کوئی حد نہیں بتائی تھی اس کا مطلب تھا کہ دن میں جانے والے ہر جگہ جا سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے کنبے کو خوراک کیسے دی جائے۔ ویسے یہاں خوراک کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا اور پکانے کی جگہ بھی تھی۔ مگر پکاتا کون؟ میں نے کچھ بعد ایرٹ کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ وہ قیدیوں میں سے معلوم کرے کہ کھانا کون بنا سکتا ہے۔ دو تین آدمی باہر نکالو جو سب کے لیے کچھ بنائیں۔ ایرٹ چلا گیا۔

میں روبیر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس لڑکی نے پہلے شامین کی محبت میں اتنا بڑا قدم اٹھایا، اپنی عزت اور زندگی دونوں داؤ پر لگا دی۔ شامین نے اسے دھوکا دیا تو وہ میری طرف آئی اور اب میری محبت میں اس نے ایک بار پھر خود کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ خطرے کے منہ میں براہِ راست

ملک ملک کے دلچسپ قوانین

☆ آرکنساس میں اگر کوئی عورت دوسری شادی کر رہی ہے تو وہ سفید لباس نہیں خرید سکتی۔

☆ وکٹوریا (آسٹریلیا) میں آدھے دن کے بعد گلابی رنگ کی پینٹ پہننا قانونی جرم ہے اور اس پر جرمانہ ہو جاتا ہے۔

☆ کینٹکی کٹ میں آئس کریم کون جیب میں رکھ کر چلنا منع ہے۔

☆ انٹرنیشنل فالس مینی سولا میں اگر آپ اپنے کتے کو ساتھ لے گئے ہیں اور وہ کتا اگر اس بلی کے پیچھے پڑ گیا ہے جو اس سے بچنے کے لیے ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ گئی ہو تو آپ سزا کے مستحق ہیں۔ (اب کتوں کو کون سمجھائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ صرف ٹیلی فون کے کھمبے پر بلی چڑھ گئی ہو تو۔ ورنہ کچھ بھی نہیں ہوگا)۔

☆ امریکا کی بہت سی ریاستوں میں دوسری شادی جرم ہے۔

☆ یونان میں پولیس کو اس آدمی کو گرفتار کرنے کا حق حاصل ہے جو ایڈز کا مریض ہے۔

☆ ویٹی کن اور فلپائن میں طلاق دینا قانوناً جرم ہے۔ پولیس شوہر کو گرفتار کر لیتی ہے۔

☆ سنگاپور میں چیونگ گم چبانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر ایک ہزار ڈالرز تک کا جرمانہ ہو جاتا ہے۔

☆ چین میں ابھی حال ہی میں ایک قانون پاس ہوا ہے کہ بیٹا یا بیٹی شادی کے بعد والدین سے الگ رہ رہا ہے تو اس پر لازم ہے کہ مہینے میں دو بار والدین کے پاس جایا کرے ورنہ وہ گرفتار کر لیا جائے گا۔

☆ آرکنساس میں بیوی کو مارنا جائز ہے لیکن مہینے میں صرف ایک بار مار سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ بار مارنے کی کوشش کی تو شوہر اندر ہو سکتا ہے۔

☆ ایری زونا میں ایک گھر میں دو سے زائد Vibrators لگانا جرم ہے اگر ایسا ہوا تو اسے سخت جرم سمجھا جاتا ہے۔

☆ ورجینیا میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بستر سے نیچے پھینک دے تو یہ بہت بڑا جرم ہو جاتا ہے۔

☆ ورماؤنٹ کا ایک دلچسپ قانون سن لیں۔ وہاں اگر بیوی خرابی کی وجہ سے دانت نکلوا دے تو وہ شوہر کی تحریری اجازت کے بغیر نقلی دانت نہیں لگوا سکتی۔

☆ یوٹاہ میں کزن سے شادی کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ دونوں 65 سال سے زیادہ کے ہو چکے ہوں۔ اب بتائیں ہے کوئی جواب اس قانون کا۔

مرسلہ: منیزہ یاسمین۔ رحیم یار خان

چلی گئی تھی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس بار بھی اسے کچھ نہیں ملنے والا تھا چاہے وہ کامیاب واپس آتی۔ روبیر کی محبت کا جواب محبت سے دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ مگر فی الحال میں اسے درپیش خطرات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تو اس کا سابق محبوب شاہین تھا۔ وہ معبد میں موجود تھا اور آئی زور کے خاص آدمیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ روبیر خاصے دن سے یہاں تھی اور اسے پہچاننے والے افراد کی کمی نہیں تھی۔ وہ پکڑی جاتی تو ممکن ہے اس سے یوں معبد آنے کی وجہ پوچھی جاتی۔

پجاریوں سے مجھے زیادہ چالاکی کی اُمید نہیں تھی مگر وہاں ڈیوڈ شا جیسا شاطر اور مکار موجود تھا جو اپنے سائے سے بھڑکنے والا آدمی تھا۔ جب اسے پتا چلتا کہ روبیر اصل میں مجھ سے متعلق ہے تو وہ اصل بات اگلوانے کے لیے اس پر کسی قسم کا تشدد کر سکتا تھا۔ روبیر بہرحال ایک نازک لڑکی تھی وہ تکلیف ایک حد تک ہی برداشت کر سکتی تھی۔ اس کے بعد اس کے لیے زبان بند رکھنا مشکل ہو جاتا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے اندر اضطراب کی لہریں سی اٹھنے لگی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے معبد میں جانے کا کہہ کر غلط فیصلہ کیا تھا۔ دیکھا جائے تو معبد میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کے بارے میں میرا جاننا ضروری ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں ڈیوڈ شا ہے، اس کے ساتھی ہیں اور وہ کن ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ ان کے عزائم کیا ہیں میں سب کچھ جان چکا تھا۔

مگر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ جاسوسی کا مسلمہ اصول ہے کہ دشمن کے بارے میں وہ جاننے کی کوشش کرو جو آپ نہیں جانتے اور یقیناً میں ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی کے بارے میں سب نہیں جانتا تھا۔ ان کی بہت سی باتیں مجھ سے چھپی ہوئی تھیں اور ممکن ہے روبیر وہاں کوئی ایسی بات جان لیتی جو ہمارے کام آتی اور ڈیوڈ شا کو شکست ہو جاتی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ایسا ہی ہو۔ روبیر کامیاب واپس آئے تاکہ میں اپنے ساتھیوں کے سامنے بھی سرخرو ہوں جو سوچ سکتے تھے کہ میں نے روبیر کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس دوران میں جب کہ ربیک اور ایمار رسی سیاہ کر رہے تھے۔ ایرٹ نے چند خادم تلاش کر لیے تھے جو کھانا بنانے کے ماہر تھے اور اب وہ باورچی خانے میں سب کے لیے ناشتا تیار کر رہے تھے۔ ناشتے اور کھانے کے بارے میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ وہ قیدیوں کو ان کے کمروں میں دیا جائے گا۔

یہ سب عام افراد تھے اس کے باوجود ہم محتاط رہنا چاہتے تھے اگر ان میں سے کوئی یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا تو ہمارا منصوبہ تو چوپٹ ہوتا ہی ہماری سلامتی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔ میں صبح ہونے سے پہلے ہی کھا پی چکا تھا مگر جب ناشتا تیار ہوا تو میں نے ناشتا کر لینے میں بھی حرج نہیں سمجھا۔ آرام اور کھانے کا ہر موقع غنیمت تھا کہ اس کے بعد حالات نہ جانے کیا رخ اختیار کریں۔ میں مسلسل کھڑکی سے معبد کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے لیے بالکل تیار تھا کہ اگر اس طرف سے کوئی آیا تو ہم نارس کو آگے کر دیں گے۔ مگر فی الحال اس طرف سے کوئی آتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بلکہ نہ ہی آتا تو ہمارے لیے اچھا تھا۔

دو گھنٹے بعد میں نے نگرانی کے لیے ایرٹ کو لگایا۔ میں نے عمارت کا چکر لگایا اور ربیک کی کارگزاری دیکھی۔ جس نے واش روم میں ایک بڑے سے مٹی کے ٹب میں وہ محلول بنایا ہوا تھا جو بالوں کو سیاہ کرتا ہے مگر اس وقت یہ رسی سیاہ کر رہا تھا۔ ابھی تک رسی محلول میں بھیگ رہی تھی میں نے اس کا معائنہ کیا تو مجھے لگا کہ رسی بالکل سیاہ ہو گئی تھی۔ کچھ دیر میں اسے خشک کرنے کے لیے عقبی سمت چھپا کر کسی درخت سے لٹکا دیا جاتا تو چند گھنٹوں میں اس کا سارا پانی نکل جاتا۔

''انہیں جوڑنا ہوگا۔'' رسی خشک ہوئی تو میں نے ربیک سے کہا اور کھلی رسی کا بنڈل بنانے لگا۔ جب میں نے بنڈل بنالیا تو ربیک نے دوسری رسی کا سرا اس سے گرہ لگا کر جوڑ دیا اور میں نے اسے بھی بنڈل میں شامل کیا۔ تیسری رسی جوڑنے کے بعد بنڈل خاصا بڑا اور وزنی ہو گیا تھا۔ میں نے اسے شانے پر لادلیا اور ربیک کے ساتھ اس درخت کی طرف بڑھا جس سے رسی باندھنی تھی۔ لیکن عمارت کے کنارے تک آکر میں نے پہلے ربیک کو آگے روانہ کیا کہ وہ دیکھے اگر کوئی معبد کے پہلو کی طرف آئے تو مجھے خبردار کرے۔ ربیک نے ایسی جگہ پوزیشن سنبھال لی جہاں وہ خود کو چھپا کر آنے والوں کو دیکھ سکتا تھا پھر اس نے مجھے اشارہ کیا تو میں درخت کی طرف بڑھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شام کے پانچ بج رہے تھے کیونکہ شام کا سا وقت ہو رہا تھا اور روشنی میں تیزی ختم ہو گئی تھی۔ جو جگہیں اندر یا سائے میں تھیں وہاں ہلکا سا اندھیرا چھا رہا تھا۔

میں جھکا ہوا دوڑ کر درخت کے پاس پہنچا اور اس کے قریب ہی ایک جھاڑی نما پودے کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے معبد کی طرف سے آنے والا راستہ دکھائی دے

رہا تھا۔ اہرام کی عظیم الشان عمارت یہاں سے بہت واضح تھی۔ بلکہ عین سر پر محسوس ہو رہی تھی حالانکہ اس درخت سے اس کا فاصلہ کم سے کم سو گز تھا۔ آڑ میں ہو کر میں نے اشارے سے ربیک کو بلایا تو وہ واپس عمارت کی آڑ میں ہوا اور پھر دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''رسی کو درخت کی ایسی شاخ پر باندھنا جو مضبوط ہو..... کیونکہ رسی کو لگنے والا جھٹکا بہت شدید ہو گا۔ اگر رسی شاخ سے نکل گئی یا شاخ ہی ٹوٹ گئی تو شاید اترنے والے طیارے کو نقصان نہ ہو۔''

ربیک نے سر ہلایا اور درخت پر چڑھ گیا۔ یہ درخت کم سے کم چالیس پینتالیس فٹ اونچا تھا۔ ہم رسی کو جتنا بلند باندھتے طیارے کا اس سے ٹکرانے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہوتا۔ اگرچہ دوسری طرف اگر ہم رسی کو فصیل کے سرے سے بھی باندھتے تب بھی یہ بلندی تیس فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ دیوار اتنی ہی بلند تھی۔ ربیک نے رسی کا سرا مجھ سے لے لیا تھا اور اسے کھینچتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ کوئی تیس فٹ پر جا کر اس نے درخت کی شاخوں کا جائزہ لیا اور مزید اوپر جانے لگا۔ مزید پانچ یا چھ فٹ اوپر جا کر اس نے رسی ایک مضبوط شاخ پر باندھی۔ یہ تنے کا تقسیم ہو جانے والا حصہ تھا جو بدستور خاصا موٹا اور مضبوط تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اشارے سے کہا کہ اس نے ٹھیک کام کیا ہے۔ اس دوران میں تاریکی میرے اندازے سے زیادہ تیزی سے چھانے لگی تھی۔ شاید اوپر موسم اچھا نہیں تھا اور بادل تھے جنہوں نے سورج کی روشنی پہلے ہی روک دی تھی اور اس وجہ سے نیچے وادی میں بھی وقت سے پہلے روشنی کم ہونے لگی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر اوپر موسم خراب ہے تو شاید آج طیاروں کی آمد ممکن نہ ہو سکے۔ پروپلر انجن والے طیارے جیٹ انجن والے طیاروں کے مقابلے موسم سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کی پرواز زیادہ تر توازن کے اصول پر ہوتی ہے۔ تیز ہوائیں اور کم یا زیادہ ہوتا ہوائی دباؤ ایسے طیاروں کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔ خاص طور سے پہاڑی علاقے میں جہاں اونچی چوٹیاں خاص طور سے خطرناک ہوتی ہیں۔ اگر طیارے آج رات نہ آتے تو ہمیں صبح کی روشنی ہونے سے پہلے رسی دوبارہ اتارنی پڑتی ورنہ دن کی روشنی میں یہ سیاہ رسی صاف دکھائی دیتی۔ بہرحال یہ بعد کی بات تھی۔ پہلا مرحلہ تو رسی لگانے کا تھا۔ ربیک نیچے اتر آیا تھا۔ اس نے نیچے آتے ہی ایک چھوٹے درخت کی طرف اشارہ کیا جو اس درخت سے دائیں طرف فصیل کی مخالف سمت کی دیوار سے ذرا دور کھڑا تھا۔ ''میں اس درخت سے چڑھ کر فصیل تک جا سکتا ہوں۔''

''اور اس کے بعد؟''

''دوسری طرف اتر کر رسی کو کہیں باندھنا ہوگا کیونکہ یہاں تو کوئی جگہ نظر نہیں آرہی جہاں رسی باندھی جا سکے۔''

''دوسری طرف۔'' میں فکرمند ہو گیا۔ ''یہ خطرناک ہوگا۔''

''ہاں مگر اس کے سوا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے رسی باندھنے کا۔'' ربیک نے سوال کیا تو میں اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا۔ فصیل کے ساتھ ساتھ باغ میں کچھ پودے تھے اور واحد درخت یہی تھا۔ اس کے بعد فصیل کے ساتھ گھاس کا تنکا بھی نہیں تھا اور دوسرے سرے تک مٹی کا میدان تھا۔ مجھے بھی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ فصیل اوپر سے سپاٹ تھی اور اس میں کہیں رسی باندھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے آس پاس ایسی جگہ تھی۔ دوسری طرف یقیناً جھاڑیاں تھیں اور ان میں رسی باندھی جا سکتی تھی۔ اسی لیے ربیک دیوار کے پاس جانے کی بات کر رہا تھا۔ مگر دوسری طرف ہارن اور زہریلے پرندے جیسے دشمن موجود تھے۔ اگر جھاڑیاں تھیں تو ہارن کا خطرہ اتنا نہیں تھا مگر زہریلے پرندے کا خطرہ پوری طرح تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں یہاں گنجائش نظر نہیں آرہی ہے اور فصیل کے پار ہی جا کر باندھنا ہوگا۔''

''آپ مجھ سے متفق ہیں؟''

''ہاں لیکن دیوار کے پار تم نہیں میں جاؤں گا۔'' میں نے کہا تو اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ آپ کا جسم ذرا وزنی ہے اور میں آپ کی نسبت تیزی سے رسی چڑھ سکتا ہوں اور خطرہ ہوا تو میں تیزی سے ہی واپس بھی آسکوں گا۔ اس لیے میں ہی جاؤں گا۔''

''میں بھی تیزی سے چڑھ سکتا ہوں۔''

''مجھ سے زیادہ تیز نہیں چڑھ سکتے۔'' ربیک نے اصرار کیا۔ ''آپ جانتے ہیں میں ان کاموں کا ماہر ہوں۔''

''ربیک اس میں خطرہ ہے۔''

''میں اس خطرے کا زیادہ بہتر سامنا کر سکتا ہوں۔'' ربیک نے کہا تو میں نے خود کو لاجواب محسوس کیا۔ اس دوران میں اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا اور ایسا سماں ہو رہا تھا جیسے سورج غروب ہونے کے دس منٹ بعد

ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ میں نے ربیک کے پاؤں میں رسی باندھی۔
''تم زمین پر رینگتے ہوئے جاؤ گے میں رسی کھولتا رہوں گا.... جب دیوار کے پاس پہنچ جاؤ تو رسی کھینچنا جب تک یہ زمین سے اٹھنے نہ لگ جائے۔''
ربیک نے سر ہلایا اور چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا فصیل کی طرف جانے لگا۔ اس طرف گھاس تھی اور پودے تھے اسے ان کی آڑ مل رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا میں رسی کے بل کھولتا جا رہا تھا ایسا کرنا ضروری تھا ورنہ یہ آپس میں الجھ کر مشکل پیدا کر سکتی تھی۔ ابھی بنڈل کا کچھ حصہ باقی تھا کہ وہ دیوار تک پہنچ گیا اور اس نے درخت کی آڑ میں بیٹھتے ہوئے رسی کھینچنا شروع کر دی۔ ذرا سی دیر میں اس نے رسی اتنی کھینچ لی کہ اب وہ زمین پر تھی اور مزید کھینچنے پر ہوا میں معلق ہو جاتی۔ اب میں اسی طرح رینگتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ تاریکی اتنی ہو چکی تھی کہ دور کی چیز صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ ربیک نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ اندھیرا مکمل ہو ہمیں یہ کام کر لینا چاہیے۔''
رسی اچھی خاصی تھی۔ میں نے اس کا چھوٹا ٹکڑا نکال دیا تب بھی اتنی تھی کہ کئی گز اضافی ہو رہی تھی۔ ربیک درخت پر تھا وہاں سے دیوار پر چڑھا مگر اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ لیٹا رہا تھا میں نے اس کی طرف رسی اچھالی اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا ربیک آرام سے دوسری طرف اتر گیا۔ چند لمحے بعد رسی کھنچنے لگی۔ ربیک نے کوئی ایسی جگہ تلاش کر لی تھی کہ جہاں رسی کو مضبوطی سے باندھا جا سکتا تھا۔
میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یا کسی کو فصیل پر ہونا چاہیے تھا کہ ربیک پر کوئی مشکل آئے تو ہم اس کی مدد کر سکیں۔ مگر اب تو وہ اتر چکا تھا۔ ایک منٹ سے پہلے اس نے رسی کو پوری طرف کھینچ لیا تھا اور وہ درخت سے فصیل تک اس طرح تن گئی تھی کہ اس میں بہت معمولی سا لٹکاؤ نظر آ رہا تھا۔ ربیک نے رسی باندھی اور پھر وہ اسی کے سہارے چڑھ کر اوپر آیا اور درخت کے سہارے نیچے اتر گیا۔
''میں نے اتنی مضبوطی سے باندھی ہے کہ یہ ٹوٹ سکتی ہے لیکن کھل نہیں سکتی تھی اور نہ ہی جھاڑی کا تنا ٹوٹ سکتا ہے۔''
تاریکی خاصی بڑھ چکی تھی اور سیاہ رسی اسی وقت نظر آتی جب وہ بالکل پاس آ کر دیکھتا یا پھر تیز روشنی والی مشعل میں خاص طور سے اوپر دیکھتا تو اسے رسی نظر آتی۔ میں اور ربیک واپس عمارت کی طرف آئے تو یہاں مشعلیں روشن ہو چکی تھیں۔ مگر معبد کے سامنے والے باغ میں تاریکی تھی اور ابھی تک اندر سے خادمائیں برآمد نہیں ہوئی تھیں جو مشعلیں جلاتیں۔ مارٹ اور ایرٹ دفتر والے کمرے میں تھے اور کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد مارٹ نے اطلاع دی۔ ''وہ باہر آ گئی ہیں۔''
یہ سنتے ہی میں بھی تیزی سے کھڑکی کے پاس آیا۔ خادماؤں کا ایک مشعل بردار ہجوم تھا جو باہر باغ اور روش پر کھمبوں سے لگی مشعلیں روشن کر رہا تھا جس طرح وہ اجتماعی طور پر مشعلیں جلا رہی تھیں اسی طرح انہوں نے ایک ساتھ مل کر مشعلوں کو جلانا شروع کر دیا۔ ان کی تعداد حسب معمول دو درجن کے لگ بھگ تھی اور اتنی عورتوں میں روبیر کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ہم سب دھڑکتے دل سے دیکھ رہے تھے۔ خادمائیں رفتہ رفتہ مشعلیں جلاتی ہوئی ہماری طرف والی عمارت کی طرف آنے لگیں اور میرا خیال تھا کہ روبیر ان سے اسی وقت الگ ہو کر ہماری طرف آئے گی مگر خادمائیں آئیں اور انہوں نے اس طرف کی ساری مشعلیں بھی جلا دیں مگر ان میں کوئی الگ نہیں ہوئی تھی اور پھر وہ مڑ کر معبد کی طرف جانے لگیں۔
''یہ کیا روبیر باہر نہیں آئی۔'' مارٹ نے کہا۔ اسی لمحے اندر سے ایک لکڑی سے بنی ہاتھ گاڑی نکلی جسے ایک پجاری چلا رہا تھا اور گاڑی پر سفید لبادہ اور اس پر جا بہ جا سرخ رنگ نمایاں تھا۔ لبادے میں نسوانی وجود بھی اتنی دور سے صاف نظر آ رہا تھا اور وہ وجود بالکل ساکت تھا۔ میں، مارٹ، ربیک اور ایرٹ دم بہ خود سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پجاری ہاتھ گاڑی چلاتا ہوا مخالف سمت میں قید خانے والی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ ربیک نے ڈوبتے لہجے میں ہماری سوچوں کو زبان دی۔
''کیا یہ روبیر......؟''
''نہیں۔'' میں نے کہا اور مڑ کر ایرٹ کو دیکھنا چاہا مگر وہ کمرے میں نہیں تھا۔ ربیک جواب کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اس کے منہ سے نکلا۔ ''ایرٹ۔''
میں جھپٹ کر آیا تو ایرٹ مجھے باغ میں دکھائی دیا وہ معبد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اتنا آگے جا چکا تھا کہ ہم اسے آواز بھی نہیں دے سکتے۔ ابھی وہ باغ کے وسط میں تھا۔ اسی لمحے معبد سے چند افراد برآمد ہوئے اور ہماری طرف آنے لگے۔ ان میں کرتل اور باسو نمایاں تھے۔ حالات یک دم ہی سنگین ہو گئے تھے۔

(جاری ہے)

(محمد فیضان بخاری ملتان کا جواب)

نیلوفر شاہین..........اسلام آباد

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

نادیہ فیصل..........جھنگ

دکھوں کے جنگل میں پھرتے پھرتے عجب گزریں گے دن ہمارے
اداس راتوں کی خامشی میں تم اپنے آنسو پیا کرو گے

انور عثمانی..........حیدر آباد

دو عالم میں جس کی سمائی نہیں
وہ غم ایک دل میں سما جائے ہے

مرزا حمزہ بیگ..........حیدر آباد

دل کو تمہارے نام کے آنسو عزیز تھے
دنیا کا کوئی درد سمونے نہیں دیا

(نوشین اختر پشاور کا جواب)

نجمی رحمٰن..........برٹ لیٹ یو ایس اے

روکتا تھا ناخدا کشتی کو طوفاں آگیا
تم جہاں پر ہو بس اتنی دور تھے ساحل سے ہم

(روبینہ مشتاق کراچی کا جواب)

عنایت مسیح..........کراچی

جان اب کون لٹاتا ہے محبت کے لیے
وہ مری جان کوئی اور زمانہ ہو گا

(سلیم ادریس ملتان کا جواب)

ایم عمران جونانی..........کراچی

اس شہر میں کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا

عبدالستار..........ساہیوال

اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو باپ کو استاد کو
دیکھے بڑھتا ہے آپ سے، شاگرد کو اولاد کو

(نعیم ابرار خان پور کا جواب)

معراج محبوب عباسی..........ہری پور ہزارہ

یہ اور بات کہ میں چھوڑ چکا ہوں کوزہ گری
ورنہ تیرے جیسے تو میں پتھر کے بنا سکتا ہوں

سیف اللہ..........ملک وال

زخمی ہوئے جو ہونٹ تو محسوس یہ ہوا
چوما تھا میں نے پھول کو دیوانگی کے ساتھ

(مسرت سکھر کا جواب)

ہادیہ ایمان ماہا ایمان..........ہارون آباد

اے جانِ جہاں و صبح گیتی
مجھ سے تو یہ شب نہ کٹ سکے گی
یہ شب یہ اداسیوں بھری شب
یہ شب یہ وفا کی آخری شب

ناہید عباس..........علی پور چٹھہ

اکسیر کے آجاتے ہیں اوصاف بشر میں
سو فائدے ہیں ایک محبت کے جزو میں

(ناہید سلطانہ لاہور کا جواب)

عبدالحکیم ثمر..........کراچی

کسی کو حسن دیا کسی کو مال دیا
غریب جان کے تو نے مجھی کو ٹال دیا

فرزانہ توحید..........ساہیوال

کسی آواز کا جادو تعاقب کررہا ہے
اجڑی سرزمین پر پھر کوئی سایہ اگا ہے

ابرار الحسن زیدی..........ملتان

کل جس کو محبوب تھا سایہ قامت و گیسو
وہ دیوانہ آج حریف دار و رسن ہے

(فہیم الدین صدیقی کراچی کا جواب)

مرزا ہادی بیگ..........لطیف آباد

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

(حنا غفار بہاولپور کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری..........لاہور

نقش اسی کے ہیں یکجا مجھ میں
میری آنکھیں بھی پرانی نکلیں

عبدالغفار.........جہلم

نجانے دھوپ میں کیوں کر چلا ہے ساتھ مرے
اگرچہ سایہ سفر سے گریز پا بھی تھا

(منشی عزیز مے لڈن کا جواب)

فیض الحسن.........کوٹ ادو

یہ جو پتھر ہے آدمی تھا کبھی
اس کو کہتے ہیں انتظار میاں

(انجم عباس پشاور کا جواب)

فلک شیر.........رحیم یار خان

وہ مجھ سے خفا ہی سہی مجھے منظور ہے لیکن
یارو اسے سمجھاؤ کہ میرا شہر نہ چھوڑے

(نصرت جاوید کا جواب)

منیب ربانی.........ملتان

نہ آیا ہوں نہ میں لایا گیا ہوں
میں حرفِ کن ہوں فرمایا گیا ہوں

عشرت حسین زیدی.........پشاور

نقدِ اہلِ ہوس رہا ہے جسم
مدتوں خار و خس رہا ہے جسم

نیہا نسیم.........چنیوٹ

روح کو ہر روز یہ پیغام دیتا ہے بدن
ملتوی رکھو ابھی شوقِ رہائی معذرت

(مجتبیٰ رحمٰن، برٹ لیٹ امریکا کا جواب)

نجمہ الیاس.........اسلام آباد

یہ اور بات میں خود کو سنبھال بھی نہ سکا
قدم قدم پر میں اندر سے ٹوٹتا بھی تھا

عارفہ شاہین.........سیالکوٹ

یہ کیسی سوچ ہے کیسا عمل ہے
خطا کر کے سزا سے لڑ رہا ہوں

عبدالسلام.........ربوہ

یوں چونک اٹھے وہ سن کر میرا شکوہ
جیسے انہیں بھی کوئی گلہ یاد آگیا

نوشین اقرار تبسم.........شیخوپورہ

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پر گرے اور زخم آئے مجھے

عارف آرائیں.........فیصل آباد

یہ ابر سیاہ صفت برسات میں
شکستہ دلوں کو رلا جائے ہے

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

منشی عزیز مے.........لڈن وہاڑی

اس نے جب پھول کو چھوا ہو گا
ہوش خوشبو کے اڑ گئے ہوں گے

محمد ادریس حسن.........لاڑکانہ

آپ کی خاطر زمانے سے کنارہ کر لیا
اب زمانے سے ملے ہیں آپ ہی کے شوق میں

نسرین حیدر ماہی.........مظفر گڑھ

اگر لالہ و گل میں لطافتیں ہیں مگر
کسی کا حسن شریکِ نگاہ ہوتا ہے

(افروز حسن رحیم یار خان کا جواب)

شگفتہ مشتاق.........لاہور

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ ہم نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

ہادیہ ایمان ماہا ایمان.........ہارون آباد

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

انعم حسین.........لاہور

یہیں کہیں میں کسی گوشہ و جمال میں تھا
میں عشق ہونے سے پہلے بھی ایسے حال میں تھا

(قائم علی رضوی کراچی کا جواب)

اشرف شمیم.........چک نمبر 100 جنوبی

سونی راتوں میں میری یاد جو آئی ہو گی
سر نہ کاندھے سے کسی کے اٹھایا ہو گا

حیا اکرام.........ملتان

سنائیں کیا ہم اے ارمان شکستہ دل کا افسانہ
نہایت قیمتی شے تھی جو نادانوں کے ہاتھ آئی

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

علمی آزمائش
122
28 فروری 2016ء

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات سوموارہ 28 فروری 2016 تک علمی آزمائش 121 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 122

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 27 فروری 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1980ء کی دہائی میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ جہاں جہاں بھی اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی اس کے گانے سنے اور پسند کیے جاتے تھے۔ اس کی پیدائش کراچی میں ہوئی تھی لیکن شہرت غیر ممالک سے ملی۔ ایک بزنس مین سے شادی ہوئی لیکن ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہوسکی۔ نہایت کم عمری میں وہ انتقال کر گئی۔

علمی آزمائش 120 کا جواب

ٹیپو سلطان جنوبی ہندوستان کے تخت پر باپ کے بعد بیٹھا۔ انگریزوں نے اس کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے کئی حملے کیے۔ ناکام ہو جانے کے بعد ایک انگریز کو صوفی درویش کے بھیس میں اس کی ریاست میں بھیجا۔ اس نے تبلیغ دین کے نام پر لوگوں کو حکومتی اہلکاروں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور کئی اہم وزیروں کو رشوتیں دے کر اس کے خلاف کر دیا۔ جب بغاوت کی زمین تیار ہوئی تو پڑوس کی ریاستوں سے چڑھائی کرادی۔ اس جنگ میں وہ شہید ہو گیا لیکن آج بھی وہ عوام کے دلوں میں زندہ ہے۔

انعام یافتگان

1- نعیمہ حسن خان، کوئٹہ 2- توصیف احمد، میر پور خاص 3- زاہد علی، پشاور

4- ارباز خان، جہلم 5- فرقان حیدر، سرگودھا

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے شبیہ کوثر، امداد امام رضوی، احمد حسن، فرقان مجیدی، احسن علی، کامران تقوی، صنوبر برجیس قزلباش، راؤ عمران، فیض الٰہی شمسی، محمد تقی کاظمی، رانا ممتاز الدین، صبیح مصطفیٰ، خلیق حسن، تاشیر حسین رضوی، نصیر سیالکوٹی، توصیف اختر توصیف،

انعام اللہ خان، نعمت گل۔ لاہور سے بشیر مصطفیٰ، جاوید احمد، صدیق بٹ، خضر حیات، نوشین آرائیں، سیدہ کنیز کبریٰ، محمد یامین بھٹ، وقار احمد، واثق حسن ترمذی، کلثوم بٹ، نیاز احسن زیدی، سلمان خاقان، شیر نواز، ظفر حیات، رفیق ناز مغل، صنوبر صدیقی، بابر حیات خان، نیاز وٹو، فاضل حسین، محمد صلاح الدین، زاہد حسن خان، سراج الاسلام، سرفراز رفیق، کائنات جمال۔ ملتان سے انیس ضیائی، حیات محمد، شبر ملک، زاہد علی، اللہ بخش، صدف اشرفی، عزیز الدین، نصرت ملک، معراج ترمذی، کاظم علی سید، اعجاز الدین، عدنان احمد، کاشف مرزا، فہد الحسن۔ راولپنڈی سے سراج خان، ڈاکٹر سعادت علی خان، عائشہ نیاز، وردہ سلیم، فرقان حسن، نصیر الدین، مجاہد علی، مہوش نیاز، استراج احمد، موسیٰ علی، انعام الحسن، نور احمد، توصیف فاروقی، نعمت گل، عنایت حسین رزاقی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، محمد ریاض راحیل، بشیر احمد شبیر (علی پلازہ)، رسول بخش کادوانی، عنایت جعفری سید، رحیم داد، طارق اسماعیل، تاثیر عباس، نبیل زبیری، ذوالفقار حسن خان، زاہد واسطی، عنایت علی عنایت، نوید الحق، کاشف بیگ، سلطان بھایانی، ذوالفقار اعوان، جاوید اسحاق بٹ۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز، ناہید سلطان، سلطان احمد خان، ابرار ظفر، یحییٰ شاہ۔ جامشورو سے منصور احمد نعمانی۔ گوٹھ غلام شاہ بدین سے سید ایس ڈی ساغر۔ حیدرآباد سے نسرین بیین، مرزا حمزہ بیگ، ماہ رخ، عاشق حسین انصاری، نوید ظفر، کاشف حسنین کاشف، سائیں نور اللہ، اشفاق میمن، جنید عباسی، نصر اللہ بھٹو، حسین علی۔ ساہیوال سے محمد افضل (فرید ٹاؤن)۔ رحیم یار خان سے محمد کاشف ملک (شاہ گڑھ)۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، نیاز حسن، نصیر عباس، ممتاز الدین، عمران مصطفیٰ۔ لڈن وہاڑی سے منشی عزیز مئے۔ لاہور سے: امروز اسلم ملک' ثاقب سجاد' محمد عاقب جنید' سید محمد احسن نواز' عبدالخالق چوہدری' عبدالقادر' یاسمین ملک' فرزانہ مصطفیٰ' کائنات مرزا' شاہینہ اسلم چوہدری' روایت خان' کلثوم شہزاد' سرفراز اکرم خان' عنبرین شاہد' محمد اسلم۔ لالہ موسیٰ سے: بشریٰ اصغر' صفدر ملک' ارشد محمد ولی' صبیحہ نواز۔ کھاریاں سے: شعیب اقبالی۔ طاہر پورہ' بہاولپور سے: شاہ رخ ہاشمی۔ کوٹلی' آزاد کشمیر سے: لیاقت علی۔ بھمبر' آزاد کشمیر سے: پروفیسر خالد جاوید۔ ڈڈیال ضلع میرپور آزاد کشمیر سے: محمد ہارون.... خانیوال سے: گل لیاقت' اسما توحید' ملک فیروز' اعجاز حسین محمد اقبال۔ ملتان سے: سید فیض الحسن شاہ گیلانی' نبی ارشاد' امام بخش ملک' اویس سلطان' محمد معین چشتی' نازش فاروقی' خواجہ محمد حسین' محمد شفیق بھٹی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے: آصف اقبال' ڈاکٹر ایس اے اختر۔ سوئی ضلع ڈیرہ بگٹی سے: محمد اکمل خان۔ نوشہرو فیروز سے: نعمت اللہ سومرو۔ فرید ٹاؤن' ساہیوال سے: محمد افضل۔ اٹک سے: محمد نصیر۔ سرگودھا سے: علی اصغر گوجر' محمد سعید قریشی۔ کوٹ ادو سے محمد احمد رضا انصاری، اشفاق حسین۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ)، حیات اللہ، انیس احمد، رفیق علی۔ بنوں سے معظم علی قریشی (حسین آباد)۔ سرگودھا سے رفعت بانو (شورہ فیکٹری)، سید امتیاز حسین بخاری (چک 36)، محمد بلال احمد، نوشین شاہ، بیاد احمد، شیر گل خان۔ منڈی بہاؤ الدین سے سلونی، ادریس علی خان، کشف احمد، سلطان احمد، ادریس علی، یحییٰ مجاہد، شعیب علی، آفاق احمد، عباس حیدر۔ میانوالی سے صائمہ بخش، فرید الدین۔ چونیاں سے ضیاء عباس، فرحین آرائیں۔ لاڑکانہ سے اعتزاز احمد، ممتاز حسن بھٹو، نجمہ عباسی۔ بہاولنگر سے شمیم کنول، احسان علی خان، شازیہ اختر، سمیر الحسن۔ لیہ سے محمد اشفاق، شاہین عنبر بٹ۔ پاک پتن سے اریبہ حسن، نعمان چشتی، نگہت افتخار۔ حافظ آباد سے سیما نایاب، سراج الحق، اشفاق احمد، زویا احمد۔ میرپور آزاد کشمیر سے نیاز بھٹ، عرفان علی رائے، واحد الاسلام۔ میرپور خاص سے ضیاء الاسلام، اشفاق علی، اعتزاز خان، چونی لال اسرانی۔ پشاور سے کشمالہ مفتی، امام بخش، لیاقت علی، ذکیہ احمد گل، عابد حسن۔ خانیوال سے ملک فیروز۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے محمد افضل، صفیہ بلوچ، واحد شاہ، نصرت جاہ۔ اٹک سے نوروز عباس، ملک ادریس، شیخ محمد فرقان، حسن قادری۔ لالہ موسیٰ سے ارشد ولی مجید۔ کھاریاں سے طالب علی۔ راجن پور سے ظفر اللہ خان۔ مظفر گڑھ سے ارشد علی، سلطان بشیر، فرحت اسلام خان، نیاز علی، مظفر حسن شاہ، عباس حیدر، کرم اللہ واسطی۔ مالاکنڈ سے عبدالاحد۔ کوئٹہ سے نوشین فاطمہ کاظمی، صدیق بٹ، کاظم چنگیزی۔ تلہ گنگ سے فرقان عباس۔ ہری پور سے نیابت خان۔ کوٹری سے نصیر احمد عباسی۔ گجرات سے خاقان بٹ۔ شجاع آباد سے غلام پنجتن، ناصر زیدی۔ صادق آباد سے عتیق احمد، عرفان علی خان۔ ممالک غیر سے: عنایت بھٹو (شارجہ)، احمد عباس (عمان)، ناصر رند (جرمنی)، زویا علی شاہ (ٹورنٹو کینیڈا)، اسماعیل حسن، نادر مرزا (بیڈفورڈ، یوکے)۔

فرض مرض اور قرض

مکرم و محترم
السلام علیکم
مجھے نہیں معلوم کہ کہانی کیسے لکھی جاتی ہے ہاں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کہانی پڑھی کیسے جاتی ہے اس لیے کہ میں آٹھویں کلاس سے سرگزشت پڑھ رہا ہوں اُمید ہے کہ میری کہانی بھی سرگزشت کے معیار کی ہوگی۔
ندیم قیصر
(کراچی)

میں نے کسی سیانے کا قول پڑھا تھا کہ مرض، قرض اور فرض آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں۔ اس وقت توجہ نہیں دی تھی مگر جب ان تینوں سے واسطہ پڑا تو اس قول کی عملی تفسیر بھی سمجھ میں آگئی۔ اپنا تعارف کرادوں میرا نام ندیم قیصر ہے۔ تعلق ایک متوسط اور مختصر سے خاندان سے ہے۔ خاندان میں صرف میں اور اباجی تھے۔ دور پرے کے کچھ رشتے دار تھے جو ہمیں منہ نہیں لگاتے کیونکہ ان کے اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا۔ یہ فرق میری پیدائش کے وقت شروع ہوا اور جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا فرق بھی بڑھتا گیا۔ نتیجے میں ان لوگوں سے میل ملاقات بھی کم ہوتی چلی گئی۔ بڑے تایا ابا کے ہاں دو سال پہلے گیا تھا جب ان کی چھوٹی بیٹی روحی کی شادی ہوئی تھی۔ اماں کی خواہش تھی کہ میری شادی روحی سے ہو لیکن اماں کی یہ خواہش اماں کے ساتھ ہی دفن ہوگئی۔

چھوٹے تایا ابا کے ہاں گئے ہوئے بھی سال سے اوپر ہوگیا تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا تھا کہ ایک نوکری کے سلسلے میں۔ جب میں نے ان کی مدد چاہی تھی۔ میں خوش ہوگیا کہ چھوٹے تایا ابا نے شاید سفارش کا سوچا ہے اور ان کی جھاڑ کھا کر واپس آیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنی معمولی سی نوکری کی سفارش کر کے اپنی بے عزتی نہیں کرانی تھی اس لیے مہربانی کر کے آئندہ ایسی کوئی فرمائش نہ کروں۔ بڑے تایا ابا بزنس مین تھے اور ڈیفنس میں رہائش تھی۔ چھوٹے تایا ابا بزنس مین تو نہیں تھے مگر ان کی دولت شاید کچھ زیادہ ہی تھی کیونکہ وہ انیس گریڈ کے بیوروکریٹ تھے۔ تینوں بھائیوں میں ابا ہی پیچھے رہ گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے نہ زیادہ پڑھا اور نہ ہی بزنس کا سوچا۔ میٹرک کر کے کے ایم سی میں جونیئر کلرک بھرتی ہوئے اور کلرک کی پوسٹ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کی ساری جمع پونجی میں ہی تھا کیونکہ مجھ پر ہی ان کی ساری جمع پونجی خرچ ہوئی تھی۔

اماں ابا مجھے اچھے اسکول میں پڑھانا چاہتے تھے مگر نجی اسکولوں کی فیس بھرنے کی استطاعت نہیں تھی اس لیے کوشش کر کے مجھے ایک سرکاری اسکول میں داخل کرادیا جہاں کا تعلیمی معیار نجی اسکولوں کے برابر ہی تھا۔ میں نے یہیں سے میٹرک کیا اور اتنے اچھے گریڈ سے کیا کہ ایک اچھے سرکاری

ٹیکنیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ کیونکہ ابا میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ مجھے انجینئرنگ پڑھا سکتے تھے اس لیے میں نے ڈپلومے کا انتخاب کیا۔ اگر بعد میں موقع ملتا تو میں اپنے بل بوتے پر آگے پڑھ سکتا تھا۔ تین سالہ ڈپلومہ کے بعد مجھے ایک کارخانے میں جاب مل گئی۔

ابھی مجھے کارخانے میں ملازمت کرتے ہوئے پہلا ہی سال تھا کہ ابا ملازمت سے اور اماں زندگی سے ریٹائر ہوگئیں۔ ابا کی ریٹائرمنٹ تو متوقع تھی۔ مگر اماں کی وفات نے مجھے اور ابا دونوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تین افراد کے اس مختصر کنبے کا محور اماں تھیں اور وہ نہ رہیں تو ہمیں لگا کہ ہماری زندگی کا محور نہیں رہا ہے۔ ہمارا اماں کے ساتھ بائیس اکیس برس کا ساتھ تھا۔ شادی کے ٹھیک دس مہینے بعد میں پیدا ہوا اور اس کے بعد اللہ نے اماں ابا کو مزید اولاد نہیں دی۔ اس لیے میں ہی ان کی اُمیدوں اور چاہتوں کا مرکز بن گیا۔ اماں عام سی عورت تھیں۔ جیسے ابا تھے ویسی ہی ان کو بیوی ملی تھی۔ دونوں میں قناعت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ابا اپنی ملازمت اور کم تنخواہ سے مطمئن تھے اور اماں اس آمدنی سے۔ گھر کو وہ اس طرح چلاتی تھیں کہ ہم باپ بیٹے کو مشکل سے کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

لیکن جب اماں نہ رہیں تو ان کی اہمیت کا احساس ہوا۔ میں نے محور والی بات درست کہی تھی۔ ہمارا تو گھر ہی بکھر کر رہ گیا تھا۔ کسی چیز کا پتا نہیں تھا۔ مجھے اور ابا کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ سودا کہاں سے آتا ہے اور دو آدمیوں کی چائے بنانے کے لیے کتنی پتی درکار ہوتی ہے۔ اماں کی وفات پر آخری موقع تھا جب میں نے اپنے سارے خاندان کو ایک ساتھ دیکھا۔ اماں کے صرف ایک بھائی تھے اور وہ ہماری طرح تھے بلکہ ہم سے بھی گئے گزرے تھے کہ ان کی بیوی اور بچے بھی نہیں تھے۔ جوانی میں ایک بار شادی کی اور بیوی بھاگ گئی۔ اس کے بعد انہوں نے شادی کا نام نہیں لیا تھا۔ دو تایاؤں کے ساتھ میری ایک پھپھو بھی ہیں۔ پھپھو کی شادی بڑے تایا نے اپنے بزنس پارٹنر سے کی تھی۔ اگرچہ اب وہ پارٹنر نہیں رہے تھے لیکن بزنس مین ضرور تھے۔ پھپھو بھی کوٹھی میں رہتی تھیں۔ وہ بھائی سے اور مجھ سے محبت کرتی تھیں مگر شوہر سے مجبور تھیں جو ہم سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے اسٹیٹس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

کبھی کبھی میں حیران ہوتا کہ خون کے رشتوں کے معیار زندگی میں بھی اتنا فرق ہوتا ہے۔ میں نے تو دیکھا تھا کہ گھر کا کوئی ایک فرد اوپر چلا جاتا یا ملک سے باہر نکل جاتا تو وہ کوشش کر کے دوسروں کو بھی اپنے پاس بلا لے جاتا۔ یہاں ایک بھائی کے لیے دو بڑے بھائیوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ شاید اس میں قصور ابا کا تھا انہیں لینے کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا۔ بہر حال ہم اپنی زندگی سے اتنے غیر مطمئن بھی نہیں تھے۔ ہاں اماں کی وفات ہمارے لیے بہت بڑا دھچکا تھی۔ اس سے سنبھلنے میں ہمیں بہت عرصہ لگا تھا۔ ایک سال بعد ابا نے میری شادی کا سوچا۔ مگر میں فی الحال اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے اپنے مکان کا کرلوں اس کے بعد شادی کا ڈول ڈالا جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس

طرح اماں ابا نے در بدر زندگی گزاری تھی اور ہر تیسرے چوتھے سال سامان لے کر بھاگ رہے ہوتے تھے میں بھی ایسا ہی کروں۔ بچپن سے اب تک میں بلا مبالغہ کوئی سات آٹھ گھر اور محلے دیکھ چکا تھا۔ بعض جگہوں پر تو سال سے بھی کم رہنا نصیب ہوا تھا۔

ابا کو فطری طور پر مکان کا خیال نہیں تھا۔ ایک تو وہ اس کے عادی تھے کہ کرائے کے مکان میں رہیں اور پھر ان کی عمر میں انسان کو دنیا کے سامان کی پرواہ ذرا کم رہ جاتی ہے۔ انہیں ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملی تھی وہ انہوں نے فی الحال انکم اسکیم میں ڈیپازٹ کر دی تھی' میری شادی کے لیے کام آتی۔ ابا کی پنشن، اسکیم کی آمدنی اور میری تنخواہ ملا کر اتنی رقم ہو جاتی تھی کہ اس کے نصف میں آرام سے ہمارا گزارا ہو جاتا تھا اور آدھی رقم بچ جاتی تھی۔ میں اس بچ جانے والی رقم کو کسی مکان یا فلیٹ میں تبدیل کرانا چاہتا تھا۔ مگر میں بکنگ اور انسٹالمینٹ کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا میں نے دیکھا کہ اس میں آدمی کو صرف خواری نصیب ہوتی ہے۔ میں رقم جمع کر رہا تھا اور اس چکر میں تھا کہ کوئی جگہ مل جائے۔ یا بڑی رقم دے کر قبضہ لے لوں اور باقی رہتے ہوئے ادا کر دوں۔

ان ہی دنوں ابا اپنے ایک کولیگ کے انتقال پر اس کے جنازے میں گئے۔ عرفان صاحب ابا کے ساتھ کام کرتے تھے اور ابھی ان کی جاب جاری تھی مگر اوپر سے بلاوا آ گیا۔ ابا نے آ کر بتایا کہ ان کی بیوی اور بیٹی بہت رو رہی تھیں۔ کیونکہ ان کا اب کوئی نہیں رہا ہے۔ بیٹی چھوٹی ہے اور حال ہی میں انٹر کیا ہے۔ اب اس بے چاری کو روزگار کے لیے بھاگنا پڑے گا۔ میں نے افسوس کیا۔ چند دن بعد ابا سوئم سے آئے تو سوچ میں تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا سوچ رہے ہیں؟ تو بولے۔ ''بیٹا میں سوچ رہا ہوں کہ عرفان کی بیٹی رضوانہ کو تمہارے لیے مانگ لوں۔ اچھی پیاری بچی ہے اور یتیم ہو گئی ہے۔ اس کی ماں اب رشتے کے لیے بھی پریشان ہے۔ اپنا گھر ہے مگر کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے سوائے پنشن اور گریجویٹی کے۔''

''ابا ہمارا تو اپنا گھر بھی نہیں ہے کیا وہ مان جائیں گے؟''

ابا نے میری طرف دیکھا اور بولے۔ ''کیا کمی ہے تم میں، اچھی شکل ہے اچھا کردار ہے اور ملازمت کر رہے ہو۔ اپنا گھر نہیں ہے لیکن ہو جائے گا۔''

میں نے سوچا اور کہا۔ ''ابا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن جب تک اپنا گھر نہیں ہو جائے گا میں شادی نہیں کروں گا۔''

''ابھی بات کرتے ہیں۔ رضوانہ شاید آگے بھی پڑھے گی۔ پھر باپ کا ابھی انتقال ہوا ہے۔ سمجھو کہ دو سال تو لگ جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے آپ بات کرلیں۔''

ابا نے بات کی اور رضوانہ کی امی مان گئیں۔ عرفان صاحب کے انتقال کے دو مہینے بعد ایک سادہ سی تقریب میں ہمارا رشتہ طے ہو گیا۔ وہ لوگ بھی شادی دو سال بعد ہی کرنا چاہتے تھے۔ ایک تو آنٹی عرفان صاحب کی ملنے والی گریجویٹی کی کچھ رقم سے اوپر گھر بنوا رہی تھیں کہ خود اوپر منتقل ہو جائیں اور نیچے والا پورشن کرائے پر دے دیں تو آمدنی کا ذریعہ بن جائے۔ پھر رضوانہ نے بی کام کے بعد کالج میں داخلہ لے لیا تھا۔ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی تھی۔ منگنی ہوئی تو میں نے بھی اپنی کوشش تیز کر دی۔ ابا کے پاس کوئی پانچ لاکھ روپے تھے اور میں نے بھی ایک لاکھ بچائے تھے۔ ہماری رہائش سائٹ ایریا کے نزدیک ایک متوسط آبادی میں تھی۔

ہم زیادہ تر اسی آبادی کے مختلف محلوں میں رہے تھے۔ شاید ایک بار یہاں سے کچھ عرصے کے لیے باہر گئے مگر دوبارہ یہیں آ گئے۔ اس وقت میں چھوٹا تھا اس لیے ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ لیکن جب آبادی بڑھی تو دیکھتے ہی دیکھتے مکانوں کی اوپری منزلیں بڑھتی چلی گئیں اور جن کے پاس بڑے پلاٹ تھے انہوں نے پرانے گھر گرا کر ان پر بلڈنگز کھڑی کرلیں اور فلیٹ بنا کر بیچنے لگے۔ ایسی ہی ایک زیر تعمیر بلڈنگ میں مجھے دو کمروں اور لاؤنج کا فلیٹ پسند آیا۔ یہ دوسری منزل پر تھا اور ویسٹ اوپن تھا اس لیے ہوا بھی خوب آتی۔ بلڈنگ اسٹرکچر کے لحاظ سے آخری مرحلے میں تھی۔ بلڈر کا کہنا تھا کہ وہ ایک سال کے اندر نیچے سے قبضہ دینا شروع کر دے گا۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سال میں مجھے فلیٹ مل جاتا اور قیمت بھی وارے والی تھی۔ چھ لاکھ پہلے دینے تھے اور باقی دو لاکھ رہتے ہوئے قسطوں میں دینے تھے۔ بلڈر کو میں جانتا تھا اسی علاقے میں اس نے کوئی ایک درجن عمارتیں بنا کر فروخت کی تھیں۔ وہ وقت پر اور اچھا کام کرنے والا آدمی تھا۔

میں فلیٹ بک کرانے کا سوچ رہا تھا مگر بک کرانے کی نوبت نہیں آئی۔ ابا کی طبیعت خراب تو کچھ عرصے سے چل

رہی تھی۔ انہیں کھانسی اٹھتی تھی اور بڑی مشکل سے ٹھیک ہوتی تھی۔ دوا اور علاج کراتے تھے مگر کچھ عرصے بعد دوبارہ شروع ہو جاتی تھی۔ ابا نے بڑی سادہ زندگی گزاری تھی۔ سگریٹ انہوں نے جوانی میں چند ایک بار پی ہوگی۔ اس لیے ان کی بیماری کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر ایک دن میں کارخانے سے واپس آیا تو ابا زرد چہرہ لیے بیٹھے تھے اور سینہ دبا رکھا تھا۔ میں پریشان ہوگیا۔ ''کیا ہوا ابا؟''

''کچھ نہیں۔'' انہوں نے بہت مشکل سے کہا۔ ''سینے میں درد ہو رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے اندر کوئی نوکیلی چیز چبھ رہی ہے۔''

میں ابا کو محلے کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو اس نے کچھ دوائیں اور ہدایت دی۔ ''اگر ان سے فائدہ نہ ہو تو ان کو چیسٹ اسپیشلسٹ کے پاس لے جانا۔''

دو دن بعد میں نے یہی کیا کیونکہ ابا کو ذرا بھی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اسپیشلسٹ نے چند ٹیسٹ فوری کرانے کو کہا۔ میں یہ دیکھ کر ٹھٹکا کہ ایک ٹیسٹ ایک مخصوص اسپتال سے کرانے کو کہا تھا جو کینسر کے علاج کے لیے مشہور تھا۔ میں ابا کو لے کر وہاں گیا اور ٹیسٹ کرایا پھر چپکے سے وہیں کے ایک ڈاکٹر سے اس ٹیسٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے تصدیق کی کہ یہ ٹیسٹ کینسر کی موجودگی جاننے کے لیے کرایا جاتا ہے۔ یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے تھے مگر ابا کو میں نے یہی بتایا کہ انہیں ٹی بی کا ٹیسٹ کرانے لایا ہوں کیونکہ ڈاکٹر کو شبہ ہے کہ انہیں ٹی بی ہو رہی ہے۔ ابا اپنی بیماری کے حوالے سے زیادہ فکر مند نہیں تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''اس عمر میں کیا ٹی بی اور کیا کینسر موت کسی بہانے تو آنی ہے۔ مجھے تیری فکر ہو رہی ہے۔''

''میری فکر کیوں کرتے ہیں ابا؟''

''یہ جو تو علاج پر خرچ کر رہا ہے اسے بچائے گا تو تیرے کام آئے گا۔''

''ابا کیسی بات کر رہے ہیں میرے لیے آپ اہم ہو پیسا نہیں۔''

''بیٹا آج کل پیسے کی قدر ہے اور مجھے آج نہیں تو کل مر جانا ہے۔'' ابا مایوسی سے بولے۔ شاید ان کی چھٹی حس نے انہیں بتا دیا تھا کہ انہیں کوئی بڑی بیماری ہے۔ مگر میں نے ان سے سچ کہا تھا۔ میرے لیے ابا سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر ان کے علاج کے لیے ضرورت پڑتی تو میں خود کو بھی بیچ سکتا تھا۔ ایک ہفتے بعد آیا تو اس میں کینسر نکلا تھا۔ ابا کو پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے مزید کچھ ٹیسٹ لکھ دیئے جن سے یہ پتا چلتا کہ کینسر کس درجے کا ہے اور اس کا علاج کس طرح ممکن ہے۔ یہ سارے ٹیسٹ کرانے پر کوئی چالیس ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ جب نتیجہ سامنے آیا تو پتا چلا کہ ابا کے دونوں پھیپھڑوں میں کچھ کچھ حصے کینسر زدہ ہو رہے تھے اور ان کا ایک ہی علاج تھا کہ ان حصوں کو آپریشن کر کے نکال دیا جاتا۔ جب ڈاکٹر نے مجھے بتایا تو میں پریشان ہوگیا۔

''پھیپھڑوں کے بغیر انسان زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟''

''پورے پھیپھڑے نہیں نکلیں گے ان کا صرف کینسر زدہ حصہ نکالا جائے گا اس کے بعد آپ کے والد باقی ماندہ پھیپھڑوں پر زندہ اور صحت مند رہ سکیں گے۔''

میں نے سکون کا سانس لیا مگر فوراً ہی خیال آیا۔ ''ڈاکٹر صاحب خرچ کتنا آئے گا؟''

''تقریباً چھ سے سات لاکھ روپے۔''

''یہ تو بہت زیادہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''زیادہ تو ہے لیکن اگر آپ سرکاری یا کسی خیراتی اسپتال سے علاج کرائیں گے تو بہت زیادہ امکان ہے کہ آپریشن کے بعد بھی مسئلہ حل نہ ہو۔ کینسر دوبارہ ہو سکتا ہے۔ اگر کسی اچھی جگہ سے کرائیں گے تو شفایابی کی اُمید نوّے فیصد سے زیادہ ہوگی۔ آپ یہ مت سمجھیں کہ میں آپ کو کسی کے پاس جانے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیں اور فیصلہ کر لیں۔''

''ڈاکٹر صاحب میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کون سے سرکاری یا خیراتی اسپتال علاج کرتے ہیں پرائیویٹ ڈاکٹرز کا میں کیا جانوں گا؟''

''آپ دیکھ لیں۔'' ڈاکٹر نے ایک لسٹ میری طرف بڑھائی۔ ''یہ سرکاری اور ٹرسٹ اسپتال اس نوعیت کے کینسر کو آپریٹ کر سکتے ہیں۔ پہلے آپ ان سے بات کر لیں اگر سمجھ میں نہ آئے تو میرے پاس آیئے گا۔ میں کچھ پرائیویٹ سرجنز کے بارے میں بتاؤں گا مگر ذہن میں رکھیے گا کہ پھر خرچ اس سے بھی زیادہ ہوگا۔''

میں پہلے ابا کی رپورٹس لے کر سرکاری اسپتالوں میں گیا اور وہاں جو حال دیکھنے کو ملا تو میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا۔ زندگی و موت اللہ کے ہاتھ میں ہے ممکن ہے کسی اچھی جگہ سے آپریشن کے باوجود وہ بچ نہ پاتے لیکن میں ان کو اس ذلت و خواری سے نہیں گزاروں گا جس سے یہاں موجود

مریض گزر رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے ٹرسٹ اسپتالوں کا رخ کیا۔ مگر وہاں نہ تو مجھے خاص انتظامات نظر آئے اور پھر وہ بھی لاکھوں میں ہی اخراجات بتا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ابا کو دو مہینے کے اندر لازمی آپریشن کرا لینا چاہیے ورنہ کینسر مزید پھیلنے کا خدشہ تھا۔ ایک مہینا ان ہی چکروں میں گزر گیا اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو مجبوراً میں نے ڈاکٹر کا رخ اور اس سے پرائیویٹ سرجنوں کے بارے میں پوچھا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ میرے پاس آئیں گے۔ ہمارے ہاں کینسر کا آپریٹ بھی زیادہ تر عام آپریشن کی طرح کیا جاتا ہے اور اس سے دوبارہ کینسر ہونے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ میں جن تین سرجنوں کے پاس آپ کو بھیج رہا ہوں یہ اس شعبے میں جدید ترین تربیت لے کر آئے ہیں اور ان کے پاس سیٹ اپ بھی اچھا ہے۔ مہنگے ہیں مگر آپ کوشش کریں تو کچھ رعایت ہو سکے گی۔''

ان تین سرجنوں سے اپائنٹ منٹ لینا ہی ایک مہم سے کم نہیں تھا۔ جب سے ابا کی بیماری کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور میں ان کو لے کر ڈاکٹروں کے پاس بھاگ دوڑ کر رہا تھا میں نے اپنی شفٹ ایوننگ کی کرالی تھی۔ صبح میں ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے چکر لگاتا تھا۔ وہاں سے تھکا ہارا آتا تو ملازمت پر جاتا اور وہاں سے تھکا ٹوٹا آتا تو سونے سے پہلے ابا کی چیزیں دیکھتا تھا کہ انہیں کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اگرچہ وہ مجھ سے کہتے تھے کہ میں آرام کروں مگر مجھے اس کے بغیر سکون سے نیند نہیں آتی تھی۔ ان دنوں میں مشکل سے چھ گھنٹے سو رہا تھا۔ ابا کی بیماری کی اطلاع ان کے بھائیوں تک پہنچ گئی تھی مگر انہیں اتنی فرصت نہیں تھی کہ بھائی سے آ کر مل لیتے انہوں نے فون پر اپنا فرض پورا کر لیا تھا۔ پھپھو ملنے کے لیے آئی تھیں اور ابا سے لپٹ کر روتی رہی تھیں۔ جاتے ہوئے چپکے سے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا۔ ''اگر ضرورت ہو مجھے کال کر دینا۔''

لفافے میں بیس ہزار روپے تھے۔ جب لاکھوں کا معاملہ آیا تو میں نے سوچا کہ ان سے بات کروں مگر پھر میری غیرت نے گوارہ نہیں کیا۔ میری غیرت نے تو یہ بھی گوارہ نہیں کیا تھا جب آنٹی نے مکان کی بات پر دبے الفاظ میں کہا تھا کہ ان کے بعد مکان رضوانہ کا ہوگا اور رضوانہ کا ہوگا تو میرا بھی ہوگا۔ مگر میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں اپنے زور بازو پر بھروسا کرنے والا شخص ہوں۔ اس لیے میں نے پھپھو سے نہیں کہا اور تایاؤں سے کہنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ان تین سرجنوں کو ابا کی رپورٹس دکھائیں اور انہوں نے کہا کہ ابا کا علاج ہو جائے گا اور وہ ٹھیک بھی ہو جائیں گے مگر جب بات اخراجات کی آئی تو انہوں نے اس میں کمی سے انکار کر دیا۔ تینوں نے مجھے جو تخمینہ دیا تھا وہ تقریباً سات کے آس پاس تھا۔ ایک ڈاکٹر احسان کر کے بہ مشکل پونے سات پر آیا۔ اس نے کہا۔

''اس میں سب شامل ہوگا۔ ایک مہینے تک کی دوائیں بھی۔ یہ بہت مہنگی ہوتی ہیں اور غریب لوگ آپریٹ تو کرا لیتے ہیں مگر دواؤں کا کورس پورا نہیں کراتے جس سے بعض اوقات کینسر دوبارہ آ جاتا ہے یا کوئی اور مسئلہ ہو جاتا ہے اور بدنامی ساری سرجن کی ہوتی ہے۔''

میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ بہ مشکل چھ لاکھ تھے۔ میں نے منت سماجت کر کے ڈاکٹر احسان کو اسی پر آمادہ کر لیا اور وعدہ کیا کہ باقی کے پون لاکھ اسے ایک مہینے کے اندر کر کے دے دوں گا۔ رقم دینے کے ایک ہفتے بعد ابا کا آپریشن تھا۔ میں نے باقی رقم کے لیے ابھی سے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔ سیٹھ سے بات کی مگر اس نے پچاس ہزار سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا۔ پچاس مل گئے مگر پچیس ابھی بھی کم تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اور کہاں سے کروں۔ دوست احباب تھے مگر میں نے کبھی ان سے قرض ادھار نہیں کیا۔ اب ضرورت آن پڑی تھی اور میں کمر ہمت کس رہا تھا کہ اچانک رضوانہ ہمارے گھر چلی آئی۔ میں اور ابا دونوں ہی حیران رہ گئے تھے۔ میں منگنی کے بعد صرف دو بار اس کے گھر گیا تھا اور وہ میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس لیے اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ اس نے عبایا اور نقاب لیا ہوا تھا۔ وہ کالج سے آئی تھی۔

''میں انکل کو دیکھنے آئی ہوں۔''

ابا نے خوش ہو کر اس کا استقبال کیا اور مجھے خاطر مدارات کا حکم دیا۔ میں موسم کی مناسبت سے کولڈ ڈرنک اور کچھ ریفریشمنٹ لے آیا۔ وہ آدھے گھنٹے رکی اور ابا سے باتیں کرتی رہی پھر جانے لگی تو دروازے پر اس نے اپنے بیگ سے ایک چھوٹا سا پیک پیکٹ نکال کر مجھے دیا۔ ''یہ میں آپ کے لیے لائی ہوں۔ آپ کی سالگرہ کا گفٹ ہے۔''

میں جھجکا۔ ''اس کی کیا ضرورت تھی؟''

''تھی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جب آپ اسے کھول کر دیکھیں گے تو آپ کو پتا چل جائے گا۔''

میں نے سامنے سے رضوانہ کو منگنی یا رسم والے دن ہی دیکھا تھا نہ تو اس سے بات ہوئی تھی اور نہ ہی میرے پاس اس کا موبائل نمبر تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے پاس موبائل ہے یا نہیں۔ دوسری بار میں آنٹی کی دعوت پر گیا تھا اور اس میں رضوانہ کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ آج کل کے رشتوں سے بالکل مختلف ہے۔ جس میں منگیتر نہ صرف آپس میں رابطے میں رہتے ہیں بلکہ ملتے ہیں اور جو ذرا آزاد خیال ہوں ان کے تو اطوار ہی دوسرے ہوتے ہیں۔ مگر ایک تو ہمارے گھروں کا ماحول ایسا نہیں تھا اور دوسرے ہم ماں باپ کے اکلوتے تھے۔ جو بچے اکلوتے ہوں وہ عام کیٹیگری سے ذرا ہٹ کر ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے رضوانہ کا یوں آنا اور پھر جاتے ہوئے مجھے تحفہ دے کر جانا مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مگر جب اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے میں آکر اس کا گفٹ پیپر میں لپٹا ہوا تحفہ کھولا تو اس میں خلافِ توقع کسی پرفیوم کے بجائے ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی ایک لپٹی ہوئی گڈی اور ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔ میں نے رقعہ اٹھایا تو اس پر تحریر تھا۔

''شاید آپ مجھے آج کل کی عام لڑکیوں کی طرح سمجھ رہے ہوں جو منگیتر سے فری ہوتی ہیں اور اس سے ملتی اور تحفے بھی دیتی ہیں مگر اللہ گواہ ہے میں ایسے کسی مقصد سے نہیں آئی تھی۔ مقصد آپ تک اپنا خلوص پہنچانا تھا۔ یہ وہ رقم ہے جو میں نے کئی سالوں میں جمع کی ہے۔ ابو دیتے تھے۔ کبھی امی دیتی تھیں۔ میں میٹرک کے وقت سے ٹیوشن پڑھا رہی ہوں۔ ضرورت کی ساری چیزیں امی ابو لا دیتے تھے اور مجھے فضول خرچی کی عادت نہیں ہے اس لیے یہ جمع ہوتی رہی اور جب مجھے انکل کا پتا چلا تو میں نے سوچا کہ شاید یہ چھوٹی سی رقم آپ کے کسی کام آئے جب آپ خود کو بہت اکیلا محسوس کریں تو آپ کو یاد دلائے کہ آپ اکیلے نہیں ہیں کوئی آپ کے ساتھ ہے۔''

تحریر پڑھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرا اور رضوانہ کا رشتہ اب صرف منگیتر والا نہیں رہا ہے بلکہ اس میں محبت بھی شامل ہو گئی ہے اس کے ایک ایک لفظ سے میرے لیے محبت ٹپک رہی تھی اور یہ عام محبت نہیں تھی بلکہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی محبت تھی جو انسان کو اپنی سب سے قیمتی متاع قربان کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جب میں نے رقم دیکھنا چاہی تو دھندلاہٹ نے آ گھیرا۔ میں نے آنسو صاف کر کے رقم گنی جو تیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ میں اسے واپس کر دوں مگر فوراً میرے دل نے مجھے ڈانٹا کہ میں یوں اس کی محبت اور خلوص کی تذلیل کروں گا۔ اس نے مجھے رقم نہیں اپنا سب کچھ دے دیا تھا۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ میں اپنا سب کچھ اسے دے دوں۔ میں اس کا شکریہ ادا بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ میرا اس سے براہِ راست رابطہ ہی نہیں تھا۔

رقم مکمل ہوئی تو میں نے آپریشن سے پہلے ہی پوری رقم جمع کرادی۔ آپریشن ڈاکٹر احسان اپنے کلینک میں کر رہے تھے اور شہر کے ایک پوش علاقے میں یہ چھوٹا سا لیکن بہت جدید اور تمام تر سہولتوں سے آراستہ کلینک تھا۔ آپریشن بہت طویل تھا جو ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ وقت تک جاری رہا اور اس دوران میں، پھپھو اور آنٹی ویٹنگ روم میں انتظار کرتے رہے۔ تایاؤں نے اس بار بھی آنے کی زحمت نہیں کی تھی اور انہوں نے مجھ سے کال کر کے پوچھ لیا تھا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا ان سے بات کرنے کو مگر صرف اللہ واسطے کر لی کہ اس وقت مجھے صرف ابا کی فکر تھی۔

تقریباً پانچ گھنٹے بعد اندر سے ڈاکٹر احسان بہت تھکے ہوئے برآمد ہوئے اور انہوں نے مسکراہٹ کے ساتھ صرف میرا شانہ تھپکا اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اندر سے نکلنے والے ایک اٹینڈینٹ سے ابا کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا۔

''وہ ٹھیک ہیں۔ فی الحال انہیں بارہ گھنٹے سخت انڈر آبزرویشن رکھا جائے گا۔ وہ بے ہوش رہیں گے اور کوئی ان سے مل نہیں سکے گا۔''

''میں دیکھ سکتا ہوں؟''

''ہاں کمرے کے باہر سے کیونکہ اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

میں نے اس پلوشن اور جرم فری کمرے کے باہر شیشے سے دوسری طرف ابا کو بستر پر ساکت لیٹے دیکھا۔ ان کے منہ سے آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا اور وہ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ لیکن سرجن اور اس کے عملے کا انداز بتا رہا تھا کہ آپریشن کامیاب رہا تھا۔ ابا بارہ گھنٹے بعد ہوش میں آ گئے مگر ان سے ملنے کی اجازت اب بھی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے ایک دن بعد مجھے یوں کمرے میں جانے کی اجازت ملی کہ میں سر سے پاؤں تک ایک خاص لباس میں تھا اور میرے منہ پر ماسک لگا ہوا تھا اندر جانے سے پہلے مجھے اوزون گیس

سے شاور دیا گیا جو جراثیم کش ہوتی ہے۔ ابا کو بولنے سے منع کیا ہوا تھا کہ اس سے پھیپھڑوں پر زور آتا اور ابھی زخم تازہ تھے۔ مگر مجھے دیکھ کر ابا کی آنکھوں میں روشنی آ گئی تھی۔ میں صرف پانچ منٹ رک سکا کہ بس اتنی ہی اجازت تھی۔ مگر دو دن بعد جب ابا کو عام کمرے میں شفٹ کیا گیا تو ان کی حالت بہت اچھی تھی۔ انہوں نے بات کی تھی اور اس روز انہیں کھانے کو دیا گیا تھا۔

ابا پانچ دن اس کلینک میں رہے مگر ان کی بہترین دیکھ بھال اور بہترین علاج کے باعث جب وہ گھر جا رہے تھے تو لگتا ہی نہیں تھا کہ ان کا اتنا مشکل اور خطرناک آپریشن ہوا ہے۔ ڈاکٹر احسان نے خود مجھ سے مل کر مجھے تمام احتیاطی تدابیر زبانی بتائیں اور ان کا چارٹ بھی بنا کر دیا۔ حسب وعدہ انہوں نے ابا کے لیے پورے مہینے کی دوائیں فراہم کیں اور ان کے دینے کے اوقات کی سختی سے پابندی کرنے کو کہا تھا۔ اس طرح ابا کی خوراک اور آرام کا چارٹ بھی تھا کہ کب آرام کرنا ہے اور کب چہل قدمی کرنی ہے۔ کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے آکسیجن کی بوتلیں دی گئی تھیں جن کی نوزل پر ماسک لگا ہوتا ہے۔ گرد مٹی سے بچانے کے لیے ابا کو منہ پر دو ہفتے تک ماسک پہننا تھا۔ ایک ماسک چوبیس گھنٹے بعد بدل دیا جاتا اور نیا ماسک پہننا پڑتا۔

اب مجھے احساس ہوا کہ پرائیویٹ علاج اور سرکاری علاج میں کیا فرق ہے۔ میں نے جو دیکھا تھا سرکاری اسپتالوں میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ وہاں آپریشن کے بعد مریض کو خاص ماحول میں رکھنے کے بجائے اسے وارڈ میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں صفائی کا حال سب کو پتا ہے۔ ابا کو جو دوائیں دی جا رہی تھیں ان میں کینسر کے دوبارہ ہونے کے امکان کو ختم کرنے والی دوائیں بھی تھیں۔ دواؤں کا کورس مکمل ہونے کے بعد ان کے دوبارہ ٹیسٹ ہوتے جس میں دیکھا جاتا کہ کینسر ختم ہو گیا ہے یا اس کا کچھ حصہ باقی ہے۔ ایک ہفتے تک ان کی حالت ٹھیک رہی تھی مگر پھر ان کو سینے میں دائیں طرف درد شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر احسان نے کسی قسم کے درد کی صورت میں فوری کلینک لانے کو کہا تھا۔ اس لیے میں ابا کو اسی دن کلینک لے گیا۔ ڈاکٹر احسان کے پاس جدید ترین ایم آئی آر کی سہولت تھی۔ انہوں نے ابا کا ایم آئی آر کیا اور اس سے یہ بات سامنے آئی کہ دائیں پھیپھڑے میں ایک جگہ گلٹی نمودار ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر احسان نے ہنگامی آپریشن کا فیصلہ کیا اور مجھ سے کہا۔

''شاید یہ حصہ نکالنے سے رہ گیا تھا۔''

میں پریشان ہو گیا ''ڈاکٹر صاحب کیا کینسر پھر سے پھیل رہا ہے؟''

''نہیں ایسی کوئی علامت نہیں ہے یہ حصہ پہلے سے کینسر زدہ تھا مگر نکالنے سے رہ گیا۔ اب گلٹی نمایاں ہوئی ہے۔ اسے نکالنا ہوگا۔''

ابا کی طرف سے اطمینان ہوا تو پریشانی کا رخ اخراجات کی طرف مڑ گیا۔ ''ڈاکٹر صاحب اس کے اخراجات؟''

''میرے اور کلینک کے کوئی اخراجات نہیں ہیں کیونکہ یہ میری ذمّے داری ہے۔ ہاں آپ کو دواؤں کا خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔''

''یہ خرچ کتنا ہوگا؟''

''دو لاکھ روپے ہوں گے۔'' ڈاکٹر احسان نے آرام سے کہا۔ ''اگر آپ چاہیں تو میں منگوا دوں ورنہ آپ خود منگوا لیں۔''

میں کہاں سے منگواتا۔ میں نے پہلے بھی مارکیٹ سے ان دواؤں کی قیمت معلوم کی تھی تو ڈاکٹر احسان کی منگوائی دوائیاں ہی سستی پڑ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ ''آپریشن کب کرنا ہے؟''

''جلد از جلد اس سے پہلے کہ یہ کینسر میچور ہو جائے اور بڑے حصے پر قبضہ کر لے۔'' انہوں نے کہا۔ ''میرے اندازے کے مطابق پانچ دن کے اندر ہو جانا چاہیے۔''

میں ابا کو لے کر گھر آیا تو میرا سر چکرا رہا تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں دو لاکھ کہاں سے کروں گا۔ کارخانے سے پہلے ہی پچاس ہزار لے چکا تھا۔ ابا کی اسکیم والی بچت ختم ہو گئی تھی۔ اب میری تنخواہ کٹ کر آتی تھی اور ابا کی پنشن تھی۔ اس سے گزارا ہو سکتا تھا ابا کا علاج نہیں۔ ایسے میں مجھے ایک ہی اُمید نظر آئی تھی مگر وہ اُمید بہت خوفناک بھی تھی۔

☆☆☆

میں ایوننگ شفٹ کر کے کارخانے سے نکلا تو سوا بارہ بج رہے تھے۔ شفٹ بارہ بجے ختم ہو جاتی تھی۔ مگر دوسرے بندے کو چارج دے کر باہر نکلتے نکلتے پندرہ بیس منٹ ہو جاتے تھے۔

سڑکوں پر آمد و رفت اور چہل پہل جاری ہوتی

ہے۔ میں جیسے ہی کارخانے سے باہر نکلا دو بائیکس پر سوار چار لڑکوں نے مجھے روک لیا۔ میرا دل ڈوب گیا کہ وہ لوٹنے اور بائیک چھیننے آئے ہیں۔ ایک لڑکا اتر کر میرے پاس آیا۔

''تجھے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

سوال کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ میرے پیچھے بیٹھ گیا اور پستول کی نال سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میری حالت زیادہ خراب ہوگئی کہ نہ جانے یہ مجھے کیوں لے جا رہے ہیں۔ یہ آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے جب شہر کے حالات کی خرابی عروج پر تھی۔ روزانہ دس بیس لوگ قتل ہو رہے تھے اور اکثر اندھے قتل تھے یعنی قاتلوں کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کون تھے اور کیوں مار گئے تھے۔ مرنے والوں کو اکثر ٹارگٹ بنا کر یا پھر ساتھ لے جا کر مارا جاتا اور ان کی لاشیں پھینک دی جاتی تھیں۔ اس لیے میرا پریشان ہونا لازمی تھا میں نے گھبرا کر کہا۔ ''تمہیں بائیک چاہیے تو لے جاؤ مجھے کیوں لے جا رہے ہو۔''

''بکواس نہ کر۔'' میرے پیچھے بیٹھے لڑکے نے غرا کر کہا۔ ''شرافت سے چل ورنہ بائیک کے پیچھے باندھ کر گھسیٹ کر لے جائیں گے۔''

وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔ مجبوراً میں نے بائیک آگے بڑھائی۔ کچھ دیر بعد ہم سائٹ کے ساتھ موجود ایک کچی آبادی میں داخل ہوئے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جرائم پیشہ افراد اور قاتلوں کی پناہ گاہ ہے۔ یہاں آ کر میری حالت مزید خراب ہوگئی۔ پتا نہیں میں بائیک کو کیسے قابو کیے ہوئے تھا۔ تاریک اور گندی گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک بڑے احاطے میں داخل ہوئے۔ ایک بائیک والے نے مخصوص انداز میں ہارن دیا تو دروازہ کھل گیا تھا۔ احاطے میں ایک دو منزلہ پکا مکان تھا۔ یہاں بجلی نہیں تھی مگر جنریٹر چل رہا تھا اور احاطہ روشن تھا۔ مجھے لانے والے پستول کی نوک پر ہی دھکیلتے ہوئے اندر لے گئے۔ دوسری منزل کے ایک پُرتعیش کمرے میں ایک شخص صرف نیکر میں اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا اور ایک آدمی اس کے جسم کی تیل سے مالش کر رہا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے نے اس آدمی سے کہا۔ ''جاجی بھائی بندہ آگیا ہے۔''

یہ نام سن کر میرے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ جاجی بھائی ایک معروف جرائم پیشہ، منشیات فروش، بھتہ خور اور ٹارگٹ کلرز کی ٹیم کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ میں نے اس کا نام بہت سنا تھا مگر دیکھا پہلی بار تھا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں میں سفاکیت جیسے تیر رہی تھی۔ وہ پچاس کے آس پاس کا تنومند شخص تھا۔ نزدیک ہی دیوار کے ساتھ اسلحہ یوں سجا ہوا تھا جیسے لوگ شوپیس سے اپنا ڈرائنگ روم سجاتے ہیں۔ اس میں جدید ترین خودکار اسلحہ بھی تھا۔ میرا خوف کسی قدر کم ہوا تھا کہ وہ مجھے مارنے نہیں لائے تھے ورنہ یہاں لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ایک گولی مار کر کہیں بھی پھینک دیتے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے جاجی بھائی نے بلایا ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا اور میرا جائزہ لیا۔ ''تو سیٹھ شفیق دلدار کے کارخانے میں کام کرتا ہے؟''

''جی جاجی بھائی۔''

''تیرے کارخانے میں مال بن کر کہاں جاتا ہے؟''

''کچھ گودام میں جاتا ہے کچھ آرڈر کا ہوتا ہے وہ کارخانے سے براہِ راست چلا جاتا ہے اور کچھ بیرونِ ملک کا ہوتا ہے جو بندرگاہ جاتا ہے۔'' میں نے وضاحت سے بتایا۔ اب میرا خوف اور کم ہوگیا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ معاملہ میرا نہیں بلکہ سیٹھ شفیق کا ہے۔ جب جاجی بھائی نے اگلا سوال کیا۔

''مال ہفتے میں کتنے دن جاتا ہے؟''

''عام طور سے جمعے یا ہفتے کی شام کو نکلتا ہے کبھی رات میں بھی جاتا ہے۔''

جاجی بھائی نے اسلحے میں سے ایک پستول اٹھالیا اور بولا۔ ''تجھے اپنی زندگی کتنی پیاری ہے؟''

میرا دم خشک ہوگیا اور میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ''جتنی سب کو پیاری ہوتی ہے۔''

''تب زندہ رہنا چاہے گا۔'' جاجی بھائی نے پستول میری طرف کیا۔ ''اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اگلے ہفتے جب کارخانے سے مال نکلنے لگے تو مجھے بتائے گا۔''

جاجی بھائی کی انگلی ٹریگر پر تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے انکار کیا تو وہ ٹریگر دبا دے گا۔ تب اللہ نے میرے ذہن میں ایک بات ڈالی اور میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''جاجی بھائی اگر تم نے مجھے مارنا ہے تو مار دو، لیکن میری ایک بات سن لو تمہاری مہربانی ہوگی۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر پستول نیچے کر لیا۔ ''بول۔''

''جاجی بھائی، میں بہت غریب گھر سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے باپ نے مجھے ہمیشہ رزق حلال کھلایا ہے۔ آج وہ کینسر سے جنگ لڑ رہا ہے اور میں اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جاجی بھائی شفا دینے والا اللہ ہے اور میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میرے باپ کی زندگی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں یہ بات نہ کہتا اپنی جان بچانے کے لیے تمہاری بات مان لیتا مگر اپنی جان میں اپنے باپ کی جان کے بدلے نہیں بچا سکتا۔''

''تجھے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔'' جاجی بھائی کا سخت لہجہ ذرا نرم ہوا تھا۔ ''اس کے تجھے پیسے ملیں گے۔''

میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''جاجی بھائی خدا کے لیے، اس کارخانے میں ڈیڑھ سو بندے کام کرتے ہیں۔ تم کسی کو بھی بلوا سکتے ہو وہ تمہارا کام کرے گا۔''

جاجی بھائی ہنسا۔ ''اگر اس کے باپ کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نکل آیا۔ اب کیا میں بندے ہی پکڑواتا رہوں گا۔''

میں سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے اس کے فیصلے کا انتظار تھا۔ اگر وہ پھر کہتا تو میرے لیے انکار ممکن نہیں تھا مگر اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے اپنے آدمی سے کہا۔ ''اسے باہر تک پہنچا دے کل کسی اور کو لانا۔''

''چل۔'' اس کے آدمی نے بدمزہ ہو کر کہا۔ اسے جاجی بھائی کی رحم دلی پسند نہیں آئی تھی۔ ہم باہر نکلنے لگے تو عقب سے جاجی بھائی نے کہا۔

''اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو ادھر آجانا۔''

میں حیران تھا کہ ایک بدنام زمانہ جرائم پیشہ مجھ پر یوں مہربان ہوا تھا کہ پہلے تو اس نے میری بات مان کر مجھے جانے دیا اور پھر مدد کی پیشکش بھی کر رہا تھا۔ اس کے آدمی مجھے آبادی کے باہر چھوڑ گئے اور جانے سے پہلے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس بات کا کسی سے ذکر کیا تو وہ پھر آئیں گے اور میری لاش گرا کر جائیں گے۔ میں نے یقین دلایا کہ میں اپنے باپ سے بھی نہیں کہوں گا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں رات دو بجے گھر پہنچا تو ابا جاگ رہے تھے مجھ سے پوچھا تو میں نے بہانہ کر دیا کہ نائٹ شفٹ کا سپروائزر دیر سے آیا تھا اس لیے مجھے وہاں رکنا پڑ گیا اور آتے آتے دو بج گئے تھے۔ اس کے بعد جاجی بھائی نے کسی اور کو بلایا یا نہیں مجھے اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ کئی دن میں سہا رہا کہ میری شامت نہ آجائے مگر جب دوبارہ جاجی بھائی کے آدمی نظر نہیں آئے تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ احاطے کا فولادی دروازہ بجایا۔ چند لمحے بعد اندر سے کسی نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں جی ندیم ہوں۔ جاجی بھائی کے پاس آیا ہوں۔''

جواب میں دروازہ کھلا اور ایک مجرم صورت نوجوان نے باہر جھانکا اور ناک سکیڑ کر میرا جائزہ لیا۔ ''کون ہے تو اور جانتا ہے جاجی بھائی کون ہیں؟''

''میں ایک بار ملنے آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر مجھے ادھار کی ضرورت ہو تو اس کے پاس آجاؤں۔''

یہ سنتے ہی اس کے تاثرات بدل گئے اور وہ اندر غائب ہوگیا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے میں ایک کمرے کے سامنے رکا اور جب اس کے ساتھ لگا ہوا سبز بلب روشن ہوا تو وہ مجھے لے کر آگے بڑھا اور ایک منٹ سے بھی پہلے میں جاجی بھائی کے سامنے اسی نشست گاہ میں تھا۔ وہاں دیوار کے ساتھ سجا ہوا اسلحہ تک ویسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج جاجی بھائی مکمل لباس میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے شیشے کی میز پر شیشے کی بوتل اور گلاس میں ام الخبائث موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پہلے گلاس سے ایک گھونٹ لیا اور پھر بولا۔ ''کیوں آئے ہو؟''

''جاجی بھائی مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ آپ نے کہا تھا......''

''کتنی رقم کی ضرورت ہے؟'' اس نے بات کاٹ کر پوچھا۔

''دو لاکھ روپے۔''

اس نے مجھے لانے والے کی طرف دیکھا تو وہ گیا اور چند منٹ بعد ہزار کے نوٹوں والی دو گڈیاں لا کر جاجی بھائی کے سامنے رکھ دیں۔ اس بار بھی میں حیران رہ گیا تھا۔ اس نے ایک بار کہنے پر رقم میرے سامنے رکھ دی تھی۔ پھر اشارہ کیا کہ میں رقم اٹھا لوں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے گڈیاں اٹھائیں تو اس نے کہا۔ ''چیک کر لے۔''

''ٹھیک ہے جاجی بھائی۔'' میں نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں جلد یہ رقم واپس کر دوں گا۔''

''تین مہینے میں۔'' اس نے بے نیازی سے پہلا بم

گرایا۔

میں گھبرا گیا۔ ''جاجی بھائی اتنی جلدی میں نہیں کر سکتا دو لاکھ......''

''واپس چار لاکھ کرنے ہیں۔'' اس نے دوسرا بم گرایا۔ ''تین مہینے کے اندر چار لاکھ واپس کرنے ہیں۔''

''جاجی بھائی میں کہاں سے کروں گا۔'' میں نے کہا اور گڈیاں واپس رکھ دیں۔

''رقم میں دے چکا ہوں اگر واپس کرنے ہیں تو دو لاکھ اور دو۔''

اس سے پہلے میں کچھ کہتا۔ اس نے اپنے آدمی سے کہا۔ ''ایک منٹ بعد اسے باہر کر دینا۔ جا کر اس کا گھر دیکھ لینا۔ ابھی یہ رقم نہیں لے جاتا تو تین مہینے بعد اس سے دو لاکھ لینے ہیں ورنہ چار لاکھ۔''

''سن لیا۔'' مجھے لانے والے آدمی نے کہا۔ ''ایک منٹ ہے تیرے پاس۔''

میں نے ایک منٹ سے پہلے فیصلہ کر لیا۔ میں نے گڈیاں اٹھالی تھیں کیونکہ ان سے میرے باپ کی زندگی وابستہ تھی۔ جاجی بھائی کا آدمی میرے ساتھ میرے گھر تک آیا اور پھر واپس چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ گھر نہ بھی دیکھتا تب بھی با آسانی میرا پتا چلا سکتا تھا۔ کارخانے میں دسیوں میرے جاننے والے تھے اور یہ سارا علاقہ ہی مجھے جانتا تھا۔ مجھے تلاش کرنا بہت آسان تھا۔ اب مجھے لگا کہ جاجی بھائی نے اس طرح مجھ سے انتقام لیا تھا کہ میں نے اس کا کام کرنے سے انکار کیسے کیا؟ وہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا اور اسے معلوم تھا کہ میرے باپ کو ایسی بیماری ہے کہ مجھے قرض کی ضرورت پڑ جائے گی تب ہی اس نے فراخ دلی سے پیش کش کی تھی۔ اسے اُمید تھی کہ میں اس کے جال میں ضرور آؤں گا۔ جب میں رقم لے کر وہاں سے نکل رہا تھا تو جاجی بھائی نے کہا تھا۔ ''ایک بات یاد رکھنا تین مہینے بعد مجھے چار لاکھ روپے یا تیری جان دونوں میں سے کوئی ایک چیز چاہیے ہوگی۔''

ان دنوں میں ڈبل شفٹ میں کام کر رہا تھا۔ فیکٹری منیجر طاہر صاحب نیک فطرت آدمی تھے جب انہیں میرے مسئلے کا پتا چلا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ تنخواہ سے ہر مہینے چار ہزار روپے کٹ رہے ہیں تو انہوں نے میری شفٹ ڈبل کر دی تھی۔ اب میں صبح آٹھ بجے سے رات بارہ بجے تک کارخانے میں ہوتا تھا اور صرف اس دن ایک شفٹ کرتا جب ابا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوتا تھا۔ یوں چار ہزار کٹنے سے جو کمی ہوتی تھی وہ پوری ہو جاتی تھی بلکہ مجھے اضافی کچھ رقم بھی مل جاتی تھی۔ یہاں سارے غریب گھروں کے لوگ کام کرتے تھے اور سب کو اوور ٹائم درکار ہوتا تھا اس لیے یہ پالیسی بنادی تھی کہ کسی بھی ورکر کو مہینے میں اسی گھنٹے سے زیادہ اوور ٹائم نہیں ملے گا۔ لیکن طاہر صاحب نے میری مجبوری کی وجہ سے مجھے اس سے مستثنیٰ قرار دیا تھا اور میں چاہتا تو پورے مہینے بھی اوور ٹائم کر سکتا تھا۔

رقم ملنے کے دو دن بعد ابا کا دوبارہ آپریشن ہوا اور پھیپھڑے کا کینسر والا باقی حصہ بھی نکال دیا گیا۔ اس بار بھی ابا پانچ دن کلینک میں داخل رہے اور تمام احتیاطوں سے گزرنا پڑا۔ ڈاکٹر احسان نے ان کی دوائیں منگوادی تھیں اور ان کا یہ بھی احسان تھا کہ دوبارہ آپریٹ کے پیسے نہیں لیے ورنہ میں نے دیکھا ہے کہ ڈاکٹر اور خاص طور سے سرجن فیس نہیں چھوڑتے ہیں۔ ایک مہینے بعد ابا ٹھیک ہو گئے تھے کیونکہ اس بار ان کے ٹیسٹ کلیئر آئے تھے اور کینسر مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا مگر ڈاکٹر احسان نے مجھ سے کہا کہ میں چھ مہینے بعد ان کا دوبارہ چیک اپ کراؤں اور اس کے بعد سال میں کم سے کم ایک بار ان کا چیک اپ کراتا رہوں۔ مگر جب ابا نے سنا تو صاف انکار کر دیا بولے۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے یہ سب ان ڈاکٹروں کے چکر ہوتے ہیں۔ لاکھوں لے کر بھی اس کا دل نہیں بھرا۔''

ابا کو میں نے اضافی دو لاکھ کا بتایا نہیں تھا ورنہ وہ ٹینشن میں آجاتے اور یہ چیز ان کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں تھی مگر اندر سے فکر مجھے کھائے جا رہی تھی کہ میں دو مہینے میں چار لاکھ کہاں سے کروں گا۔ مہلت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جاجی بھائی کہہ چکا تھا کہ اسے رقم یا میری جان میں سے کوئی ایک چیز چاہیے ہوگی۔ کسی سے چار لاکھ ملنا اس سے بھی زیادہ محال تھا۔ میری فکر اتنی بڑھی کہ میں بیمار نظر آنے لگا۔ ابا جن کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی وہ مجھ سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکے کہ مجھے کیا ہوا ہے اور میں اتنا کمزور کیوں ہو رہا ہوں۔ مگر میں انہیں ٹال گیا اور کمزوری کی وجہ کام کی زیادتی کو قرار دیا۔ دو شفٹوں میں کام کرنے کے بعد مجھے گھر کے بہت سے کام دیکھنا پڑتے تھے اور آرام کا موقع کم ملتا تھا۔ ایک مہینے بعد ابا نے یہ کام سنبھال لیے جیسے کھانا بنانا، گھر کی صفائی اور باہر سے سودا وغیرہ لانا۔

گھر کی ذمے داریاں کم ہوئی تھیں مگر جاجی بھائی والا

معاملہ موت کے فرشتے کی طرح میرے سر پر سوار تھا۔ میں دو بار اس کی منت سماجت کرنے اس کے ٹھکانے پر گیا مگر اس کے گرگوں نے مجھے وہاں سے بھگا دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس آفت سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں۔ ان دنوں کارخانے میں کام بڑھ رہا تھا۔ کچھ نئی مشینیں لگی تھیں جو لگژری گاڑیوں کے پرزے بنا سکتی تھیں۔ یہ جدید مشینیں باہر سے آئی تھیں اور ان کے لیے تربیت یافتہ لڑکے رکھے گئے تھے۔ ان کے سپروائزر بھی دوسرے آئے تھے۔ مشینیں لگتے ہی ان پر دھڑا دھڑ کام شروع ہو گیا اور پرزے بن بن کر کمپنی کے گودام میں جانے لگے۔ یہاں تین شفٹوں میں کام ہو رہا تھا۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں اس لیے میں نے تجسس نہیں کیا کہ نئے پرزے کہاں جا رہے ہیں اور ان کے مقامی آرڈر کیوں نہیں آ رہے۔ مقامی آرڈر کارخانے سے پیک ہو کر براہِ راست جاتے تھے اسی طرح بیرونِ ملک جانے والے پرزے بھی یہیں سے پیک ہو کر جاتے تھے۔ صرف گودام میں کھلا مال جاتا تھا اور حسبِ ضرورت وہیں سے پیک ہو کر آگے جاتا تھا۔

دوسرا مہینا بھی ختم ہونے والا ہو گیا تو میری فکر بھی سوا ہو گئی تھی اب میرے پاس صرف ایک مہینا رہ گیا تھا۔ اب مجھے اپنے بجائے ابا کا خیال آنے لگا تھا کہ میرے بعد ان کا کیا ہوگا۔ میری موت کا صدمہ تو الگ ہوگا مگر جب میری تنخواہ نہیں ہوگی تو وہ گزارا کیسے کریں گے۔ صرف پنشن میں گزارا ہونا تو ممکن نہیں تھا اس میں تو ایک آدمی تین وقت سستا ترین کھانا بھی پیٹ بھر کر نہیں کھا سکتا تھا۔ ابا کے بھائیوں سے قطعی اُمید نہیں تھی جو ان کی صحت یابی پر بھی انہیں دیکھنے نہیں آئے تھے۔ پھپھو کو ابا سے محبت تھی مگر وہ اپنے شوہر کی وجہ سے مجبور تھیں اور ان سے بھی یہ توقع نہیں تھی کہ وہ بھائی کا خیال رکھیں گی۔ ابا بالکل اکیلے رہ جاتے ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوتا تو شاید وہ چند مہینے بھی زندہ نہ رہ پاتے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے۔ امکان تھا کہ میری موت کا صدمہ ہی ان کے لیے جان لیوا ہوگا۔

دوسرا خیال مجھے رضوانہ کا آ رہا تھا۔ جب سے وہ ہمارے ہاں سے ہو کر گئی تھی اور اس نے انوکھے انداز میں اپنی چاہت و خلوص کا اظہار کیا تھا تب سے میرے اندر اس کی محبت دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا اس سے رابطہ نہیں تھا مگر اس کا خیال ذہن سے جاتا نہیں تھا۔ کئی بار مجھے خیال آیا کہ اس سے ملوں مگر ہمت نہیں ہوئی تھی۔ مگر اب میرے پاس ایک ہی مہینا رہ گیا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس سے مل لوں اور اسے بتا دوں کہ میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ شاید ہمارا رشتہ کبھی شادی کی منزل تک نہ پہنچ سکے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے دل پر کیا گزرے گی لیکن میں اسے بے خبر بھی رکھنا نہیں چاہتا تھا یہ اس کے ساتھ زیادہ بڑا ظلم ہوتا۔ اس لیے میں اس سے ملنے کے لیے اپنے اندر ہمت جمع کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کس کالج میں پڑھتی ہے۔ رضوانہ کا گھر پاک کالونی میں تھا اور اس کا کالج بھی زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک دن میری ایوننگ شفٹ تھی یعنی اس روز اوور ٹائم نہیں تھا۔ میں دوپہر کے قریب گھر سے نکلا اور رضوانہ کے کالج پہنچ گیا۔ چھٹی ہوئی تو لڑکیوں کا غول نکلا اور ان میں بے شمار عبایا پوش تھیں جنہوں نے نقاب بھی لیا ہوا تھا۔ میں چکرا گیا کہ ان میں رضوانہ کو کہاں تلاش کروں۔ مگر قدرت مدد پر آمادہ تھی۔ اچانک کسی لڑکی نے زور سے کہا۔ ”رضوانہ کل آؤ گی؟“

”ہاں۔“ ایک لڑکی نے مڑ کر جواب دیا۔ ”آؤں گی۔“

وہ رضوانہ تھی جو پیدل ہی بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ کچھ وین میں جا رہی تھیں اور کچھ پیدل ہی تھیں۔ میں بائیک ذرا آگے لے گیا اور ایک جگہ رک گیا۔ جب رضوانہ نزدیک آئی تو میں نے اسے آہستہ سے آواز دی۔ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر آس پاس کا جائزہ لیا مگر کوئی لڑکی اس کی طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں ایک بڑے تنے والے درخت کے عقب میں تھا۔ وہ بھی اس کے عقب میں آ گئی۔ ”آپ......“

”رضوانہ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز صرف چند منٹ کی بات ہے پھر میں تمہیں گھر کے پاس چھوڑ دوں گا۔ تم زیادہ دیر سے گھر نہیں پہنچو گی۔“

خود رضوانہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ کالج کے پاس کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں تھا وہ بائیک پر میرے پیچھے بیٹھ گئی اور میں اسے ایک عام سے لیکن فیملی ریستوران میں لے آیا۔ گرمی تھی اور جلدی تھی اس لیے میں نے کولڈ ڈرنک منگوالی۔ ویٹر کے جاتے ہی وہ بولی۔ ”ندیم کیا بات ہے جلدی کہیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے انکل کی طبیعت تو ٹھیک

ہے نا۔''
''ان کی طبیعت ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ اس دوران میں ویٹر کولڈ ڈرنک کی بوتلیں لے آیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اسے مختصراً اس چکر کا بتایا جس میں میں پھنس چکا تھا اور نکلنے کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جب میں نے بات ختم کی تو وہ رونے جیسی ہو رہی تھی۔

''ندیم اب کیا ہوگا؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''میں نہیں جانتا لیکن رضوانہ میں تمہیں کسی دھوکے میں بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔''

''پلیز ایسا مت کہیں۔'' وہ رونے لگی۔

''تمہیں حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ شاید اللہ کوئی سبیل نکال دے ورنہ......''

''میں امی سے بات کرتی ہوں انہوں نے میرے لیے کچھ زیور بنا کر رکھا ہے اور پھر مکان......''

''رضوانہ پلیز۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''تم سے میں نے یہ سب اس لیے شیئر نہیں کیا ہے۔''

''مشکل میں اپنے ہی کام آتے ہیں۔'' اس نے تڑپ کر کہا۔ ''آپ مجھے منع مت کریں۔''

''تمہیں قسم ہے تم ایسی کوئی بات نہیں کرو گی۔ میں نہیں چاہتا کہ بات آنٹی تک پہنچے اور وہ مشکل میں پڑ جائیں۔''

''کیسی مشکل؟''

''دیکھو وہ پہلے تمہاری ماں ہیں اور کوئی ماں اپنی بیٹی کا رشتہ ایسے آدمی سے کیسے برقرار رکھ سکتی ہے جس کے اگلے پل کا پتا نہ ہو۔ اگر انہوں نے رشتہ توڑ دیا اور یہاں میرے مسئلے کا کوئی حل نکل آیا تو تم سوچ سکتی ہو کہ ہمارا ملاپ پھر بھی نہیں ہو سکے گا۔''

اس کا چہرہ مزید زرد پڑ گیا تھا۔ رضوانہ بہت حسین اور متوجہ کرنے والی لڑکی نہیں تھی مگر اس میں ایک معصومانہ دلکشی پائی جاتی تھی۔ لباس وہ ایسا پہنتی تھی جس میں جسم نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ چھریرے جسم کی مالک تھی۔ جب سے میری اس سے منگنی ہوئی تھی وہ مجھے دنیا کی حسین ترین لڑکی لگنے لگی تھی۔ جب بھی میں رضوانہ کے بارے میں سوچتا تو میرے دل میں جیسے ابال آجاتا تھا شاید یہی محبت تھی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں چھلکتے آنسو دیکھ کر میں نے بے قرار ہو کر اسے اپنا رومال دیا۔ اس نے آنسو صاف کیے اور رومال مجھے واپس کرنے کے بجائے ہاتھ میں ہی رکھا اور کچھ دیر بعد اسے اپنے بیگ میں ڈال لیا۔ میں نے کوئی ردِعمل نہیں دیا تھا۔ شاید وہ اسے میری نشانی کے طور پر رکھنا چاہتی تھی۔ نشانی پر مجھے خیال آیا کہ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ رضوانہ نے گھڑی دیکھی اور بولی۔ ''اب تک میں گھر پہنچ جاتی ہوں۔''

''میں دس منٹ میں پہنچا دوں گا۔'' میں نے ایک نوٹ نکال کر بل کے لیے رکھا اور رضوانہ نقاب درست کرنے لگی جو اس نے یہاں آنے کے بعد ہٹا دیا تھا۔ ہم باہر آئے اور میں نے اسے دس منٹ سے بھی پہلے اس کی گلی کے پاس اتار دیا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے کہا۔

''اپنا خیال رکھیے گا میں آپ کے لیے بہت دعا کروں گی۔''

''شاید تمہاری دعائیں میرے کام آئیں۔'' میں نے کہا اور بائیک آگے بڑھا دی۔ میں شام کے وقت کارخانے پہنچا تو وہاں کچھ ہنگامی صورتِ حال تھی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی جہاں ایک وقت میں ساٹھ سے اوپر لوگ کام کرتے ہوں وہاں کوئی نہ کوئی مسئلہ اٹھتا رہتا ہے۔ میں اپنے سیکشن کی طرف جا رہا تھا کہ انجینئر فرخ صاحب نے مجھے بلا لیا۔ میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا۔

''یار ایک مسئلہ ہو گیا ہے نئی مشینوں کا سپروائزر بیمار پڑ گیا ہے تم اس کی جگہ کام دیکھ لو۔''

''لیکن سر مجھے تو ان مشینوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''یار مینول دیکھ لو اور کوئی مسئلہ ہو جو سمجھ میں نہ آئے تو میرے پاس آجانا۔ کام کرو گے تو سیکھو گے۔''

مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی مگر میرے پاس وقت کہاں تھا جو میں کچھ نیا سیکھتا۔ بہرحال حکم حاکم تھا۔ مجبوراً میں نئی مشینوں والے سیکشن میں آیا۔ یہاں کل چھ مشینیں لگی تھیں جو مختلف پرزے بناتی تھیں۔ چھ بندے کام کر رہے تھے اور ساتواں اس میں سپروائزر تھا۔ میں نے مینول دیکھا اور مجھے بالکل آسان لگا تھا۔ ظاہر ہے میں ایسی ہی مشین پر برسوں سے کام کر رہا تھا۔ یہ مشینیں فونڈری سے ڈھلے ہوئے پرزوں کو فنش کرتی تھیں۔ کام جاری تھا میں بننے والے پرزوں کو چیک کر رہا تھا۔ بظاہر یہ اعلیٰ درجے کے میٹریل سے اعلیٰ درجے کے فنش کیے ہوئے پرزے تھے جو

پالش کے بعد چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اتنے عرصے کام کر کے مجھے کسی قدر پتا چل گیا تھا کہ کون سا پرزہ کس کام آتا ہے اور اس کی مالیت کیا ہوسکتی ہے۔ مجھے لگا کہ یہ پرزے بہت مہنگی گاڑیوں کے تھے۔

مگر اس قسم کی گاڑیوں میں ہمیشہ جنیوین پرزے لگتے ہیں اور یہ پرزے گاڑیاں بنانے والی کمپنیاں خود تیار کر کے اپنے مخصوص ڈیلرز کے ذریعے فروخت کرتی ہیں۔ کیونکہ کمپنیاں ان سے بہت کماتی ہیں اس لیے وہ ان کی تیاری کا ٹھیکا کسی دوسری کمپنی کو بھی نہیں دیتی ہیں۔ میں حیران تھا کہ ہمارے کارخانے میں اس قسم کے پرزے کیسے بن رہے ہیں اور ان کا خریدار کون ہوگا۔ ایک بار ایک بڑی ورکشاپ کا مالک ہمارے کارخانے آیا تھا اور وہ بہت باتونی آدمی تھا۔ اتفاق سے میں ہی اس کے ساتھ تھا۔ اسے کچھ پرزے چاہیے تھے جو مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھے اور وہ ہم سے بنوانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس ری کنڈیشن لگژری گاڑیاں آئی تھیں۔ ان میں مرمت کا کچھ کام تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مارکیٹ دستیاب پرزے بہت ہلکی کوالٹی کے تھے اور ایک نمبر باہر سے منگوائے جاتے تو بہت مہنگے پڑتے اس لیے وہ بنوانے کے لیے ہمارے کارخانے آیا تھا۔

اس سے مجھے اس بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔ ہم نے اسے پرزے بنا کر دیئے تھے جو اچھی کوالٹی کے تھے مگر ان کی فنشنگ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ لیکن اس وقت یہاں جو پرزے بن رہے تھے وہ بین الاقوامی کوالٹی کے حامل تھے۔ باقی اندر کا مال مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسا تھا کیونکہ ابھی تک میں نے دیکھا نہیں تھا۔ ایک کھیپ نمٹانے کے بعد جب ڈھلے ہوئے پرزوں کی دوسری کھیپ آئی تو میں نے دیکھا کہ یہ عام سے میٹریل کے تھے یعنی صرف فنشنگ ہی تھی ورنہ اندر سے کوالٹی مقامی ہی تھی۔ گویا یہاں دو نمبر کام ہو رہا تھا اور ایسا میں نے پہلی بار ہوتے دیکھا تھا۔ ورنہ یہاں جس کوالٹی کی چیز بنائی جاتی تھی فنشنگ بھی اسی کوالٹی کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے مستقل گاہکوں کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا اس لیے جو وہ قیمت دے رہے تھے اسی قیمت کی فنشنگ کر کے چیز ان کو دی جا رہی تھی۔ لڑکے خاموشی سے اپنا کام کر رہے تھے اور دوسرے لڑکوں کی طرح وہ آپس میں ہنسی مذاق یا باتیں نہیں کر رہے تھے۔ شفٹ رات بارہ بجے ختم ہوئی اور اس دوران میں اس شفٹ کا سپروائزر اور دوسرے لڑکے آ گئے تھے۔ جانے سے پہلے مجھے انجینئر فرخ صاحب نے بلایا اور آہستہ سے کہا۔ ''یہاں جو بن رہا ہے اس کے بارے میں کسی سے بات مت کرنا۔''

''جی سر۔''

''اس شفٹ کے تمہیں دو سو روپے اضافی دیئے جائیں گے۔''

''جی سر۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں خوش ہو جاتا لیکن اس وقت دو سو روپے مجھے بے وقعت لگ رہے تھے۔ کیونکہ مجھے چار لاکھ روپے ادا کرنے تھے اور میرے پاس ایک مہینے کا وقت رہ گیا تھا۔ میں جانے لگا تو انجینئر صاحب نے روکا۔

''اتنی جلدی کیا ہے، پوری بات تو سنتے جاؤ۔ ابھی یہ شفٹ تمہیں ہی دیکھنی ہے کیونکہ اس کا سپروائزر بیمار ہے جب تک وہ نہیں آتا تم اس کی جگہ کام کرو گے۔''

''یس سر۔'' میں نے تیسری بار کہا اور کارخانے سے نکل آیا۔ اگرچہ یہ خاصی انوکھی بات تھی اور اگر جاجی بھائی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں اس میں بہت دلچسپی لیتا۔ اگلے دن میں نے ایک شفٹ نارمل کی اور پھر ایوننگ شفٹ میں یہاں آ گیا۔ اس روز بھی خاموشی سے کام ہوتا رہا۔ میں نے ایک دو بار لڑکوں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے خاص ردعمل نہیں دیا۔ مجھے لگا جیسے انہیں منع کیا گیا تھا کہ آپس میں یا مجھ سے بات نہ کریں۔ اگرچہ وہاں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا مگر انجینئر صاحب وقفے وقفے سے اس حصے کا چکر لگا رہے تھے اور کام دیکھ رہے تھے۔ فنش ہونے والے پرزے سادہ پیکنگ میں گودام بھیجے جا رہے تھے اس لیے مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ اصل میں کہاں کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

کئی دن میں اسی جگہ لگا رہا پھر اس شفٹ کا سپروائزر ٹھیک ہو کر آ گیا اور میں اپنی جگہ واپس آ گیا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ دس دن رہ گئے تھے۔ ابھی جاجی بھائی کے کسی گرگے نے نہ تو مجھ سے رابطہ کیا تھا اور نہ ہی ان میں سے کسی کی صورت دکھائی دی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ آخری دن وہ آئیں گے اور مجھے لے جائیں گے۔ اگر میں کہیں چھپ بھی جاؤں تو کتنے دن چھپا رہوں گا۔ پھر ابا کو لے کر کہاں جاتا۔ اگر انہیں چھوڑ جاتا تو میری جگہ جاجی بھائی کے آدمی ابا کو لے جاتے۔ وہ لوگ رضوانہ اور اس کی امی کے گھر تک بھی پہنچ سکتے تھے اور میں ایک اپنی ذات کے لیے اتنے لوگوں کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں سوچ رہا

تھا کہ آخری دن خود ہی جاجی بھائی کے سامنے پیش ہو جاؤں۔ اپنی تقدیر کا لکھا ہوا فیصلہ قبول کرلوں۔ یہی سوچتا ہوا اگلے دن کارخانے پہنچا تو وہاں پھر ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ہنگامہ گیٹ پر ہی ہو رہا تھا۔ پتا چلا کہ گودام سے آنے والے سپروائزر نے طاہر صاحب سے بدتمیزی کی تھی اور نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ گاڑی تیار کھڑی تھی اور سامان گودام تک پہنچانا تھا مگر اب صرف ڈرائیور تھا اور گاڑی اس کے سپرد نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں اندر پہنچا تو طاہر صاحب کی نظر مجھ پر پڑی اور انہوں نے بلالیا۔

''ندیم تم گاڑی کے ساتھ جاؤ اور سامان گودام کے انچارج کے سپرد کر کے آؤ۔''

''میں سر؟''

''ہاں یار سپروائزر نے جاب چھوڑ دی ہے۔'' انہوں نے گالی دی حالانکہ وہ بہت کم گالی دیتے تھے مگر اس وقت غصے میں تھے۔ ''اسے بھی ابھی جاب چھوڑنی تھی۔''

میں نے سامان کی لسٹ لی جو چھوٹی سی فائل کی صورت میں تھی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ شہزور تھی۔ عقب میں لکڑی کی پیٹیوں میں پرزے موجود تھے۔ گودام سائٹ ایریا میں ہی تھا۔ کچھ دیر میں گاڑی وہاں پہنچی۔ ریکارڈ کیپر نے مجھ سے فائل لی اور بولا۔ ''میری مدد کرو آج دو بندے شارٹ ہیں۔''

''مجھے واپس جانا ہے۔''

''کیسے جاؤ گے؟'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''یہی گاڑی لے جائے گی اور جب تک گاڑی خالی نہیں ہوگی کیسے جاؤ گے۔''

مرتا کیا نہ کرتا اس کے ساتھ لگ گیا۔ مزدور سامان اتار رہے تھے اور وہ میری مدد سے اس کو ویری فائی کر رہا تھا۔ یہ سارا ہی دو نمبر پرزوں پر مشتمل مال تھا جو گودام کے ایک خاص حصے میں پہنچایا جا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے سرسری سے انداز میں ریکارڈ کیپر سے کہا۔ ''کیا یہ مال بھی باہر جائے گا؟''

میں نے تکا مارا تھا اگر یہ مال واقعی باہر جانا تھا تو وہ سمجھتا کہ مجھے علم ہے اور وہ مجھے اس کے بارے میں بتاتا۔ ریکارڈ کیپر نے چونک کر مجھے دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں یہ باہر جائے...... سارا ہی باہر جاتا ہے۔''

''مڈل ایسٹ؟'' میں نے پھر تکا مارا تو وہ بیزاری سے بولا۔

''کیوں پوچھ رہے ہو یار، سارا وہیں تو جاتا ہے۔''

گویا یہ مال سارے کا سارا مڈل ایسٹ جاتا تھا۔ مگر اس کا وہاں کیا کام ہوسکتا تھا۔ کیونکہ وہ مارکیٹ تو ساری ہی لگژری گاڑیوں والی تھی اور وہاں کے لوگ اپنی گاڑیوں میں دو نمبر پرزے کیوں لگاتے اور جو لگاتے وہ پکڑے جانے سے کیسے بچے ہوئے تھے کیونکہ قانون وہاں بہت سخت ہے۔

کچھ دیر بعد ریکارڈ کیپر نے خود ہی رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا کہ یہ پرزے اصل میں ان ری کنڈیشن گاڑیوں میں لگتے ہیں جو مقامی استعمال کے بعد اونے پونے خرید لی جاتی ہیں اور پھر انہیں ری کنڈیشن کر کے برصغیر اور آس پاس کے ممالک بھیجا جاتا ہے۔ اصل پرزے بہت مہنگے ہوتے ہیں اس لیے دو نمبر پرزے تیار کرا کے بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں صرف ہمارا کارخانہ ہی نہیں اور بھی بہت سے کارخانے یہ پرزے تیار کر رہے ہیں۔ ریکارڈ کیپر مجھے رازدار سمجھ رہا تھا اس لیے کھل کر بات کر رہا تھا اور اس نے تقریباً سب کچھ ہی بتا دیا تھا۔

جہاں مزدور پیٹیاں اتار کر رکھ رہے تھے وہاں پہلے سے مزید پیٹیاں موجود تھیں۔ ریکارڈ کیپر نے بتایا کہ دو ہفتے بعد یہ سارا سامان ایک کنٹینر میں پیک کر کے بندرگاہ پہنچے گا۔ جہاں سے کسی جہاز پر بار کر کے اسے مڈل ایسٹ کے ایک ملک بھیجا جائے گا۔ ایک گھنٹے بعد شہزور کے ڈرائیور نے مجھے کارخانے پر اتار دیا۔ میں دو شفٹیں بھگتا کر گھر پہنچا تو تھکن سے چور تھا۔ ابا جاگ رہے تھے انہوں نے میرے لیے چائے بنائی تھی کیونکہ دوپہر اور رات کا کھانا میں کارخانے میں کھاتا تھا۔ صبح گھر سے ناشتا کر کے جاتا تھا۔ ابا نے کہا۔ ''کیوں اتنی جان مار رہا ہے۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ دیکھ تو نے اپنی حالت کیا کرلی ہے۔''

میں ابا سے کیا کہتا کہ میں سچ مچ جان سے جانے والا تھا۔ زبردستی مسکرایا اور ابا سے کہا۔ ''بس اس مہینے کی حد تک مسلسل اوور ٹائم ہے اس کے بعد آرام ہوگا۔''

میں نے دل میں کہا تھا کہ آرام ہمیشہ کا ہوگا۔ ابا خوش ہوگئے۔ ''اچھا ہے، میں تو سوچ رہا ہوں کہ میں کوئی چھوٹا موٹا کام تلاش کرلوں سارا دن گھر میں فارغ بیٹھا رہتا ہوں۔''

''نہیں ابا آپ کام نہیں کریں گے ابھی میں زندہ ہوں۔'' میں نے چائے کا کپ خالی کیا۔ ''میں نہ رہوں پھر دیکھ لینا۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ابا گھبرا کر بولے۔ ''ایسی باتیں

کیوں نکالتا ہے منہ سے؟''

''ابا موت تو آنی ہے۔''

''تیری بجائے مجھے آجائے۔''

''ابا موت سب کو آتی ہے ایک دن کے بچے کو بھی، نوجوان کو بھی اور بوڑھے کو بھی۔''

''کام کر کے تیرا دماغ چل گیا ہے اس لیے ایسی باتیں کر رہا ہے جا کر سو جا۔''

میں سویا مگر خواب میں بھی جاجی بھائی اور اس کے گرگے مجھے ڈراتے رہے۔ کبھی وہ مجھے گولی مار رہے ہوتے تھے اور کبھی تلوار سے میرا سر قلم کر رہے ہوتے۔ صبح ابا نے جھنجھوڑ کر اٹھایا۔ ''کیا ہے کیوں چلا رہا ہے۔''

اس وقت جاجی بھائی کے گرگے مجھے گاڑی سے باندھ کر زمین پر کھینچ رہے تھے اور میں چیخ چیخ کر ان سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''خواب دیکھ رہا تھا۔''

''خواب تو خواب ہوتا ہے۔''

لیکن کچھ خواب حقیقت کا روپ بھی دھار لیتے ہیں اور یہ ایسا ہی خواب لگ رہا تھا۔ خواب کے مناظر بہت واضح تھے اور سچی بات ہے کہ میرا دل دہل گیا تھا۔ جس خوف کو میں اب تک محسوس کر رہا تھا اس خواب نے اسے بھرپور کر کے میرے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ ناشتا کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں کہیں سے چار لاکھ روپے نہیں کر سکتا۔ ابا کے علاج کے لیے کارخانے سے جو قرض لیا تھا وہ ابھی نصف بھی ادا نہیں ہوا تھا۔ پچاس ہزار کا قرض ملا تھا۔ وہ بھی منت سماجت کے بعد۔ چار لاکھ روپے کہاں سے ملتے؟ مجھے طاہر صاحب کا خیال آیا وہ ہمدرد انسان تھے۔ میں نے سوچا کہ ایک کوشش کر کے دیکھ لوں۔ شاید مجھے چار لاکھ مل جائیں جو میں تنخواہ سے قسطوں میں کٹوا دوں۔ اوور ٹائم سمیت مجھے چوبیس ہزار مل جاتے تھے۔ اس میں سے چار ہزار قسط میں کٹ کر باقی بیس ملتے تھے۔ کوئی ساڑھے چار ہزار ابا کی پنشن تھی۔

مکان کا کرایہ پانچ ہزار تھا۔ بجلی اور گیس کی مد میں کوئی دو ہزار نکل جاتے تھے۔ باقی سترہ ہزار میں مجھے اور ابا کو گزارا کرنا ہوتا تھا۔ اگر مجھے چار لاکھ مل بھی جاتے تو میں کہاں سے اتارتا اور پھر اپنا گزارا کیسے ہوتا۔ رضوانہ کی امی نے دو سال کا کہا تھا جس میں سے ایک تقریباً گزر گیا تھا۔ قرض لینے کی صورت میں میں صرف شرعی طریقے سے شادی کر سکتا تھا کہ رضوانہ کو دو کپڑوں میں لے آتے اور وہ اپنا نصیب ساتھ لاتی۔ مگر یہ سب اسی صورت میں ہوتا جب مجھے چار لاکھ مل جاتے۔ کارخانے آتے ہی میں نے طاہر صاحب کو درخواست بھیج دی کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ نگران کی طرف سے جواب آیا کہ آج وہ بہت مصروف ہیں میں کل ان سے ملوں۔ اگلے دن کا بے تابی سے انتظار کیا اور صبح سویرے جیسے ہی طاہر صاحب آئے میں ان کے پاس پہنچ گیا۔

''کہو کیا بات ہے؟''

''طاہر صاحب میں بہت مشکل میں پڑ گیا ہوں آپ میری بات سن لیں۔''

''کہو۔'' انہوں نے کہا تو میں نے مختصر الفاظ میں انہیں سب بتا دیا۔ یہ بھی کہ میں جاجی بھائی جیسے خطرناک آدمی کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔ طاہر صاحب پریشان ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ تو بہت برا ہوا ہے اور یہاں مالکان تمہاری کوئی مدد نہیں کریں گے بلکہ بات ان تک گئی تو تمہیں کھڑے قدموں جاب سے نکال دیں گے۔''

میں روہانسا ہو گیا۔ ''تب میں کیا کروں؟''

''ندیم مجھے تم سے ہمدردی ہے کیونکہ تم ایک اچھے انسان ہو لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا ہوں۔ اگر میں خود کرنا چاہوں تو ڈیڑھ لاکھ تک کا بندوبست کر سکتا ہوں مگر تم باقی ڈھائی لاکھ کہاں سے کرو گے؟''

''کہیں سے نہیں، مجھے کوئی ڈھائی روپے نہیں دے گا۔''

''ایک مشورہ ہے تم پولیس سے تحفظ مانگو۔''

''پولیس۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''آپ جانتے ہیں کہ میں صرف خوار ہوں گا اور اس کے بعد زیادہ اذیت ناک موت میرا مقدر بنے گی۔''

''بھاگ جاؤ زندگی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔''

''میرے ابا اور میری منگیتر میرے لیے زندگی سے بڑھ کر ہیں۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی جان بچانے کے لیے انہیں قاتلوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔ آپ کا بہت شکریہ طاہر صاحب آپ نے میرے لیے خلوص سے بات کی اس کا اجر آپ کو اوپر والا ہی دے گا۔''

''اگر میں تمہارے کسی کام آسکا تو مجھے بہت خوشی ہو گی۔'' انہوں نے خلوص سے کہا۔ ''ڈیڑھ لاکھ روپے میں تمہیں ایک گھنٹے کے نوٹس پر دے سکتا ہوں۔''

''شاید اس کی ضرورت نہ پڑے اور شاید پڑ

جائے۔'' میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ کارخانے کے مالکان کے بارے میں طاہر صاحب نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ اسی قسم کے لوگ تھے۔ اگر طاہر صاحب نہ ہوتے تو وہ پچاس ہزار بھی نہ دیتے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رقم انہوں نے طاہر صاحب کی ضمانت پر دی تھی۔ ایک واحد اُمید یہی تھی مگر اب وہ بھی نہیں رہی تھی۔ طاہر صاحب نے ذاتی طور پر ڈیڑھ لاکھ کی پیشکش کی تھی مگر اس سے میرا مسئلہ کہاں حل ہوتا؟ جاجی بھائی کو پورے چار لاکھ درکار تھے۔ ایسا ہوتا کہ میں اسے ڈیڑھ لاکھ دے کر مہلت مانگتا تو رقم لے کر پھر مجھے تین مہینے کی مہلت اور ڈبل رقم کا کہہ دیتا تو پھر میں پانچ لاکھ روپے کہاں سے لاتا۔ اگر مقدر میں مرنا ہی تھا تو ڈیڑھ لاکھ خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دن ایک ایک کر کے گزرتے رہے اور آخری دن آگیا۔ اس دن میں نے نکلنے سے پہلے ابا کو لپٹ کر پیار کیا تو وہ حیران رہ گئے۔

''کیا ہو گیا ہے بیٹا؟ آج باپ پر زیادہ ہی پیار آ رہا ہے؟''

''ابا مجھے آپ سے دنیا میں ہر فرد سے زیادہ محبت ہے۔ بس اظہار نہیں کر پاتا۔ آج خیال آیا کہ شاید میری زندگی کا آخری دن ہو۔''

''پھر بکواس کی۔'' ابا نے ڈانٹا۔ ''تجھ میں میری زندگی ہے تجھے کچھ ہوا تو میں بھی زندہ کہاں رہوں گا۔''

اس روز میں بائیک لے کر نہیں گیا تھا کہ اگر میں نہ آسکا تو بائیک تو ابا کے پاس رہے۔ ایسا نہ ہو میرے ساتھ بائیک بھی جائے۔ ابا سے بہانا کیا کہ اس کا انجن مسئلہ کر رہا ہے۔ میں پیدل نکلا اور کارخانے جانے کے بجائے رضوانہ کے کالج کی طرف چل پڑا۔ حالانکہ ابھی اس کی چھٹی میں بہت وقت تھا۔ میرے پاس موبائل تھا مگر نہ رضوانہ کے پاس اور نہ اس کی امی کے پاس موبائل تھا اس لیے وہ رابطہ نہیں کر سکی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ایک سانس میں مجھے یاد کر رہی ہو گی۔ میں کالج سے ذرا دور ایک چائے ہوٹل میں بیٹھا رہا۔ پھر چھٹی کا وقت آیا۔ میں اٹھ کر کالج کے نزدیک آیا اور میں سوچ رہا تھا کہ آج رضوانہ کو کیسے پہچانوں گا۔ اس لیے میں نے یہ کیا کہ خود یوں نمایاں ہو کر کھڑا ہو گیا کہ کالج سے نکلنے والی لڑکیاں مجھے دیکھ لیں۔ میں ظاہر کر رہا تھا جیسے میں کسی لڑکی کو لینے آیا ہوں۔ وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے اس لیے میں الگ سے بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اچانک ایک عبایا پوش لڑکی میرے پاس سے گزرتی ہوئی بولی۔ ''ندیم میں رضوانہ۔''

میں اس کے پیچھے چل پڑا اور کچھ دور جا کر وہ ایک گلی کی طرف مڑ گئی جو عام آبادی کی طرف جا رہی تھی اور یہاں کالج کی لڑکیاں نہیں تھیں۔ میں اس کے پاس آگیا۔ ''رضوانہ کیسی ہو؟''

''کیسی ہو سکتی ہوں۔'' اس نے بھیگی آواز میں کہا۔ ''جو روز پل پل مرتا ہو وہ کیسا ہو سکتا ہے؟''

''یہی میرا حال ہے آج آخری دن ہے۔ میں نے سوچا کہ تم سے مل لوں۔''

اس نے تڑپ کر میرا بازو تھام لیا۔ ''پلیز ایسا نہ کہیں۔''

ہم اسی ریستوران میں آئے۔ اس نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا۔ آنکھیں پہلے ہی بھیگی تھیں اب چہرہ بھی بھیگنے لگا۔ ویٹر آیا تو اس نے چہرہ نیچے کر لیا۔ میں نے کولڈ ڈرنک اور کچھ ریفریشمنٹ منگوائی۔ رضوانہ نے منع کیا اور میرا بھی موڈ نہیں تھا مگر یہاں بیٹھنے کا کچھ تو بہانہ چاہیے تھا۔ وہ روتی رہی اور میں اسے خاموش زبان میں تسلی دیتا رہا۔ کولڈ ڈرنک اور چیزیں آئیں اور ایسے ہی پڑی رہیں۔ پھر رضوانہ نے کہا۔ ''مجھے جاجی بھائی کے پاس لے چلیں میں اس کی منت کر لوں گی۔''

میں نے دوٹوک انکار کر دیا۔ ''وہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ تم وہاں جا سکو اگر مجھے یقین ہوتا کہ جاجی بھائی تمہارے کہنے پر مجھے معاف کر دے گا تب بھی نہیں لے جاتا۔''

''ندیم کوئی راہ تو ہو گی۔ آپ اس سے بات کریں اسے کوئی پیشکش کر دیں۔ اسے کہہ دیں کہ آپ قسطوں میں اس کا قرض اتار دیں گے۔''

''اس نے مجھے جان بوجھ کر پھانسا ہے۔ وہ کہاں مانے گا۔'' میرے لہجے میں مایوسی تھی۔

''جان کا کوئی بدلہ نہیں ہوتا ہے روپے کے تو دس بدل ہو سکتے ہیں۔''

رضوانہ کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''کولڈ ڈرنک پیو ابھی تمہیں گھر بھی چھوڑنا ہے۔''

''میں چلی جاؤں گی۔''

''نہیں بس ویگن میں اور دیر ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔ ہم کولڈ ڈرنک ختم کر کے باہر آئے اور میں نے ایک رکشا روکا اور اسے اس کے گھر کے پاس اتار دیا اور خود اسی رکشے میں روانہ ہوا مگر میرا رخ کارخانے کی طرف نہیں تھا۔ رضوانہ کی بات نے مجھے ایک خیال دیا تھا اور میں اس پر عمل کرنے جا رہا تھا۔ جب ہم کچی آبادی کے پاس پہنچے تو رکشے

والے نے اندر جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے وہیں اترنے اور کرایہ دینے کو کہا۔ میں نے کرایہ دیا اور پیدل روانہ ہو گیا۔ جاجی بھائی کا ٹھکانہ زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ میں نے گیٹ بجایا تو اندر سے اسی مجرم صورت آدمی نے جھانکا۔ مجھے دیکھ کر اس نے دانت نکالے۔

''تو خود آ گیا، اچھا ہوا ورنہ ہمیں لانا پڑتا۔ آج آخری دن ہے قرض کا یا تیرا۔''

ایک منٹ بعد میں جاجی بھائی کے سامنے تھا۔ وہ ٹی وی پر ایک واہیات سی فلم دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی پچاس انچ سے بڑا ایل سی ڈی تھا۔ جاجی بھائی میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''کیا لایا ہے؟''

''اپنی جان۔'' میں نے کہا تو جاجی بھائی نے ریموٹ سے فلم پوز کر دی اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔

''خود مرنے آ گیا ہے؟''

''ہاں آدمی موت سے بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔''

''یہ تو نے ٹھیک کہا ہے۔'' جاجی بھائی نے پستول اٹھا لیا۔ ''اس لیے میں چاہوں گا تجھے تکلیف نہ ہو بس ایک گولی لگے اور تو ختم ہو جائے۔''

وہ پوری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا اور میں لرز گیا۔ ''جاجی بھائی تمہیں میری جان ملے گی مگر رقم نہیں ملے گی۔ میرے پاس رقم نہیں ہے مگر ایک چیز ہے سودا کرنے کے لیے۔''

''کیا چیز ہے؟''

''میں بتاتا ہوں لیکن پہلے تم وعدہ کرو کہ اگر وہ تمہارے کام کی ہوئی تو مجھے معاف کر دو گے اور پھر کبھی مجھے نہیں چھیڑو گے۔''

جاجی بھائی آگے جھکا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''منظور ہے پر کوئی چالاکی ہوئی تو ایک گولی والی سزا نہیں ملے گی۔ کم سے کم دس گولیاں ماروں گا اور تو پھر بھی فوری نہیں مرے گا۔ بہت اذیت سے مرے گا۔''

میں نے سر ہلایا اور اسے بتانے لگا۔ وہ غور سے سن رہا تھا۔ جب میں نے بات ختم کی تو اس نے دلچسپی سے کہا۔ ''تجھے یقین ہے وہ مان جائیں گے؟''

''بالکل مانے گا میں انہیں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر نہ مانے تو ظاہر ہے تم مجھے پکڑو گے۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے...... اگر مجھے دس لاکھ مل گئے تو اس میں سے دو تیرے ہوں گے۔''

''جاجی بھائی مجھے رقم نہیں چاہیے۔ بس اپنی زندگی

جام درک Jam Durrak

اٹھارہویں صدی کا بلوچی شاعر۔ ڈومبی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ میر نصیر خان اعظم والئی قلات (1750ء۔ تا 1795ء) کا ملک الشعرا تھا۔ اس نے نہ صرف عوامی کہانیوں کو منظوم کیا بلکہ بلوچی شاعری میں تغزل کو معراج تک پہنچایا۔ اس کی زبان، تشبیہات اور استعارات خالصتاً بلوچی ہیں۔ اس نے عرب اور ایران کی رومانی داستانوں، لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کو بلوچی نظم میں ایسے لکھا کہ یہ کردار بلوچی معلوم ہونے لگے۔ اس کی مشہور ترین نظمیں بھمبور کی پریاں اور غسل کرتی عورتیں ہیں۔

مرسلہ: نازش نیاز۔ کراچی

اور تمہاری طرف سے اطمینان چاہتا ہوں۔''

''اب جا چار دن بعد دیکھیں گے۔''

میں جاجی بھائی کے ٹھکانے سے نکلا تو بہت دیر تک مجھے یقین نہیں آیا کہ میں زندہ سلامت نکل آیا ہوں ورنہ اندر جاتے ہوئے مجھے دس فیصد امید بھی نہیں تھی۔ پہلے میں گھر گیا اور اماں سے لپٹ گیا وہ پھر حیران ہوئے تھے۔ پھر میں ان سے اجازت اور اپنی بائیک لے کر رضوانہ کے گھر گیا۔ ملاقات تو آنٹی سے ہوئی مگر میں نے باتوں باتوں میں پردے کے پیچھے موجود رضوانہ کو بتا دیا کہ آفت عارضی طور پر ٹل گئی ہے اور امید ہے کہ مستقل ٹل جائے گی۔ وہاں سے نکلا تو پونے چار بجے کارخانے پہنچ گیا کیونکہ میری شفٹ کا آغاز ہونے والا تھا۔ صبح کی شفٹ سے میں نے پہلے ہی چھٹی مانگ لی تھی۔ شام کی شفٹ میں نہ آتا تو جلد کارخانے والوں کو پتا چل جاتا۔ مگر میرا وقت نہیں آیا تھا اس لیے میں خود آ گیا۔ دو دن بعد بائیک پر ہیلمٹ پہنے ہوئے کمپنی کے گودام کے باہر موجود تھا۔ بارہ بجے کے قریب گودام سے ایک کنٹینر بردار ٹرک نکلا۔ جیسے ہی وہ بندرگاہ جانے والی سڑک کی طرف مڑا میں نے موبائل پر کہا۔ ''یہی ہے؟''

فوراً ہی ایک بڑی جیپ نے ٹرک کا راستہ روک لیا اور پھر اس سے دو مسلح افراد اتر کر ٹرک میں گھس گئے اور انہوں نے ڈرائیور کو نیچے پھینک دیا۔ جب تک وہ کپڑے

جھاڑ کر اٹھا تو ٹرک جا چکا تھا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی میں نے بائیک گھمائی اور مخالف سمت میں روانہ ہو گیا۔ میں نے آج بھی مارننگ شفٹ نہیں کی تھی۔ شام کی شفٹ میں گیا تھا۔ اگلی رات شفٹ کر کے نکلا تھا کہ جاجی بھائی کے اسی گرگے نے روک لیا۔ جو پہلی مرتبہ مجھے لے گیا تھا مگر آج وہ اکیلا تھا۔ اس نے کہا۔ ''جاجی بھائی نے بلایا ہے ابھی۔''

میں اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ بیس منٹ بعد جاجی بھائی کے سامنے تھا جو حسبِ معمول مالش کروا رہا تھا یہ وقت شاید مالش کے لیے مخصوص تھا۔ برابر میں تپائی پر ایک کھلے بریف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں تہہ در تہہ رکھی تھیں اور یہ خاصی رقم تھی۔ دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ جاجی بھائی نے سر گھما کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''دس نہیں لیے یہ بیس لاکھ ہیں۔ پچاس مانگے تھے میں نے۔ کنٹینر سے زیادہ اسے راز کھلنے کی فکر تھی۔''

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''یعنی میں اب آزاد ہوں۔''

''ہاں اور اس میں سے جتنی چاہے رقم لے لے۔''

میں نے ایک نظر کھلے بریف کیس کو دیکھا اور پھر بولا۔ ''جاجی بھائی تمہارا شکریہ اور مہربانی کہ تم نے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ رقم کے لیے بھی معافی دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے سر ہلایا۔ ''دفع ہو جا اور زبان بند رکھے گا تو سب ٹھیک رہے گا ورنہ......''

''میں سمجھتا ہوں جاجی بھائی۔'' میں نے کہا اور وہاں سے ہمیشہ کے لیے نکل آیا۔ قارئین شاید حیران ہوں کہ جب میں نے پہلے جاجی بھائی کو انکار کیا تھا تو اب خود اسے کیوں پیشکش کی۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو میری زندگی پر بنی ہوئی تھی اور جب جان خطرے میں ہو تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ دوسرے جب میرے کارخانے کے مالکان دوسروں کو دھوکا دے رہے تھے تو میں نے ان کو دھوکا دینا برا نہیں سمجھا۔ گھر آ کر میں نے شکرانے کے نفل پڑھے اور ابا حیران تھے کہ یہ میں کون سی نماز پڑھ رہا ہوں۔ اگلے دن میں پھر رضوانہ کے کالج کے باہر موجود تھا۔ میرے بتانے سے پہلے وہ سمجھ گئی تھی۔ جب ہم ریسٹوران میں بیٹھے تھے تو اس بار اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''رضو میں اب تمہیں جلد از جلد اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میرا مکان کرائے کا ہے اور میری تنخواہ بھی زیادہ نہیں ہے۔''

وہ شرمائی۔ ''یہ تو امی سے کرنے والی بات ہے۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو میرے لیے آپ کے ساتھ سے بڑھ کر کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ پر......''

''پر کیا؟''

''مجھے گریجویشن تو مکمل کرنے دیں گے نا۔ آج مجھے دو خوش خبریاں ملی ہیں۔''

''دوسری کون سی؟''

''میرا بی کام پارٹ ون کا رزلٹ آ گیا ہے اور میری سیونٹی سیون پرسنٹیج آئی ہے۔''

''مبارک ہو یہ تو مٹھائی والا کیس ہے۔''

''گھر آئیں گے تو کھلاؤں گی۔'' اس نے پہلی بار محبوبانہ شوخی سے کہا تھا۔

ایک سال بعد وہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی میں آ گئی۔ میں نے شادی کے دو سال بعد اس جگہ سے ملازمت چھوڑ دی کیونکہ مجھے کوریا میں جاب مل گئی تھی۔ دو سال کا کنٹریکٹ تھا مگر تنخواہ اتنی اچھی تھی کہ میں نے دو سال میں اپنا گھر بنا لیا تھا۔ رضوانہ اور ابا کا دل بہلانے کو ایک عدد گڑیا آ گئی تھی۔ مجھے پھر دو سال کا کنٹریکٹ ملا اور اس کے مکمل ہونے پر مجھے واپس آنا پڑا کیونکہ ابا کی طبیعت بہت خراب تھی۔ وہ بس میرا ہی انتظار کر رہے تھے مجھے دیکھا اور سکون سے دنیا سے گزر گئے مگر جاتے جاتے میرے حوالے سے ساری خوشیاں دیکھ گئے تھے۔ رضوانہ نے بیٹی کی طرح ان کی خدمت کی تھی تو ابا نے سائبان بن کر میری عدم موجودگی میں اس کی حفاظت کی تھی۔ ورنہ آج کل اکیلی عورت کا بچوں کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔

بیٹی کے بعد ایک بیٹا ہوا اور ابا کے بعد ایک بیٹا اور ہوا تو میں نے ابا کے نام پر اس کا نام قیصر رکھا۔ کوریا سے مجھے کچھ تجربہ ملا تھا اور میں نے یہاں کورین گاڑیوں کی مرمت کی ورکشاپ کھول لی۔ ورکشاپ ڈیفنس کے علاقے میں ہے اور اللہ کا فضل ہے۔ چند دن پہلے ٹی وی اور اخبار میں جاجی بھائی کے حوالے سے خبریں آئیں کہ وہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ساتھ مقابلے میں چھ ساتھیوں سمیت مارا گیا۔ میں اسے بھولا کبھی نہیں تھا۔ اس نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ مگر آخر اپنا وعدہ ضرور پورا کیا تھا۔ شاید اسی لیے جب اس کی موت کی خبر سنی تو میں دکھ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ تب میں نے سوچا کہ اب یہ کہانی دنیا کے سامنے لے آؤں جاجی بھائی تو رہا نہیں تو راز رکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

علم عروض

مکرمی معراج رسول
آداب عرض
ایک اور سچ بیانی ارسال کررہا ہوں۔ یہ میرے واقف کار کے پیار کی داستان ہے۔ بہت ہی سادہ ہے۔ اس کی زندگی میں پیار نے کس طرح چھب دکھایا آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ناظم بخاری
(لودھراں)

اس دن میں نے اپنی فیس بک آئی ڈی آن کی تو تیس عدد نوٹیفکیشن کے ساتھ دو عدد میسج اور ایک عدد فرینڈ ریکویسٹ بھی آئی ہوئی تھی۔ میں نے سب سے پہلے میسج دیکھے۔ ان میں سے ایک میسج ایک شاگرد نے عروض کے حوالے سے کیا تھا اور ایک کسی فیک آئی ڈی سے اس کی ای میل آئی ڈی پر رابطہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ میں نے اس میسج کو نظر انداز کیا اور شاگرد کے سوال کا جواب دینے کے بعد نوٹیفکیشنز دیکھنے لگا۔ ان میں سے کچھ نوٹیفکیشن دوستوں کی

پوسٹ کے حوالے سے تھے جو انہوں نے مجھے ٹیگ کی تھیں اور کچھ میرے گروپ کے حوالے سے تھے۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ میں ایک چھوٹا موٹا سا شاعر اور افسانہ نگار ہوں۔ افسانہ نگار تو خیر آپ مجھے معمولی سا کہہ سکتے ہیں مگر شاعری پر میری گرفت، بقول میرے احباب کے بہت مضبوط تھی۔ وہ مجھے بہت اچھا شاعر کہتے اور مانتے تھے اور میری پوسٹ کی گئی ہر غزل پر کیے گئے، دو سو سے تین سو تک کمنٹس، میرے لیے یہ بات سمجھنے کے لیے کافی ہوتے تھے کہ احباب میں میرا کلام کس درجہ مقبول ہے اور پسند کیا جاتا ہے۔ فیس بک دوستوں کے اتنے زیادہ کمنٹس، اتنی محبت، میرے لیے وجۂ افتخار تھی۔ اتنے زیادہ کمنٹس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ فیس بک پر صرف میں ہی ایک اچھا اور بڑا شاعر تھا...... نہیں، ایسا نہیں تھا۔ فیس بک پر مجھ سے بھی بڑے اور اچھے شاعر موجود تھے۔ مگر میری ہر پوسٹ پر اتنے زیادہ کمنٹس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں ”علم عروض“ کا استاد تھا۔ میرے بے شمار شاگرد تھے اور ”آؤ عروض سیکھیں“ کے نام سے میں نے اپنا ایک گروپ بنایا ہوا تھا، جہاں میں نئے اور پرانے شعراء کو، جنہیں عروض سیکھنے کی ضرورت ہوتی، بغیر کسی لالچ اور معاوضے کے یہ علم سکھاتا تھا۔ یہ علم عروض کس چیز کا نام ہے، اس سے شاید کوئی عام فرد بالکل بھی واقف نہ ہو مگر شاعری کرنے اور سیکھنے والا تقریباً ہر فرد ہی اس سے واقف ہے۔

آپ کی معلومات لیے بتاتا چلوں کہ علم عروض ایک ایسے علم کا نام ہے، جس سے آپ باوزن اور بے وزن شعروں میں با آسانی تمیز کر سکتے ہیں۔ وزن، شاعری کی بنیادی شرائط میں سے پہلی شرط ہے۔ آپ کے کلام میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو مگر اس میں وزن کی پابندی ضرور ہونی چاہیے۔ اگر آپ کا کلام وزن سے ہی خارج ہوگا تو اس کی اساتذہ او پڑھنے والوں کے ہاں کوئی اہمیت اور وقعت نہیں ہوگی۔ جس طرح حرفوں سے مل کر لفظ بنتے ہیں اور لفظوں سے مل کر جملے بنتے ہیں اسی طرح کچھ ”اسباب“ سے ارکان بنتے ہیں اور ارکان سے بحریں بنتی ہیں۔ وزن کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کا کلام ایک کسی نہ کسی مانوس اور مستعمل بحر میں ہونا چاہیے جو کہ اساتذہ کے ہاں مقبول ہیں۔ کسی بھی بحر میں لکھا گیا کلام اپنا ایک مخصوص آہنگ اور ردھم رکھتا ہے، جسے مطلع سے لے کر مقطع تک پوری غزل میں مدِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یعنی جو وزن پہلے مصرع کا ہوگا وہی وزن پوری غزل کا ہونا چاہیے۔ اکثر نئے لکھنے والے اسی پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ انہیں ارکان، بحر، وزن کسی شے کا پتا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دل کی بات کو لفظوں کا روپ تو دے دیتے ہیں مگر وہ صرف ایک نثر بن کر رہ جاتی ہے شاعری کا روپ اختیار نہیں کر پاتی۔ کبھی میں بھی انہی مشکلات سے گزرا تھا جن سے اکثر نئے شعرا گزرتے ہیں۔ پھر میں نے محنت کی ایک اور استاد سے دل لگا کر عروض سیکھا۔ اور پھر اتنا سیکھا کہ میرا شمار بھی ماہر عروض میں ہونے لگا۔ مجھے لوگوں کی مشکلات کا اندازہ تھا، سوان کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے میں نے اپنے گروپ کو تشکیل دیا تھا جس کا نام میں نے ”آؤ عروض سیکھیں“ رکھا۔

اس گروپ کو احباب نے پسندیدگی کی سند بخشی اور بہت سے عروض کے طالب علم وہاں عروض سیکھنے اور مجھے اپنی محبتوں سے نوازنے لگے۔ مجھے گروپ کو بنائے چھ ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ وہاں میں وزن کے علاوہ دوسرے معائب سخن (سخن کے عیب) کے بارے میں بھی دوستوں کو بتاتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ عروض سے متعلق کسی بھی قسم کا سوال یا کسی بھی لفظ کا وزن معلوم کیا جاتا تو میں اس کا بھی تسلی بخش جواب دیتا۔ اس دن میں سارے نوٹیفکیشن دیکھنے کے بعد اپنے گروپ میں پہنچا ہی تھا کہ اچانک کسی صدف نامی لڑکی کا میسج آیا۔

”السلام علیکم سر۔“

”وعلیکم السلام۔“ میں نے ٹائپ کیا۔

”سر! کل سے آپ کو فرینڈ ریکویسٹ سینڈ کی ہوئی ہے اگر ایکسیپٹ کر لیں تو نوازش ہوگی۔“

مجھے اچانک ہی آئی ہوئی فرینڈ ریکویسٹ کا خیال آیا۔ ارادہ تھا کہ نوٹیفکیشن دیکھنے کے بعد اسے دیکھوں گا مگر پھر یہ خیال میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ میں نے اسے فرینڈ لسٹ میں شامل کرنے کے بعد اباؤٹ میں اس کے متعلق جاننا چاہا تو وہاں مجھے کچھ خاص معلومات نہیں ملیں۔

پکچرز میں بھی صرف دو ہی فوٹو تھے جو کہ گلاب کے پھولوں کے تھے۔ اس کی وال پر بھی مجھے کچھ خاص دیکھنے کو نہیں ملا۔ میں فیس بک پر پچھلے تین سال سے تھا اور اس عرصے میں، میں فیس بک کی دنیا کو اچھی طرح سے جان گیا تھا۔ یہاں اچھے لوگ بھی تھے اور برے بھی۔ فیک بھی تھے اور ریئل بھی۔ ان میں سے کسی کی بھی آئی ڈی میں جا کر سرسری سا جائزہ لینے سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ فیک ہے یا ریئل۔ اس کے بارے

میں بھی مجھے یہی گمان ہوا کہ وہ فیک ہے۔ ورنہ رئیل آئی ڈی والے خود کو یوں چھپا کر نہیں رکھتے۔ اسے دوستوں کی لسٹ میں شامل کرتے ہی اس کا اگلا میسج آیا۔

''تھینک یو سر!''

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ یعنی اسے مسکراتا ہوا ایک اسٹیکر سینڈ کر دیا۔

''سر! مجھے شاعری پڑھنے کا جنون ہے۔ میں نے بہت سے شاعروں کو پڑھا بھی ہے اور ان کو پڑھ پڑھ کر پچھلے کچھ عرصے سے مجھے بھی شاعری کا شوق ہوا ہے مگر جب میں نے کچھ شعر لکھ کر اپنی وال پر پوسٹ کیے تو پتا چلا کہ میرا سارا کلام ہی بے وزن ہے۔ کیسے بے وزن ہے؟ میں خود اس بات کو نہیں سمجھ سکی۔ بس کچھ احباب نے ان باکس میسج کر کے بتایا کہ آپ کا کلام بے وزن ہے۔ آپ پہلے وزن سیکھ لیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کریں گے تو ممنون رہوں گی۔''

پتا نہیں کیوں مجھے یقین ہو چلا کہ یہ فیک آئی ڈی ہے، جو لڑکی کے نام کا سہارا لے کر عروض سیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔

''دیکھیں، اس طرح ان باکس میں کسی کو سکھانا میرے لیے ممکن نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کو یہاں سکھا سکتا ہوں۔ میرے پاس وقت کی بہت کمی رہتی ہے۔ البتہ آپ میرے گروپ میں شامل ہو سکتی ہیں جو میں نے عروض سکھانے کے لیے ہی بنایا ہے۔ وہاں آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ وہاں اور بھی بہت سے دوست سیکھ رہے ہیں، آپ بھی سیکھ سکتی ہیں''

پتا نہیں اس نے میرے گروپ کا کتنا وزٹ کیا تھا۔ وہاں پر تو سیکھنے والوں کے لیے بہت کچھ تھا۔

اس بات کو ابھی دو دن ہی ہوئے تھے کہ اگلے دن اس کا ان باکس میں پھر میسج آ گیا۔ دعا سلام کے بعد اس نے اپنی ایک غزل سینڈ کر دی۔

''سر، اگر اس کی اصلاح کر دیں تو آپ کی بہت نوازش ہوگی۔ اصل میں، آپ جانتے تو ہیں کہ مجھے شاعری کی...... یعنی وزن کی اتنی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔''

اس کا کلام، سرسری نظر سے دیکھنے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ نہ صرف وہ بے وزن ہے بلکہ اس میں خیالات کی پختگی بھی نہیں ہے۔ بہت سے نئے شعرا کی طرح اس نے بھی گھسے پٹے مضامین میں لکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا۔

''دیکھیں، میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اس طرح ان باکس میں اصلاح کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے اور آپ کے کلام کو اصلاح کی نہیں بلکہ آپ کو وزن سیکھنے کی ضرورت ہے۔ آپ میرے گروپ میں جائیں۔ وہاں ہر پوسٹ کو تسلی سے دیکھیں سمجھیں اور اگر کوئی بات سمجھ نہ آئے تو بلا جھجک پوچھ لیں۔''

جواب میں اس نے ایک منہ پھلایا ہوا اسٹیکر سینڈ کیا اور اس کے کچھ دیر بعد لکھا۔

''پچھلے دو دنوں سے میں آپ کے گروپ میں ہی ہوں مگر وہاں ہر پوسٹ اچھی طرح پڑھنے کے بعد بھی مجھے کسی شے کی سمجھ نہیں لگی۔ اور پھر سر عام، سب کے سامنے کچھ پوچھتے ہوئے مجھے اچھا بھی نہیں لگتا۔ اگر آپ یہیں سکھا دیں تو ممنون رہوں گی۔''

''سوری میں پہلے ہی اس بارے میں عرض کر چکا ہوں۔''

''اچھا آپ ایک کام کریں۔ آپ معاوضہ یا فیس لے کر مجھے یہیں سکھانا شروع کر دیں۔ آپ جو فیس یا معاوضہ کہیں گے۔ وہ میں آپ کو دینے کو تیار ہوں۔''

اور تو کچھ نہیں، مگر اس کی اس بات نے مجھے یہ سوچنے پر ضرور مجبور کر دیا تھا کہ وہ اور کچھ ہو یا نا ہو، کم سے کم فیک نہیں ہے۔ اگر وہ فیک ہوتی تو مجھے اس طرح فیس دینے کی بات نہ کرتی۔ میں نے جواباً کہا۔

''دیکھیں، علم بیچا نہیں جاتا اور دوسرا میں فیس لے کر سکھانے کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ جس دن میں نے یہ علم سیکھا تھا اسی دن میں نے دل میں ارادہ باندھ لیا تھا کہ میں جسے بھی یہ علم سکھاؤں گا بغیر کسی لالچ اور پیسے کے سکھاؤں گا اور میں آج تک اپنی اس بات پر عمل پیرا ہوں......''

اس نے بجھے بجھے ہوئے چہرے جیسا ایک اور اسٹیکر سینڈ کیا۔

''اس کا مطلب ہے آپ یہاں نہیں سکھائیں گے؟''

''میں اپنی مجبوری بتا چکا ہوں۔''

''اچھا تو ایک اور کام کر دیں، پلیز۔ اپنا موبائل نمبر دے دیں مجھے۔''

میں اس کی بات پر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر لکھا۔

''اگر آپ عروض کے حوالے سے رابطہ کرنا چاہتی ہیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میری عروض کی دنیا صرف فیس بک تک ہی محدود ہے۔ معذرت خواہ ہوں، میں آپ کو اپنا نمبر نہیں

دے سکتا۔''

اس نے بجھے ہوئے چہرے جیسے دو چار اسٹیکر مزید سینڈ کیے اور پھر فیس بک سے آف ہوگئی۔

میں اپنے گروپ میں چلا گیا۔ تین دن بعد مجھے اپنے موبائل پر کسی اجنبی نمبر سے کال آئی۔

''السلام علیکم سر!'' میرے کانوں سے ایک کھنکتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

''وعلیکم السلام۔''

''سر! پہچانا آپ نے مجھے؟''

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ ''سوری، مجھے یاد نہیں آ رہا۔''

دوسری طرف سے ہنسی کی آواز سنائی دی۔

''پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ ہم موبائل پر ایک دوسرے سے پہلی بار مخاطب ہو رہے ہیں۔'' میں صدف بات کر رہی ہوں۔ وہی صدف جس نے فیس بک پر آپ کا سر کھایا ہوا ہے۔ آپ نے تو اپنا نمبر نہیں دیا مگر دیکھ لیں، آخر ڈھونڈ ھ نکالا میں نے۔''

میرے دل میں اس کے فیک ہونے کا جو رہا سہا شک تھا اس دن وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں اپنی سوچ پر مسکرا کر رہ گیا۔ میں ایک اصل نام اور شخصیت کو فیک سمجھتا رہا تھا۔ اصل میں اسے ان باکس عروض نہ سکھانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ مجھے شک ہی نہیں، یقین تھا کہ وہ فیک ہے اور اسی لیے میں نے اسے ٹال دیا تھا۔

اب اس کی سچائی کا پتا چلا تو میں یہ سوچنے کے لیے مجبور ہو گیا کہ اسے عروض سکھایا جائے یا نہیں۔

''سر آواز آ رہی ہے؟'' اس کی آواز مجھے خیالات کی دنیا سے کھینچ لائی۔

''جی... جی آ رہی ہے۔''

''سر پلیز مجھے عروض سکھا دیں، میں آپ کی بہت ممنون رہوں گی۔ پلیز پلیز پلیز سر...... آپ کہیں تو میں آپ کو فیس بھی دینے کو تیار ہوں......''

میری سماعتوں سے اس کی آواز ٹکراتی رہی۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اسے عروض نہ سکھانے کی وجہ بتا دی۔ میری بات سن کر وہ بہت زور سے ہنسی۔

''او مائی گاڈ...... آپ مجھے فیک سمجھتے تھے اور اسی لیے نہیں سکھا رہے تھے مجھے؟''

''کیا فیس بک پر ایسا نہیں ہو رہا؟''

''جی، بالکل ہو رہا ہے۔ آپ اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ اب تو آپ کا شک دور ہو گیا نا؟''

''جی بالکل، اسی لیے تو آپ سے دل کی بات کہہ دی۔''

''تو پھر آپ عروض سکھا رہے ہیں نا مجھے؟ دیکھیں، پلیز اس بار انکار نہیں کیجیے گا، پلیز......'' اس کے لہجے میں ایک التجا سی تھی۔

''جی ضرور سکھاؤں گا اگر آپ کو واقعی شوق ہوا تو۔''

''یس...... یہ ہوئی نا بات۔ آپ نے میرا دل خوش کر دیا۔ شوق تو مجھے بہت زیادہ ہے اسی لیے تو یہ سب کر رہی ہوں۔ اچھا اب اپنی فیس بھی بتا دیں۔''

''دیکھیں، میں نے اس دن بھی آپ کو کہا تھا کہ میں نہ کسی کو فیس لے کر سکھاتا ہوں اور نہ ہی سکھا سکتا ہوں۔ میں بغیر فیس کے آپ کو سکھا دوں گا۔''

''تھینک یو سر۔'' اس کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

''تو پھر کب اسٹارٹ کریں؟ آج سے؟''

میں نے ٹائم دیکھا۔ ''آج تو ٹائم نہیں ہے، کل سے شروع کریں گے۔''

''فیس بک پر سکھائیں گے یا موبائل پر؟''

''جو باتیں سمجھانے کی ہیں وہ میں آپ کو فون پر سمجھاؤں گا، باقی سبق فیس بک پر سینڈ کر دیا کروں گا۔ وہ آپ حل کر کے فیس بک پر ان باکس کر دیا کیجیے میں دیکھ لیا کروں گا۔ اس میں جو کمی بیشی ہوگی اس پر بعد میں بات کر لیں گے ہم۔''

''او کے سر تھینک یو ویری مچ۔''

''اچھا، اب اجازت دیں مجھے تھوڑا بزی ہوں۔ کل تفصیل سے بات ہوگی آپ سے...... اللہ حافظ۔''

''او کے سر، اللہ حافظ۔''

اس سے بات کرنے کے بعد میری کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ مجھے اچھا لگا تھا۔ کچھ ہلکا پھلکا، خوبصورت سا احساس ہوا تھا۔ میں اپنی اس کیفیت پر خود ہی مسکرا دیا۔ ایک بات تو طے تھی کہ اس کی آواز بہت خوبصورت تھی۔ معلوم نہیں وہ خود کیسی تھی اور پتا نہیں کس شہر میں رہتی تھی۔ اس کی عمر کا بھی مجھے پتا نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چوبیس، پچیس کی ہوگی۔ اگلے دن اس کی کال آئی تو ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں کافی کچھ پتا چلا۔ اس نے دورانِ کال پوچھا۔

''سر اگر برا نہ مانیں تو میں آپ کی ایج پوچھ سکتی ہوں؟''

''آپ نے میری آئی ڈی نہیں دیکھی؟''

''دیکھی ہے، پر اس میں تو لکھا ہے کہ آپ صرف چوبیس سال کے ہیں۔ میں اس بات پر یقین نہیں کر پائی کہ آپ سچ میں چوبیس برس کے ہیں۔ مجھے ڈاؤٹ ہے اس بات پر۔''

''میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہی سچ ہے کہ میں چوبیس برس کا ہوں۔''

''مجھے اب بھی یقین نہیں ہو رہا۔ آپ علم عروض کے استاد ہیں۔ اتنی کم عمر میں آپ نے یہ علم کیسے حاصل کر لیا؟''

''اگر انسان محنت کرے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ ویسے یہ علم اتنا مشکل نہیں ہے جتنا لوگوں نے اسے سمجھا ہوا ہے۔ میں نے صرف تین ماہ میں یہ سارا علم سیکھا تھا۔''

''صرف تین ماہ میں؟'' اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''آپ کمال ہیں سر! سچ میں کمال ہیں۔'' اس کے لہجے میں ستائش تھی۔ ''سر! ویسے میں کتنے عرصے تک یہ علم سیکھ پاؤں گی؟'' اس کے لہجے میں بچوں کا سا اشتیاق تھا۔

''زیادہ عرصہ نہیں لگے گا، دو سے تین ماہ میں آپ سیکھ جائیں گی۔''

''سچ میں؟''

''جی بالکل۔''

وہ خوش ہوگئی۔ میں نے کہا۔

''اب میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟''

''جی ضرور پوچھیں۔''

''آپ کی ایج کتنی ہے؟''

''انیس سال ہے سر!''

''کس شہر میں رہتی ہیں؟''

وہ ایک پل کو چپ ہوئی اور پھر کہا۔ ''میں...... آپ کے ہی شہر کی ہوں۔''

مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔

''آپ پنڈی میں رہتی ہیں؟''

''جی سر۔''

''کہاں پر؟''

''صدر میں۔''

نہ جانے کیوں اس بات پر میرا دل خوش ہوگیا تھا۔

''اچھی بات ہے۔''

میں نے بمشکل اپنے جذبات چھپائے۔

''آپ ہاؤس وائف ہیں؟''

میری اس بات پر وہ زور سے ہنسی۔ ''آپ کا دل کیا کہتا ہے؟''

''میرا دل...... اسے چھوڑیں، وہ تو پاگل ہے۔''

''پھر بھی، آپ کچھ اندازہ لگائیں۔''

''آپ ہاؤس وائف لگتی ہیں۔''

میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔ وہ میرے لہجے کی شرارت کو بھانپ گئی۔

''جی نہیں...... آپ کا اندازہ غلط ہے۔ ابھی تو بڑی آپی کی شادی نہیں ہوئی، میری کہاں سے ہوئی ہوگی؟''

میں ہنسا۔ ''میں مذاق کر رہا تھا۔''

''میں سمجھ گئی تھی۔''

''اچھا آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟'' میں نے ایک اور سوال پوچھا۔

''وہ ایک بینک میں منیجر ہیں۔''

''ماشاء اللہ...... اللہ انہیں اور عروج دے۔''

''سر! آپ کیا کرتے ہیں؟''

اس بار اس نے سوال کیا۔

''میں ایک پرائیوٹ اسکول میں ٹیچر ہوں۔''

''ویری گڈ...... یہ تو بہت اچھا اور سلجھا ہوا کام ہے۔''

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''اچھا سر! اب عروض اسٹارٹ کریں؟'' کافی باتوں کے بعد وہ اصل بات پر آگئی۔

مجھے بھی احساس ہوا کہ ہم نے فضول میں کافی وقت گنوا دیا ہے۔ جس مقصد کے تحت اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا، اس کی تو ابھی ہم نے ابتدا بھی نہیں کی تھی۔

''جی بالکل۔''

''تو بتائیں سر۔''

''دیکھیں، سب سے پہلے تو آپ کو تمام لفظوں میں متحرک اور ساکن حروف کی پہچان کرنا ہوگی۔ آپ اس میں کامیاب ہوگئیں تو ہم اس کے بعد آگے بڑھیں گے۔''

''مثلاً...... کیسے سر؟''

''دیکھیں، مثال کے طور پر، ہم ایک تین حرفی لفظ شام لیتے ہیں۔ اس میں شین متحرک ہے اور الف اور میم ساکن ہیں۔''

''جی بالکل۔''

''اب ایک اور لفظ لیتے ہیں۔ مثلاً، قلم...... اس میں قاف اور لام متحرک ہیں اور میم ساکن ہے۔''

''جی آپ کی بات اچھی طرح سمجھ آرہی ہے مجھے۔''

''یہاں...... اب مزید کچھ آپ کو سمجھانا تھوڑا مشکل ہوگا۔ میں ایسا کرتا ہوں، آپ کو فیس بک پر پہلا سبق سینڈ کرتا ہوں۔ آپ اسے ایک دو بار صحیح سے پڑھیں اور پھر اسے حل کر کے مجھے دکھائیں۔ جب تک ہم پہلا سبق حل نہیں کر لیں گے، تب تک دوسرا سبق نہیں پڑھیں گے۔''

''جی سر بالکل، اگر ہو سکے تو آپ یہ سبق ابھی سینڈ کر دیں فیس بک پر، میں اسے حل کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''میں ابھی سینڈ کرتا ہوں۔''

میں نے فیس بک آن کی اور اپنے موبائل میں سیو کیے ہوئے اسباق میں سے پہلا سبق اسے سینڈ کر دیا۔ وہ بھی اسی وقت آن لائن ہوگئی تھی۔ میں نے سبق سینڈ کرنے کے بعد نوٹیفکیشن دیکھے اور پھر اپنے گروپ میں چلا گیا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے صدف کا میسج موصول ہوا۔

''سر میں نے اپنی طرف سے درست سبق حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھیں، اس میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں۔''

اس نے میری توقع سے پہلے ہی سبق حل کر لیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی اس کا سبق ننانوے فیصد درست تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بہت جلد عروض سیکھ جائے گی۔ اس نے کامیابی سے کامیابی کی طرف پہلا قدم بڑھا لیا تھا۔

''مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کے تمام جواب درست ہیں۔ صرف دید کی ی کو آپ نے متحرک لکھا ہے یہ متحرک نہیں، ساکن ہے۔''

''اوہ سوری، شاید جلدی میں غلطی ہوگئی۔''

''کوئی بات نہیں۔ آپ مجموعی طور پر اس سبق میں کامیاب رہی ہیں۔''

''تو دوسرا سبق اسٹارٹ کریں؟''

اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔ میں اس کی بے تابی پر مسکرا دیا

''دیکھیں، ہم روزانہ ایک سبق پڑھیں گے اور حل کریں گے۔ آپ نے پہلا سبق حل کر لیا بہت اچھا کیا، آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ دوسرا سبق کل ملے گا آپ کو۔ ہم دھیرے دھیرے آگے بڑھیں گے۔''

جواب میں اس نے پہلے تو منہ سوجا ہوا اسٹیکر سینڈ کیا، پھر مسکراتا ہوا۔ جواباً میں نے بھی اسے اسی جیسا مسکراتا ہوا اسٹیکر سینڈ کر دیا۔

''آپ تھوڑا گروپ کو بھی وقت دیں۔ اس کی پوسٹوں کو پڑھیں۔ آپ کو کافی فائدہ ہوگا۔''

''جی ضرور سر۔ ویسے آپ کے کہے بغیر بھی میں آپ کے گروپ میں جاتی رہتی ہوں اور وہاں پوسٹ کیا گیا کلام پڑھتی رہتی ہوں۔ خاص کر آپ کا اصلاح کیا ہوا کلام مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ کیسی باریک سے باریک غلطی بھی ڈھونڈھ لیتے ہیں آپ۔ میں تو دنگ رہ جاتی ہوں آپ کا اصلاحی تبصرہ پڑھ کر۔ قسم سے مزہ آجاتا ہے۔''

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''اگر آپ نے محنت جاری رکھی تو ایک دن مجھ سے بھی آگے نکل جائیں گی آپ۔''

''اف...... کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں آپ کے قدموں تک پہنچ جاؤں، اتنا کافی ہے۔''

''دیکھیں، ایسی باتیں کر کے آپ مجھے شرمسار مت کریں۔ آپ میں وہ چیز موجود ہے جو میں دیکھنا چاہتا تھا۔ بس اسی طرح شوق اور لگن سے سیکھتی رہیں۔ آپ بہت آگے تک جائیں گی۔''

''بہت شکریہ سر! اگر آپ کا ساتھ رہا تو انشا اللہ ضرور آگے تک جاؤں گی۔ اچھا سر، کل موبائل پر بات کرتے ہیں ابھی امی بلا رہی ہیں، فیس بک آف کرنی پڑے گی...... اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔''

اگلے دن وہ اس بحر میں ایک غزل لکھ لائی تو اس میں صرف ایک مصرعہ ہی بے وزن تھا۔ اس نے لفظ ہجر کی جیم کو متحرک باندھا تھا جب کہ یہ ساکن تھی۔

میں نے اس کی غلطی کی نشاندہی کی اور اسے کہا۔ ''دیکھیں درست لفظ اس طرح باندھنا چاہیے۔ جس طرح اس کی اصل ہے جیسے وہ پڑھا جاتا ہے۔ باقی آپ نے خوب لکھا ہے اس کے لیے بہت سی داد...... وزن کے حوالے سے آپ کا کلام ٹھیک ہے البتہ اس کے علاوہ آپ کے کلام میں کچھ اور خامیاں ضرور موجود ہیں جن کے بارے میں آپ کو بعد میں بتائیں گے جب آپ ساری بحروں کا وزن سیکھ جائیں گی۔''

''جی بہتر سر۔''

میں نے اس سے، اس بحر میں ایک دو اور غزلیں

لکھوائیں جو اس نے ٹھیک لکھیں۔ اگلے دن میں اسے ''بحرِ متدارک'' کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ اس بحر میں بھی اس نے شروع میں ایک دو غلطیاں کیں اور پھر اس بحر کا آہنگ اور وزن بھی اس کی سمجھ میں آ گیا اور وہ اس بحر میں بھی پُر وزن شعر کہنے لگی۔

عروض کے حوالے سے یہ دوسری کامیابی تھی جو اس نے حاصل کی تھی۔ میں اسے اگلے دن ''بحرِ رمل'' کے بارے میں سکھا اور سمجھا رہا تھا۔

یہ بحر بھی وہ سیکھ گئی تو میں نے اسے ایک اور بحر سے آشنا کیا۔ وہ جیسے جیسے نئی بحریں سیکھتی جا رہی تھی اور ان میں لکھتی جا رہی تھی ویسے ویسے میرا دل خوش ہوتا جا رہا تھا۔ اور مجھے یقین سا ہو چلا تھا کہ ایک دن وہ تقریباً تمام مانوس اور مستعمل بحروں میں لکھنا سیکھ جائے گی۔

مگر میرے اس یقین کی دیوار میں دراڑ اس دن پڑی جس دن دو چار آسان بحروں کے بعد مشکل بحروں کی باری آئی اور میں نے اسے اس بارے میں سمجھایا۔ اس دن میں اسے اس نئی بحر کے بارے میں ہر طرح سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا مگر ایک وہ تھی کہ اس بحر کا آہنگ کسی طور سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ جب آدھے گھنٹے تک سمجھانے کے باوجود بھی وہ اس بحر کا آہنگ نہیں سمجھ سکی اور اس بحر میں ایک بھی درست مصرعہ نہیں بنا سکی تو اچانک ہی مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسی وقت موبائل نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کر دیا۔

کال ریسیو ہوتے ہی میں غصے سے اس پر پھٹ پڑا۔

''آپ کا دماغ کہاں غائب ہے؟ میں آپ کو سمجھاتا کچھ ہوں، آپ کی سمجھ میں کچھ آتا ہے۔ جتنے آسان طریقے سے میں نے آپ کو سمجھایا ہے اگر آپ کی جگہ کوئی عقل سے پیدل انسان بھی ہوتا تو وہ بھی اس بحر کے آہنگ کو سمجھ کر اس وزن میں مصرعے لکھ لیتا اور ایک آپ ہیں کہ......''

''سر! میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہوں شاید اس لیے اس بحر کا آہنگ سمجھ نہیں پا رہی۔''

اس نے رنجیدہ لہجے میں کہا اور پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ اس کے یوں رونے سے میں گھبرا گیا۔

مجھے اچانک ہی احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی سختی کر بیٹھا ہوں۔ پتا نہیں وہ اپنی کن پریشانیوں میں تھی اور میں تھا کہ......

''ارے ارے......ایم سوری بھئی، ایم ویری سوری۔ پلیز یہ رونا بند کریں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ذہنی طور پر پریشان ہیں۔ ورنہ میں آپ سے اس طرح بات نہیں کرتا۔''

''قصور آپ کا نہیں ہے سر میرا ہے۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ میں آج کل ذہنی طور پر اتنی پریشان ہوں کہ آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔'' اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیا پریشانی ہے آپ کو؟ مجھے بتائیں، میں شاید آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔''

''یہی تو پریشانی ہے سر کہ میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔'' اس کے لہجے میں شدید بےچارگی تھی۔

''مجھے ایک دو دن کی رخصت دیں سر جب ذہنی طور پر فٹ ہو جاؤں گی تو پھر ہی کچھ سیکھ پاؤں گی ورنہ اس طرح بہت مشکل ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے آپ ایک دو دن آرام کریں جب آپ کا ذہن پرسکون ہو جائے تو تب سیکھیے گا۔''

''جی انشاءاللہ سر......تھینک یو......اللہ حافظ۔''

''اللہ حافظ۔''

دو دن کی بجائے چار دن گزر گئے۔

نہ ہی صدف ان چار دنوں میں فیس بک پر آئی تھی اور نہ ہی اس نے موبائل پر مجھ سے رابطہ کیا تھا اور ایک میں تھا کہ جو پچھلے کچھ دنوں سے صدف کا اس کی آواز کا اور اس کی کال کا عادی ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے ایک ایسا خیال آیا کہ میں اپنے اس خیال پر جھنجلا اٹھا۔ ایک سوچ نے لاشعور کا سہارا لے کر سرگوشی کی۔

''میں صدف کو چاہنے لگا ہوں، مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔''

مجھے نہیں معلوم کہ میری اس سوچ میں صداقت تھی یا نہیں مگر میں اپنی اس سوچ پر جھنجلا ضرور اٹھا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میں اپنی اس سوچ کو جھٹلا دوں اور اگر میرے دل میں سچ میں کوئی ایسا جذبہ ہے اور وہ پنپ رہا ہے تو اسے اپنے دل سے کھرچ پھینکوں، مگر......تین چار دن تو میں اپنی اس سوچ سے لڑتا رہا۔ جب میں کامیاب نہیں ہو سکا تو میں نے شکست مان کر اس سوچ کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ بات تسلیم کر کے گزرے ہوئے شب و روز میں کسی دن وہ کھنکتی ہوئی آواز والی لڑکی چپکے سے میرے دل میں اتر گئی ہے اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ اس سچائی کا احساس اور ادراک ہوتے ہی میں اور بےچین ہو گیا تھا۔ آٹھ دن ہونے کو آئے تھے اور صدف کا مجھ سے

رابطہ منقطع تھا اور میرا دل تھا کہ اس کی آواز سننے کو مچل رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا لوں مگر میں اس میں زیادہ دیر تک کامیاب نہ ہو سکا۔
اس دن میں نے اپنا موبائل نکالا اور صدف کا نمبر ڈائل کر دیا۔
کال رسیو ہوتے ہی مجھے اس کی بجھی بجھی سی آواز سنائی دی۔ یوں، جیسے اس کی آواز کی دلکشی کسی نے چھین لی ہو۔
''السلام علیکم سر۔''
''وعلیکم السلام، کیسی ہو صدف؟''
''جی اچھی ہوں۔''
''مگر مجھے تو ایسا نہیں لگ رہا۔'' میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔
دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وہ کچھ بولے گی مگر کافی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ چپ رہی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا بات ہے صدف! خاموش کیوں ہو گئی ہو؟''
''جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو خاموش ہی ہونا پڑتا ہے۔''
''کیا مطلب؟''
''کچھ نہیں۔'' اچانک اس کی آواز بھیگ گئی۔
''آپ رو رہی ہیں؟''
''نہیں سر۔''
مجھے صاف پتا چل گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔
اس کے لہجے میں نمی کا احساس ہوتے ہی میرا دل بے چین ہو گیا۔
یقیناً اسے کوئی پریشانی تھی۔ کوئی بڑی پریشانی تھی جسے وہ پوری کوشش کر کے چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔
میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی پریشانی کو فوراً دور کر دیتا۔ ''دیکھیں صدف! مجھے صاف محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کو کوئی بڑی پریشانی لاحق ہے۔ اگر سچ میں ایسی کوئی بات ہے اور آپ مجھے اپنا سمجھتی ہیں تو پلیز بتائیں مجھے۔ میں آپ کی پریشانی حل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''
وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر بولی۔ ''اچھا سر، موبائل کی بیٹری لو ہے پھر بات ہو گی آپ سے۔ آج میں فیس بک پر آپ کے لیے ایک میسج چھوڑوں گی۔ شاید میں اس میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کر سکوں، خدا حافظ۔''
اس کے ساتھ ہی اس کی کال منقطع ہو گئی۔ میری بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے، میں ایک گھنٹے بعد فیس بک پر گیا تو وہاں صدف کا کوئی میسج نہیں آیا تھا۔ میں پھر ایک گھنٹے بعد گیا تو وہاں نہ ہی صدف تھی نہ ہی اس کا میسج۔ اس کا موبائل بھی آف جا رہا تھا۔ میں وقتاً فوقتاً، ایک ایک گھنٹے بعد فیس بک پر جاتا رہا مگر ناکامی ہوئی۔ یہاں تک کہ رات کے دس بج گئے تھے۔ میرے سونے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں مایوس ہو کر فیس بک آف کر ہی رہا تھا کہ مجھے اسی وقت صدف کا ایک طویل میسج موصول ہوا تھا۔ اس نے دعا سلام کے بعد لکھا تھا۔
''مجھے لگتا ہے سر، شاید ہماری جدائی کے دن قریب آ گئے ہیں۔ آپ شاید میری بات کا یقین نہ کریں اور میں چاہتی بھی نہیں کہ آپ یقین کریں مگر حقیقت یہی ہے کہ پچھلے کچھ دنوں میں جب سے میں نے آپ سے عروض سیکھنا شروع کیا ہے آپ پتا نہیں کب چپکے سے میرے دل میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں اپنی اس پسندیدگی کو احترام سے منسوب کرتی رہی مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ ہر لڑکی یا عورت کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے میرا آئیڈیل آپ جیسی ہی کسی شخصیت کو ہونا تھا۔ معلوم نہیں میں کب آپ کو اپنا آئیڈیل سمجھنے لگی اور اگر بات یہیں تک ہی رہتی تو بھی ٹھیک تھا، پر کچھ دن بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی اس آئیڈیل شخصیت سے محبت کرنے لگی ہوں، اسے چاہنے لگی ہوں۔''
میں نے اس سچائی کو کئی بار جھٹلانا چاہا مگر جھٹلا نہیں پائی۔ بالآخر مجھے یہ بات تسلیم کرنا ہی پڑی کہ میرے دل کو آپ کی سحر انگیز شخصیت نے تسخیر کر لیا ہے۔ معلوم نہیں آپ مجھے کوئی گری پڑی لڑکی سمجھیں یا کچھ اور مگر حقیقت یہی ہے جو میں آپ کو بتا رہی ہوں۔
میں نے پچھلے کچھ دنوں میں بہت کوشش کی کہ اپنے دل کی اس بات کو خود تک ہی محدود رکھوں مگر مجھے آپ کے شفقت اور محبت بھرے رویے نے یہ بات کہنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ اب کم سے کم مجھے اس بات کا افسوس نہیں رہے گا کہ میں آپ تک اپنے دل کی بات نہیں پہنچا سکی۔
اپنے دل کی بات خود تک محدود رکھنے میں، میں کتنا الجھ گئی تھی اور ذہنی طور پر کس قدر ڈسٹرب ہو گئی تھی اس بات کے آپ خود شاہد ہیں۔
صرف یہی وجہ تھی جو میرا ذہن ڈسٹرب تھا اور آپ کی پوری کوششوں کے باوجود بھی میں عروض میں آگے نہیں بڑھ پائی تھی۔
آپ کے اتنا مجبور کرنے پر ہی میں اپنے دل کی بات کو

لفظوں کا [illegible] دے پائی ہوں۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ اس سچائی کو تسلیم کریں یا انکار کردیں۔

بس مجھے اپنے تلخ یا شیریں جواب سے ضرور آگاہ کیجیے گا تاکہ میری خوش فہمیوں کا سلسلہ تھم سکے۔ ورنہ مجھے یقین ہے آپ اتنا بھی نہیں کریں گے۔

ہمارے درمیان جو عروض کا سلسلہ چلا تھا مجھے یقین ہے اس کے اختتام کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس دوران اگر میری کسی بات سے آپ کا دل دکھا ہو تو معافی چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے معاف کردیجیے گا۔"

میں اس کا میسج پڑھ کے گم صم سا ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ پریشان ہے مگر اسے یہ پریشانی لاحق ہے اس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ صدف نے اپنے دل کی بات کہہ دی تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں بھی پتا نہیں کب سے اسے دل ہی دل میں چاہنے لگا تھا۔

مجھے اکثر اس کا، اس کی کال کا بیتابی سے انتظار رہتا تھا۔ میرے دل نے کئی بار مجھے احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہوں مگر میں نے ہر بار اپنے دل کی اس بات کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔ شاید مجھے یہ خوف لاحق ہو گیا تھا کہ اگر میں نے اپنے دل کی یہ بات درست مان لی اور صدف سے اپنے دل کی بات کہہ دی تو وہ کیا سوچے گی کہ ایک معروف شاعر، اور عروض کا استاد، وہ ایسی سوچ کا مالک ہے۔ اگر میں اس سے اپنے دل کی بات کہہ دیتا تو شاید اس کی نظروں سے بھی گر جاتا اور مجھے اس کی محبت بھی نہیں ملتی اور اس کے ساتھ اس سے وہ تعلق بھی ٹوٹ جاتا جو بنا ہوا تھا مگر اب، جب صدف نے خود محبت کا اظہار کیا تو مجھے سمجھ نہ آیا کہ میں اس کی اس بات کا کیا جواب دوں۔

گو اس کا یہ میسج پڑھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا تھا مگر میں جلد بازی میں کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میں اس کی نظروں میں چھوٹا ہو جاتا۔ مجھے اس کی محبت کے بدلے محبت سے ہی جواب دینا تھا مگر مجھے سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا تھا۔ مجھے ایسی کوئی بات نہیں کرنی تھی جس سے عامیانہ پن جھلکتا ہو۔ بالآخر بہت سوچ سمجھ کر میں نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھا۔ جس میں، میں نے دوسری باتیں لکھتے ہوئے اپنے دل کی بات بھی کہہ دی...... اور وہ میسج صدف کو سینڈ کر دیا۔

قصہ مختصر، اس دن سے ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے اور ہمارے درمیان تکلف کا جو پردہ تنا ہوا تھا وہ کسی حد تک چاک ہو گیا۔

ہماری ہر صبح کا آغاز ایک دوسرے کے گڈ مارننگ کے میسج سے ہوتا اور رات گڈ نائٹ کے میسج سے۔ ہمارے دن سہانے ہو گئے اور راتیں رنگین۔ زندگی اچانک بہت ہی خوبصورت ہو گئی تھی۔

وہ عروض جو ہم دونوں کو ملانے کا سبب بنا تھا ہم دونوں سے بہت دور چلا گیا اور اس کی ہمارے نزدیک کوئی وقعت نہ رہی۔

ہمیں جب جب فرصت ملتی، ہم ایک دوسرے سے بہت ساری پیار بھری باتیں کرتے اور ایک دوسرے کو اپنی اپنی پسند اور مشاغل کے بارے میں بتاتے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کافی حد تک جان گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں کافی کچھ بتایا تھا اور میں نے اسے اپنے بارے میں۔ میرے اصرار پر اس نے مجھے ان باکس میں اپنی دو چار اچھی اچھی تصویریں بھی سینڈ کیں جنھیں دیکھ کر میری محبت میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ خوبصورت تھی، حسین تھی، سچ میں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

جس دن اس نے مجھے اپنی تصویریں سینڈ کی تھیں اس دن میں نے اس کی خوبصورتی پر لفظ چن چن کر ایک بہترین غزل تخلیق کی تھی اور اسے اس کے نام کر کے ان باکس میں سینڈ کر دی تھی۔

اپنی ایسی تعریف پر وہ شرما گئی تھی۔

"کیا میں سچ مچ اتنی حسین ہوں؟"

اس نے پوچھا۔

"آئینہ تو روز دیکھتی ہوں، پر خود کو حسین تو نہیں دکھتی۔"

مجھے بے اختیار عدم کا ایک شعر یاد آگیا۔

"یہ آئینے ترے حسن کی کیا دید کریں گے
تو دیکھ مری آنکھ سے تو کتنا حسیں ہے"

اس نے شرما جانے والا ایک اور اسٹیکر سینڈ کیا۔

"ہمارا وہ عروض کا سلسلہ کہاں تک پہنچا تھا؟"

اسے اچانک ہی اس دن عروض یاد آگیا۔

"کیوں؟ یہ اچانک پھر عروض کا شوق کیوں چرانے لگا تمھیں؟ اس طرح سکون سے ٹھیک نہیں ہو گیا؟"

"اگر عروض سیکھوں گی تو وزن میں شاعری کرنا آئے گی ناں۔ ورنہ تو تمام عمر بے وزن شعر ہی کہتی رہوں گی۔"

''اس کی اب ضرورت نہیں ہے۔
بس جو کلام لکھنا مجھے سینڈ کر دیا کرنا میں اس کی اصلاح کر دیا کروں گا۔''
''یعنی اب عروض میں مغز ماری کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟''
''بالکل نہیں۔''
''چلو جان چھوٹی۔''
میں اس کی بات پر مسکرا دیا۔
''سچ پوچھیں تو عروض مجھے عذاب لگتا تھا۔ دو چار بحریں بھی، میں پتا نہیں کیسے سیکھ گئی تھی۔ اب آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''
اس کے بعد وہ مجھے اپنی ٹوٹی پھوٹی غزلیں اور شعر روزانہ سینڈ کرنے لگی تھی۔ جس کی میں اصلاح کر کے اسے پہلے سے کئی گنا بہتر کر دیتا تھا۔ وہ میری اصلاح دیکھ کر خوش ہو جاتی اور میں اس کی خوشی میں خوش ہو جاتا۔
کچھ دن بعد اس نے ایک نئی بات کی۔ ''میں اپنی کتاب چھپوانا چاہتی ہوں۔''
مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی۔
''کیوں اس کی کیا ضرورت ہے؟''
وہ میری بات پر خفا ہو گئی۔ ''ضرورت کیوں نہیں ہے؟ میں اتنا اچھا لکھتی ہوں میرا کلام دنیا کے سامنے آنا چاہیے اور دوسرا، صاحب کتاب ہونا ایک اعزاز کی بات ہے کیا مجھے یہ اعزاز حاصل نہیں کرنا چاہیے؟''
''ضرور کرنا چاہیے مگر......''
''مگر کیا؟''
میں اسے حقیقت بتا کر اس کی خوشی اور اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔
میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ صاحب کتاب ہو کر بھی انسان کوئی آسمان کے تارے توڑ نہیں لاتا، نہ ہی دنیا اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔
میں خود دو کتابوں کا مصنف تھا۔ دونوں کتابیں اپنے ذاتی خرچے پر شائع کرائی تھیں، مگر کیا ملا تھا مجھے؟ صرف آس پاس کی سستی شہرت اور فیس بک کی دنیا۔ میں نے اس کا دل توڑنے کی بجائے کہا۔ ''کتنی غزلیں ہو گئیں ہیں تمھاری؟''
''بیس ہو گئی ہیں۔''
''کتاب کے لیے کم سے کم بھی پچاس ساٹھ غزلیں ہونی چاہیں۔''

''وہ میں کر لوں گی۔''
''کیسے؟''
''میں روزانہ دو دو، تین تین غزلیں لکھا کروں گی...''
میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائے۔
اس کے بعد وہ روزانہ دو دو، تین تین غزلیں لکھنے لگی تھی اور اس سے زیادہ لکھنے کے چکر میں وہ بہت گھسے پٹے مضامین کو لفظوں میں ڈھالنے لگی تھی۔ ان غزلوں کی اصلاح سے بہتر تھا کہ میں خود اسے اپنی طرف سے نئی غزل لکھ کر دے دیتا جو کم سے کم کسی قابل تو ہوتی۔
میں نے اس سے اس دن یہ بات کی تو اس نے کہا۔ ''میں کیا کروں، مجھ سے جو ہو پاتا ہے، لکھ کر بھیج دیتی ہوں۔ اس سے بہتر میں نہیں لکھ سکتی۔ ویسے آپ کی یہ بات میرے دل کو لگی ہے کہ ان سے بہتر ہے آپ مجھے نئی غزل لکھ کر دے دیا کریں یہ بہتر رہے گا۔''
مجھے اس کی بات تھوڑی عجیب لگی۔ میں نے تو یونہی مثال دینے کے لیے یہ بات کی تھی اور اس نے کہہ دیا کہ......
ویسے مجھے اس کے لیے کلام تخلیق کرنے میں کوئی اعتراض یا کسی قسم کا تعامل نہیں تھا۔ کیوں کہ شاعری کسی کو دیتی ہی کیا ہے؟ وہ اچھی ہو یا بری۔ اور ویسے بھی شاعری میرے لیے صرف بائیں ہاتھ کا کھیل تھی۔ دو کتابوں کی اشاعت کے تلخ تجربے سے گزرنے کے بعد، میرا دل اور کوئی کتاب شائع کرانے سے بھر گیا تھا بلکہ شاعری کرنے سے ہی بھر گیا تھا۔ بس کبھی کبھار کوئی غزل ہو گئی تو ہو گئی، ورنہ میرا زیادہ تر وقت دوسروں کو عروض سکھانے میں ہی بسر ہوتا تھا۔ اس دن سے میں روزانہ ایک غزل صدف کو لکھ کر دینے لگا۔ جسے وہ فیس بک پر بھی لگا دیا کرتی تھی جہاں اسے بھرپور پذیرائی ملتی اور وہ اس پذیرائی پر خوش ہو جاتی۔ میری خوشی اس کی خوشی میں تھی۔
میری بھیجی ہوئی غزل پڑھ کر وہ میری اتنی تعریف کرتی کہ میرا دل خوش ہو جاتا۔
اگلے دن میں اس سے بہتر غزل تخلیق کرنے کی کوشش کرتا۔
اگلے دو ماہ میں اتنا کلام جمع ہو گیا کہ اس کی کتاب شائع ہو سکتی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں جلد ہی اس سے اس سلسلے میں بات کروں گا مگر میرے بات کرنے سے پہلے ہی ایک دن اس نے یہ بات چھیڑ دی تھی۔
''اسی غزلیں ہو گئی ہیں میرے پاس، اب تو کتاب شائع ہو سکتی ہے نا؟''

''ہاں ہو سکتی ہے۔''
''یس...... مجھے پتا تھا۔''
اس کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔
''پر تم نے پیسے کتنے جمع کر لیے ہیں کتاب کی اشاعت کے لیے؟''
''کیا... کتاب شائع کرانے کے بھی پیسے لگتے ہیں؟''
میرا دل چاہا کہ میں اس کی سادگی پر کھل کر ہنسوں مگر میں نے صرف مسکرانے پر کیا۔ ''جی ہاں اور اچھے خاصے لگتے ہیں۔''
''چاہے شاعری معیاری ہو یا غیر معیاری؟''
''غیر معیاری شاعری، اگر کسی قابل ہو تو چل جاتی ہے اور اگر زیادہ غیر معیاری ہو تو پبلشر اسے شائع ہی نہیں کرتے اور جو کلام اشاعت کے قابل ہو اور مصنف کی پہلی کتاب ہو تو اس کے تمام اخراجات اسی کو ہی ادا کرنے پڑتے ہیں۔''
''مثلاً، کتنا خرچا آ جاتا ہے ایک بک پر؟''
''زیادہ نہیں تو کم سے کم پچاس ہزار تو آ ہی جاتا ہے۔''
''پچاس ہزار!''
اس کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔
''جی ہاں، پچاس ہزار کے لگ بھاگ خرچا ہو جاتا ہے۔''
اچانک اس کی بجھی بجھی سی آواز سنائی دی۔
''پھر تو یہ خواب، خواب ہی رہ جائے گا۔ میں نے کیسے کیسے، کتاب کی اشاعت کے خواب بن رکھے تھے مگر......''
پتا نہیں کیوں، اسے افسردہ محسوس کر کے میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔
''اچھا، تم سچ میں کتاب شائع کرانا چاہتی ہو؟''
''ارادہ تو یہی تھا پر لگتا ہے اب یہ خواب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔''
''کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔ کتاب شائع کرانے کے لیے پیسے تو لگیں گے ہی۔
ویسے میری ایک پبلشر سے دعا سلام ہے میں اس سے بات کروں گا شاید وہ پانچ دس ہزار چھوڑ دے۔ ویسے تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟''
''میرے پاس زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہوں گے۔''
اس کی مری مری سی آواز سنائی دی۔ ''جب پاپا نے میرا بینک اکاؤنٹ کھلوایا تھا تو صرف پانچ ہزار تھے اس میں۔ پانچ چھ ہزار میں نے اپنی پاکٹ منی سے بچا بچا کر سیو کیے ہیں۔''
''اچھا کتنی پاکٹ منی ملتی ہے تمہیں؟''
''بس پچاس روپے روزانہ کے ملتے ہیں۔'' اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اچھا دل چھوٹا مت کرو کچھ کرتے ہیں اس سلسلے میں۔ اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر بتاؤ اور یہ بھی کہ کس بینک میں تمہارا اکاؤنٹ ہے؟''
''کیوں...... وہ کیا کرنا ہے؟''
''بس کچھ کرنا ہے۔ کیا مجھ پر اعتبار نہیں؟''
''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔''
''تو بتاؤ مجھے۔''
اس نے مجھے اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر بتا دیا جو میں نے سیو کر لیا۔
اگلے دن میں نے اپنے اس پبلشر دوست سے بات کی وہ پچاس کی بجائے چالیس میں کتاب شائع کرنے پر تیار ہو گیا۔
کتاب کی اشاعت کے بعد وہ سو کتابیں ہمیں دیتا باقی خود سیل کرتا۔ صدف سے پوچھنے کے بعد ایک دن میں نے صدف کی بھی کانفرنس کال ملا کر، اس سے بات کرا دی۔ ہم کافی دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس نے کہا کہ پیسے ملتے ہی پندرہ دنوں میں کتاب مارکیٹ میں آ جائے گی۔
اگلے دن میں نے صدف کو کال کی تو اس نے کہا۔ ''وسیم صاحب تو کہہ رہے تھے کہ کتاب چالیس ہزار میں شائع ہو جائے گی اور آپ بھی کہہ رہے تھے کہ ہم دو دن میں پیسے دے دیں گے مگر میرے پاس تو فی الحال اتنے پیسے نہیں ہیں۔'' میں مسکرایا۔
''میں آج ہی تمہارے بینک اکاؤنٹ میں تیس ہزار جمع کرا دیتا ہوں۔ سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔''
''ارے...... نہیں نہیں۔ میں آپ سے ایک پیسا بھی نہیں لوں گی۔'' اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔
''کیوں، کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتی؟''
''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔''
''تو بس جیسے میں کہتا ہوں، ویسا کرو۔ میں آج ہی تمہارے اکاؤنٹ میں رقم جمع کراتا ہوں۔ تم اکیلے یا کسی کے ساتھ جا کر وسیم صاحب سے مل لو تا کہ جو تھوڑا بہت ابتدائی کام ہے وہ مکمل ہو جائے۔ میں خود تمہارے ساتھ چلتا مگر میں

پرسوں کسی کام سے شہر سے باہر جا رہا ہوں آٹھ دس دن لگ جائیں گے واپسی میں۔‘‘

’’جی بہتر۔‘‘

میرے بینک اکاؤنٹ میں کچھ رقم موجود تھی۔ میں نے اس میں سے تیس ہزار نکال کر صدف کے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے۔ شام کو صدف نے بتایا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ وسیم صاحب سے بھی مل آئی ہے اور ان سے بات بھی کر آئی ہے۔ اب صرف مسودہ اور رقم دینے کی دیر ہے انہیں۔ پھر بولی۔ ’’کیا غزلوں کا مسودہ اور رقم دے آؤں انہیں جا کر؟‘‘

اچانک میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش نے کروٹ لی۔ ’’تمہاری ساری غزلیں کہاں ہیں اس وقت؟‘‘

’’میرے پاس ایک ڈائری میں محفوظ ہیں۔‘‘

میں ایک لمحے کو رکا۔

’’صدف! میری ایک بات مانو گی؟‘‘

’’جی کہیں۔‘‘

’’میں تم سے ایک ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کسی پارک میں، کسی ہوٹل میں، کسی کھلی اور پر رونق جگہ پر، جہاں تم مناسب سمجھو۔ اپنے ساتھ اپنی ڈائری بھی لیتی آنا۔ میں دوبارہ سے ایک نظر سب غزلوں کو دیکھ لوں گا۔ جہاں ترمیم واضافے کی ضرورت ہوگی، وہاں وہ بھی کرلیں گے۔‘‘

وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔ میں سمجھا کہ وہ تھوڑی دیر میں جواب دے گی۔ مگر جب خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تو میں ہی اسے مخاطب کرنے پر مجبور ہو گیا۔

’’کیا ہوا؟ چپ کیوں ہو گئی ہو؟‘‘

مجھے یوں لگا، جیسے اس نے ایک گہری سانس لی ہو۔

’’کچھ نہیں، بس ویسے ہی۔ چلیں ٹھیک ہے آپ جہاں کہیں میں آ جاؤں گی۔‘‘

’’نہیں، جہاں تمہیں سہولت ہو میں آ جاؤں گا۔‘‘

’’ملنے کی بات آپ نے کی ہے جگہ بھی آپ بتا دیں میں آ جاؤں گی۔ مجھے آپ سے کوئی خوف نہیں ہے۔‘‘

میرا دل خوشی سے بھر گیا۔

میں نے اسے ایک معروف ہوٹل میں شام چھ بجے آنے کا کہا۔

’’ٹھیک ہے، میں کل وقت سے پہلے ہی وہاں آ جاؤں گی مگر میں آپ کو پہچانوں گی کیسے؟‘‘ اس نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

وہ اپنی جگہ بجا تھی۔ ہماری یعنی میری اور اس کی فیس بک آئی ڈیز پر، ہماری اصل تصویریں نہیں تھیں۔ میں نے جب سے اپنا فیس بک اکاؤنٹ بنایا تھا۔ تب سے اس پر ایک مخصوص تصویر ہی لگائی ہوئی تھی جسے میں نے کبھی تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میرے کہنے پر صدف نے تو مجھے اپنی کچھ تصویریں سینڈ کر دی تھیں مگر اس کے لاکھ کہنے کے باوجود میں نے اسے اپنی ایک تصویر بھی نہیں بھیجی تھی۔ وہ زیادہ اصرار کرتی تو میں کہتا۔

’’میں بہت بدصورت ہوں۔ تمہیں اپنی تصویر دکھا کر کھونا نہیں چاہتا۔‘‘

میری بات پر وہ خفا ہو جاتی۔ معلوم نہیں اس نے میری بات کو سنجیدگی سے لیا تھا یا مذاق سمجھا تھا البتہ ایک دو بار اصرار کے بعد اس نے دوبارہ مجھ سے یہ بات نہیں کی تھی۔

میں نے کہا۔ ’’ہمارے پاس موبائل فون ہیں، یہی ہماری پہچان بنیں گے۔‘‘

’’چلیں، یہ بھی ٹھیک ہے۔‘‘

مزید کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے کال منقطع کر دی۔ اس دن میں بہت خوش تھا۔ صدف، جس کی محبت نے پچھلے کچھ عرصے سے میرے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا، میں کل اس ماہ جبیں سے ملنے والا تھا، اسے دیکھنے والا تھا۔ نجانے ہماری محبت میں آگے کیا ہونے والا تھا۔ ہماری محبت کا کیا انجام ہونا تھا۔ مگر میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کل میں صدف سے ملنے اس سے بہت سی باتیں کرنے والا تھا۔

☆☆☆

میرا نہ تو صدف کی جاسوسی کرنے کا ارادہ تھا اور نہ ہی میں نے ایسی کوئی کوشش کی تھی۔ البتہ میرا یہ ارادہ ضرور تھا کہ میں اپنی شناخت کو چھپائے کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے اسے بہت دیر تک دیکھنا ضرور چاہتا تھا۔ میں نے صدف کو جہاں بلایا تھا وہ بڑا خوبصورت اور تھوڑا مہنگا ہوٹل تھا۔ تھوڑا مہنگے کا مطلب کچھ زیادہ ہی مہنگا تھا۔ وہاں متوسط طبقے کے لوگ بھی جانے سے کتراتے تھے۔ صرف امیر طبقے کے لوگوں کا ہی وہاں آنا جانا تھا۔

میں نے صدف کو اپنے بارے میں یوں تو سب کچھ ہی بتایا تھا مگر اس سے ایک دو باتیں چھپائی بھی تھیں۔ وہ یہ کہ میں پہلے سچ میں ایک پرائیوٹ اسکول میں ٹیچر تھا مگر تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے میں نے کچھ ہفتے پہلے وہ نوکری چھوڑ کر اس ہوٹل میں ویٹر کی نوکری حاصل کر لی تھی۔ اس ہوٹل میں ویٹر کی نوکری

حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس کے لیے مجھے کہیں دور سے سفارش کرانا پڑی تھی۔ میں نے صدف کو اسی ہوٹل میں بلایا تھا۔ میں وہاں پہلے سے ہی موجود تھا اور میرا انگ انگ آنکھیں بنا صدف کا راستہ تک رہا تھا۔ وہ چھ بجے سے پندرہ منٹ پہلے ہی وہاں پہنچ گئی۔

میں نے اسے دیکھا تو سچ مچ میرا سانس سینے میں تھمنے لگا۔ اس نے مجھے ان باکس جو تصویریں سینڈ کی تھیں وہ ان سے کئی گنا زیادہ حسین تھی یا پھر مجھ سے ملنے کے لیے وہ خاص طور پر تیار ہو کر آئی تھی۔ نیلے کلر کے لباس میں اس کا دودھ جیسا سفید چہرہ دل میں کھب رہا تھا۔ وہ ایسی خوبصورت لگ رہی تھی کہ اس سے نگاہیں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

میں جو ہر پل لفظوں سے کھیلتا رہتا تھا، اس وقت ان لفظوں نے، اس کی خوبصورتی کی صحیح تعریف کے لیے مجھ سے بغاوت کر دی۔

صدف کے ساتھ کوئی اور لڑکی بھی تھی، غالباً اس کی کوئی دوست تھی۔ وہ ہوٹل میں داخل ہوئی اور تین نمبر میز پر جا کر بیٹھ گئی۔

اس وقت اس ہوٹل میں کچھ فاصلے پر ایک فیملی کے دو ممبر موجود تھے یا پھر صدف اپنی دوست کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ باقی سارا ہوٹل خالی تھا۔ پورے ہال میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف ہو گئیں تو میں بمشکل خود کو سنبھالتا، ان کے قریب جا تھما۔

میرے ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی۔

''گڈ آفٹر نون میم!''

''گڈ آفٹر نون۔''

صدف نے جواب دیا۔ میں نے لسٹ مینو اس کے سامنے کرنا چاہی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

''ہمارے ایک گیسٹ آنے والے ہیں، ان کے ساتھ ہی کچھ لیں گے۔''

''جی میم۔''

میں نے احتراماً کہا اور دھیرے سے واپس پلٹا۔ ابھی میں نے ایک قدم اٹھایا ہی تھا کہ میرے کانوں سے صدف کی آواز ٹکرائی۔

''سچ کہا تھا یار، فیس بک پر ایک سے بڑھ کر ایک بے وقوف پڑا ہے۔''

اس کے لفظوں نے میرے قدموں میں زنجیر سی ڈال دی۔ پتا نہیں وہ کس کی بات کر رہی تھی مگر میں اس کی پوری بات سننے کے لیے بے چین ہو گیا۔

مگر میں وہاں رک کر انہیں کسی قسم کے شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے وہاں سے قدم اٹھائے اور دوسری طرف ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر ان کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا۔

میرے اور ان کے درمیان پردے کی ایک دیوار حائل تھی۔ وہ دونوں پردے کے دوسری طرف تھیں اور میں اس طرف۔

''بھئی میں تو استاد مان گئی ہوں تمہیں۔ اگر اس دن تم مجھے وہ مشورہ نہ دیتیں تو آج شاید ایسا کچھ نہیں ہوتا۔''

مجھے صدف کی آواز سنائی دی۔

''تو پھر مٹھائی کھلاؤ اس بات پر۔''

صدف کی ساتھ والی لڑکی نے کہا۔

''مٹھائی بھی کھلا دیں گے، بس ذرا وہ میرے بدھو عاشق صاحب آ جائیں، سب اسی کے خرچے پر ہوگا۔''

اس بات پر وہ دونوں کھل کر ہنسیں۔

نجانے کیوں، میرا سانس سینے میں رکنے لگا۔ وہ دونوں غالباً میرا ہی ذکر کر رہی تھیں۔

''ویسے میں ایک بات اب بھی کہوں گی۔'' صدف کے ساتھ آئی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ ''اس شاعری وائری میں کچھ بھی نہیں پڑا، یہ سب وقت کی بربادی ہے اور کچھ نہیں۔'' یہ بات اس نے درست کہی تھی۔

''مجھے تمہاری بات سے اتفاق نہیں۔'' صدف کی آواز سنائی دی۔

''بس ایک بار میری کتاب شائع ہو جائے پھر ہر طرف دیکھنا، اردو شاعری میں میرا بھی ایک نام ہوگا۔ میری شہرت ہوگی۔ لوگ دیوانے ہو جائیں گے میرے۔''

''صرف کتاب شائع ہونے سے شہرت نہیں مل جاتی اس میں کچھ دم بھی ہونا چاہیے۔''

''دم تو بہت ہے شاعری میں۔ دم کیسے نہیں ہوگا؟ ساری شاعری ہی اسی کی لکھی ہوئی ہے۔ میری تو صرف دو چار غزلیں ہوں گی۔ سچ میں، بہت کمال کی شاعری ہے، پر بچارہ......''

اس بات پر پھر ایک ہلکا سا قہقہہ پڑا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' صدف کی ساتھ والی لڑکی نے کہا۔

''تم اچھی شاعرہ ہو یا نہیں، مگر اچھی اداکارہ ضرور ہو۔ کیسے محبت کا ڈھونگ رچا کر اس سیدھے سادے بندے کو اپنے

جال میں پھنسالیا جواب نہیں تمہارا۔"
"اور یہ مشورہ دیا کس نے تھا تم نے۔"
اس بات پر پھر قہقہہ سا پڑا۔
"یار! میں شاید ایسا نہ کرتی، پر یہ جو عروض کی بلا تھی نا، اس نے میرا دماغ چاٹ لیا تھا۔ اتنا ثقل علم تو کالج یونیورسٹی میں بھی نہیں ہوتا ہوگا سبب، وتد، ہجائے کوتاہ، ہجائے بلند...... نجانے کن کن بیماریوں کے نام تھے۔ میرے پلے تو کچھ نہیں پڑا تھا۔ پھر ارکان، وزن... پتا نہیں کیسے کیسے عذاب تھے۔ جب تک یہ نہ سیکھو، شاعر نہیں بن سکتے تم۔ جب میں نے تم سے اس پریشانی کا ذکر کیا تھا تو تم نے مجھے وہ مشورہ دیا تھا۔ دو چار بحروں کے بعد عروض میں اتنی مشکل آ گئی تھی کہ مجھے مجبوراً تمہارے مشورے پر عمل کرنا پڑا تھا اور اس دن کے بعد میری عروض سے جان چھوٹ گئی تھی۔
موصوف نے کہہ دیا تھا کہ بس اب تمھیں عروض سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا، میں اصلاح کر دیا کروں گا۔ کوئی اس سے پوچھے۔ الو کے پٹھے! یہ اصلاح محبت کے ڈرامے سے پہلے کیوں نہیں کی؟ اس وقت تو جناب کا فرمانا تھا جب تک آپ عروض نہیں سیکھیں گی آپ کو وزن میں شاعری کرنا نہیں آئے گی۔ پہلے عروض سیکھیں، پھر شاعری کیجیے گا...... اور اب نہ عروض کی ضرورت ہے نہ شاعری کی۔ موصوف خود ہی ساری غزلیں لکھ کر دیتے رہے اور تو اور، کتاب کی اشاعت کے لیے بھی تیس ہزار میرے بینک میں جمع کرائے ہیں۔ سچ میں، دنیا میں ایسا بے وقوف انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"
صدف اپنی سہیلی سے کہے جا رہی تھی اور اس کے الفاظ سیسہ بن کر میرے کانوں میں اترتے جا رہے تھے۔ میرا ذہن و دل اچانک ایک ایسی آندھی کی زد میں آ گیا تھا کہ میرا اپنے ہوش و حواس میں رہنا مشکل ہو گیا۔ میں نے جس کے لفظوں کا اعتبار کر کے جس کے لیے اتنا کچھ کیا تھا، اس نے مجھے بے وقوف بنا کر میری سادگی کا، یا پھر میرے جذبات کا فائدہ اٹھایا تھا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میرا ذہن و دل اس وقت کیسی اذیت سے دو چار تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں زور زور سے روؤں، چیخوں، اپنا سر دیواروں سے ٹکراؤں، مگر میں خود پر جبر کیے، بمشکل ان باتوں پر تحمل کرنے سے باز رہا۔ اچانک مجھے صدف کی سہیلی کی آواز سنائی۔
"تمہارا یہ ڈراما کامیاب تو ہو گیا پر مجھے یہ بتاؤ، اس ڈرامے کو جاری رکھنے کا ارادہ کب تک ہے؟"
"بس یہ کتاب شائع ہو جائے اس کے بعد ایک اور کتاب آ جائے، پھر اس ڈرامے کا دی اینڈ کر دیں گے۔"
"گڈ... اچھا یار، اتنی دیر ہو گئی ہے، وہ ابھی تک آیا نہیں؟ اس نے چھ کا کہا تھا، سوا چھ ہونے والے ہیں، اس کا معلوم تو کرو، کہاں مر گیا؟ ایک دو گھنٹے تو وہ آ کر سر کھائے گا۔ تمھاری غزلیں بھی دیکھنی ہیں اس نے۔ گپ شپ بھی ہو گی، کہیں دیر نہ ہو جائے۔"
"میں کال کر کے معلوم کرتی ہوں۔"
اچانک میرے موبائل کی اسکرین جلنے بجھنے لگی۔ مگر وہاں سے کوئی آواز برآمد نہ ہو سکی۔ ان کے آنے سے پہلے ہی میں نے اپنا موبائل سائلنٹ پر کر لیا تھا۔
"یار بیل تو جا رہی ہے، پر وہ اٹھا نہیں رہا۔"
"شاید بائیک پر ہو اور راستے میں ہو۔"
"ہو سکتا ہے۔"
اس کی کال آنا بند ہوئی تو میں نے اپنا موبائل آف کیا اور وہاں سے اٹھ کر اپنی جگہ پر چلا آیا۔ میری آنکھوں میں رہ رہ کر کوئی چیز چبھتی رہی مگر میں اپنے آپ پر جبر کیے رہا۔ میرے آنسو اندر ہی اندر کہیں گرتے رہے۔ میں وقتاً فوقتاً ایک اچٹتی سی نظر ان پر ڈال لیتا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔
ایک دو بار میں نے دیکھا، صدف اپنا موبائل فون کان سے لگائے ہوئے تھی۔ شاید وہ میرا نمبر ملاتی رہی تھی مگر میرا فون تو آف تھا۔ انہوں نے ایک گھنٹے تک میرا انتظار کیا اور پھر مایوس ہو کر وہاں سے چلی گئیں۔
اس رات میں فیس بک پر گیا تو صدف کے کئی میسج ان باکس میں آئے ہوئے تھے جسے میں نے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔
اس دن میں نے اپنے گروپ کا ایڈمن ایک اور دوست کو بنایا، جو کافی حد تک عروض جانتا تھا۔ گروپ اس کے حوالے کیا اور اپنے فیس بک اکاؤنٹ کو ہمیشہ کے لیے ڈی ایکٹیو کر دیا۔ اس دن سے میں نے شاعری، عروض اور افسانہ نگاری ترک کر دی اور اپنا موبائل نمبر بھی تبدیل کر لیا۔ کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں محبت کا ذکر ہو اور کوئی دوست اپنی محبت اور محبوب کا ذکر کرے تو میرے لبوں پر ایک مسکراہٹ سی آ جاتی ہے اور کسی کا لکھا ہوا یہ شعر بے اختیار میرے لبوں پر مچل جاتا ہے۔

گزرے ہیں زندگی میں کچھ ایسے مقام سے
نفرت سی ہو گئی ہے محبت کے نام سے

گیند اور پیپل

جناب معراج رسول
السلام علیکم
میں نے پہلی بار کہانی لکھی ہے جو میری اپنی ہے اگر اس میں کوئی خامی نظر آئے یعنی صحیح طور پر الفاظ کا استعمال نہ ہوا ہو تو پلیز اسے کسی اچھے رائٹر سے دوبارہ لکھوا لیجیے گا لیکن اسے ردی کی توکری کی نذر نہ کریں۔
وقارالحسن
(کراچی)

میری عمران دنوں بہ مشکل دس سال رہی ہوگی۔ تب نارتھ ناظم آباد نیا نیا آباد ہو رہا تھا۔ تعمیراتی کام جاری تھا۔ کافی دور دو مکانات تعمیر ہو رہے تھے۔ درمیانی جگہ میں خالی پلاٹ تھے جن پر خودرو گھاس اُگ آئی تھی۔ ہمارے بلاک میں خاصے مکان آباد ہو گئے تھے۔ یہ اپر مڈل کلاس آبادی تھی۔ اسے آپ خوش حال اور کھاتے پیتے افراد کی آبادی سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں چار سو اور چھ سو مربع گز کے پلاٹ تھے۔

خالی پلاٹ ہمارے لیے میدان کا کام دیتے تھے۔
ہم سے بڑے لڑکوں نے تو یہاں کرکٹ کھیلنے کی پچ بنائی ہوئی تھی۔ ہر اتوار کو یہاں کرکٹ میچ ہوتا سنجیدہ حضرات بھی ان میچوں کو شوق سے دیکھتے تھے اور حسب استطاعت کرکٹ ٹیموں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ یعنی کسی ٹیم کو نئے بیٹ، پیڈ اور بالز دلوادیں یا میچ کے روز لنچ کا انتظار کردیا۔
غرض یہ کہ وہ دور میری زندگی کا سنہری دور تھا۔
ہم جس گلی میں رہتے تھے اس کی طرف والا وسیع و عریض پلاٹ خالی تھا۔ اسکولوں میں گرمیوں کی تعطیلات تھیں۔ لہٰذا سوائے کھیلنے، کھانے اور نت نئی شرارتیں کرنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ ایک دن میں ناشتا کرکے گھر سے باہر نکلا تو کارنر والے پلاٹ پر مجھے کچھ مزدور نظر آئے جو پلاٹ کے ایک کونے کو ہموار کررہے تھے۔ باوقار قسم کے ایک صاحب شیروانی میں ملبوس ان لوگوں کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔
پھر ان مزدوروں اور مستریوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں بھی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔
دعا ختم کرکے شیروانی والے صاحب ایک گاڑی تک گئے اس میں سے بڑا سا مٹھائی کا ایک ڈبا نکالا اور واپس آکر مزدوروں اور معماروں میں مٹھائی بانٹنے لگے۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے بہت اپنائیت سے مجھے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔
میں کچھ شرمندہ ہوگیا کہ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا ندیدہ لڑکا ہے۔ مٹھائی پر سے نظریں ہی نہیں ہٹا رہا ہے۔ میں نے جھجک کر انکار میں سر ہلا دیا۔
''ارے آجاؤ بیٹا!'' وہ بلند آواز میں بولے۔ ''ہماری خوشی میں تم بھی شریک ہو جاؤ۔'' پھر وہ مسکراتے ہوئے خود ہی میری طرف آنے لگے۔
میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں موجود ہر شخص مجھے تضحیک آمیز انداز میں دیکھ رہا ہے۔
شیروانی والے صاحب میرے نزدیک آ گئے اور بولے۔ ''بیٹا دوسروں کی خوشی میں ہمیشہ خوش ہونا چاہیے۔ لو اس میں سے اپنی پسند کی مٹھائی نکال لو۔ شرماؤ مت۔'' پھر انہوں نے خود ہی قلاقند کا ایک بڑا سا ٹکڑا لیا اور میرے ہاتھ میں رکھ دیا۔ ابھی میں کچھ فیصلہ بھی نہیں کرسکا تھا کہ انہوں نے میرے دوسرے ہاتھ پر چم چم رکھ دی۔ اس کے شیرے میں میرا ہاتھ لتھڑ گیا۔
وہ مسکرا کر بولے۔ ''ارے میاں آم، مٹھائی اور پائے کھانے کا مزہ ہی جب آتا ہے جب ہاتھ اور منہ گندے ہوں۔''
میں یہ سوچ کر مٹھائی کھانے لگا کہ کہیں میرا کوئی دوست مجھے اس حال میں نہ دیکھ لے۔ خاص طور پر مجھے صفدر سے خطرہ تھا۔ وہ تو ایسی ایسی باتیں بناتا کہ میرا باہر نکلنا دوبھر ہو جاتا۔ وہاں مکان بن رہا تھا۔ مٹھائی بٹتی دیکھ کر ہمارے وقار صاحب بھی جھٹ وہاں پہنچ کر قطار میں کھڑے ہو گئے اور انہوں نے مارے ہوس کے دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔ صفدر کے یہ جملے قبل از وقت میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ اس طرح بات کا پتنگڑ بنایا کرتا تھا۔
پھر وہی ہوا۔ صفدر اچانک ہی وہاں آ گیا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے اور تو کچھ نہ سوجھا میں نے جلدی سے کہا۔ ''صفدر ادھر آؤ۔''
شیروانی صاحب کی نظر اس پر پڑی تو انہوں نے اسے بھی بلا لیا اور مٹھائی کے دو ٹکڑے اس کے ہاتھوں پر بھی رکھ دیے۔
''بیٹا نام کیا ہے تمہارا؟'' شیروانی والے صاحب نے مجھ سے پوچھا۔
''میرا نام وقار ہے، وقار الحسن۔'' میں نے جلدی سے کہا۔
''اور تمہارا نام تو مجھے معلوم ہو ہی گیا ہے۔'' انہوں نے صفدر کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''وقار نے ابھی تمہیں صفدر کہہ کر آواز دی تھی نا!''
''جی ہاں۔'' صفدر نے کہا اور دوبارہ مٹھائی کھانے میں مصروف ہو گیا۔
''میرا نام حسان الدین بیگ ہے۔'' وہ بولے۔ ''میں ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اسلام آباد سے یہاں آیا ہوں۔'' انہوں نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔
یہ بیگ صاحب سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔
پھر دو مہینے کے اندر اندر اس خالی پلاٹ پر عمارت کا ڈھانچا کھڑا ہو گیا۔
بیگ صاحب ہفتے عشرے میں ایک دفعہ چکر لگاتے تھے۔ ان کا بنگلا تو کوئی ٹھیکے دار بنا رہا تھا۔
مزید دو ماہ بعد اس خالی پلاٹ پر ایک شاندار بنگلا تیار ہو چکا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ بیگ صاحب... وہاں منتقل ہو گئے۔ مجھے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ وہ بالکل تنہا ہیں۔ شادی انہوں نے کی ہی نہیں تھی اور دور ونزدیک کا کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔

بیگ صاحب خاصے زندہ دل آدمی تھے۔ وہاں آتے ہی انہوں نے ہماری کرکٹ ٹیم کی سرپرستی شروع کر دی۔ وہ کہتے تھے کہ ایک ہی محلے میں کرکٹ کی دو تین ٹیموں کا کیا جواز ہے۔ کرکٹ کی ایک مضبوط ٹیم بناؤ اور شہر کی دوسری ٹیموں سے میچ کھیلو۔

بیگ صاحب بچوں اور نوجوانوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ انہوں نے اپنے گھر کے سامنے خاصا بڑا لان بنوایا تھا۔ شام کو اکثر بچے اور نوجوان ان کے لان میں اکٹھے ہو جاتے۔ وہ کھیل ہی کھیل اور مذاق ہی مذاق میں ہمیں ایسی نصیحت آموز باتیں بتاتے کہ ہمارے دل میں اتر جاتیں۔

محلے کے بزرگ بھی بیگ صاحب کا احترام کرتے تھے۔ وہ ہر فرد کے کام آنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

اس وقت تک کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن نے ہمارے گھروں میں بجلی کی میٹر نہیں لگائے تھے۔ محکمے نے محلے کے ہر گھر کو بجلی کے لیے ایک کنڈا فراہم کر دیا تھا۔ الیکٹرک کمپنی کا ایک اہلکار ہر ماہ کی دس تاریخ کو آتا اور ہر گھر سے ایک مقرر کی رقم لے کر رسید دے جاتا۔

اچانک ایک روز وہاں الیکٹرک کمپنی کے کچھ بڑے افسران آگئے ان کے ساتھ پولیس بھی تھی۔ پھر الیکٹرک کمپنی کی گاڑی آئی اور پہلے تو اس نے ہر گھر کے کنڈے نکالے پھر گھر میں موجود کسی نہ کسی لڑکے کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ سب بڑے تو اس وقت دفتروں میں یا اپنے کام دھندے پر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف امی اور میری چھوٹی بہن روبی تھی۔ پولیس کے ایک سپاہی نے مجھے بھی پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا اور بولا۔ ''بجلی چوری کرتے ہو، اب معلوم ہوگا کہ چوری کیا ہوتی ہے؟''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کبھی تھانے کی شکل تو نہیں دیکھی تھی لیکن وہاں کے بارے میں واقعات بہت سنے تھے کہ پولیس والے الٹا لٹکا دیتے ہیں اور ایسی مار لگاتے ہیں کہ مار کھانے والا مہینوں اپنے پیروں پر چلنے کے قابل نہیں رہتا۔

بچوں کو پولیس کی تحویل میں دیکھ کر خواتین گھروں سے نکل آئی تھیں اور وہ سب چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ چور تو تم لوگ ہو، تمہارا ایک افسر ہر مہینے ہم سے پیسے لیتا رہا ہے۔

''ہمیں ایسے کسی افسر کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔'' ایک افسر نے جواب دیا۔

ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ اچانک بیگ صاحب وہاں آگئے۔ اس وقت وہ تھری پیس سوٹ میں تھے۔ آنکھوں پر نفیس فریم کا چشمہ اور ہاتھ میں سلگتا ہوا سگار، ان کی شخصیت کو مزید باوقار بنا رہا تھا۔

''کیا بات ہے آفیسر؟'' انہوں نے پولیس کے سب انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ ''ان بچوں کو کیوں پکڑا ہے؟''

''الیکٹرک کمپنی کی رپورٹ پر۔'' سب انسپکٹر نے جواب دیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' بیگ صاحب درشت لہجے میں بولے۔

''تم جانتے ہو کہ پاکستان پینل کوڈ کی فلاں دفعہ کے تحت کسی نابالغ کو شبے میں بھی گرفتار کرنا جرم ہے۔''

''ہمیں قانون مت پڑھائیں بڑے صاحب۔'' سب انسپکٹر نے کہا۔

''وہاٹ ڈو یو مین انسپکٹر۔'' بیگ صاحب چیخے۔ ''چلو تم ہی بتا دو کہ ان بچوں کو کس جرم کی کس دفعہ کے تحت گرفتار کیا ہے۔ تم تو مجھے نہیں جانتے ہو لیکن تمہارے آئی جی صاحب ضرور جانتے ہیں۔ میں ابھی ان سے بات کرتا ہوں۔'' پھر الیکٹرک کمپنی کے افسر کی طرف گھومے۔ ''سب سے بڑے چور تو تم ہو۔ یہ تمہارے ہی آدمی کی دی ہوئی رسید ہے نا؟''

''اس قسم کی رسیدیں تو کوئی بھی بنا سکتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ سید احمد نام کا کوئی آدمی نہیں ہے تمہاے دفتر میں؟''

وہ سب انسپکٹر سے مخاطب ہوئے۔ ''انسپکٹر! بچوں کے بجائے تم ان چوروں کو گرفتار کرو اور یہ بغیر کسی آرڈر کے یہاں آئے کیسے؟''

''بچوں!'' وہ ہم لوگوں سے بولے۔ ''ان لوگوں کو پکڑ کر پہلے تو اچھی طرح دھنائی کرو پھر انہیں پولیس کے حوالے کرو۔''

بیگ صاحب کی وجہ سے ہمارے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے صفدر پولیس کی گاڑی سے کودا پھر تو محلے کا ہر لڑکا کود کر گاڑی سے باہر آگیا۔ پولیس والے ''ٹھہرو

رک جاؤ۔'' کہتے رہ گئے۔ لڑکوں نے اچانک الیکٹرک والوں پر دھاوا بول دیا۔

بیگ صاحب خواتین سے بولے۔ ''آپ لوگ تماشا کیا دیکھ رہی ہیں گھروں سے بیلن، جھاڑوں اور ڈنڈے لے کر آئیں اور ان لوگوں کی ایسی خاطر کریں کہ یہ دوبارہ یہاں نہ آئیں۔''

''بھائی صاحب۔'' امی نے کہا۔ ''پہلے ان سے ہمارے گھروں کے الیکٹرک کنکشن لگوائیں۔''

''لگائیں گے ضرور لگائیں گے۔'' انہوں نے الیکٹرک کمپنی کے سوٹ پوش افسر سے کہا۔ ''کنکشن لگواؤ، جلدی کرو۔''

''لگا دو کنکشن۔'' سوٹ پوش بے بسی سے بولا۔

''ان لوگوں کو یہاں سے جانے مت دینا۔ میں ان کے آئی جی سے بات کر کے آتا ہوں۔'' بیگ صاحب نے کہا۔

''سر ہم نے تو کوئی مداخلت نہیں کی۔'' سب انسپکٹر سمجھ گیا کہ بیگ صاحب نے دھمکی نہیں دی تھی بلکہ وہ واقعی آئی جی سے بات کرنے جا رہے ہیں۔

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں کہ مداخلت کیوں نہیں کی۔ ان کا ایک آدمی چوری پر آمادہ کرتا ہے اور اس چوری کو قانونی بناتا ہے، دوسرے صاحب آتے ہیں اور لوگوں کو ہراساں کرنے لگتے ہیں۔ تم نے اس قانون شکنی پر مداخلت کیوں نہیں کی؟''

دس منٹ کے اندر اندر پورے محلے کی بجلی بحال ہو گئی۔

''اب ان لوگوں کو گرفتار کرو، تھانے لے جاؤ اور رشید کو بھی تھانے لے آؤ۔ میں اس سے پوچھوں گا کہ اس رسید پر اس کے دستخط ہیں یا نہیں؟''

الیکٹرک کارپوریشن کے افسر نے معافی مانگی تو بیگ صاحب معاملہ رفع دفع کرنے پر آمادہ ہوئے۔

اس واقعے کے بعد تو محلے کے تمام بڑوں نے انہیں اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ پھر ایک ہفتے کے اندر اندر محلے کے ہر گھر میں الیکٹرک میٹر لگ گئے۔

بیگ صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ بس ان کی ایک خامی تھی کہ وہ محلے کی لڑکیوں کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی شعر ضرور پڑھتے تھے۔ لڑکیاں بھی ان کی عادت سمجھ گئی تھیں اس لیے مسکراتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ یہ گویا ان کا مذاق تھا۔ ہم میں سے اگر کوئی کسی لڑکی پر ایک کے بعد دوسری نظر بھی ڈالتا تو بیگ صاحب اس سے خفا ہو جاتے۔

وہ انتہائی پڑھے لکھے آدمی تھے اور ہر موضوع پر بے تکان بولتے تھے۔ معلومات عامہ، سیاست اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ امتحان کے دنوں میں اکثر لڑکے ان سے پڑھنے بھی آتے تھے۔

وہ نوجوانوں کے ساتھ نوجوان، بچوں کے ساتھ بچے اور بزرگوں کے ساتھ بزرگ بنے رہتے تھے۔ غرض یہ کہ ان کے آنے سے محلے والوں کے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے۔

وہ صبح گھر سے نکلتے اور اکثر گھروں کے سودا سلف بھی لا دیا کرتے تھے۔ صدیقی صاحب کسی بینک میں معمولی ملازم تھے۔ ان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر بیگ صاحب نے سارا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس دور میں میرج لان یا شادی ہال کا فیشن نہیں تھا۔ شادیاں عموماً کسی کھلی جگہ پر شامیانے قناتیں لگا کر کی جاتی تھیں۔ بیگ صاحب نے ڈیکوریشن کا ایسا بہترین انتظام کیا تھا کہ ہر مہمان ان کی تعریف کر رہا تھا۔ پھر انہوں نے صدیقی صاحب سے ایک پیسا بھی نہیں لیا۔

فارغ اوقات میں انہوں نے محلے کے بچوں کو اب باقاعدہ پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ لڑکے صبح کی شفٹ میں اسکول جاتے تھے۔ انہیں وہ سہ پہر کے وقت پڑھایا کرتے تھے، لڑکیوں کو صبح کے اوقات میں پڑھایا کرتے تھے۔

ایک دن اچانک میرا ایک دوست ناصر گم ہو گیا۔ لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑے۔ بیگ صاحب تو یوں پریشان تھے جیسے ناصر انہی کا بیٹا ہو۔

سب لوگوں نے رات تک اسے تلاش کیا۔ پھر محلے والوں نے بیگ صاحب کے ساتھ جا کر پولیس میں رپورٹ درج کرا دی۔

میں نے ناصر کو آخری بار گلی کے نکڑ پر دیکھا تھا۔ شاید وہ گھر کا کوئی سودا لے کر آ رہا تھا۔ پھر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ناصر کی والدہ کی حالت صدمے سے خراب تھی۔ بیگ صاحب کبھی خالہ کو تسلی دیتے، کبھی ناصر کے والد کو، کبھی پولیس کو ٹیلی فون کر کے ناصر کے بارے میں معلوم کرتے لیکن ناصر کا کوئی سراغ نہ ملا۔

پھر دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے۔ ناصر کے گھر والوں کو بھی صبر آ گیا۔

پھر اچانک ہمارے محلے میں ہلچل مچ گئی۔ راشد صاحب کی بیٹی سلمٰی اسکول سے آتے ہوئے غائب ہوگئی۔ وہ محلے کی ایک اور لڑکی صالحہ کے ساتھ اسکول جایا کرتی تھی۔ اس دن صالحہ اسکول نہیں گئی تھی۔ اسکول کی لڑکیوں اور ٹیچرز کا کہنا تھا کہ صالحہ چھٹی کے بعد گھر چلی گئی تھی لیکن وہ گھر نہیں پہنچی۔

محلے والے ایک مرتبہ پھر سلمٰی کی تلاش میں نکل پڑے۔ بیگ صاحب کو اس کا بہت صدمہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ سلمٰی میری اسٹوڈنٹ تھی اور انتہائی ذہین بچی تھی۔

ایک مرتبہ پھر پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ اس مرتبہ تو بیگ صاحب تھانے کے عملے پر بہت گرجے اور انہیں دھمکی دی کہ اگر بارہ گھنٹے کے اندر اندر لڑکی نہ ملی تو تم سب کو معطل کرادوں گا۔

سلمٰی کے گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ یوں بھی وہ سلجھی ہوئی طبیعت کی خوب صورت لڑکی تھی۔ محلے کا ہر فرد اسے پسند کرتا تھا۔

اس واقعے پر بھی وقت کی گرد پڑ گئی۔ ناصر کی طرح سلمٰی کے والدین نے بھی صبر کرلیا۔ زندگی پھر اپنے معمول پر آگئی لیکن یہ سکون زیادہ دن برقرار نہ رہ سکا۔ اس مرتبہ عابد صاحب کی جوان بیٹی صائمہ غائب ہوگئی۔ صائمہ میٹرک کی طالبہ تھی اور بہت شوخ اور چنچل تھی۔ اس کی گمشدگی کا قلق اس کے والدین کو تھا ہی ان لڑکوں کو بھی تھا جو صائمہ کے یک طرفہ عشق میں مبتلا تھے۔

اس مرتبہ بیگ صاحب کے چیخنے چلّانے پر پولیس والوں نے بہت سرگرمی دکھائی۔ انہوں نے محلے میں آکر تفتیش کی اور کئی اوباش لڑکوں کو اٹھالیا جو صائمہ کی محبت کا دم بھرتے تھے۔

ان لڑکوں کے والدین روتے پیٹتے بیگ صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے کہا۔ ”آپ تو جانتے ہیں کہ بچے کچی عمر کے تھے لیکن وہ اتنا بڑا کام نہیں کرسکتے۔“

محلے کے ہر فرد کا یہی خیال تھا کہ وہ لڑکے کسی جوان لڑکی کو اغوا نہیں کرسکتے۔

بیگ صاحب کے کہنے پر پولیس والوں نے ان لڑکوں کو چھوڑ دیا۔ ان بے چاروں کی حالت ایک ہی رات میں تباہ ہوگئی تھی۔ اب تو ان لوگوں نے لڑکیاں تو درکنار محلے میں کام کرنے والی ماسیوں کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

صائمہ کا بھی کچھ سراغ نہ ملا۔ نہ جانے اسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان کھا گیا تھا۔

بیگ صاحب اتنے بددل ہوئے کہ انہوں نے اعلان کردیا، اب میں بچوں کو نہیں پڑھاؤں گا۔ ان بچوں کو دیکھ کر مجھے گم شدہ بچے یاد آتے ہیں۔

محلے والوں کے مجبور کرنے پر وہ بہت مشکل سے بچوں کو دوبارہ پڑھانے پر راضی ہوئے۔

میں اب بارہ سال کا ہوگیا تھا اور مجھے اچھے برے میں تمیز کا فرق بھی معلوم ہوگیا تھا۔

فاخرہ ہمارے محلے کی بہت شرارتی لڑکی تھی۔ وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی ذہین بھی تھی۔ بھائی جان اور اس میں نہ جانے کب تعلق پیدا ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ میں سب جانتا تھا لیکن خاموش تھا۔

بھائی جان ان دنوں این ای ڈی کالج میں پڑھ رہے تھے۔ کالج سے آتے ہی وہ خالی پلاٹوں کی طرف نکل جاتے۔ ان پلاٹوں میں خودرو جھاڑیوں اور درختوں کا ایک جنگل سا اگ آیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فاخرہ وہاں پہلے سے موجود ہوگی یا پھر وہ اکثر بھائی جان کے جانے کے بعد چھپتی چھپاتی اس طرف جاتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ یہ کھیل خطرناک ہے لیکن بھائی جان کے ذہن پر عشق کا ایسا بھوت سوار تھا کہ انہیں فاخرہ کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔

فاخرہ اکثر ہمارے گھر بھی آجاتی تھی۔ باجی سے اس کی دوستی تھی لیکن باجی کو اس کی آزادخیالی اور بے باکی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ جب بھی آتی اپنے ساتھ کوئی فلمی رسالہ لے کر آتی اور باجی کو بتاتی کہ آج کل کون سا ہیرو یا ہیروئن شادی کے چکر میں ہے یا کس کی فلم نے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ابا جی کو آہستہ آہستہ اس سے چڑ ہوگئی۔ بھائی جان البتہ اس کی آمد سے بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک دن باتوں باتوں میں انہوں نے کہا۔ ”میں فاخرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

امی ہتھے سے اکھڑ گئیں۔ ”عرفان تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ فاخرہ اچھی لڑکی نہیں ہے، انتہائی پھوڑ اور بدمزاج ہے۔ صرف خوب صورتی سے کیا ہوتا ہے؟“

بھائی جان اپنی بات پر اڑے رہے۔

درختوں کے جھنڈ میں ان کی ملاقاتیں اب بھی جاری تھیں۔ ایک دن میں نے بھائی جان کے پیچھے فاخرہ کو جاتے

دیکھا لیکن میں کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے تھے۔
اچانک میری نظر فاخرہ کے ابا پر پڑی۔ وہ کسی فیکٹری میں فورمین تھے۔ غصے کے بھی بہت تیز تھے۔ میں نے انہیں بھی اس طرف جاتے دیکھا جدھر فاخرہ اور بھائی جان گئے تھے۔

میرا دل انجانے خدشات سے دھڑکنے لگا۔
اچانک درختوں کے جھنڈ کی طرف سے چیخ پکار اور ہنگامے کی آوازیں آئیں۔ وہ آوازیں سن کر میں بھی دوڑا۔ میرے ساتھ محلے کے کئی اور لوگ بھی تھے۔
وہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ بھائی جان اور سلمٰی کے والد گتھم گتھا تھے اور فاخرہ ایک طرف کھڑی تھی۔
لوگوں نے ان دونوں کو الگ کیا اور لڑنے کی وجہ پوچھی۔
''اجی صاحب!'' فاخرہ کے والد نے کہا۔ ''اس کمینے نے تو وہ گھٹیا حرکت کی ہے کہ مجھے تو بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔''
''میں نے کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی ہے۔'' بھائی جان چیخے۔
''یہ فاخرہ کو ورغلا کر اس طرف لے آیا اور اگر میں کچھ دیر اور نہ آتا تو میری بچی کی زندگی تباہ ہو جاتی۔''
''تم بتاؤ۔ کیا بات ہے؟'' بیگ صاحب وہاں پہنچے تو ہر شخص پیچھے ہٹ گیا۔
''عرفان مجھے یہاں دھوکے سے لایا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تمہیں مور کے بچے دکھاؤں گا۔'' فاخرہ نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔
''اور تم اس کی باتوں میں آگئیں؟'' بیگ صاحب ناگواری سے بولے۔ پھر وہ فاخرہ کے والد سے بولے۔ ''ارشاد صاحب! اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں۔ زیادہ کریدیں گے تو آپ ہی کی رسوائی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ عرفان ایسا لڑکا نہیں ہے۔''
سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن محلے والوں کے ہاتھوں ایک موضوع آگیا۔ بھائی جان الگ شرمندہ شرمندہ سے رہنے لگے۔ انہیں فاخرہ سے اس جھوٹ اور ڈھٹائی کی توقع نہیں تھی۔ پھر وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنی پڑھائی میں لگ گئے۔ میں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔
ایک دن پھر محلے میں بھونچال آگیا۔ فاخرہ صبح کالج کے لیے گھر سے نکلی تھی لیکن وہاں پہنچی نہیں تھی۔ اس نے نیا نیا کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ میں نے اکثر اسے دوسرے محلے کے لڑکوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور بات چیت کرتے دیکھا تھا۔ بھائی جان تو اس واقعے کے بعد فاخرہ کے نام سے بھی چڑنے لگے تھے۔ محلے کے ہر فرد کی زبان پر یہی بات تھی کہ فاخرہ گھر سے بھاگ گئی۔
اس کے باپ نے فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرا دی کہ اس کی بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے اور اس میں عرفان کا ہاتھ ہے۔ وہ کافی عرصے سے میری بچی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔
بھائی جان اس وقت کالج میں تھے۔ انجینئرنگ کا آخری سال تھا۔ اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی مصروف رہتے تھے۔ رات کو دیر تک پڑھتے رہتے یا پھر اپنے کسی دوست کے پاس پڑھنے کے لیے چلے جاتے۔
شام کا وقت تھا جب پولیس ہمارے گھر پہنچی۔ اس وقت تک ابو بھی آفس سے آچکے تھے۔ دروازے پر وہی گئے تھے۔
پولیس کے اے ایس آئی نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔ ''عرفان گھر پر ہے؟''
''نہیں وہ تو کالج گیا ہوا ہے۔'' ابو نے جواب دیا۔
''عرفان سے کیا کام ہے آپ کو؟''
''اس نے ارشاد صاحب کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔'' اے ایس آئی نے بدتمیزی سے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہوگا۔ وہ تو فاخرہ کو لے کر کہیں اور چلا گیا ہوگا۔''
''آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' ابو نے ناگواری سے کہا۔ ''وہ کالج گیا ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔''
''جب تک وہ نہ آئے، آپ ہمارے ساتھ چلو۔'' اے ایس آئی نے کہا۔
''تم ہوش میں تو ہو؟'' ابو کو ایک دم غصہ آگیا۔ ''میں کوئی خربوزے بیچنے والا یا پنواڑی نہیں ہوں کہ تم کہو اور میں تمہارے ساتھ چل دوں گا۔ میں اٹھارہ گریڈ کا سرکاری افسر ہوں۔ میرے ساتھ تمیز سے بات کرو۔''
''بزرگو! یہ ہی تمیز اپنے بچوں کو بھی تو سکھاؤ۔ اس نے کوئی معمولی جرم نہیں کیا ہے۔ ایک لڑکی اغوا کی ہے۔''
اس وقت بھائی جان کالج سے آگئے۔ وہ پولیس کے اے ایس آئی کو دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے ابو سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے ابو؟''

''اوئے تو عرفان ہے؟'' اے ایس آئی نے پوچھا۔
''ہاں میں ہی عرفان ہوں۔'' بھائی جان نے کہا۔
''چل تجھے انچارج صاحب نے تھانے میں بلایا ہے۔''
''تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔'' بھائی جان نے کہا۔
''اوئے ہمارے ساتھ چل، نواب کی اولاد، تو ہمیں اتنا بے وقوف سمجھتا ہے۔ میں تجھے چھوڑ کر جاؤں اور تو فرار ہو جائے۔''
بھائی جان نے اپنی کتابیں اور فائل میرے ہاتھوں میں دے دیں اور بولے۔ ''چلو کہاں چلنا ہے۔''
''بیٹا تم گھبرانا مت، میں بھی آرہا ہوں۔'' ابو نے کہا۔
بھائی جان کے جانے کے بعد ابو تو بیگ صاحب کے گھر کی طرف چلے گئے۔ میں نے بھائی جان کی کتابیں رکھیں اور تھانے کی طرف بھاگا۔ تھانہ ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔
اے ایس آئی نے بھائی جان کو لاک اپ میں بند کر دیا اور بولا۔ ''ابھی انچارج صاحب نہیں ہیں۔ وہ آئیں گے تو بات ہوگی۔''
فاخرہ کا باپ تو پہلے سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد بیگ صاحب، ابو اور تھانے کا انچارج آ گئے۔
انچارج نے بھائی جان کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ ''کب سے چکر چل رہا تھا؟''
''ایک سال پہلے اس نے مجھ سے اظہارِ عشق کیا تھا۔ میں بھی اس کی باتوں میں آ گیا۔ پھر جب اس نے سب لوگوں کے سامنے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا تو میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا۔'' بھائی جان نے کہا۔
پھر انچارج نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ جس وقت فاخرہ غائب ہوئی ہے بھائی کالج میں تھے۔ پھر بیگ صاحب اور ابو کی کوششوں سے بھائی جان کو اس کیس سے رہائی ملی۔ پولیس کو ان کے خلاف ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ ظاہر ہے کہ فاخرہ غائب تھی تو بھائی جان کو بھی غائب ہونا چاہیے تھا۔
اس واقعے کے بعد سے تو بھائی جان بالکل گم صم ہو گئے۔ وہ خود کو قصوروار سمجھتے تھے کہ ان کی چھوٹی سی بھول کی وجہ سے پورے گھر کی بدنامی ہوئی۔
آہستہ آہستہ اس واقعے پر بھی وقت کی گرد پڑ گئی۔

کالج سے فارغ ہو کر بھائی نے ایک ملٹی نیشنل فرم میں جاب کر لی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا کہ محلے میں کشیدگی پھیل گئی۔ اس مرتبہ جمعہ چاچا کی بیٹی کلثوم گھر سے غائب تھی۔ وہ میٹرک میں پڑھتی تھی۔ ان سب واقعات میں سوائے ایک واقعے کے یہ بات مشترک تھی کہ غائب ہونے والی ہر لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ صرف ناصر لڑکا تھا ورنہ لڑکیاں ہی اغوا ہوئی تھیں۔
کلثوم شام کو اپنی خالہ کے گھر سے آرہی تھی کہ راستے سے غائب ہو گئی۔ ایک مرتبہ پھر محلے میں ہاہا کار مچ گئی۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ کلثوم کو ہر طرف ڈھونڈا گیا لیکن دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی نہ ملی۔
محلے والوں نے اپنی بیٹیوں کے تنہا باہر نکلنے پر پابندی لگا دی۔
باجی کی شادی ہو چکی تھی۔ ویسے امی کو زیادہ فکر نہیں تھی۔ البتہ وہ میری طرف سے فکرمند رہتی تھیں۔ لڑکیوں کو اسکول اور کالج چھوڑنے کی ذمے داری بیگ صاحب نے اپنے ذمے لے لی۔ وہ محلے کی تمام لڑکیوں کو جمع کر کے اپنے ساتھ لے جاتے اور انہیں اسکول اور کالج چھوڑنے کے بعد لوٹ آتے پھر وہ چھٹی کے وقت انہیں لینے بھی جاتے تھے۔
محلے والے ابھی کچھ مطمئن ہو گئے۔
ان ہی دنوں ہمارے محلے میں ایک فیملی کرائے پر آکر رہنے لگی۔ اس گھرانے میں دو جڑواں لڑکیاں افشاں اور مائرہ تھیں۔ ایک میرا ہم عمر لڑکا آصف تھا اور ایک بیٹی تھی جس کی شادی ہونے والی تھی۔
جس دن اس لڑکی کی شادی تھی اسی شام وہ گھر سے غائب ہو گئی۔ اس مرتبہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ محلے کے کچھ لوگ تو اسے جن اور بھوتوں کی کارستانی قرار دینے لگے۔ آخر وہ لڑکیاں کیسے غائب ہوئی تھیں اور کہاں گئیں کہ ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ لوگ اتنے بد دل ہوئے کہ وہ محلہ ہی چھوڑ گئے۔
بیگ صاحب نے اب بچوں کو پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ اب انہوں نے اپنے گھر میں کیرم، شطرنج، لوڈو وغیرہ رکھ لیے تھے۔ شام کو ان کے گھر میں محلے کے نوجوان جمع ہو جاتے تھے۔ کچھ کیرم کھیلنے میں مصروف ہو جاتے کچھ شطرنج کھیلتے۔
بیگ صاحب بھی خصوصی طور پر دلچسپی لیتے۔ وہ کہتے تھے کہ بچوں کو اس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رکھا جائے تو ان کے بگڑنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے

محلے کے بہت سے لڑکے کیرم میں طاق ہو گئے۔ کچھ بچے جو ذرا ذہین تھے وہ شطرنج میں بڑوں کی برابری کرنے لگے۔

محلے میں امن وسکون تھا کہ ایک دن پھر کہرام مچ گیا۔ اس مرتبہ ماجد چاچا کا بیٹا ماجد غائب ہو گیا۔ ماجد کی عمر مشکل سے آٹھ برس ہوگی۔ لوگوں میں ایک مرتبہ پھر خوف و ہراس پھیل گیا۔ پولیس والے بھی عجیب کشمکش و پیچ میں تھے کہ اس محلے کے لڑکے اور لڑکیاں کیوں غائب ہوتے ہیں۔

ان دنوں پولیس تھانے کا انچارج ایک نوجوان افسر تھا۔ وہ بہت فرض شناس اور دیانت دار تھا۔ اس کے آنے سے علاقے میں جرائم بھی کم ہو گئے تھے۔

اس نے چارج سنبھالا ہی تھا کہ محلے کی ایک جوان لڑکی کنیز غائب ہوگئی۔ وہ میٹرک کر کے پڑھائی چھوڑ چکی تھی اور گھر میں ہی رہتی تھی۔ غائب ہونے والی دوسری لڑکیوں کی طرح کنیز بھی بہت خوب صورت تھی۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو اسکول لینے گئی تھی لیکن وہاں پہنچی نہیں تھی۔ بھائی خود ہی کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ گیا۔

محلے میں ایک دفعہ پھر کہرام مچ گیا۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی اس مرتبہ نئے انچارج نے خود اس کی تفتیش کا فیصلہ کیا۔

اس نے پہلے تو کنیز کے گھر والوں سے پوچھ گچھ کی۔ ان سے کنیز کے معمولات کے بارے میں معلوم کیا۔ وہ بے چاری تو سوائے بھائی کو اسکول لانے اور لے جانے کے کہیں جاتی ہی نہیں تھی۔ اسکول بھی گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مشکل سے ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔

پولیس انسپکٹر نے ماہر سراغ رسانوں کی طرح پہلے اس راستے کا جائزہ لیا۔ کنیز عموماً سڑک کے راستے اسکول جایا کرتی تھی۔ سڑک کے کنارے ایک مکان میں دو دکانیں نکالی گئی تھیں۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک جھونپڑی ہوٹل تھا جو وہاں تعمیراتی کام کرنے والوں مزدوروں کی وجہ سے بنایا گیا تھا۔ وہ ہوٹل بھی عارضی تھا اور ایک خالی پلاٹ پر بنایا گیا تھا۔ جہاں تعمیراتی کام ہوتا ہے وہاں عموماً مزدوروں کے لیے ایسے جھونپڑی ہوٹل بن جاتے ہیں۔

پولیس انسپکٹر اس ہوٹل پر پہنچا اور اس کے مالک سے پوچھ گچھ کی۔ وہ پشاور کا رہنے والا تھا۔ انسپکٹر نے اسے کنیز کی تصویر دکھائی تو وہ اسے پہچان گیا۔ کوئی خوب صورت اور پرکشش لڑکی اگر روزانہ ایک ہی راستے سے گزرے تو لوگ اسے پہچان ہی لیتے ہیں۔

''ہاں صاحب!'' ہوٹل کے مالک نے کہا۔ ''یہ لڑکی دن میں دو دفعہ ادھر سے گزرتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہوتا تھا۔''

''تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا خان۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

خان نے یادداشت پر زور دیا اور چونک کر بولا۔

''اسے ہم نے کل دیکھا تھا۔ پھر ایک گاڑی آیا ہم حیران تھا کہ یہ لڑکی تو ہمیشہ پیدل جاتا تھا یہ گاڑی والا کون ہے؟ وہ اس لڑکی سے کچھ بات کر رہا تھا۔ ہمارے پاس رش تھا اس لیے ہم گاڑی والے کا شکل نہیں دیکھ سکا۔ پھر وہ لڑکی گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی چلی گئی۔'' خان نے سوچ سوچ کر بتایا۔ ''پھر ہم نے اس بچے کو اکیلا ادھر جاتے دیکھا تو ہم حیران رہ گیا کہ وہ لڑکی کہاں گیا۔ ہم نے ایک مزدور سے کہا کہ اس بچے کو اس کے گھر تک چھوڑ آئے۔''

''وہ گاڑی کون سی تھی؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''وہ نئے ماڈل کا ہنڈا تھا صاحب۔'' خان نے جواب دیا۔ گاڑیوں کے معاملے میں بھی ان کی معلومات عام لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس علاقے کے زیادہ لوگ ڈرائیور...... ہوتے تھے یا پھر مزدوری کرتے تھے۔

''گاڑی کا نمبر دیکھا تھا؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''نہیں صاحب!'' خان نے جواب دیا۔ ویسے ہمارا عادت ہے کہ ہم گاڑی کا نمبر بھی دیکھتا ہے لیکن اس وقت دو تین گراہک (گاہک) آ گیا اور ہم ادھر مصروف ہو گیا۔

''گاڑی کا رنگ۔'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''گاڑی کا رنگ سبز تھا صاحب کائی کی جیسا سبز۔''

وہاں سے انسپکٹر اور دکانوں پر گیا وہاں بھی اس نے کنیز کی تصویر دکھائی اور اس کے بارے میں معلوم کیا۔

وہ دکان دار بھی اسے فوراً پہچان گیا اور بولا۔

''صاحب یہ لڑکی اکثر اپنے بھائی کے ساتھ میری دکان سے ٹافیاں اور پاپڑ وغیرہ خریدا کرتی تھی۔ اسے یہ یاد نہیں تھا کہ لڑکی کو آخری بار کب دیکھا تھا۔

ان دنوں کراچی میں اتنی گاڑیاں نہیں تھیں جتنی آج ہیں۔ اس کے باوجود گاڑیوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔

انسپکٹر واقعی اپنی دھن کا پکا تھا۔ اس نے رجسٹریشن آفس سے تمام کاروں کی ایک ہسٹری حاصل کی۔

متعلقہ کلرک نے دو دن میں انسپکٹر کو وہ لیٹر ٹائپ کر کے دیا۔ انسپکٹر نے اس لسٹ میں صرف ہنڈا کے نمبر نوٹ

کر لیے پھر مزید کمی کی اور صرف ان کاروں کے نمبر نوٹ کیے جن کا رنگ سبز تھا۔
اب لسٹ بہت محدود ہوگئی تھی۔ انسپکٹر نے علاقے کے ہر تھانے میں اطلاع دی کہ سبز رنگ کی ہنڈا جہاں بھی نظر آئے اسے اطلاع دی جائے۔
وہ ایک مرتبہ اس جھونپڑی ہوٹل کے نزدیک سے گزر رہا تھا کہ ہوٹل کی چائے پینے رک گیا اس نے ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔ ''خان تمہیں دوبارہ تو وہ گاڑی نظر نہیں آئی؟''
خان نے نفی میں سر ہلا دیا پھر چونک کر بولا۔
''صاحب ہمیں ایک اور بات یاد آیا ہے۔ اس گاڑی کا بائیں طرف والا ایک لائٹ ٹوٹا ہوا تھا۔ ہم نے سوچا تھا کہ کیسا بدبخت آدمی ہے نیا گاڑی ہے اور اس کا بیک لائٹ ٹوٹ گیا تو اسے لگواتا نہیں ہے۔''
انسپکٹر جوش میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے اس روز سارے تھانوں کو اور خاص طور پر ٹریفک پولیس کو اطلاع دے دی کہ اس سبز گاڑی پر نظر رکھیں جس کی بائیں طرف کی بیک لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے۔
اس سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ لگتا تھا کہ گاڑی کسی دوسرے شہر کی تھی یا پھر اس کے مالک نے بیک لائٹ لگوالی ہے۔ سبز رنگ کی کاریں تو بہت سی تھیں۔
پھر اس نے محلے میں تفتیش شروع کی۔ اس نے بیگ صاحب کے گھر کا بھی جائزہ لیا اور ان سے کہا۔ ''جناب آپ اپنا یہ کلب کچھ دن کے لیے بند کردیں۔''
''کیوں؟'' بیگ صاحب غرائے۔ ''کیا یہاں جوا ہوتا ہے یا کوئی اور غیر قانونی کام؟''
''یہاں کچھ بھی نہیں ہوتا لیکن آپ سے درخواست کررہا ہوں کہ اس کلب کو بند کردیں۔''
''انسپکٹر صاحب!'' بیگ صاحب غصیلے لہجے میں بولے۔ ''ایک تو آپ میرے گھر کو بار بار کلب کہہ کر اس کی توہین کررہے ہیں پھر جو کچھ ہوتا ہے میرے گھر کے اندر ہوتا ہے یہ معاملہ قابل دست اندازی پولیس نہیں ہے۔''
''لیکن ہوسکتا ہے۔'' انسپکٹر نے بھی غصے میں کہا۔ ''اگر یہاں سے کچھ برآمد ہوجائے تو آپ کے ساتھ ساتھ محلے کے بچے بھی پریشان ہوسکتے ہیں۔''
''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟'' بیگ صاحب پھنکارے۔ ''آپ شاید مجھے جانتے نہیں ہیں۔ میں ابھی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں۔''
''میرے سامنے ہی کرلیں۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''تاکہ آئی جی صاحب جو حکم دیں میں اسی کے مطابق کام کروں۔'' پھر اس نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ ''چلیے میں خود ہی آئی جی صاحب سے بات کرلیتا ہوں۔''
بیگ صاحب نے ٹیلی فون سیٹ انسپکٹر سے لے لیا اور بولے۔ ''انسپکٹر صاحب یہ آپ کے تھانے کا ٹیلی فون نہیں ہے۔ رہی بات اس کلب کی تو میں اسے آج ہی بند کردیتا ہوں، محلے والے آپ سے خود نمٹ لیں گے۔''
بھائی جان نے انسپکٹر سے سوال کیا۔ ''آپ نے وہ کلب کیوں بند کرادیا؟''
''وہاں دن رات لوگوں کا مجمع رہتا تھا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''وہاں محلے ہی کے نہیں بلکہ دوسرے محلوں کے لڑکے بھی آنے لگے تھے۔ کیا آپ نے یہ بات نوٹ نہیں کی؟''
''جی ہاں۔ یہ بات تو درست ہے۔'' بھائی جان نے کہا۔ ''بلکہ ان میں کئی لڑکے تو اوباش بھی ہیں۔''
آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے ان سب باتوں کا علم کیسے ہوا؟ اصل بات تو یہ ہے کہ انسپکٹر صاحب نے خود محلے کے تمام سمجھدار بچوں کو بلا کر یہ کہا تھا کہ ہم اس سبز کار پر نظر رکھیں جس کی بائیں بیک لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہمیں یہ تفصیل بھی بتائی تھی کہ انہیں اس گاڑی کا علم کیسے ہوا؟ دوسری بات یہ کہ وہ انسپکٹر صاحب ابو کے کزن تھے اس لیے ہمیں ہر بات معلوم ہوتی رہتی تھی۔
بیگ صاحب نے پہلے تو محلے والوں کو ساتھ ملا کر گھریلو کلب کھولنے کے لیے درخواست دینا چاہی لیکن محلے کے لوگ واقعی ان لڑکوں سے پریشان تھے۔ جتنے لڑکے گھر کے اندر ہوتے تھے اتنے ہی گھر کے باہر چبوترے پر بیٹھے رہتے تھے اور ہر گزرنے والی لڑکی کو گھورتے تھے۔ اب بیگ صاحب خود بھی چبوترے پر نہیں ہوتے تھے اس لیے ان لڑکوں کو روکنے ٹوکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔
ایک دن بیگ صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''وقار بھائی! میں نے اپنے گھر کو کلب بنانے کے لیے باقاعدہ درخواست دی ہے۔ میں حکومت کے اجازت نامے کے ساتھ کلب کھولوں گا اور اب کمرشل بنیادوں پر کھولوں گا۔ وہاں آنے والوں کے لیے ممبر شپ لازمی ہوگی۔ پھر دیکھوں گا یہ انسپکٹر کیسے مجھے روکتا ہے۔''
''انکل! کیا آپ پھر سے ممبر شپ فیس لیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میاں کاروبار تو کاروبار ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولے۔ ''لیکن محلے کے بچوں کے ساتھ یہ رعایت ہوگی کہ وہ فری بھی ممبر شپ حاصل کرسکیں گے۔''

میں نے یہ بات انسپکٹر صاحب کو بتائی تو وہ کہنے لگے۔ ''میں نے محلے والوں سے پہلے ہی ایک درخواست لکھوا کر بھجوادی ہے کہ علاقہ مکینوں کو اس کلب کی وجہ سے بہت دقت ہوتی ہے۔ محلے کی لڑکیاں اس راستے سے گزر نہیں سکتیں لہٰذا وہاں کلب نہ کھولا جائے۔ پھر یہ کوئی کمرشل علاقہ تو ہے نہیں۔ اس لیے کلب بھی نہیں کھل سکے گا۔''

مجھے کیرم کھیلنے کا چسکا لگ چکا تھا۔ میں اس کھیل میں کافی ماہر بھی ہوگیا تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر کیرم کا ایک کلب تھا۔ کلب کیا ایک دکان میں دو تین کیرم بورڈ رکھ کر کلب بنا دیا گیا تھا۔ میں وہاں جانے لگا لیکن جو مزہ مجھے بیگ صاحب کی چائے پینے میں آتا تھا وہ وہاں نہیں آتا تھا۔

میں ان دنوں آٹھویں میں تھا۔ امتحانات ہو چکے تھے۔ اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اس لیے ہم لوگ سارا دن فارغ رہتے تھے۔ سہ پہر سے ہی محلے کے لڑکے گلی میں نکل آتے اور کرکٹ شروع ہو جاتی۔ اس کے لیے ہم لوگ ہمیشہ کریچ کی بال استعمال کرتے تھے کیوں کہ اکثر گھروں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور کئی لوگوں کو سخت گیند سے چوٹیں بھی لگی تھیں۔

بیگ صاحب اب دوبارہ چبوترے پر بیٹھنے لگے تھے۔ ان کے ساتھ محلے کے لڑکے ہوتے تھے لیکن صرف اس محلے کے۔ وہ کسی دوسرے علاقے کے بچوں کو وہاں نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔

ہم ایک مرتبہ پھر چبوترے پر بیٹھنے لگے اور بیگ صاحب کی علمیت سے فیض اٹھانے لگے۔ وہ سیاست پر تو یوں بات کرتے تھے جیسے وہ سیاست پر اتھارٹی ہوں۔

ہم لوگ اکثر بڑے بڑے بلب لگا کر نائٹ میچ بھی کھیلنے لگے تھے۔ جن لوگوں نے نارتھ ناظم آباد دیکھا ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ وہاں کی گلیاں کتنی چوڑی ہیں۔ پھر ہماری گلی تو کچھ زیادہ ہی چوڑی تھی۔ وہاں سے سڑک نکالنے کا پروگرام تھا۔

دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں بات کر رہا تھا کرکٹ کی۔

اس دن شام کو ہم کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میں نے زبردست ہٹ لگائی تو بال اچھل کر گلی کے کونے پر لگے ہوئے پیپل کے درخت کی شاخوں میں الجھ گئی۔ اب یہ اس لڑکے کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ یا تو وہ گیند وہاں سے لے کر آئے یا پھر نئی گیند خرید کر لائے۔ اس دن کھیل ختم ہونے کے بعد لڑکوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ کل ہمیں گیند چاہیے۔

مغرب ہونے والی تھی اس لیے سب لڑکے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ پیپل کا وہ درخت میرے لیے نیا نہیں تھا میں بچپن میں اکثر اس پر چڑھا کرتا تھا اور شرط لگا کر چڑھتا تھا کہ مجھ سے اوپر کوئی جا کر دکھائے۔ ابھی تک میرا ریکارڈ کوئی نہیں توڑ سکا تھا۔

رات کو اکثر ہم میں سے کوئی اس کی شاخوں پر بیٹھ جاتا تھا اور وہاں سے گزرنے والوں کو ڈراؤنی آوازیں نکال کر ڈرایا کرتا تھا۔ میں نے محلے کے ایسے ایسے لوگوں کو خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگتے دیکھا تھا جو اپنی بہادری کے واقعات سنا کر ہمیں بور کرتے رہتے تھے۔

میں اس درخت تک پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کس طرف سے اوپر چڑھوں۔ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھ گیا لیکن گیند مجھے کہیں نظر نہ آئی۔ میں مزید اوپر چڑھ کر گیند ڈھونڈنے لگا۔

اچانک میری نظر بیگ صاحب کے گھر کی طرف اٹھ گئی۔ ان کی چار دیواری کے اندر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ پھر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ مجھے وہ دونوں جڑواں بہنیں وہاں دکھائی دیں جو پہلے ہمارے محلے میں آکر رہی تھیں اور جن کی ایک بہن شادی والے دن غائب ہوگئی تھی۔ میں گیند کو تو بھول گیا اور ان لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بیگ صاحب دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں رنگا رنگ مٹھائیاں تھیں۔ انہوں نے خود بھی چھانٹ کر برفی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور ان لڑکیوں کو بھی اصرار کرکے مٹھائی کھلانے لگے۔ دونوں لڑکیاں مزے لے لے کر مٹھائی کھا گئیں۔ میں پھر گیند تلاش کرنے والا تھا کہ پھر چونک اٹھا ان میں سے ایک لڑکی بے ہوش ہو کر لڑھک گئی تھی۔ پھر دوسری لڑکی بھی لڑھک گئی۔

بیگ صاحب اندر کمرے میں گئے اور دو چادریں لے آئے۔ انہوں نے ایک چادر میں ایک لڑکی کو لپیٹا تو میں چونک اٹھا۔ اب تماشا دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میرے پاس اگر اس وقت موبائل ہوتا تو میں بھاگ دوڑ سے بچ جاتا۔ میں جلدی سے درخت سے نیچے اترا اور تھانے کی طرف دوڑ لگادی۔ انسپکٹر اس وقت تو کہیں جانے کی تیاری کررہے تھے۔

مجھے بدحواسی میں دیکھا تو جاتے جاتے رک گئے۔ میں نے جلدی سے انہیں سارا واقعہ بتا دیا۔

وہ فوراً دو سپاہیوں کو لے کر چلنے کو تیار ہو گئے۔ اس زمانے میں پولیس والوں کے پاس پولیس کی موبائل وغیرہ بھی بہت کم تھیں۔ پرانے زمانے کی ڈیزل جیپیں ہوا کرتی تھیں وہ بھی شہر کے بڑے تھانوں میں۔ انسپکٹر صاحب کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ انہوں نے اپنے ایک ماتحت کو اپنے ساتھ بٹھایا اور بقیہ دو کو سائیکلوں پر آنے کی ہدایت کی۔ ان میں سے ایک کے ساتھ میں بھی بیٹھ گیا۔

جب پولیس والے وہاں پہنچ گئے تو انہوں نے دو پولیس والوں کو مکان کے عقب میں بھیج دیا مکان کا ایک دروازہ پیچھے کی طرف بھی تھا۔ پھر انہوں نے مین گیٹ پر لگی ہوئی اطلاعی گھنٹی بجائی۔

کچھ دیر بعد بیگ صاحب اندر سے برآمد ہوئے۔ پولیس کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھے۔ پھر سنبھل کر بولے۔ ”زہے نصیب! انسپکٹر صاحب آج کیسے زحمت فرمائی۔ کیا اب میرا گھر بھی سیل کرنا چاہتے ہیں؟“

”ہم آپ کو سیل کرنا چاہتے ہیں۔“ انسپکٹر نے ہنس کر کہا۔ ”ذرا اندر تو چلیے۔“

”معاف کیجیے گا میں اس وقت آپ کو اندر نہیں بلا سکتا۔ میرے کچھ رشتے دار آئے ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ پردہ دار خواتین بھی ہیں۔“ بیگ صاحب نے بہت متانت سے کہا۔

”ہم پردہ دار خواتین کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”آپ اندر تو چلیں۔“

”آپ میری مرضی اور اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے۔“ بیگ صاحب کا لہجہ بدل گیا۔

”تو آپ سے اجازت مانگ کون رہا ہے؟“ انسپکٹر نے کہا۔ پھر درشت لہجے میں بولا۔ ”اندر چلو۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بیگ صاحب کو دھکا بھی دیا۔

”یہ اچھی زبردستی ہے۔“ بیگ صاحب نے کہا۔ ”پولیس خود ہی غیر قانونی حرکات کرے تو عوام کو کیسے روکے گی؟“

”اندر چل عوام کا بچہ۔“ پولیس والے نے اس مرتبہ ان کی گردن پکڑ کر اندر دھکیلا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو میں دھک سے رہ گیا۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سپاہیوں نے دوسرے کمروں میں بھی ڈھونڈ لیا۔ وہ لڑکیاں تو کیا ان کا سایہ بھی نہیں تھا۔

”یار وقار!“ انسپکٹر صاحب نے کہا۔ ”تم نے مروا دیا، اب یہ ہمارے لیے مشکل کھڑی کر دے گا۔ جو تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں وہ لڑکیاں؟“

”جی ہاں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔“ میں نے جواب دیا۔

اچانک انسپکٹر صاحب کی نظر پورچ میں کھڑی ہوئی گاڑی پر پڑی۔ بیگ صاحب نے اس پر کپڑا ڈال رکھا تھا۔

”ذرا اس گاڑی کا کپڑا ہٹائیں۔“ انسپکٹر صاحب نے کہا۔ میں نے دیکھا کہ یہ سنتے ہی بیگ صاحب کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

پھر ایک سپاہی آگے بڑھا اور گاڑی کا کور ہٹا دیا۔ اس کی عقبی سیٹ پر دونوں لڑکیاں چادروں میں لپٹی پڑی تھیں۔

”گرفتار کر لو اسے۔“ انسپکٹر صاحب چیخ کر بولے۔

سپاہی نے ہتھکڑی نکال کر بیگ صاحب کے ہاتھوں میں ڈال دی۔

☆......☆

بعد میں بہت سے انکشافات ہوئے۔ بیگ صاحب اصل میں بردہ فروش تھے۔ ان کا اصل مقصد تو لڑکیاں ہی تھیں۔ لڑکوں کو وہ لوگوں کو بھٹکانے کے لیے اغوا کرتے تھے۔ انہیں کسی بیگار کیمپ کو بیچ دیتے تھے۔ لڑکیوں کو خلیج کی ریاستوں میں بھیج دیتے تھے۔ اس حوالے سے پاکستانی لڑکیوں کی بردہ فروشی عام تھی۔

ہماری اطلاع کے بعد بیگ صاحب نے نہ جانے کس وقت لے جا کر گاڑی کا رنگ بھی بدلوایا اور اس کی بیک لائٹ بدلوائی تھی۔

بیگ صاحب اب نہ جانے زندہ بھی ہوں گے یا نہیں۔ اللہ انہیں معاف کرے۔ ان دو لڑکیوں کے بارے میں تو آپ کو بتایا ہی نہیں ان میں سے ایک لڑکی آج میری بیوی ہے اور اب وہ لڑکی نہیں بلکہ کئی بچوں کی ماں ہے۔ میں ابھی تک اسی مکان میں رہتا ہوں۔ بیگ صاحب کا مکان بعد میں کسی نے خرید لیا تھا لیکن میں آج بھی اس مکان کے سامنے سے گزرتا ہوں تو مجھے وہ منظر یاد آ جاتا ہے جب انہوں نے میری بیوی کو مٹھائی کھلائی تھی اور چادر میں لپیٹا تھا۔ اس واقعے میں سارا کام اس پیپل کے درخت اور گیند کا تھا اگر میں درخت پر نہ چڑھتا تو آج افشاں میری بیوی نہ ہوتی۔

محترم ایڈیٹر
آداب و نیاز
انسان کتنا ہی کچھ کر لے لیکن وہ قسمت کے آگے مجبور ہوتا ہے جس انسان کی موت نہ ہو اسے چاہ کر بھی کوئی مار نہیں سکتا۔ زیرِ نظر روداد بھی ایک ایسے ہی شخص کی ہے۔ پتا نہیں شرجیل کہاں ہو گا لیکن اس کی کہانی میں بھولنے کی کوشش کروں بھی تو بھول نہیں سکتا۔

صداقت حسین ساجد
(شورکوٹ۔ جھنگ)

جیسے جیسے میں خط کی عبارت پڑھتا گیا، میرے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی۔ میرے سامنے بیٹھے کاشف کا چہرہ بھی زرد تھا، جیسے اس کا سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

پیارے کاشف!
مجھے اُمید ہے کہ تم خیریت سے ہو گے۔
تم نے اس سال بھی پہلے کی طرح مرغابیوں کے شکار کا منصوبہ بنا رکھا ہو گا۔ اس بار بھی تم مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے۔ تمہارے لیے ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ اس سال مرغابیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہجرت کر کے جھیل پر آئی ہے اور ہاں! منصور کو اپنے ساتھ لانا مت بھولنا، میں تم دونوں کا انتظار کروں گا۔

فقط والسلام تمہارا دوست
شرجیل

خط کے نیچے لکھا ہوا نام پڑھ کر میں حیرت سے کاشف کو تکنے لگا۔

آپ کو یقیناً حیرت ہو رہی ہو گی کہ ایک دوست کی طرف سے شکار کی دعوت ملنے پر ہم اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟ تو سنیں۔ میں اور کاشف بچپن کے دوست ہیں اور ہم نے بہت سے ایسے خطرناک کام کیے ہیں کہ صرف ان کا ذکر سن کر عام آدمی کو پسینا آ جائے۔ مگر یہ خط پڑھ کر خود ہماری حالت بری تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ خط ہمارے اس دوست شرجیل نے لکھا تھا جسے ایک سال پہلے ہم اپنے ہاتھوں سے دفن کر چکے تھے۔

شرجیل کی موت ایک حادثہ تھی جسے چھپانے کے لیے ہم نے اسے جھیل کے نیم دلدلی جنگل ہی میں دفن کر دیا تھا۔ ہر سال مرغابیوں کا شکار کرنے کے لیے جھیل جانا، ہم تینوں کا معمول تھا۔

شرجیل کراچی کے ایک نجی ادارے میں اکاؤنٹینٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ کاشف ایک اشتہاری کمپنی کا مالک تھا۔ جب کہ میں ایک انجینئر تھا اور ایک بہت اچھے ادارے میں ملازمت کر رہا تھا۔ اگرچہ ہمارے شعبے الگ الگ تھے لیکن شکار اور مہم جوئی کے شوق نے ہمیں اکٹھا کر دیا تھا۔ اسی شوق کو پورا کرنے گئے تھے کہ وہ حادثہ ہو گیا تھا۔ تب سے میں اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ اس بار پروگرام یہ بنا تھا کہ یہ خط آ گیا۔

''یہ اندازِ تحریر تو اسی کا ہے۔'' میں نے خط میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''لل...... لل...... لیکن...... یہ کیسے ممکن ہے؟'' کاشف لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مجھے تو یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔''

''ہمیں اتنا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے خط پرزے پرزے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینکتے ہوئے کہا۔ ''کسی نے مذاق کیا ہے۔'' ''ویسے بھی ہم تین دن بعد جھیل جا رہے ہیں اگر کوئی شک ہے، تو اپنا وہ شک ہم شرجیل کی قبر کھود کر دور کر لیں گے۔''

''تم نے سامان کا بندوبست تو کر لیا ہے ناں؟'' کاشف نے چند لمحے سوچنے کے بعد پوچھا۔

''سارا انتظام مکمل ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اخبارات بھی اس واردات کو بھول چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ پولیس بھی اتنا وقت اپنا دماغ کھپانے کے بعد اپنی ہار مان چکی ہے۔ ایک سال کی مدت کچھ کم بھی تو نہیں ہوتی۔''

میری بات سن کر کاشف کو حوصلہ ملا تو میں اپنے دفتر واپس آ گیا۔ میں نے اپنی طرف سے تو اس کا خوف دور کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن میرا اپنا ذہن ابھی تک

شرجیل اور اس کے پُراسرار خط میں الجھا ہوا تھا کہ یہ مذاق کیا کس نے۔

☆......☆

ایک سال پہلے رونما ہونے والے واقعات آج بھی میرے ذہن میں اسی طرح تازہ تھے، جیسے کل پیش آئے ہوں۔

اس دن ہم صبح سویرے کراچی سے روانہ ہوئے۔ بارشوں نے راستے کو بہت خراب کر دیا تھا۔ اوپر سے یہ سفر طویل بھی تھا۔ اس راستے پر کیچڑ اور پھسلن اس قدر تھی کہ ہم بڑی مشکل سے سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں تو راستہ اتنا تنگ ہو جاتا تھا کہ کسی اور گاڑی کو پاس کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ راستہ آخر کار دلدلی جنگلات تک جا پہنچتا تھا۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر جھیل تھی۔ یہ ایک زبردست سی تفریحی جگہ تھی۔ دلدلی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی فضا حبس زدہ تھی۔ رات کو خطرناک کیڑوں اور مچھروں کی بھرمار نے لوگوں کو اس طرف کا رخ نہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب یہ علاقہ ویران تھا۔ پچھلے سال تو یہاں چند لوگ ہی شکار کے لیے آتے تھے۔ وہ بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھے۔ یہ بات ہمارے لیے فائدہ مند تھی۔ ہم تو اس جگہ جاتے ہی اس لیے تھے کہ شہر کی ہنگاموں سے بھرپور زندگی سے کچھ دن کا چھٹکارا مل جائے۔ جب سے یہاں شکاریوں نے آنا چھوڑا تھا، تب سے یہاں مختلف قسم کے پرندوں نے اپنا ڈیرا ڈال دیا تھا۔ یوں ہمارے شکاری جذبے کی تسکین کا خاطر خواہ انتظام قدرت کی طرف سے خود بخود ہو گیا تھا۔

کاشف نے ایک پرانا کاٹیج خرید رکھا تھا۔ یوں وہاں رہنے کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ مرغابیوں کی طرح کے بے ضرر پرندوں کے شکار کے لیے ہلکے پھلکے ہتھیار موجود تھے۔

جنگل کی طرف سے آنے والے خطرناک درندوں کے استقبال کے لیے دور مار رائفلیں بھی ساتھ تھیں۔

تین گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم لکڑی سے بنے ہوئے اس کاٹیج تک پہنچ گئے۔ اس میں دو کمرے تھے۔ ایک کو ہم سونے کے لیے استعمال کرتے تھے اور دوسرے میں اپنا سامان وغیرہ رکھتے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی ہم نے مختلف کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ کاشف کے ذمے صفائی کا کام تھا اور وہ بالکل کسی ماہر خاتون کی مانند یہ کام کرتا تھا۔ شرجیل کے ذمے گاڑی اور سامان کی دیکھ بھال تھی۔ رہ گیا میں، تو میرے ذمے باورچی خانہ تھا۔

اس دن تھکاوٹ کی وجہ سے ہم نے وہ کھانا استعمال کرنا تھا جو ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔ جتنی دیر میں ہم چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہوئے، سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور گپ شپ لگانے لگے۔ پھر نیند آنے لگی تو ہم سونے کی تیاری کرنے لگے۔ ہمارے پاس زپ سے بند ہونے والے خصوصی بستر موجود تھے۔ ان کی وجہ سے ہم مچھروں اور کیڑے مکوڑوں سے بالکل خوف زدہ نہیں تھے۔

بہت زیادہ تھکاوٹ کی وجہ سے اگلے دن کوئی بھی جلدی نہ اٹھ سکا۔ دس بجے کے قریب میری آنکھ سب سے پہلے کھلی۔ ان دونوں کو جگانے کے بعد میں نے تولیہ اور ٹوتھ برش لیا اور جھیل کی طرف چل دیا۔ باہر تھوڑی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی مگر یہ سردی مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ جھیل کا پانی بہت ٹھنڈا تھا لیکن میں نے ہمت سے کام لیا اور برداشت کرتے ہوئے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور واپس آکر چولہے پر چائے کا پانی رکھ دیا۔

وہ دونوں جاگ تو گئے تھے لیکن لیٹے ہوئے تھے۔

"بھئی! اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔" میں نے انھیں باری باری جھنجوڑ کر کہا۔ "ہم یہاں سونے کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ تفریح کے لیے آئے ہیں۔"

"رات کو میں نے ایک بہت خوف ناک خواب دیکھا ہے۔" کاشف نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"یہ کون سی نئی بات ہے، تم جب بھی کوئی خواب دیکھتے ہو وہ خوف ناک ہی ہوتا ہے۔ کبھی تم نے اچھا اور سہانا خواب بھی دیکھا ہے۔" شرجیل نے جملہ کسا۔

"اصل میں سوتے ہوئے مجھے تمہارا چہرہ دکھائی دیا تھا، اس لیے خوف ناک خواب تو آنا ہی تھا۔" کاشف نے بھی یہ کہہ کر حساب برابر کر دیا۔

ان دونوں کے درمیان اکثر ایسا مذاق چلتا رہتا تھا۔ میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اب بھی میں شاید خاموش رہتا لیکن دیر ہو رہی تھی اس لیے بول پڑا۔ "اب اٹھ جاؤ پھر باتیں کرتے رہنا۔"

وہ دونوں اٹھ تو گئے لیکن ان کی باتیں ختم نہ ہوئیں۔ وہ تیار ہو گئے اور میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ ہمارے پاس ہی ایک اسٹول پر ایک چھوٹا سا ریڈیو پڑا ہوا تھا۔ یہ ریڈیو شرجیل کا تھا اور وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس وقت اس پر کرکٹ میچ آرہا تھا۔ ہمیں کرکٹ سے گہری دل چسپی تھی اس لیے ہم بڑی توجہ سے کمنٹری سن رہے تھے۔ کمنٹری ختم ہوئی اور خبریں شروع ہو گئیں ہم پوری توجہ سے خبریں سننے لگے۔ "آج صبح چند نامعلوم افراد نے مقامی بینک کی بکتر بند گاڑی پر حملہ کر کے اس کے ڈرائیور اور محافظوں کو قتل کر دیا اور گاڑی چھین کر لے گئے گاڑی کی تجوری میں کئی لاکھ روپے موجود تھے۔ گاڑی اور مجرموں کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا ہے لوگوں سے درخواست ہے کہ وہ اگر ڈاکوؤں یا گاڑی کا کوئی سراغ پائیں تو فوراً مقامی پولیس اسٹیشن کو اطلاع دیں، اطلاع دینے والے کو معقول انعام بھی دیا جائے گا۔"

خبریں ختم ہوئیں تو کچھ دیر کے لیے فضا میں خاموشی سی چھا گئی۔ اس خاموشی کو کاشف کی آواز نے توڑا۔

"کاش! مجھے یہ رقم مل جائے تو میرے سارے ادھورے خواب پورے ہو سکتے ہیں۔" اس نے اپنے ہونٹوں کو گول کر کے سیٹی مارتے ہوئے کہا۔

"بھئی! مجھے تو اتنی بڑی دولت کا کچھ حصہ بھی مل جائے تو میرے دن تبدیل ہو سکتے ہیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"پہلی تو بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے وہ رقم کبھی تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔" شرجیل ہمارے خوابوں کے محل گراتے ہوئے بولا۔

"چھوڑو بھئی!" میں نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "جو چیز ہمارے مقدر ہی میں نہیں ہے۔ اس پر بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

ان دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا اور پھر ہم تینوں اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر جھیل کی طرف چل دیے۔ اب ہوا میں پہلے کی نسبت زیادہ ٹھنڈک تھی۔ جھیل کی سطح سے ہلکا

ہلکا سا دھواں اٹھ کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ یہ ماحول شکار کے لیے بہت نا مناسب تھا، کیوں کہ دھند کی وجہ سے انسانی نظر چند فٹ سے آگے کام نہیں کر رہی تھی۔ اب ہمیں اس وقت کا انتظار تھا جب سورج اونچا ہو، کیوں کہ سورج جوں ہی اونچا ہوتا، دھند چھٹ جاتی۔ ہم اس وقت کے انتظار میں جھیل کے کنارے پر موجود ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گئے۔

ابھی ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک پاس ہی سے ایسی آواز آئی...... جیسے کسی بھاری جانور کے پیروں تلے آکر سوکھی جھاڑیاں ٹوٹ رہی ہوں۔ میں نے بہت تیزی سے اپنی رائفل اٹھائی۔ یہ اتنی طاقت ور رائفل تھی کہ اس کی ایک ہی گولی شیر کو بھی ہلاک کر سکتی تھی۔ کاشف اور شرجیل کے پاس چھرے والی عام رائفلیں تھیں۔ انھیں بھی اگر قریب سے استعمال کیا جاتا تو یہ بھی مہلک ثابت ہوتیں۔

''احتیاط سے......'' میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھند کی دوسری طرف دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہمارے علاوہ یہاں اور کون ہو سکتا ہے، سب ہماری طرح پاگل تھوڑی ہیں!'' کاشف بڑبڑایا۔ ''مجھے تو کوئی جانور لگتا ہے؟''

ہم نے اس طرف چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ ہمارے کانوں نے تیز تیز سانسوں کی آواز سنی۔ یوں لگا کہ جیسے کوئی طاقت ور درندہ ہوا سونگھ کر کچھ جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ابھی میرا ذہن اسی الجھن میں مبتلا تھا کہ اچانک ہوا میں کسی آدمی کا قہقہہ گونجا۔ خون ہماری رگوں میں جم سا گیا۔

''تم نے کچھ سنا؟'' میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں ان دونوں سے پوچھا۔

''کسی آدمی کی آواز تھی۔''

شرجیل نے میری تائید کی۔ پھر وہ ہمیں منع کرتے ہوئے بولا۔

''کوئی فائر نہ کرے، شاید ہمارے علاوہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔''

''اگر ایسا ہے، تو پھر اس کی زندگی شدید خطرے میں ہے۔'' میرے منہ سے پریشانی کی حالت میں نکلا۔ ''میں نے ابھی کسی درندے کی غراہٹیں بھی سنی تھیں۔''

اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کچھ کہتا، ایسی آواز آئی جیسے کوئی جانور جھیل میں سے پانی پی رہا ہو۔

''مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' کاشف کی خوف زدہ آواز ابھری۔ ''چلو! یہاں سے......''

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ درندے کی دبی دبی غراہٹوں کے درمیان ایک بار پھر کسی آدمی کا قہقہہ گونجا۔ یہ قہقہہ پُرسکون تھا اور اس میں ذرا بھر بھی خوف شامل نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عجیب و غریب صورتِ حال کو کیا نام دوں۔

اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی وہ وقت جب یاد آتا ہے، تو مارے خوف کے میرا جسم پسینے میں بھیگ جاتا ہے۔

ہم تینوں سانس روکے کھڑے رہے۔

اگر بات صرف درندوں کی ہوتی، تو ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے کہ شاید جنگلی بھیڑیئے وغیرہ جھیل پر پانی پینے آئے ہوں گے لیکن ایک آدمی کی وہاں موجودگی اس معاملے کو پُراسرار بنا رہی تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ہم کافی وقت جنگلوں میں گزار چکے تھے، اس لیے ہم مختلف جنگلی جانوروں کی آوازیں پہچان لیتے تھے۔ وہ آوازیں جنگلی بھیڑیوں یا ریچھوں کی ہرگز نہیں تھیں۔ ان کے علاوہ اس جنگل میں اور کوئی بڑا درندہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ غراہٹیں غائب ہو گئیں، تو ہم سمجھ گئے کہ وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔

شرجیل نے گہری سانس لی اور کہنے لگا۔

''اف میرے خدایا! مجھے تو یہ کوئی خوف ناک خواب لگ رہا ہے۔''

''اللہ تعالیٰ جانے کیا معاملہ تھا۔'' میں نے کہا۔ ''آؤ! واپس چلیں...... کہیں وہ دوبارہ ادھر نہ آنکلیں۔''

دونوں نے میری تائید کی اور ہم واپس کاٹیج کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد سورج بھی نکل آیا اور اس کی گرمی نے دھند دور کر دی۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ آس پاس کے دلدلی میدان کو سبزے نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

''یہ...... یہ...... یہ کیسی آواز ہے؟'' اس نے اپنی نگاہیں جھیل تک آنے والی کیچڑ زدہ سڑک پر گاڑتے ہوئے کہا۔

اگرچہ مجھے اور شرجیل کو کچھ نہیں سنائی دیا تھا مگر ہمیں پتا تھا کہ کاشف کی سننے کی حس بہت تیز ہے۔ وہ چاروں

طرف گھوم رہا تھا۔ آخر کار اس نے مشرق کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ ''کوئی گاڑی ادھر سے آ رہی ہے۔''
ہم نے توجہ سے سننے کی کوشش کی تو ہمیں بھی کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی سی گھر گھر سنائی دینے لگی۔
شرجیل نے پوچھا۔ ''یہ کون ہو سکتا ہے؟''
''شاید کوئی دوسرا شکاری گروہ ہو۔'' میں نے رائے دی۔
پھر ہم تینوں بھاگ کر اپنے کاٹیج میں پہنچ گئے۔ کاشف اندر سے دوربین اٹھا لایا۔ اس نے چھت پر چڑھ کر دوربین آنکھوں سے لگالی۔
''اف میرے خدایا!'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''یہ...... یہ...... یہ تو بینک کی گاڑی ہے۔''
''کک...... کک...... کیا مطلب؟'' میں اور شرجیل چلّا اٹھے۔
''اس پر نشان صاف دکھائی دے رہا ہے۔''
یہ سن کر ایک لمحے کے لیے ہمیں سانپ سونگھ گیا۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔
''تت...... تت...... تمھارا مطلب ہے۔ یہ وہی گاڑی ہے جسے ڈاکو اغوا کر کے لے گئے تھے؟'' شرجیل نے کہا۔
کاشف نے دوربین نظروں سے ہٹا کر کندھے اچکائے اور پھر جواب دیا۔
''شاید وہی ہے اور اس کا رخ ہمارے کاٹیج کی طرف ہے۔''
''اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ قانون سے بچنے کے لیے ادھر آ رہے ہیں۔'' شرجیل بڑبڑایا۔
''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' کاشف نے دوربین دوبارہ آنکھوں سے لگا کر پوچھا۔
''بھئی! سیدھی سی بات ہے۔'' شرجیل نے جواب دیا۔ ''ہمارا کاٹیج پورا سال خالی رہتا ہے، اس لیے مجرموں نے اسے اپنا ٹھکانا بنانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔''
''پھر تو ہماری جانوں کو بھی ان سے بہت خطرہ ہے۔''
اتنا کہہ کر کاشف چھت سے اتر آیا۔
''ہمیں فوراً اپنے آپ کو گاڑی سمیت چھپا لینا چاہیے...... ورنہ! وہ لوگ اپنا راز چھپانے کے لیے ہمیں قتل بھی کر سکتے ہیں۔''

یہ سن کر میں پریشان ہو گیا۔ صورتِ حال اچانک خوف ناک رخ اختیار کر گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہم نے ریڈیو پر ڈاکے کی خبر سنی تھی، تو ہم میں سے کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اتنی جلدی اس خونی ڈرامے میں ہم بھی شامل ہو جائیں گے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ہمیں قتل کرنا ان کے لیے کون سا مشکل کام تھا یا انھوں نے پہلی بار تو کسی کو قتل نہیں کرنا تھا۔ وہ یہ کام تو جانے کب سے کر رہے ہوں گے۔
''لل...... لل...... لیکن...... ہم فوراً کہاں چھپیں؟'' شرجیل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔
''یہ وقت سوچنے کا نہیں ہے۔''
کاشف یہ کہہ کر جلدی سے گاڑی میں سوار ہوا اور اسے کاٹیج کے پیچھے اگی ہوئی جھاڑیوں میں یوں کھڑا کر دیا کہ سامنے سے وہ دکھائی نہیں دیتی۔
''اب ہم کہاں جائیں گے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔
''ہم اپنے ہتھیار سنبھال کر سامنے والی جھاڑیوں میں چھپ جاتے ہیں۔'' کاشف نے کارتوسوں کی پیٹی کمر سے باندھتے ہوئے کہا۔
اس کے سوا اور کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے ہی تھے کہ تھوڑی دیر بعد بکتر بند گاڑی کاٹیج کے دروازے پر آ کر رک گئی۔ تین افراد اچھل کر باہر آئے۔ وہ خودکار رائفلوں سے مسلح تھے اور شکل سے ہی سفاک مجرم لگ رہے تھے۔ ہم سے وہ مشکل سے پندرہ بیس گز کے فاصلے پر تھے۔
''تو یہ ہے وہ جگہ۔'' ان میں سے ایک نے کاٹیج پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔
''کیسی ہے؟''
دوسرے کے لہجے میں فخر تھا۔ شاید اسی نے ہماری اس ذاتی تفریح گاہ کا پتا لگایا تھا۔
''اس کے مالک سارا سال غائب رہتے ہیں۔''
''لیکن اگر وہ ہماری موجودگی کے دوران میں یہاں اچانک آ گئے تو......؟'' پہلے نے دانت پیس کر کہا۔
''تو کیا ہوا پیارے!'' دوسرا مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''اس کا بھی آسان سا حل ہے۔''
''وہ کیا......؟''
''ہم ان کا قصہ پاک کر دیں گے۔''
یہ سن کر ہمارے جسموں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ شاید

کاشف کو ڈاکو کی یہ بات بہت بری لگی، اس لیے اس نے فوراً لیٹے لیٹے اپنی رائفل سے اس کا نشانہ لے لیا مگر میں نے اس کی رائفل جھکا دی۔

"بے وقوف نہ بنو۔" میں نے سرگوشی کی۔ "ان تینوں کے پاس خودکار رائفلیں ہیں، جتنے وقت میں ہم اپنی رائفلیں تیار کریں گے وہ ایک ہی برسٹ میں ہمارا خاتمہ کر دیں گے۔"

یہ سن کر کاشف نے گھوڑے پر سے انگلی ہٹا لی مگر اس کی آنکھوں میں سے شعلے پھر بھی نکل رہے تھے۔ شرجیل میری تائید کرتے ہوئے بولا۔

"ہم نے یہ ہتھیار شکار کرنے کے لیے خریدے ہیں، انسانوں کے چیتھڑے اڑانے کے لیے نہیں۔"

"تم دونوں شاید بھول رہے ہو کہ وہ عادی مجرم اور سفاک قاتل ہیں۔" کاشف نے کہا۔

"اور اگر انہوں نے ہمارا شکار کر لیا تو؟"

"کوئی کسی کو ایسے ہی گولی نہیں مار دیتا قتل کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔"

تبھی ان میں سے ایک ڈاکو اسی جھاڑی کی طرف دیکھتا ہوا بڑھا جہاں پر وہ چھپے ہوئے تھے۔ شاید اسے شک ہوا تھا اسے آگے بڑھتے دیکھ کر کاشف نے گھبرا کر ٹریگر دبا دیا۔

دھماکے سے فضا گونج اٹھی۔ ڈاکو کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور وہ دوسری سانس بھی نہ لے سکا۔

اس کے بعد ایک لمحے کے لیے فضا پُرسکون رہی۔ پھر اگلے ہی لمحے ڈاکوؤں نے جھاڑیوں کی طرف گولیوں کی بارش کر دی۔

"یہاں سے نکلو۔" شرجیل نے زمین سے چپک کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

گولیاں جھاڑیوں کو چھیدتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر رہی تھیں۔ اس وقت کاشف نے ڈاکوؤں کی طرف دوسرا فائر کیا۔ اس سے ڈاکوؤں کا تو کچھ نہ بگڑا، لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ چند لمحوں کے لیے ان کے ہتھیار خاموش ہو گئے۔ ہمارے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جھاڑیوں سے نکل کر چند قدم دور موجود چھ فٹ کے قریب لمبی اگی ہوئی گھاس کے میدان کی طرف دوڑ پڑے۔ اس دوران میں شاید ڈاکوؤں نے ہمیں دیکھ لیا تھا کیوں کہ ان میں سے ایک کو میں نے چلاتے ہوئے سنا۔

"وہ......وہ......وہ بھاگ رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی فضا لگاتار گولیوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ اگر ہم تیزی سے زمین پر نہ لیٹ جاتے تو ہمارے سروں پر سے گزرنے والی گولیاں یقیناً ہمارے جسموں کو چھلنی کر ڈالتیں۔

اچانک فائرنگ رک گئی۔ ہم سانس روکے وہیں لیٹے رہے۔ وہ میدان کا نشیبی حصہ تھا۔ اسی لیے ہم گولیوں کی... بوچھاڑ سے تو بچ گئے تھے لیکن...... اب ڈاکو ہمیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ انھیں دیکھنے کے لیے گھاس میں سے سر اٹھا کر دیکھنا ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

"یہاں سے کسی نہ کسی طرح سے نکلو۔" میں نے خوف زدہ خرگوش کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہیں وہ ہمیں ڈھونڈ نہ لیں۔"

"مگر جائیں کہاں؟" شرجیل کی آواز آئی۔ "سر اٹھاتے ہی ان کی گولیاں ہمیں ختم کر ڈالیں گی۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

"جنوب کی طرف درختوں کا جھنڈ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر ہم وہاں تک کھسکتے ہوئے پہنچ جائیں، تو پھر جنگل میں چھپنا ہمارے لیے آسان ہوگا۔"

"میں جنگل میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔" کاشف نے گھبرا کر کہا۔ "کیا تم لوگ جھیل پر آنے والی بلاؤں کو بھول گئے ہو؟"

ڈاکوؤں کے حملے کی وجہ سے میں جھیل والے پُراسرار معاملے کو بھول بیٹھا تھا۔ اب کاشف نے یاد دلایا، تو میرا دل یکایک لرز اٹھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شکار کی یہ ہماری چھوٹی سی مہم اس قدر خطرناک ہو جائے گی۔ میرا ذہن ابھی ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ سن کر میں بے اختیار رائفل سمیت پیچھے کی جانب مڑ گیا۔ میں دھک سے رہ گیا۔ ایک کرخت شکل والا ڈاکو رائفل تانے مجھے گھورتے ہوئے سفاکانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اتنی خطرناک تھی کہ میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا۔

اس کی انگلی کی صرف ایک حرکت ہم تینوں کی زندگیوں کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ خاموش فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ ڈاکو حیرت سے اپنے سینے میں بننے والا سوراخ دیکھنے لگا جس سے خون ابل ابل کر کے نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل نکل گئی اور وہ منہ کھولے ایک لمبی سی کراہ مار کر پیچھے کی طرف گر گیا۔ یہ کام

شرجیل کی رائفل کا تھا۔ جب ہم تینوں مردہ ڈاکو کی لاش کی طرف متوجہ ہوئے تو اس دوران میں تیسرا بدبخت ڈاکو بغیر آواز پیدا کیے چلتا ہوا ہمارے سروں پر پہنچ گیا۔ پہلا دھما کا ہوتے ہی میں جلدی سے زمین پر گر گیا۔ کاشف نے بھی میری تقلید کی لیکن...... افسوس! شرجیل کو مہلت نہ مل سکی۔ وہ ویسے بھی ہم دونوں کے پیچھے ڈھال بنا کھڑا تھا، اس لیے گولی اس کے جسم میں گھس گئی۔ ڈاکو نتیجہ دیکھنے کے لیے اپنی جھوک میں چند قدم آگے بڑھا تو ہمارا نشانہ بن گیا۔ ہماری رائفلوں سے نکلنے والے چھروں نے محاورتاً ہی نہیں بلکہ حقیقت میں اس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔

ڈاکوؤں کی موت کا یقین کر لینے کے بعد ہم جلدی سے شرجیل کی طرف بڑھے، اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پیٹھ خون سے سرخ ہو چکی تھی۔ اس کا جسم اگرچہ ساکت تھا ......مگر حیرت انگیز طور پر اس کی نبض چل رہی تھی۔

''یہ ابھی زندہ ہے۔'' میں نے کاشف کو بتایا۔

''مگر اس کا بچنا مشکل ہے۔'' اس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کوشش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔'' میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ''اگر ہم اسے اسپتال لے جانے میں کامیاب ہو جائیں تو شاید یہ بچ جائے۔''

''لیکن ......اس طرح ہم گاڑی میں رکھی رقم سے محروم ہو جائیں گے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔'' میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے دوست کی زندگی خطرے میں ہے اور تم پر لالچ کا بھوت سوار ہے۔''

''میرا دماغ بالکل درست ہے۔'' وہ بے رحمی سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ ''یہ رقم ہماری قسمت بدل سکتی ہے اگر ہم شرجیل کو اسپتال لے گئے تو ہمیں پورا واقعہ بتانا پڑے گا یوں یہ موقع ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس ویرانے میں ہونے والے ان خونی واقعات کے گواہ صرف ہم ہی ہیں پھر اسپتال لے جانے کے باوجود شرجیل کی جان بچنے کے امکانات بہت ہی کم ہیں۔ ڈاکوؤں سے مقابلہ کر کے ہم نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالی ہیں۔ اگر ہم نے رقم حکومت کو واپس کر دی تو سوائے کاغذی انعامات کے ہمیں کچھ اور نہیں ملے گا۔''

کاشف کی باتیں سن کر میں نے جان کنی کے عالم میں مبتلا شرجیل پر نظر ڈالی اور اپنا سر آہستہ سے اثبات میں ہلا کر رہ گیا۔ اس کے دلائل اتنے کمزور بھی نہیں تھے۔

''مگر اب ہم کیا کریں؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ہم شرجیل کی لاش یہیں دفن کر دیتے ہیں۔'' اس نے مجھے قائل ہوتے دیکھ کر جوشیلے لہجے میں جواب دیا۔ ''ڈاکوؤں کی لاشیں ان کے اسلحہ سمیت بکتر بند گاڑی کے اگلے حصے میں بند کر کے جھیل میں غرق کر دیتے ہیں پھر ٹھیک ایک سال بعد جھیل سے سونا نکال لیں گے۔ تب تک یہ معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔''

''لیکن......؟''

''کیا لیکن......؟''

''لیکن...... اگر شرجیل کے بارے میں ہم سے پوچھا گیا، تو کیا وضاحت پیش کریں گے؟'' میں نے اس کے منصوبے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں کوئی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے دوست!'' وہ پہلی بار مسکرا کر بولا۔ ''شرجیل اکیلا تھا اور ہمیں پتا ہے کہ ہمارے سوا اس کا شہر میں کوئی اور دوست نہیں تھا۔ رہا اس کا ادارہ، تو اسے ہم یہ جواب دیں گے کہ شرجیل شہر کے ہنگاموں سے اکتا کر اپنے آبائی قصبہ چلا گیا ہے چوں کہ وہ کوئی مالی غبن تو کر کے گیا نہیں، اس لیے کچھ عرصہ سر کھپانے کے بعد ادارہ بھی اسے بھول جائے گا۔''

''آؤ! ذرا دیکھتے ہیں کہ گاڑی میں رقم کہاں رکھا ہوئی ہے؟'' مجھے سوچتے ہوئے دیکھ کر کاشف نے کہا۔

پھر ہم اپنے دوست کو خون میں لت پت چھوڑ کر اٹھ گئے۔

بکتر بند گاڑی کے پچھلے حصے میں ایک آہنی صندوق نصب تھا۔ یہ مخصوص نمبروں سے کھلنے والی تجوری تھی۔ لیکن ......ڈاکو اسے کھولنے کا پورا بندوبست کر کے آئے تھے۔ عقبی حصے میں گیس ویلڈنگ کا سلنڈر اور ٹارچ رکھی ہوئی تھی۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی کاشف نے وہاں رکھا ہوا مخصوص ہیلمٹ پہن کر ویلڈنگ ٹارچ روشن کی اور اس کا شعلہ صندوق کے تالے پر مرکوز کر کے دائرے میں گھمانے لگا۔ کئی سو ڈگری درجۂ حرارت والے شعلے نے چند ہی لمحوں میں صندوق کی چادر کاٹ ڈالی۔ تالا ٹوٹتے ہی ہم نے مل کر صندوق کا ڈھکنا اٹھایا تو نوٹوں کی گڈیاں رکھنے والا تھیلا نظر آیا۔ یہ ایک مخصوص قسم کا واٹر پروف تھیلا ہوتا ہے

اور سیلڈ بھی ہوتا ہے۔ سیل توڑتے ہی ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

''اوہ...... میرے خدایا!''

ہم دونوں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں کچھ دیر پہلے شرجیل کی بری حالت کے بارے میں فکرمند تھا۔ اب میرے ذہن سے اس کا خیال نکل چکا تھا۔ اب مجھے صرف وہ گڈیاں یاد رہ گئیں جسے دیکھتے ہوئے ہر ایک سحر زدہ سا ہو جاتا ہے۔

''یہ دولت اب ہماری ہے۔'' کاشف نے سحر زدہ حالت میں تھیلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مگر اسے ابھی ہم ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا تب اسے نکالیں گے۔'' کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''میں نے یہ تالا اس لیے کاٹا ہے کہ بعد میں جب غوطہ خوری کا سامان لا کر جھیل سے بیگ نکالیں تو ہمیں تالے کو کاٹنے والا کام نہ کرنا پڑے ...... آؤ! اب شرجیل کا بندوبست کر دیں۔''

ہم نے صندوق کا ڈھکنا دوبارہ اپنی جگہ پر لگا دیا اور شرجیل کے پاس پہنچ گئے۔ اس بے چارے کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ نبض ہلکی ہلکی چل رہی تھی اور کبھی کبھی اس کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا حرکت کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

''اسے اس خراب حالت میں بھی دفن کرنا ظلم ہوگا۔'' میں نے کہا، تو میری آواز بھرا گئی تھی۔

''لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے پیارے!'' کاشف بے نیازی سے بولا۔

پھر وہ کاٹیج میں سے بیلچہ اٹھا لایا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''تم ذرا جھاڑیوں کے پاس ایک قبر کھود دو...... میں ڈاکوؤں کا بندوبست کر لوں۔''

میں نے جھاڑیوں کے پاس ایک گڑھا کھود دیا۔ اس دوران میں کاشف نے ڈاکوؤں کو ان کے اسلحہ سمیت بکتر بند گاڑی کے اگلے حصے میں بند کر دیا۔

''اب میں گاڑی جھیل میں غرق کرنے لگا ہوں۔''

اتنا کہہ کر اس نے گاڑی چلائی اور جھیل کی طرف چل دیا۔ جھیل سے چند گز کے فاصلے پر اس نے گاڑی ایک ڈھلوان جگہ پر کھڑی کی اور انجن کو چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ پھر ایک بلاک کو رسی کی مدد سے اندر ایکسلیٹر پر رکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ گاڑی دوڑتی ہوئی جھیل میں جا گری۔ گاڑی تھوڑی دیر سطح پر کھلونے کی طرح ہچکولے کھاتی رہی اور پھر وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس گاڑی میں ہی رقم کا تھیلا تجوری میں بند تھا۔

''میں ایک زندہ انسان کو دفن نہیں کر سکتا۔'' جوں ہی کاشف گاڑی غرق کر کے آیا، میں نے ناراضی سے کہا۔ ''یہ کام بھی تم خود ہی کر لو۔''

''اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔'' اس نے اپنی رائفل مجھے دیتے ہوئے کہا۔

''بات وہ نہیں ہے۔''

''پھر کیا ہے؟''

''مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔''

''اگر تمہیں اتنا ہی خوف محسوس ہو رہا ہے، تو تم اندر چلے جاؤ، میں ابھی اسے دفن کر دیتا ہوں۔''

میں بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ آدھے گھنٹے بعد کاشف مٹی میں لت پت اندر داخل ہو کر کرسی پر گر سا گیا۔

''اگر پولیس بکتر بند گاڑی کے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گئی تو......؟'' چند لمحوں بعد میں نے اس سے پوچھا۔ یہ بات ابھی کچھ دیر پہلے ہی میرے ذہن میں اچانک آ گئی تھی۔

''قدرت نے ہمارے راستے کی ہر رکاوٹ ختم کرنے کا بندوبست خود بخود کر دیا ہے۔'' وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑے مطمئن انداز میں بولا۔

''وہ کیسے؟''

''شاید تم نے محکمہ موسمیات کی رپورٹ نہیں سنی۔''

''نہیں، کیوں کہ حالات ہی کچھ اس طرح کے تھے کہ میرا دھیان کسی اور طرف جا ہی نہیں سکا۔''

''اس رپورٹ کے مطابق آج رات اس حصے میں طوفان اور تیز بارش کا امکان ہے۔''

اس نے بالکل صحیح کہا تھا کیوں کہ اسی رات ہمارے وہاں سے روانہ ہونے کے دو گھنٹے ہی بعد طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ اس تند و تیز بارش نے جھیل کے کنارے ہونے والی ہماری ہر کارروائی کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔

☆......☆

اب ایک سال بعد ہم رقم نکالنے کے لیے ہر ممکن تیاری کر چکے تھے کہ ہمیں اپنے مرحوم دوست کی طرف سے وہ عجیب و غریب خط ملا۔ جس میں اس نے پچھلے سالوں کی طرح اس بار بھی شکار کھیلنے کی دعوت دی تھی۔ اگرچہ میں نے کاشف کو ہر طرح سے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ شرجیل

مر چکا ہے اور یہ خط اس کا ہو ہی نہیں سکتا۔ کسی نے مذاق کیا ہے اور یہ کوئی ایسا شخص ہے جو جانتا ہے کہ ہر سال ہم تینوں مل کر جاتے تھے لیکن اس بارے میں ہمارے ساتھ شرجیل نہیں ہے۔

کاشف کو مطمئن کرنے کے باوجود میرا اپنا ذہن شکوک وشبہات میں مبتلا تھا۔ دفتر سے واپسی تک میں اسی بات پر غور کرتا رہا کہ اگر وہ خط شرجیل نے نہیں لکھا ہے، تو اس کے اندازِ تحریر کی اتنی کامیاب نقل کون کر سکتا ہے؟

دوسری طرف گذشتہ واقعات یاد آنے پر مجھے جھیل پر پیش آنے والا پُراسرار واقعہ بھی یاد آگیا تھا جس کے ساتھ ہی میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ چیتوں کی غراہٹوں کے درمیان وقفے وقفے سے گونجنے والی ہنسی کی وہ آواز ایک سال گزرنے کے باوجود بھی میری یادوں میں ایسے تازہ تھی جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ ان باتوں کے باوجود رقم حاصل کرنا میرے لیے بہت ضروری تھا۔

مقررہ دن ہم غوطہ خوری کا سامان گاڑی میں رکھ کر صبح سویرے جھیل کی طرف چل پڑے۔ اگرچہ اس بار ہمارا ارادہ شکار کا نہیں تھا...... اس کے باوجود ہم نے اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ بھی ساتھ رکھ لیا۔ پورے سفر کے دوران میں رقم ہی ہماری گفتگو کا موضوع رہی۔

''اتنی بڑی رقم کو گھر لے جانا۔ ایک مسئلہ ہوگا۔''

میں نے کاشف سے کہا، جو بڑی دل چسپی سے اونچے نیچے رستوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔

''میں نے اس کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔'' وہ کچھ دیر ٹھہر کر بولا۔

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے انداز سے سمجھ گیا کہ مجھے سمجھ نہیں آئی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا۔

''تم نے لعل ماسٹر کا نام سنا ہے؟''

''لعل ماسٹر......؟ تم پاکستان کے مشہور زمانہ بلے باز حنیف محمد کی تو نہیں بات کر رہے ہو...... انھیں لعل ماسٹر کہا جاتا ہے۔''

''بھئی! یہ وہ نہیں ہے۔''

''تو پھر کون ہے؟''

''تم نے داود کے اسمگلر شیرو کا نام سن رکھا ہے۔''

''ہاں، سن تو رکھا ہے لیکن تم تو مجھے لعل ماسٹر کے بارے میں بتا رہے تھے یہ شیرو کہاں سے ٹپک پڑا؟''

''یہ کہیں سے نہیں ٹپکا۔''

''پھر......؟''

''پھر یہ کہ زیرِ زمین دنیا میں اس کا نام لعل ماسٹر ہے۔''

''کک...... کک...... کیا مطلب؟ تم اسے کیسے جانتے ہو؟''

''گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری اس کے ساتھ جان پہچان اس وقت سے ہے جب وہ ایک سڑک چھاپ غنڈا تھا۔''

''تو کیا تم اس راز میں اسے بھی شریک کرو گے، ایک مجرم کو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''تمھیں مجھ سے مشورہ تو کرنا چاہیے تھا۔''

''ارے! تم تو ناراض ہو گئے دوست! میں نے اسے حقیقت نہیں بتائی۔''

''پھر کیا بتایا ہے؟''

میں نے اس سے صرف غیر قانونی طور پر حاصل کیے گئے نوٹوں کو دبئی منتقل کرنے کی بات کی ہے کروڑوں کی کرنسی تو ہم یہاں استعمال نہیں کر سکتے اس لیے سوچا ہے کہ ہم دونوں بھی وہیں منتقل ہو جائیں گے۔

میرا ذہن پہلے ہی خط والے پُراسرار معاملے میں الجھا ہوا تھا کہ اب اس کی یہ بے وقوفی والی بات سن کر اور الجھ گیا۔

جھیل پر پہنچنے کے بعد ہم اس وقت تک گاڑی میں بیٹھے رہے جب تک کہ ہمیں یقین نہیں ہو گیا کہ وہاں ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ ماحول کو اسی پُراسرار دھند نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جو اب اس جھیل کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ کاشف نے گاڑی کے عقبی حصے سے آکسیجن سلنڈر اور ماسک وغیرہ نکال کر مجھے دے دیے۔

''میرے خیال میں پہلے ہم اس جگہ کو دیکھ لیں جہاں ہم نے شرجیل کو دفن کیا تھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اس طرح ہمیں اطمینان ہو جائے گا اور ہم درست طور پر اپنا کام کر سکیں گے۔''

''آخر تم اس قدر وہمی کب سے ہو گئے ہو؟'' کاشف کے لہجے میں ہلکا سا غصہ تھا۔ ''بہرحال تم اپنا یہ شوق بھی پورا کر لو، میں یہیں گاڑی کے پاس انتظار کرتا ہوں۔''

شرجیل کی قبر پر اکیلے جانے کا خیال ہی خوف ناک تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ اگر

میں نے کاشف کو ساتھ چلنے پر مجبور کیا تو وہ مجھے بھی روک دے گا جب کہ میں چاہتا تھا کہ میں دیکھوں کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں تنہا چل پڑا۔ میں نے بیلچہ اٹھا لیا تھا۔ وہ جگہ جھیل سے پچاس ساٹھ گز دور تھی۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے میرے قدم من من کے وزنی ہو گئے تھے۔ مٹی ہٹانے سے پہلے میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو کاشف گاڑی کے مڈگارڈ پر پاؤں رکھے جھیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں ..... ایک لمبی سانس لے کر بیلچے کی مدد سے مٹی ہٹانے لگا۔ میں نے کاشف کو اس لیے نہ بلایا کہ وہ کہیں میرا مذاق نہ اڑانا شروع کر دے۔ جوں جوں لاش سے مٹی ہٹی، توں توں میری حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ میں چلانا چاہتا تھا۔ مگر آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ قبر میں ایک لاش موجود تھی، لیکن ..... لیکن ..... وہ لاش کسی انسان کی نہیں بلکہ ایک چیتے کی تھی، جواب گل سڑ چکی تھی۔ اس سے اٹھنے والی بدبو اس قدر تیز تھی کہ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے بیلچہ وہیں پھینکا اور الٹے قدموں وہاں سے بھاگ اٹھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ میری زندگی کا ایک ناقابلِ یقین منظر تھا۔

''کک ..... کک ..... کاشف ..... کاشف! وہاں ..... لل ..... لل ..... لاش ..... چچ ..... چچ ..... چیتا ..... چیتا ..... '' میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہکلاتے ہوئے کہا اور گاڑی کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

دوسرے ہی لمحے میں چونک پڑا، کیوں کہ کاشف نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ وہاں میرے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ شاید وہاں تھا ہی نہیں اور میں نے جلد بازی میں غور بھی نہیں کیا۔ میرے جو حواس باقی تھے، وہ بھی ساتھ چھوڑنے لگے۔ میرے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو چکی تھیں کہ ان کی دھک دھک مجھے اپنے کانوں میں صاف سنائی دینے لگی۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔

میں نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بند تھا اور چابیاں بھی غائب تھیں۔ میں اس منحوس جگہ پر پھنس چکا تھا۔ نا جانے کیوں مجھے یقین ہونے لگا کہ شرجیل زندہ ہے اور ہم سے بدترین انتقام لے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانے اس نے کاشف کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا، تو اچھل پڑا۔ میرے پیچھے کاشف تھا لیکن ..... وہ اس حال میں تھا کہ اسے چار افراد نے اپنے اسلحہ کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ چاروں شکل ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش لگ رہے تھے۔ کاشف کو زندہ دیکھ کر جتنا اطمینان ہوا تھا، اس سے بڑھ کر اس کے پیچھے چاروں بدمعاشوں کو دیکھ کر برا حال ہو گیا تھا۔

ان بدمعاشوں میں سے ایک کی شکل مجھے کچھ جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ اسے دیکھ کر جانے کیوں میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے اپنی یادداشت پر زور دیا، تو مجھے اچھلنا پڑا، لیکن ..... یہ اچھلنا خوف کا تھا کیوں کہ یہ شیرو تھا۔ وہی شیرو جو زیرِ زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اسے لعل ماسٹر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ اپنی اس خامی کو چھپانے کے لیے وہ اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ میں جتنا زمین کے اوپر ہوں، اس سے کہیں بڑھ کر میں زمین کے نیچے ہوں۔ اگر کوئی پاتال میں بھی چھپ جائے تو بھی وہ مجھ سے بچ نہیں سکتا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ آج تک پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکی تھی۔

ابھی میں انھیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کے دو ساتھیوں نے مجھ پر بھی اسلحہ تان لیا۔

''تو یہ ہے تمہارا دوست؟'' لعل ماسٹر شیرو نے میرا جائزہ لیتے ہوئے سرد لہجے میں کاشف سے کہا۔ ''اس سے کہو کہ غوطہ خوری کا لباس پہن کر جھیل میں اتر جائے ..... ورنہ ہم تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دیں گے۔''

میں نے کاشف کو ملامت بھری نظروں سے گھورا۔ یہ سب اس کی حماقت کا پھل تھا۔ کاشف کے منہ سے بھاری رقم کا ذکر سن کر لعل ماسٹر یقیناً چونک اٹھا ہو گا۔ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا۔ بینک ڈکیتی کی واردات اور پھر بکتر بند گاڑی کی پُراسرار گمشدگی پہلے ہی سے اسے پتا ہو گی۔ لعل ماسٹر کا تعلق جس دنیا سے تھا وہاں پولیس سے پہلے خبریں پہنچ جاتی ہیں۔ کاشف کی بات کا تعلق اس نے اس واردات سے جوڑ لیا ہو گا۔ اس کے بعد اس نے لازمی طور پر ہماری نگرانی بھی کرائی ہو گی۔ یہ نگرانی ایسی خفیہ ہو گی کہ ہمیں پتا بھی نہیں چلا۔ ہمارا تعاقب کرتے ہوئے وہ یہاں تک پہنچے ہوں گے۔

''تم اپنے آدمیوں سے یہ کام کیوں نہیں کراتے؟''

میں نے ہمت کرتے ہوئے گڑگڑا کر کہا۔
"میرے آدمی غوطہ خوری نہیں جانتے۔" وہ غرایا۔
"جب کہ تم نے اس بارے میں مکمل اور باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے...... پھر تمھیں یہ بھی پتا ہے کہ گاڑی کہاں ڈوبی تھی اور ہاں! ایک بات خاص طور پر یاد رکھنا۔"
"وہ کیا؟"
"مجھے دھوکا دینے کی بالکل کوشش نہ کرنا۔ کیوں کہ مجھے گڈیوں کی اصل تعداد معلوم ہے اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو ایسی اذیت ناک موت دوں گا کہ تمھاری روحیں قیامت تک بلبلاتی رہیں گی۔"
اس وقت ہم اس کے رحم و کرم پر تھے۔ وہ جو کہہ رہا تھا اس پر عمل کرنے کی ہمت بھی رکھتا تھا، اس لیے اس کی بات مانے بغیر چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
"ٹھیک ہے...... جیسا تم کہہ رہے ہو...... ویسا ہی کروں گا، لیکن......"
"لیکن...... کیا؟"
"لیکن...... یہ کہ میں جھیل کی تہ میں جانے سے پہلے ایک راز تمھیں بتانا چاہتا ہوں۔"
"راز...... کون سا راز؟"
میں نے مختصر طور پر اسے بتایا کہ کس طرح ہم نے اپنے زخمی ساتھی شرجیل کو زندہ دفن کیا تھا اور اب وہ کس طرح بچ کر ہم سے بھیانک انتقام لے رہا ہے۔ میں نے اس خط کا بھی ذکر کیا جو ہمیں چند دن پہلے ملا تھا۔
اس دوران میں وہ بڑی گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا تھا۔ جوں ہی میں خاموش ہوا، اس کا ایک آدمی بول اٹھا۔
"ماسٹر! یہ جھوٹ بک رہا ہے، آپ اسے جلدی سے جھیل میں بھیجیں تاکہ ہمیں رقم مل جائے۔"
لعل ماسٹر نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑا اور رائفل کی نال میرے منہ میں ٹھونس دی۔ پھر وہ ناگ کی طرح پھنکار کر بولا۔ "میں یہاں تمھاری بکواس سننے نہیں آیا۔"
یہ کہہ کر اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا تو اس نے غوطہ خوری کا سامان میری طرف پھینک دیا۔
میں ہر لحاظ سے مجبور تھا اس لیے میں نے غوطہ خوری کا سامان پہن لیا اور پھر آکسیجن سلنڈر کمر پر باندھا۔ مکمل تیاری کے بعد میں جھیل کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں جھیل میں اترتا، ان بدبختوں نے میری کمر کے گرد ایک رسی باندھ دی۔ اس رسی کا ایک سرا ان میں سے ایک نے پکڑ لیا۔
"اگر تم نے فرار ہونے کی کوشش کی تو یاد رکھنا! اس جھیل کا چپہ چپہ ہماری دور مار رائفلوں کے نشانے پر ہے۔" لعل ماسٹر نے کہا۔
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جھیل میں اتر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ رقم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ ہمیں قتل کر دیں گے۔ بھلا وہ کیسے اتنی بڑی رقم کے گواہ زندہ رہنے دیتے لیکن میں ان کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ فی الحال تو مجھے بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
پانی کے نیچے اترتے ہی مجھے جھیل کے شفاف پانی کی تہ میں موجود گاڑی کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ میں اس کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ صندوق موجود تھا لیکن اس کا اوپر والا حصہ الگ پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ سے پہلے کوئی اس صندوق تک آیا تھا اور اس میں سے رقم کی تھیلی لے اڑا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا لیکن صندوق میں کیچڑ اور پانی کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ اس میں موجود کائی یہ بتا رہی تھی کہ یہ کام کافی عرصہ پہلے ہوا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔
پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی رسی کھولی۔ مجھے اچھی طرح پتا تھا کہ اگر میں نے اوپر جا کر لعل ماسٹر کو خالی صندوق کے بارے میں بتایا تو وہ اسے میری چال ہی سمجھے گا۔ یوں میرے حصے میں سیسے کی گولی آئے گی۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے بڑی تیزی دکھائی ... اور اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی رسی کو کھول کر صندوق کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر تیز تیز ہاتھ پیر چلاتا ہوا جھیل کے اندر سے دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ زندگی بچانے کے لیے آخری کوشش تو کر لوں۔
کچھ ہی دیر میں، میں جھیل کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ میں نے سر باہر نکالا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں بڑے اطمینان سے باہر نکل آیا۔ میری خوش قسمتی کہ وہاں آبی گھاس اور جھاڑیوں کے جھنڈ بہت تھے۔ ان میں خود کو چھپا کر میں آسانی سے وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ لیکن میں نے جوں ہی جھاڑیوں سے نکل کر صاف زمین پر پاؤں رکھا تو میرے اعصاب پر بجلی سی گر گئی اور میں اپنی جگہ پر منجمد سا ہو کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

لعل ماسٹر اور اس کے گرگوں نے مجھے چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان کی رائفلوں کے دہانے میری طرف اٹھے ہوئے تھے۔
"مجھے پہلے ہی سے پتا تھا کہ تم ضرور یہ کمینی حرکت کرو گے۔" لعل ماسٹر دانت پیس کر بولا۔ "اسی لیے میں تمھاری موت بن کر پہلے سے یہاں آ گیا۔"
اتنا کہہ کر اس نے اپنی رائفل کا رخ تھر تھر کانپتے کاشف کی طرف کیا۔ اوپر تلے دو دھماکے ہوئے اور کاشف کی کھوپڑی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس بدنصیب کو چیخنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے لالچ نے آخر اس کی جان لے ہی لی تھی۔
"اپنے اپنے ہتھیار پھینک دو۔" اچانک لاؤڈ اسپیکروں کی آواز گونجی۔ "تم سب اس وقت چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو۔"
اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے پولیس اور پولیس کے جوان نمودار ہو گئے۔ وہ سب کلاشنکوف ہماری طرف تانے ہوئے آگے بڑھے۔
لعل ماسٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے اپنی موت سامنے ہی دکھائی دے رہی تھی کیوں کہ یہ پہلا اور شاید آخری موقع تھا کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالیں گے بلکہ بچنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اگر وہ ایک بار پولیس کے گھیرے سے نکل جاتے تو پولیس بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرتے، میں نے اپنے جسم کی تمام تر طاقت ٹانگوں میں منتقل کی اور اچھل کر جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ کسی کی رائفل سے ایک شعلہ سا نکلا۔ لمحہ بھر کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دائیں شانے میں انگارے سے بھر گئے ہوں۔ اتنے میں مجھے ٹھنڈے پانی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ پتا نہیں۔ صرف اتنا احساس باقی تھا کہ میرا جسم کسی بے جان چیز کی طرح بہت ٹھنڈی تاریکیوں میں اترتا جا رہا ہے۔
جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو بالکل بدلے ہوئے ماحول میں پایا۔ وہ ایک صاف ستھرا کمرا تھا جس کے اکیلے آرام دہ بستر پر میں لیٹا ہوا تھا۔ میرا دایاں شانہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ تھوڑے تھوڑے سے وقفے سے شانے سے اٹھنے والی درد کی ٹیسیں سارے جسم میں پھیلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرا ذہن آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگا۔ جوں ہی میں معمول پر آیا، مجھے پچھلے تمام واقعات یاد آ گئے اور ایک بار پھر میرے ذہن میں یہ واقعات ایک فلم کی طرح چلنے لگے۔
میرا ذہن ان واقعات میں الجھ رہا تھا کہ میں دروازہ کھلنے کی آواز سن کر چونک پڑا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک لمبا تڑنگا سا نوجوان تھا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر نرس مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ اس کی ذمہ داری کا ایک حصہ تھی۔ پھر اس نے میری نبض دیکھی اور ایک ٹیکا میرے بازو میں لگا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد درد کی ٹیسیں ختم ہو گئیں۔
"مم...... مم...... میں کہاں ہوں؟" میرے منہ سے مشکل سے نکلا۔
"بے فکر رہو دوست! خطرے کا وقت ٹل چکا ہے۔" ایک مانوس سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "اب تم ہر لحاظ سے محفوظ ہو۔"
یہ الفاظ تو ہمدردی سے کہے گئے تھے، لیکن ...... میرے لیے تو وہ بم کے دھماکے سے کم نہ تھے۔ وہ آواز میں پہچان گیا تھا۔ وہ آواز ہمارے اس دوست کی تھی جسے ہم نے ایک سال پہلے سونے کے لالچ میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ میں اچھلا۔ وہ کمرے میں ابھی ابھی داخل ہوا تھا۔
"تت...... تت...... تم تو......"
اس نے آگے بڑھ کر نرمی سے مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ وہ شرجیل ہی تھا۔
"تمہارے زخم ابھی تازہ ہیں۔ مجھے کاشف کی موت کا بے حد افسوس ہے، لیکن وہ اپنی حماقتوں اور اندھے لالچ کی وجہ سے مارا گیا۔"
کاشف کی دردناک موت کے بارے میں سنتے ہی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ آہ لالچ نے آخر اس کی جان لے ہی لی تھی۔ دولت کا تو یہی کام ہے۔ یہ کسی کے حصے میں ایسے نہیں آتی بلکہ یہ تو خون کی پیاسی ہوتی ہے۔ خون سے اپنی پیاس بجھانے کے باوجود بھی یہ کسی کے ہاتھ نہیں لگتی۔ بھلا دولت بھی کبھی کسی کی ہوئی ہے۔
میں نے پہلی بار غور سے شرجیل کو دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس حالت سے کہیں زیادہ بہتر حالت میں تھا۔ جس حالت میں ہم نے اسے زندہ دفن کیا تھا۔ قبر اپنا مردہ کہاں واپس کرتی ہے، تو یہ کیسے بچ

گیا۔ شرجیل نے شاید میرے چہرے کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگا لیا تھا اس لیے وہ بولا۔ ''شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں اتنا شدید زخمی ہونے اور زندہ قبر میں دفن ہونے کے باوجود کیسے تمہارے سامنے زندہ کھڑا ہوں۔''

میں نے ہونقوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اصل میں سب اس فرشتہ صفت نوجوان کی وجہ سے ہوا ہے اور اب یہی تمھیں میرے ساتھ ہونے والے واقعات کے بارے میں بتائے گا۔''

اتنا کہہ کر اس نے اس لمبے تڑنگے نوجوان کو اشارہ کیا، جو نرس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

''آپ تو مجھے ویسے ہی شرم سار کر رہے ہیں ورنہ میں نے تو ایک انسانی فرض نبھایا تھا، اللہ تعالیٰ کو آپ کی زندگی بچانا مقصود تھی، سو بچالی۔''

''نہیں...... دوست! تمھاری بات بھی ٹھیک ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمھیں وہاں وسیلہ بنا کر بھیجا تھا۔''

ان دونوں کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا وہ بہت ہی حیران کن تھا۔ اس نوجوان کا نام طلحہ تھا۔ وہ محکمہ تحفظ جنگلی حیات میں ملازم تھا۔ یہ محکمہ ایسے جانوروں پر تحقیق کرتا ہے جن کی نسل کو انسان کی غفلت یا زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے ختم ہونے کا ڈر ہو۔ ایک سال پہلے جب ہم تینوں جھیل کے کنارے ہونے والے خونی ڈرامے کا حصہ بنے، تو طلحہ اپنے ادارے کی طرف سے چیتوں پر تحقیق کر رہا تھا۔ اس تحقیق کے لیے اس جنگل کو منتخب کیا گیا تھا۔

تحقیق کا مقصد یہ پتا کرنا تھا کہ آیا چیتے جیسے جانور دلدلی ماحول میں زندگی گزار سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ چیتے جب چھوٹے سے تھے تب سے ان کی نگرانی طلحہ کے ذمے تھی۔ اس لیے وہ اس سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ وہ اس کے ساتھ یوں چلتے پھرتے تھے جیسے وہ پالتو جانور ہوں۔ تحقیق کے عرصے کے دوران میں وہ باقاعدگی سے جھیل کی طرف چہل قدمی کرنے جایا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ چیتوں کے ساتھ جھیل کی طرف آیا ہوا تھا لیکن جنگل کے گھنے حصے میں واقع اپنے تحقیقاتی مرکز تک پہنچنے سے پہلے ہی اس نے ہمارے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اس نے نہ صرف ہمیں جھیل میں گاڑی کو ڈبوتے ہوئے دیکھا تھا بلکہ جھاڑیوں میں چھپ کر ہماری باتیں بھی سن لی تھیں۔

جب ہم نے شرجیل کو سنگ دلی سے زندہ دفن کیا۔ تو اس نے جلدی سے تحقیقی مرکز سے اپنے ایک ساتھی کو بیلچے سمیت بلایا۔ پھر ان دونوں نے مل کر شرجیل کو باہر نکالا اور اسے تحقیقی مرکز لے گئے۔ گھنے جنگل میں واقع اس مرکز میں ہنگامی طبی امداد کا شعبہ بھی قائم تھا۔ گولی دو ہڈیوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی جسے بہ آسانی نکال لیا گیا۔ شکر ہے کہ وہ پسٹل کا فائر تھا اگر کلاشنکوف کی گولی ہوتی تو جانبر ہونا مشکل تھا۔ بروقت طبی امداد ملنے سے شرجیل کی جان تو بچ گئی لیکن اسے ایک طویل عرصے تک بستر پر لیٹنا پڑا۔ اسی دوران اس نے پولیس کو بھی اس واقعے کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ جمیل سے رقم برآمد کر کے پولیس نے مقرر کردہ انعام سے زیادہ انعام دینا چاہا۔ تو اس نے انعام لینے سے بالکل انکار کر دیا۔ شرجیل نے ان سے درخواست کی کہ جب تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتا، تب تک اس کے زندہ بچ جانے کے راز کو راز ہی رکھا جائے۔ اصل میں وہ ہمیں ہمارے لالچ کی سزا اپنے طریقے سے دینا چاہتا تھا۔ اس نے چوں کہ قانون کی بغیر کسی لالچ کے مدد کی تھی، اس لیے شرجیل کی بات مان لی گئی۔

شرجیل کو مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں گیارہ ماہ لگ گئے۔ اس کے بعد اس نے خط لکھ کر ہمیں خوف زدہ کر دیا لیکن اسے یہ توقع بالکل نہیں تھی کہ اس ڈرامے کا انجام اتنا ہول ناک اور الم ناک ہوگا۔ بہرحال کاشف کو اپنے کیے کی سزا مل گئی تھی اور لعل ماسٹر بھی آخرکار اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ جب اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ تو ملٹری پولیس والوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کے سب آناً فاناً اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

جب وہ خاموش ہوئے، تو میں بے اختیار بول اٹھا۔

''لیکن وہ مردہ چیتا قبر میں کہاں سے آ گیا تھا؟''

''وہ طلحہ کا خیال تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تحقیقاتی مرکز میں ایک چیتا بیمار ہو کر مر گیا تھا۔ طلحہ کو یقین تھا کہ تم میری قبر ضرور کھودو گے اسی لیے اس نے چیتے کی لاش وہاں دفن کرا دی تھی۔''

یوں تمام پُراسرار واقعات کی حقیقت سامنے آ گئی۔

مجھے تندرست ہونے میں تین ماہ لگ گئے۔ ضروری قانونی کارروائی کے بعد پولیس نے شرجیل کی ضمانت پر مجھے چھوڑ دیا۔ شرجیل نے نہ صرف مجھے معاف کر دیا بلکہ ہر طرح سے میرا خیال بھی رکھا۔ آج ہم پھر تین دوست ہیں۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ کاشف کی کمی طلحہ نے پوری کر دی تھی لیکن پھر بھی ماضی کی تلخ یادیں کبھی کبھی مجھے بہت بے چین کر دیتی ہیں۔

جناب مدیراعلیٰ
السلام علیکم
بعض واقعات ایسے انوکھے ہوتے ہیں کہ ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن رونما تو ہوئے ہیں اس لیے جھٹلا بھی نہیں سکتا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہوا ہے کچھ تو حالات کی ستم ظریفی اور کچھ میں نے اندازِ تحریر سے اسے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے، اُمید ہے قارئین پسند کریں گے۔
محمد عالمگیر
(کراچی)

روشن آرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''عالمگیر تم میری شادی میں آؤ گے نا۔''
''تمہاری شادی!'' میں نے چونک کر پوچھا۔
''میں سمجھا نہیں۔''
''ہو رہی ہے عالمگیر۔ میری شادی ہو رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور میں یہی بتانے کے لیے آئی تھی۔''
''سوال یہ ہے کہ تمہارے ابا نے تو کہا تھا کہ وہ

تمہاری شادی نہیں کریں گے۔ کم از کم اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک تمہاری اماں مرحومہ کی قبر کی مٹی نہ سوکھ جائے۔'' میں غصے سے بولا۔

''ابا کو ان سب باتوں کی کیا پروا۔ شاید انہوں نے پنکھے جھل جھل کر اماں کی قبر کی مٹی سکھا دی ہے۔'' روشن آرا نے کہا۔ ''کم بخت دعائیں بھی تو پوری نہیں ہوتیں۔''

''کیا دعا مانگ لی تھی تم نے؟''

''یہی کہ خوب بارش ہوتی رہے اور قبر گیلی رہے۔''

''یہ بارش کا سیزن ہی نہیں ہے اور تمہاری اماں نے بھی تو مرتے وقت موسم کا خیال نہیں کیا۔''

''اب میری اماں کو تو برا مت کہو۔ یہ سوچو کہ میری شادی ہوگئی تو کیا ہوگا۔''

''میں یہ شادی ہونے ہی نہیں دوں گا۔''

''کیوں؟ کیا سلطان راہی بن جاؤ گے۔''

''نہیں تمہارے ابا سے مل کر ان سے درخواست کروں گا کہ وہ کچھ اور رک جائیں میری قسمت بدلنے والی ہے۔''

''یہ تو میں کب سے سن رہی ہوں۔''

''تو پھر ایک دفعہ اور سن لو میری قسمت واقعی بدلنے والی ہے۔ پہلے یہ بتاؤ تمہاری شادی کب ہو رہی ہے۔''

''ابا کا ارادہ دو مہینے بعد کا ہے۔'' روشن آرا نے بتایا۔

''تو پھر فکر ہی مت کرو ابھی بہت وقت ہے۔''

''سنو، تم ایسا کرو کہ اس عورت کو راستے سے ہٹا دو۔'' روشن آرا نے کہا۔

''کیا مطلب؟ کیا تمہاری شادی کسی عورت سے ہو رہی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''او خدا! تم کچھ ہی نہیں رہے۔ میں اس عورت کی بات کر رہی ہوں۔ جو ابا سے شادی کے لیے زور دے رہی ہے۔''

اس نے بتایا۔ ''اگر وہ راستے سے ہٹ جائے تو پھر ابا کو میری شادی کی اتنی جلدی نہیں ہوگی۔''

''ارے تم اپنے ابا کی نیچر نہیں جانتیں۔ خود دیکھ لو تمہاری اماں مرگئیں تو انہوں نے ان کی پروا نہیں کی۔ دوسری شادی کے لیے تیار ہوگئے اب وہ عورت راستے سے ہٹ بھی گئی تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ وہ دو چار مہینوں کے بعد کسی اور کو پکڑ لیں گے۔''

''تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے۔'' روشن آرا نے پوچھا۔

''مجھے اپنے ابا سے ایک بار ملنے دو۔ ان سے مل کر میں صورتِ حال بدل دوں گا۔ ان کو یقین دلا دوں گا کہ میں بہت جلد کروڑ پتی بننے والا ہوں۔''

''اگر اتنا ہی یقین ہے تو بھائی ایک بار اور مل کر دیکھ لو۔''

حالانکہ میں ایک بار پہلے روشن آرا کے ابا سے بے عزت ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود روشن آرا میرے لیے زندگی بنی ہوئی تھی اور اب وہی زندگی بتا رہی تھی کہ وہ کسی اور کی ہونے والی ہے۔ یہ ظلم ہے جج صاحب میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میرے ذہن میں محمد علی کے ڈائیلاگ گونجنے لگے تھے۔

میں دوسری ہی شام روشن آرا کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ابا نے مجھے دیکھتے ہی برا سا منہ بنا لیا تھا۔ ''تم پھر آگئے۔ اب کتنی بار منع کروں۔''

''انکل! میں اس بار اکیلا نہیں آیا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''اپنے ساتھ امام شرف الدین تبریزی کو بھی لے کر آیا ہوں۔''

''اچھا کسی امام کو لائے ہو روشن آرا سے نکاح پڑھوانے کے لیے۔'' وہ غرایا۔

''ارے نہیں انکل! امام شرف الدین تبریزی کے انتقال کو تو سو سال ہوگئے۔'' میں نے بتایا۔ ''آپ کی جنرل نالج کمزور ہے نا۔ اس لیے آپ امام صاحب کو نہیں جانتے۔''

''کیا بکواس کر رہا ہے۔'' روشن آرا کا ابا پھٹ پڑا تھا۔

''یہ بکواس نہیں ہے انکل سچائی ہے۔ امام شرف الدین تبریزی تحفہ خمسہ و جواہر سنہری کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔''

''ابے کیا پاگل تو نہیں ہوگیا۔ کون ہے یہ جواہر سنہری۔''

''انکل یہ کوئی آدمی نہیں بلکہ ایک مستند اور نادر

کتاب ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''یہ امام شرف الدین تبریزی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں سونا بنانے کا بالکل سولہ آنے سچ فارمولا بتایا گیا ہے۔''

''کیا؟'' روشن آرا کے ابا کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ کسی سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روشن آرا کا باپ بہت دنوں تک سونا بنانے کے چکر میں خوار ہوتا رہا ہے۔ میں نے یہ بتا کر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''یہ سب بکواس ہے۔'' اس کا لہجہ اب بالکل نرم ہو گیا تھا۔ ''کوئی سونا ونا نہیں بنتا۔''

''بنتا ہے انکل! امام صاحب سونا بنا بنا کر چنگیز خان کی بیویوں کو سپلائی کرتے تھے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا چلو مان لیا کہ اس کتاب سے سونا بنتا ہے لیکن تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔''

''انکل! میں پرسوں سے سونا بنانے کا پروگرام شروع کرنے والا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اُمید ہے کہ اس مہینے کے آخر تک چار پانچ کلو سونا بنا ہی لوں گا۔''

''تو پھر۔''

''پھر یہ ہے انکل کہ آپ روشن آرا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں تو ہم دونوں مل کر بہت دولت بنا سکتے ہیں۔''

''ہوں۔'' روشن آرا کے ابا نے ایک گہری ہنکاری لی۔ سوچتا رہا۔ پھر گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ''نہیں بھائی میں اب ان چکروں میں نہیں پڑنے والا۔ تم چاہے مہینے میں پچیس کلو سونا کیوں نہ بنا لو۔ میں روشن آرا کی شادی تم سے نہیں کرنے والا۔ میں نے اپنے شیخ صاحب سے وعدہ کر لیا ہے۔ روشن آرا کی شادی رمانسو ہی سے ہوگی۔''

''اور یہ رمانسو کون ہے انکل؟''

''ابے وہی جس سے روشن آرا کا رشتہ طے ہوا ہے۔''

''تو ان رشتے کے بیچ میں تم اپنے شیخ صاحب کو بیچ میں کیوں لا رہے ہو انکل؟''

''اس لیے کہ رمانسو ان ہی کا بیٹا ہے۔''

''تو یہ کہو نا انکل کہ اس پیری فقیری کے چکر میں تم بیٹی کو برباد کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ابے چپ، تجھے کیا معلوم کہ ان فقیروں کے درجے کیا ہوتے ہیں۔ اب اگر ان کی شان میں گستاخی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''اچھا انکل چھوڑو اس بات کو، تم یہ بتاؤ کیا میں اپنے رشتے کو انکار سمجھوں۔''

''تو اب انکار کیسے سمجھو گے کیا ڈنڈا اٹھا کر کھوپڑی پھاڑ دوں۔ تب سمجھو گے۔''

میں بور ہو کر واپس آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ سونا بنانے کا لالچ اس کو راہ راست پر لے آئے گا لیکن اس نے تو سونے کو ہی لفٹ نہیں دی تھی۔

پھر روشن آرا جب ملی تو میں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ ''نہیں روشن آرا تمہارا باپ ایک نمبر کا دوسرے درجے کا انسان ہے۔ وہ میری بات سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔''

''میں نے کہا تھا ناں کہ وہ ہر حال میں رمانسو سے میری شادی کر دیں گے۔''

''لیکن میں کسی بھی حال میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''سلطان راہی کی قسم، میں یہ شادی رکوا کے ہی رہوں گا۔''

''بڑی۔ بڑی باتیں مت کرو، کچھ سوچو۔'' اس نے بتایا۔ ''بابا نے تو شادی کی تاریخ بھی طے کر دی ہے۔''

''کب ہے شادی؟''

''اٹھائیس تاریخ کو انجمن ہال میں۔ وہ ہال تو دیکھا ہی ہوگا تم نے؟''

''ہاں گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ شادی ہالوں کے جمعہ بازار میں ہے۔''

''ہاں وہی۔ عالمگیر میں تمہارے بغیر بہت اداس رہوں گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ رمانسو پیسے والا آدمی ہے لیکن تم یقین کرو اس کی شاندار گاڑی میں اس کے ساتھ جاتے ہوئے بھی تم ہی کو یاد کروں گی۔ بنکاک میں بھی تم بہت یاد آؤ گے۔''

''اب یہ بنکاک کہاں سے بیچ میں آ گیا۔''

''رمانسو نے ایک بار مجھے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا شادی کے بعد ہنی مون کے لیے بنکاک جائیں گے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں اسے کراچی ائرپورٹ سے نہیں نکلنے دوں گا۔ بنکاک تو بہت دور کی بات ہے۔''

روشن آرا اس وقت مطمئن ہو کر چلی گئی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس شادی کو کیسے رکواؤں۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ روشن آرا کے ہونے والے شوہر شیخ صاحب سے ملاقات کر کے دیکھ لوں۔ ٹرائی کرنے میں کیا حرج تھا۔

میں نے اپنے گھٹیا سے موبائل سے روشن آرا کے قیمتی موبائل پر فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر خوش ہوگئی تھی۔ ”عالمگیر میں جانتی تھی کہ تم کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوگے۔ بتاؤ کیا راستہ نکلا۔“

”روشن آرا میں راستے ہی کی تلاش میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم یہ بتاؤ تمہارے رمانسو کے باپ شیخ صاحب کا کیا نام ہے اور وہ کہاں ملتے ہیں۔“

”ان کا نام شیخ گھسیٹا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”شیخ گھسیٹا، یہ کیسا نام ہوا۔“

”سنا ہے کہ بہت منتوں کے بعد پیدا ہوئے تھے اور جب پیدا ہوئے تو منت پوری کرنے کے لیے انہیں ایک ٹوکری میں رکھ کر بہت دنوں تک گھسیٹا گیا تھا۔ اس لیے وہ شیخ گھسیٹا ہوگئے۔ تم یہ بھی تو دیکھو کہ ان کے بیٹے کا نام رمانسو ہے۔ یہ بھی تو کوئی نام نہیں ہوا۔“

”ہاں یہ تو ہے۔ اب ان کا آستانہ بھی بتادو۔“

”گلشن چار نمبر پر جا کر کسی سے پوچھ لو سب بتا دیں گے۔“ روشن آرا نے کہا۔

واقعی جب میں نے چار نمبر میں جا کر معلوم کیا تو فوراً ہی پتا چل گیا۔ شیخ گھسیٹا کا آستانہ اچھا خاصا بڑا اور خوب صورت مکان ثابت ہوا تھا۔

وہاں ایک عدد گیٹ بھی تھا۔ جس کے برابر میں ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں بیٹھا ہوا ایک شخص آنے جانے والوں سے حساب کتاب لے رہا تھا۔

”ہاں بھائی، کس سلسلے میں آئے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”بھائی، شیخ صاحب اللہ والے لوگ ہیں۔ ان سے ملنے پر پابندی تو نہیں ہونی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”ایسے لوگوں کا در بار تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ چاہے جو بھی آئے۔“

”بالکل ٹھیک کہتے ہو لیکن حضرت سے تمہاری ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ کیوں کہ وہ حج پر گئے ہوئے ہیں۔“

”حج پر!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ حج کا کون سا سیزن ہے۔ عمرے پر گئے ہوں گے۔“

”نہیں حج پر۔“ اس نے پھر دہرایا۔ ”حضرت جب بھی دو تین تازہ بیواؤں کو اپنے ساتھ عمرے پر لے جاتے ہیں وہ اسے حج ہی سمجھتے ہیں۔“

”اچھا سمجھ گیا تو خاندان کی جو رشتے دار خواتین بیوہ ہوجاتی ہوں گی انہیں لے جاتے ہوں گے۔“

”ارے نہیں بھائی۔ ان کی عقیدت مند خواتین۔“ اس نے بتایا۔

”لیکن وہ تو نامحرم ہوتی ہوں گی۔“

”بحث کیوں کر رہا ہے بھائی۔“ اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ ”کیا تجھے اتنا بھی نہیں معلوم کہ یہ پہنچے ہوئے لوگ ہوتے ہیں ان کے پاس محرم نامحرم کا فرق ختم ہوجاتا ہے۔“

”واپس کب آئیں گے۔“

”کیا اتنا ہی ضروری کام ہے۔“

”ہاں بھائی بہت ہی ضروری ہے۔“

”وہ اٹھائیس تاریخ کو آئیں گے۔“

مجھے یاد آگیا کہ روشن آرا نے یہ بتایا تھا کہ شادی کی تاریخ اٹھائیس مقرر ہوئی ہے۔ یعنی یہ حضرت اپنے بیٹے کی شادی کے دن ہی واپس آنے والے تھے۔ یعنی اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا اور ویسے بھی میرے ذہن میں کوئی خاص پلاننگ بھی نہیں تھی۔

اب میرے لیے یہی رہ گیا تھا کہ میں بالے، لالے اور کالے کی خدمات حاصل کروں۔ یہ تینوں ایک نمبر کے بدمعاش تھے۔

تینوں بھائی تھے لیکن وارداتیں ایک ساتھ ہی کیا کرتے۔ سب سے بڑا بالا تھا۔ اس کے بعد لالے اور کالے۔ تینوں مجھ سے بہت بے تکلف تھے اور میرا لحاظ کیا کرتے۔ اسی لیے میں اپنی پرابلم لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ”یار کسی طرح اس شادی کو رکوانا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”زندگی میں پہلی بار ایک محبت ملی وہ بھی ہاتھ سے جا رہی ہے۔“

”تو فکر ہی مت کر میرے یار ہم کس لیے ہیں۔ تیرے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔“ بالے نے مجھے چپکی

دی۔

"ہم اس سالے رمانسو کو اٹھا کر لے آئیں گے۔" لالے نے کہا۔

"یارو ایک بات ہے اگر تمہارا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تو اس کا نام سالے ہی ہوتا۔"

"ابے ایک تو تیری محبت ہاتھ سے جا رہی ہے اور تجھے قافیہ ملانے کی سوجھی ہے۔"

"تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کروں۔"

"اغوا کر لے اس رمانسو کو اور جب شادی کی تاریخ گزر جائے تو پھر چھوڑ دینا۔" کالے نے کہا۔

"یار ایک آئیڈیا ہے۔" لالے نے کہا۔

"وہ کیا ہے۔"

"عین اس وقت اٹھالیں گے جب وہ نکاح کے لیے بیٹھا ہوگا۔"

"کیا پاگل ہوگئے ہو؟ ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔"

"اس کی فکر ہی مت کر۔ میرے غنڈے اسے اٹھا کر لے آئیں گے۔" کالے نے کہا۔ "ابے ہم لوگوں نے ایسے کاموں میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔ جب اس کی کمر سے پستول لگا دیا جائے گا تو اس کا باپ بھی وہی کرے گا جو ہم کہیں گے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے وہی کرو۔" میں نے سگنل دے دیا۔

"اب یہ بتاؤ کہاں ہے شادی! کب ہو رہی ہے؟" لالے نے پوچھا۔

"اٹھائیس تاریخ کو۔ انجمن ہال میں۔ دیکھا ہوا ہے ناں؟"

"ہاں ہاں دیکھا ہوا ہے۔ ہماری بہن کی شادی بھی وہیں ہوئی تھی۔"

"لیکن اسے رکھیں گے کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی بھی فکر مت کرو۔ ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ صبح ہوتے ہی اسے چھوڑ دیں گے۔ اپنے پاس ایسے کاموں کے لیے ایک زبردست ٹھکانا بھی ہے۔"

"بلکہ ایسا کرو۔ ہمارے ساتھ چل کر وہ ٹھکانا دیکھ لو۔" کالے نے کہا۔ "اور انتیس کی صبح وہیں

جان شیر خان

اسکواش کے عالمی چیمپئن۔ وہ نواں کلی (پشاور) میں بہادر خاں کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل اسکول پشاور کینٹ سے حاصل کی، اس کے بعد میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر 1 پشاور سے پاس کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکواش کا کھیل بھی جاری رکھا کیوں کہ اسکواش ان کا خاندانی کھیل ہے۔ ان کے بڑے بھائی محب اللہ خان ورلڈ ماسٹر چیمپئن کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں اور دنیا کے بہت سے اسکواش کے اعزازات لے چکے ہیں۔ دوسرے بھائی اطلس خان نے بھی اس کھیل میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ جان شیر خان نے پہلا انٹرنیشنل ٹورنامنٹ ورلڈ جونیئر اسکواش چیمپئن شپ 1985ء میں آسٹریلیا کے شہر برزبن میں جیتا، اس سے پہلے وہ 1984ء میں پاکستانی ٹیم میں شامل ہو کر ملائیشیا بھی گئے جہاں انہوں نے ایشین اسکواش چیمپئن کا اعزاز حاصل کیا۔ 1986ء میں سترہ سال کی عمر میں سنگاپور میں اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیت کر یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں صرف ایک ہی چیمپئن یعنی جان شیر خان موجود ہے۔ ہانگ کانگ اوپن میں اسکواش کے سابق عالمی چیمپئن جہانگیر خان کو 0-3 سے ہرا کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ازاں بعد انہوں نے جہانگیر خان کو پاکستان اوپن، ورلڈ اوپن، یو ایس اوپن، الفلاح اوپن اور دیگر ٹورنامنٹس میں شکست دی۔ 1987ء میں ان کی خدمات کے صلے میں صدر پاکستان نے پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔ 1992ء تک انہوں نے پانچ مرتبہ ورلڈ اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیتیں۔ 1992ء میں صدر غلام اسحاق خاں نے برٹش اوپن کا اعزاز حاصل کرنے پر گولڈ میڈل دیا۔ جب کہ وزیراعظم میاں نواز شریف کی طرف سے ایک لاکھ روپے اور اسلام آباد میں ایک کنال رقبے پر مشتمل پلاٹ بھی دیا گیا۔

مرسلہ: عطیہ زہرا۔ جہلم

آجانا۔"
"تمہارا پنچھی امانت کے طور پر ہمارے پاس ہی ہوگا۔ پھر تمہاری مرضی۔ تم جو چاہو کرو۔"
میں نے ان تینوں کے ساتھ جا کر وہ جگہ بھی دیکھ لی۔ بہت ہی محفوظ قسم کا ٹھکانا بنا رکھا تھا تینوں نے۔
میں نے جب ان تینوں سے اس کے لیے پیسوں کی بات کرنی چاہی تو وہ ناراض ہو گئے۔ لالے نے کہا۔ "یار تم نے ہم پر بھروسا نہیں کیا بس یہ سمجھ لیا کہ ہم صرف پیسوں کے لیے کام کرتے ہیں۔"
"ارے نہیں بھائی۔ میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔ تم لوگ اتنی محنت کرو گے۔"
"اوّل تو اس میں محنت کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" کالے نے کہا۔ "اگر تمہارا اتنا ہی دل چاہ رہا ہے تو واردات کی خوشی میں مٹھائی کے دس ہزار دے دینا۔"
"ہاں وہ میں ضرور دے دوں گا۔"
"بس اب جاؤ اور بے فکر ہو جاؤ۔"
اور میں بے فکر ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کام ضرور ہو جائے گا۔ یہ تینوں اس رمانسو کو ضرور اٹھا لائیں گے اور روشن آرا سے اس کی شادی کا خواب بھی پورا نہیں ہوگا۔
اس کے بعد اٹھائیس تاریخ تک کچھ بھی نہیں ہوا اور صرف ایک بار روشن آرا کا فون آیا تھا۔ وہ بہت اداس تھی۔ میں نے بھی اس سے زیادہ بات نہیں کی کام ہونے کے بعد ہی بات کرنی تھی۔
اٹھائیس تاریخ بھی آ ہی گئی۔
اور رات ساڑھے بارہ بجے لالے کا فون آ گیا۔
"مبارک ہو تمہارے مال کی ڈلیوری ہو گئی ہے۔ کل صبح پارسل لینے کے لیے آجانا۔"
وہ مارا میں اچھل پڑا، کام ہو گیا تھا۔ وہ تینوں رمانسو کو اٹھا کر لے آئے تھے۔ اب وہ تینوں کے ٹھکانے پر سہاگ رات کا غم منا رہا تھا۔
میں نے دس ہزار کا بندوبست کر کے رکھ لیا تھا۔
بہر حال جیسے تیسے رات گزاری اور صبح ہی ان تینوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔
وہ تینوں اس وقت ناشتا کر رہے تھے۔ "آؤ میری جان آؤ۔ تمہارا ہی انتظار تھا۔"
"کہاں ہے دولہے میاں؟"
"وہ برابر والے کمرے میں۔" کالے نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔
میں نے دس ہزار نکال کر لالے کو دے دیئے۔
"یہ لو یار مٹھائی کے پیسے۔"
دوسرے کمرے میں پہنچا تو رمانسو چارپائی پر پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ واقعی رمانسو ہی تھا، لمبا چوڑا، سیاہ فام۔ پتا نہیں یہ تینوں اس پر کیسے قابو پا سکیں ہوں گے۔
وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ "کیا بات ہے تم لوگ مجھے کیوں اٹھا کر لائے ہو۔ کیا بگاڑا ہے میں نے۔ میں تو تم کو جانتا بھی نہیں ہوں۔"
"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں روشن آرا کو ضرور جانتا ہوں۔"
"کون روشن آرا۔"
"وہی جس سے تمہاری شادی ہونے والی تھی۔ شیخ گھسیٹے کی بیٹی۔"
"کیا پاگل ہو گئے ہو، جس سے میری شادی ہونے والی تھی اس کا نام تو سلمیٰ ہے۔ ماسٹر ندیم کی بیٹی۔"
"کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا تمہاری شادی انجمن ہال میں نہیں ہو رہی تھی۔"
"ہاں ہاں وہیں ہو رہی تھی۔" پھر خود ہی ہنسنے لگا۔ "یار لگتا ہے تمہارے بندوں نے غلط آدمی پر ہاتھ ڈال دیا۔ بھائی انجمن ہال تین ہیں۔ اے، بی اور سی۔ میری شادی سی میں تھی۔ ہو سکتا ہے تمہاری روشن آرا کی شادی اے یا بی میں ہو۔ خوامخواہ مجھے اٹھا کر لے آئے ہو۔"
اب روشن آرا سے کیا معلوم کرنا تھا۔ کیوں کہ خود اس نے فون کر کے بتایا تھا۔ "عالمگیر! میں رمانسو کے ساتھ بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ وہ واقعی ایک رمانسو قسم کی شخصیت ہے۔ پلیز مجھے بھولنے کی کوشش کرنا۔"
اس کے بعد جو کچھ ہوا ہوگا وہ آپ چشمِ تصور سے دیکھ ہی سکتے ہیں۔

ٹھوکر

ڈیئر ایڈیٹر

آداب

میری مادری زبان اردو نہیں لیکن مجھے بیگم زمانی نے اردو لکھنا پڑھنا سکھایا ہے پھر بھی لکھنے میں دقت ہوتی ہے، ہاں روانی سے پڑھ لیتی ہوں۔ بیگم زمانی کے ہاں سرگزشت آتا ہے۔ میں بھی پڑھتی ہوں۔ شاید کسی کو میری زندگی کے اوراق پسند آجائیں اس خیال سے پہلے انگلش میں پھر اردو میں لکھی اور آپ کو بھیج رہی ہوں۔

جولیا جون

(مانچسٹر۔یو کے)

اپنی بپتا سنانے سے پہلے میں یہ بتادوں کہ اردو میری مادری زبان نہیں ہے اور نہ میں پاکستانی ہوں۔ مجھے اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا ایک ہمدرد خاتون نے سکھایا۔ میں کون ہوں یہ بتانے کے لیے مجھے اپنی پوری کہانی سنانی پڑے گی۔ ان دنوں ہم لوگ برطانیہ کے ایک قصباتی علاقے میں رہتے تھے۔ اس کاؤنٹی میں میرا اسکول بھی تھا جہاں میں پڑھتی تھی۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچی تو ایک لڑکے جون سے میری دوستی ہوگئی جو مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے اب

بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ ان دنوں میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ موٹی تھی۔ اس موٹاپے کی وجہ سے لڑکیاں میرا مذاق اڑاتی تھیں اور عجیب عجیب ناموں سے پکارتی تھیں۔

میں ان کی باتیں سن کر اداس ہو جاتی اور کبھی کبھی رونے لگتی تھی۔ ایسے میں جون مجھے بڑا سہارا دیتا تھا۔ کبھی چڑھانے والی لڑکیوں کو ستانے سے منع کرتا، کبھی مجھے سمجھاتا اور دلاسہ دیتا۔ چڑھانے والی لڑکیاں اس سے کہتیں۔ ''وہ تمہاری کیا لگتی ہے کہ تم اس کی حمایت کرتے ہو؟''

''وہی جو تمہاری لگتی ہے۔ یعنی کلاس میٹ، ہم جماعت۔''

وہ مجھ کو سمجھاتا تھا کہ ان کی باتوں پر کیوں دھیان دیتی ہو، انہیں بھونکنے دو، بکواس کرنے دو۔

میں اس سے کہتی۔ ''دیکھو نا جون! اگر میں تھوڑی موٹی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور؟ مجھے تو گاڈ نے بنایا ہے پھر وہ میرا مذاق کیوں اڑاتی ہیں؟''

''یسوع مسیح کا کہنا ہے۔'' جون کہتا۔ ''کسی کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ وہ تو سب کو خوش رکھنے کا درس دیتے تھے۔ یہاں تک کہتے تھے کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو اس کی خوشنودی کے لیے اپنا دوسرا گال بھی بڑھا دو۔''

''یسوع مسیح کی ایسی اچھی اور پیاری پیاری باتیں ہم لوگ بھول گئے ہیں اس لیے تو اس حال کو پہنچ گئے ہیں۔'' میں اپنا خیال پیش کرتی۔

جون نے ایک سچے دوست کی حیثیت سے میرا بڑا ساتھ دیا۔ اس کے کہنے پر میں شریر لڑکیوں اور لڑکوں کی چھیڑ خانی پر توجہ کم دینے لگی۔ اسکول میں ہم دونوں ساتھ ہی بیٹھتے تھے اور اسکول کے بعد بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ مجھے چاکلیٹ، ٹافی بسکٹ کھلاتا اور کولڈ ڈرنکس پلواتا تھا۔ میں اپنے گھر سے لائے ہوئے ٹفن میں اسے ضرور شریک کرتی تھی۔

ایک دن چھٹی کے بعد ٹہلتے ہوئے ہم جا رہے تھے کہ اس نے دو آئس کریم خریدیں ایک مجھے دی اور ایک خود کھانے لگا۔ اس نے تو جلد ہی اپنی آئس کریم چٹ کرلی۔ میں مزہ لے لے کر کھاتی رہی۔ ذرا دیر بعد وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''کیوں تم مجھے دیکھ کر اس طرح کیوں ہنس رہے ہو؟''

''میرے پاس کوئی آئینہ ہوتا تو میں تمہیں تمہارا چہرہ دکھاتا۔''

''کیوں کیا ہوا میرے چہرے کو؟''

''تمہارا چہرہ، چہرہ کم اور آئس کریم زیادہ ہو گیا ہے۔''

میں نے ایک لمحہ کے لیے اس مضحکہ خیز پوزیشن کے بارے میں سوچا پھر اس سے کہا۔

''تم تو بہت خراب لڑکے ہو، میرا تماشا دیکھ کر ہنس رہے ہو تم سے یہ نہیں ہوا کہ میرا چہرہ صاف کر دیتے۔ مجھے تو نظر نہیں آ رہا ہے کہاں کہاں آئس کریم لگی ہے۔''

پہلے تو وہ مزید مسکرایا پھر میرے قریب آ کر میرے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں کے کٹورے میں بھر کر بغور دیکھنے لگا اور پھر بہک گیا۔

مجھے پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن جب آیا تو میں بھی اس جرم میں شریک ہو چکی تھی۔

اس سے پہلے ہم دونوں نے کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی شاید غیر ارادی طور پر یہ مرحلہ آ گیا تھا اور آیا تو ایسا آیا کہ پھر واپس نہیں گیا۔ ہمیں ان دنوں اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہ بہت خطرناک کھیل ہے۔ ہم جیسی کچی عمر کے لڑکی لڑکے کے لیے تو سراسر غلط اور نقصان دہ ہے۔ اب سوچتی ہوں کہ ہم کیسے انگاروں سے کھیل رہے تھے جس کا ہمیں انتہائی زبردست خمیازہ بھگتنا پڑا، پھر ایک دن ہم دونوں اس حد سے گزر گئے جس کی حد بندی ہمیں بہر حال کرنی چاہیے تھی۔ اس کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہمیں اپنی اس غلطی اور اس بھول پر کوئی پچھتاوا، کوئی ندامت کا احساس نہیں ہوا۔ یہ نیا تجربہ ہمارے لیے ایک نئی تفریح اور انجانے سفر ثابت ہوا اور انجام سے بے خبر ہم اس کی لذتوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ ہم اس وقت خواب خرگوش سے چونکے جب... وقت ہاتھ سے نکل گیا۔

اسکول گئی تو جون نے کہا۔ ''آج تم کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟''

''کچھ نہیں، بہت زیادہ پریشان ہوں۔''

میری بات سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا اور پریشانی کی وجہ معلوم کرنا چاہی۔

''ابھی نہیں، چھٹی کے بعد بتاؤں گی۔'' میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

آج وقت بھی کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ بہر حال جب چھٹی ہوئی اور ہم اپنے مخصوص لو اسپاٹ پر پہنچے تو میرے کچھ بتانے سے پہلے جون بول پڑا۔ ''کیا پاپا نے ڈانٹا ہے؟ ممی نے مارا ہے؟''

''نہیں جون! ایسی کوئی بات نہیں۔''
''پھر کیا بات ہے؟''
''بات یہ ہے کہ...... میں...... میں......''
''میں پریگنینٹ ہوگئی ہوں۔''
''نہیں......!'' وہ چیخنے کے انداز میں بولا۔
''ہاں جون یہ حقیقت ہے۔ ایک بھیانک حقیقت۔''
''مگر...... مگر یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟''
''مجھے کون بتائے گا؟ میں خود بتا رہی ہوں نا۔''
''تم بتا رہی ہو......!'' اس نے بے چینی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''مگر تم کو کیسے معلوم ہوا؟''
''ایسے معلوم ہوا جیسے ہر لڑکی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پریگنینٹ ہوگئی ہے۔''
''اچھا!''
اس کے بعد وہ اور کچھ نہیں بولا۔ اس پر میں خود بولی۔
''اب بتاؤ میں کیا کروں؟''
''مجھے تو اس بات کا کوئی تجربہ نہیں۔'' اس نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا۔ ''میں کیا بتاؤں؟ تم ہی بتاؤ تمہارے خیال میں تمہیں کیا کرنا چاہیے؟''
''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اس معاملے میں بہت تجربہ کار ہوں۔''
اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا بدستور بے قراری کے عالم میں ٹہلتا رہا۔ البتہ اس کی پیشانی پر شکنیں نظر آرہی تھیں۔ میں یہ اندازہ نہیں لگا سکی کہ ان شکنوں کی وجہ کیا ہے۔ غصہ یا کچھ اور...... اگر غصہ ہے تو کس پر۔ مجھ پر یا اپنے آپ پر؟ ذرا دیر بعد میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''جون! تم بھی سوچو میں بھی سوچتی ہوں کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''
کئی دن گزر گئے مگر ہم دونوں اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہ کر سکے۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ آخر میں نے سوچا کسی اور سے مشورہ کرنا چاہیے مگر کس سے؟ اس بات پر بھی سوچتے ہوئے کئی دن بیت گئے۔ آخر مجھے سارا جونسن کا خیال آیا جو دور پار کے رشتے سے میری کزن ہوتی تھی اور میرڈ تھی۔ میں ایک دن اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر بولی۔
''ارے! اتنے دنوں بعد میں یاد کیسے آگئی؟''
''میں تم سے کچھ مشورہ کرنے آئی ہوں۔''
''وہی میں کہوں کہ آج کل تو بغیر کسی مقصد کے کوئی کسی سے ملتا نہیں۔''
یہ موقع اس کی باتوں سے برا ماننے کا نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''سارا ڈیئر! میں اپنی ایک پریشانی کا حل تم سے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔''
''پریشانی! کیسی پریشانی؟''
''میں پریگنینٹ ہوگئی ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں۔''
''پریگنینٹ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تمہاری شادی ہوگئی ہے؟ مگر تمہاری شادی کیسے ہوسکتی ہے؟ کسی صورت بھی تمہاری عمر 18 سال نہیں ہے۔''
''ہاں! میری عمر صرف 13 سال ہے۔''
''او مائی گاڈ! یہ تم نے اس ایج میں کیا کرلیا؟ وہ کون ہے؟''
''وہ میرا ایک کلاس فیلو ہے۔ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔''
سارا نے سر سے پاؤں تک مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر بے حد کھردرے لہجے میں بولی۔ ''شاید تمہارے جسم کی طرح تمہاری عقل بھی موٹی ہے۔ اس عمر میں تمہیں نہیں کرنا چاہیے تھا اور کیا بھی تھا تو...... تو تم دونوں کو احتیاطی تدابیر کرنا چاہیے تھی۔ جو لڑکیاں لڑکے شادی سے پہلے اس غلط راستے پر چلتے ہیں وہ ہر طرح کے پروٹیکشن سے کام لیتے ہیں۔''
''ہاں سارا! ہمیں پروٹیکشن سے کام لینا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ہمیں اس وقت خیال آیا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اب تو تم مشورہ دو۔ مجھے اس حالت میں کیا کرنا چاہیے؟''
اس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''تم نے آنٹی کو بتایا؟''
''نہیں ابھی کسی کو نہیں بتایا ہے۔''
''تو پھر پہلی فرصت میں انہیں بتاؤ۔ وہ تمہاری ممی ہیں۔ وہ جو فیصلہ کریں گی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔''
مجھے بڑی مایوسی ہوئی اس کے اس رویے سے۔ خود کوئی حل بتانے کی بجائے ممی سے ڈسکس کرنے کو کہہ دیا۔ واپس آکر کئی دنوں تک اس مخمصے میں رہی کہ ممی سے بات کروں یا نہ کروں؟ ممی کے غصے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتی تھیں۔ ان کے غصے ہی کا نتیجہ تھا کہ پاپا بھی ان سے الگ ہوگئے تھے۔
کئی دن بعد میں نے جون سے کہا۔ ''تم ہی اپنے گھر میں ہم دونوں کی غلطی کا ذکر کرو اور ان سے پوچھو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''
''پوچھا تھا۔''

"تو پھر انہوں نے کیا جواب دیا اور تم نے اس کا تذکرہ مجھ سے کیوں نہیں کیا؟"

"اس ڈر سے نہیں کیا کہ تمہیں دکھ ہوگا۔"

"گویا انہوں نے کوئی اچھا مشورہ نہیں دیا۔ کیا کہا انہوں نے؟"

"میری بات سن کر ممی پاپا ایک دم مشتعل ہوگئے۔ کہنے لگے ہم تمہیں پڑھنے کے لیے اسکول بھیجتے ہیں یا غلط کام کرنے؟ تمہارا یہ قصور نا قابلِ معافی ہے پھر بھی ہم تمہیں اس شرط پر معاف کرسکتے ہیں جب تم اس آوارہ لڑکی سے ملنا جلنا بالکل چھوڑ دو۔"

"مگر پاپا..... وہ جو..... وہ..... ہوگئی ہے....." میں نے احتجاج کیا تھا۔

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے دو۔" پاپا نے غصے سے کہا تھا۔

مجھے جون کی زبانی اس کے پاپا کی باتیں سن کر بڑا دکھ ہوا مگر میں نے اس سے اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ مجھے اس بات کا دھڑکا لگ گیا کہ کہیں ماں باپ کے کہنے پر یہ میرا ساتھ نہ چھوڑ دے۔

جون کے گھر والوں کی طرف سے مایوس ہوکر اب ایک ہی آسرا رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ میں اپنے گھر والوں سے اپنی مدد کی درخواست کروں مگر جب بھی کچھ کہنے کا ارادہ کرتی۔ مما کے غصے کا سوچ کر ہمت ہار جاتی۔ اس کشمکش میں کئی ماہ بیت گئے۔

ایک شام مجھے وومیٹنگ ہوئی اور میں بیسن پر جاکر الٹیاں کرنے لگی۔ ممی دوڑ کر میرے پاس آئیں اور میری پیٹھ سہلاتے ہوئے بولیں۔ "کیا الم غلم کھالیا تھا کہ بدہضمی ہوگئی؟"

جب الٹی بند ہوگئی تو میں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

"کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ یہ میری پریگنینسی کی وجہ سے....."

"کیا بکواس کررہی ہے۔ تجھے پتا بھی ہے تو کیا کہہ رہی ہے؟"

"بس مام! مجھے پتا ہے۔ یہ فیکٹ ہے کہ میں پریگنیٹ ہوں۔"

انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ ان کی پیشانی پر آہستہ آہستہ شکنیں ابھرنے لگی تھیں۔ پھر سوچنے کے انداز میں بولیں۔ "تو گویا تین چار مہینے کا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اب تک تو نے بتایا کیوں نہیں؟ چھپایا کیوں؟ اور کون تھا وہ ڈرٹی سوئین؟ جس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تو ایک چھوٹی عمر کی بچی ہے۔"

"مما! ڈر کے مارے نہیں بتایا تھا اور وہ میرا بوائے فرینڈ ہے۔"

"کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے؟"

"یہیں اسی کاؤنٹی میں رہتا ہے اور میرے ساتھ میری کلاس میں پڑھتا ہے۔"

"یعنی وہ بھی ابھی چھوٹا ہے؟"

"جی ہاں، مجھ سے ایک سال بڑا ہے۔"

اب وہ غصے سے بھوت بن گئی تھیں۔ "ہم تجھے تعلیم حاصل کرنے اسکول بھیجتے ہیں یا اپنی عمر سے بڑے لوگوں کے ساتھ کھیل کھیلنے؟" ان کے منہ کے ساتھ ان کے ہاتھ بھی چل رہے تھے۔ میرے بال نوچتے ہوئے وہ میرے دونوں گالوں پر تھپڑوں کی بارش بھی کرتی جارہی تھیں۔ "یہی سب کرنے اسکول جاتی ہے۔ چلو دوستی کی حد تک تو درست ہے کہ کلاس فیلو سے کی جائے مگر دوست کے ساتھ وہ سب کچھ کرگزرنا جس کا انجام اتنا شرمناک ہو۔ موٹی بھینس! تجھے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ تیری عمر ابھی یہ سب کرنے کی نہیں۔"

ان کے تھپڑوں سے میرے دونوں گال سن ہوگئے۔ جب وہ تھک کر چور ہوگئیں تو تھپڑوں کی بارش رکی۔ کچھ دیر تک روتے رہنے کے بعد میں نے کہا۔ "ممی! جو غلطی ہم سے ہونی تھی ہوگئی۔ اب آپ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ڈوب مرنا چاہیے۔ ہاں تجھ جیسی موٹی عقل کی لڑکی کے لیے یہی بہتر ہے کہ ڈوب مرے، جسے اپنے برے بھلے کی تمیز نہ ہو اس کے لیے یہی بہتر ہے کہ مرجائے۔"

میں کچھ دیر تک خاموش رہی، میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی چپکی بیٹھی رہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد میں نے ملتجی لہجے میں کہا۔ "ممی! بتائیے نا مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ابارشن۔" انہوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ کہا۔

میں ایک دم سناٹے میں آگئی۔ مجھے ممی سے ہرگز اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر چند لمحوں کے بعد بولیں۔ "کل میرے ساتھ چلنا، دیکھتی ہوں۔ کہیں اس کا کوئی بندوبست ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ مرحلہ کوئی آسان نہیں۔"

"نہیں ممی! آپ کا یہ پروپوزل مجھے پسند نہیں آیا۔ اپنے جرم کی سزا ہم اس ننھی سی جان کو کیوں دیں جو بے گناہ

ہے۔ کیوں اسے دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار دیں؟"
ممی کا وہ غصہ جو قدرے کم ہوگیا تھا۔ ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔
"تو پھر تو خود مرنے کے لیے تیار ہو جا۔" انہوں نے للکارتے ہوئے کہا۔ "میں تیری وجہ سے سوسائٹی میں تماشا نہیں بنوں گی۔"
"مگر مما! ہمارا معاشرہ ایسا بھی پس ماندہ نہیں۔ شادی کے بغیر بہت سی لڑکیاں ماں بن جاتی ہیں اس کے باوجود باعزت زندگی گزارتی ہیں۔"
"مگر وہ تیری طرح بچی نہیں ہوتیں۔ 18 سال سے زیادہ عمر کی ہوتی ہیں۔"
"آپ مجھے مارنا چاہتی ہیں تو مار دیجیے۔" میں تن کر کھڑی ہوگئی۔ "مجھے شوٹ کر دیجیے۔ میرا گلا دبا کر مار دیجیے یا میرے گلے پر چھری پھیر دیجیے۔"
انہیں شاید میرے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ لمحہ بھر کو رکیں، کچھ سوچا پھر بولیں۔ "میں تیری طرح موٹی عقل کی نہیں کہ تیرے خون میں ہاتھ رنگ کر قانون کی مجرم بن جاؤں۔"
اتنا کہہ کر وہ میری طرف جھپٹیں اور میرے کچھ کہنے سننے سے پہلے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دروازے تک لائیں اور دھکا دے کر باہر دھکیلتے ہوئے کہا۔ "جا دفع ہو جا اور ادھر پلٹ کر کبھی نہیں آنا۔ آج سے تو میرے لیے مر گئی۔" اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔
میرے سر پر بھی گویا بھوت سوار ہوگیا تھا۔ میں رکی نہیں، نہ ہی دروازہ کھولنے کی درخواست کی۔ چلتی رہی روتی رہی۔ جانے کتنی دیر تک اور کتنی دور تک چلی تھی کہ ایک کار میرے قریب آ کر رکی اور کھڑکی سے سر نکال کر کسی نے کہا۔
"پیدل چلنے کے لیے جب فٹ پاتھ موجود ہے تو بیچ سڑک پر کیوں چل رہی ہو؟"
میں نے چونک کر گاڑی کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی کوشش کی مگر میری آواز میری سسکیوں اور رونے کی وجہ سے گڈمڈ ہو کر رہ گئی۔ اگلے لمحے کار کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون میرے قریب آ کر کھڑی تھیں۔ "کیا ہوا ہے تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا کسی نے مارا ہے؟ یا کوئی اچکا تمہاری کوئی چیز چھین کر بھاگ گیا ہے؟"
جواب دینے کے لیے مجھے سنبھلنے میں دیر لگی تو وہ خود ہی بول پڑیں۔ "بیٹا! تمہیں گھر سے اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ آج کل یہاں اس کاؤنٹی میں بھی آوارہ گردلڑکے....."

"نہیں آنٹی!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔"
"پھر کیا بات ہے؟"
"میری ممی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔"
"مگر کیوں؟"
اب میں نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنی بپتا سنا دی۔ انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر بولیں۔ "تمہاری ممی کا غصہ بے جا نہیں ہے۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب تم کہاں جا رہی ہو؟ تمہارا کوئی عزیز رشتے دار ہے؟"
"جی نہیں۔"
"پھر کہاں جاؤ گی؟"
"پتا نہیں۔"
چند لمحوں تک وہ مجھے حیران و پریشان دیکھتی رہیں پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔ "چلو میرے ساتھ۔"
"کہاں؟"
"میرے گھر۔"
"نہیں آنٹی! جب میرے گھر کا دروازہ مجھ پر بند ہوگیا تو پھر میں کسی اور کے گھر کیوں جاؤں! میرے لیے تو اب مر جانا ہی بہتر ہے۔"
"پاگل پنے کی باتیں نہ کرو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اپنے لیے بھی اور اس ننھی سی جان کے لیے بھی جو تمہاری کوکھ میں موجود ہے۔"
یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرے مزید کچھ کہنے کا انتظار نہیں کیا۔ مجھے کھینچتی ہوئی گاڑی تک لائیں اور اپنی بازو والی سیٹ پر بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
ان کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر ان کے گھر کے لوگ حیران ہوئے۔ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں کون ہوں؟
بچوں کو تو انہوں نے یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ "یہ ہماری مہمان ہیں اب یہ ہم سب کے ساتھ ہی رہیں گی۔"
بڑوں کے درمیان بٹھا کر انہوں نے مجھ سے کہا۔ "سب سے پہلے تو تم یہ بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟"
"جولیا...... جولیا رابرٹ۔"
"اچھا جولیا! اب یہ بتاؤ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، جس نے تمہیں اس حال کو پہنچایا؟"
"وہ میرا ہم جماعت ہے، میرے ساتھ پڑھتا ہے،

اس کا نام جون ہے۔''
''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بھی ابھی ٹین ایجر ہے؟''
''وہ مجھ سے عمر میں ایک سال بڑا ہے، اس کی عمر 14 سال ہے۔''
''او مائی گاڈ!'' ایک انکل قسم کے مرد نے کہا۔ ''اس عمر میں تم دونوں کا یہ اقدام، اس ملک کے قانون کے مطابق بہت بڑا جرم ہے۔ 18 سال کی عمر سے پہلے کوئی شادی نہیں کر سکتا۔ کیا تم دونوں کو اس بات کی جانکاری نہیں تھی؟''
''جانکاری ہو گی بھی تو......'' میری بجائے آنٹی بول پڑیں۔ ''جذبات کی رو میں بہکنے والے ایسی باتوں کا کب خیال رکھتے ہیں۔'' اب وہ مجھے مخاطب کر کے بولیں۔
''جولیا! اب تم ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ رہو گی۔ اب ہم تمہارے معاملات کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور تم کوئی غلط بات سوچو گی نہ کوئی غلط قدم اٹھاؤ گی۔ مجھے آنٹی کہتی ہو تو آنٹی ہی سمجھنا۔''
آنٹی کی اس محبت پر میں ان سے لپٹ کر رونے لگی۔ آنٹی نے مجھے تسلی و تشفی دی۔ میری پیٹھ تھپتھپائی اور کہا۔ ''اب تمہیں کچھ سوچنے اور فکر کرنے کی ضرورت نہیں جو کچھ سوچنا ہے اور کرنا ہے، ہم کریں گے۔''
آنٹی کا نام مریم زمانی تھا۔ ان کا تعلق مسلم کمیونٹی سے تھا۔ ان کے ہسبنڈ ایس ایم زمان اس کاؤنٹی میں ایک طویل عرصے سے رہائش پذیر تھے اور کاروبار کرتے تھے۔
اگلے روز مریم آنٹی مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنی ایک جاننے والی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئیں۔ ڈاکٹر نے میرا بہت اچھی طرح معائنہ کیا۔ کچھ ٹیسٹ بھی لیے اور آنٹی سے کہا۔ ''کم عمری میں ماں بننے والی لڑکیوں کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب کہ بچہ بھی عام بچوں کے مقابلے میں بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس کی پرورش بھی بہت محتاط ہو کر کرنی پڑتی ہے۔''
گھر آ کر آنٹی بولیں۔ ''سنا تم نے ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھی؟''
''جی ہاں۔''
''تو اب تمہیں ہر قدم محتاط ہو کر اٹھانا چاہیے تاکہ تمہیں اور تمہارے ہونے والے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔''
آنٹی جس طرح اپنے بچوں کو چاہتی تھیں اسی طرح مجھ سے بھی پیار کا اظہار کرتی تھیں۔ ہر طرح میرا خیال رکھتی تھیں۔ ایک دن انکل زمان نے ان سے کہا۔ ''زمانی بیگم!
جولیا کو تم نے اپنے پاس رکھا ہے، اسے پروٹیکشن دیا ہے۔ یہ بہت اچھی بات ہے لیکن قانوناً کہیں یہ پولیس کیس نہ بن جائے؟''
''نہیں ایسا نہیں ہو گا۔'' آنٹی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''اور اگر اس کے پیرنٹس نے ہمارے خلاف کوئی مقدمہ بنانے کی کوشش کی تو جولیا ان کے الزام کو غلط ثابت کر دے گی۔''
آنٹی کے گھر آنے کے بعد سے میں اسکول نہیں جا رہی تھی اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری کتابیں اور یونیفارم تو میرے گھر ہی میں رہ گئے تھے۔ آنٹی مجھ سے بولیں۔
''پتا نہیں تمہاری گمشدگی کے بعد تمہارے گھر والوں نے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی یا نہیں؟ اسکول گئے یا تھانے جا کر رپورٹ لکھوائی یا نہیں؟''
''اسکول کے بارے میں تو معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔'' میں نے کہا۔
''کیسے؟''
''جون کے ذریعے۔''
''کیا جون کے گھر جا کر معلوم کرو گی؟''
''نہیں اس سے فون پر بات کر کے۔''
''تو پھر فون کر کے اسے یہاں بلا لو۔ یوں بھی اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی وجہ سے تم کس حال میں ہو۔'' انکل بولے۔ ''تھانے کے بارے میں، میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ کسی نے رپورٹ درج کرائی ہے یا نہیں۔''
جون کو میں نے فون کیا تو وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔ ''تم کیسی ہو، اسکول کیوں نہیں آ رہی ہو، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''
''میں گھر پر نہیں ہوں، ممی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔''
''نہیں!'' وہ بے یقینی کے عالم میں چیخا۔
''یہ حقیقت ہے جون۔''
''پھر تم کہاں ہو۔ خیریت سے تو ہو؟''
میں نے اسے آنٹی کے گھر کا پتا دیا اور یہاں آ کر ملنے کو کہا۔ اس نے شام کو آنے کا وعدہ کیا۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق شام کو پہنچا۔ بہت گھبرایا ہوا تھا۔
''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں نکالا تمہاری ممی نے تمہیں اپنے گھر سے۔ تم نے انہیں بتا دیا ہو گا کہ......''

"ہاں اسی پر تو ہنگامہ کھڑا ہوا۔ ان کے خیال میں میرا جرم معافی کے قابل نہیں ہے۔" اس کے بعد میں نے ساری باتیں بتا دیں اور کہا۔ "اگر آنٹی اس موقع پر مجھے سہارا نہ دیتیں تو پتا نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔ تم یہ بتاؤ اسکول میں میرے گھر سے کوئی آیا تھا؟"

"میرے خیال میں شاید کوئی نہیں آیا۔ میں نے تو یہی سمجھا کہ تمہاری طبیعت بگڑ گئی ہوگی۔ تمہاری ممی کے رویے پر بہت افسوس ہوا۔"

"مگر بیٹا!" آنٹی بول پڑیں۔ "ان کا غصہ ان کا رویہ بے جا نہیں۔ جولیا ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس چھوٹی عمر میں اس نے جو غلط قدم اٹھایا ہے وہ بہت بڑا جرم ہے۔ یورپ میں آزادی تو حاصل ہے مگر 18 سال کی عمر کے بعد۔ ابھی اس کی عمر 13 اور تمہاری صرف 14 برس ہے۔ اس عمر میں ایسا کچھ کرنا قابلِ سزا جرم ہے اور معاشرے میں بھی اسے انتہائی شرم ناک مانا جاتا ہے۔ پاکستان میں تو اس جرم پر ماں باپ اور عزیز و اقارب اپنے ہاتھوں سے دونوں کو مار دیتے ہیں اگرچہ وہاں شادی بیاہ کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں۔"

جون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔ ذرا دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا۔ تھوڑی دیر بعد آنٹی ہی کہہ رہی تھیں۔

"جون! موجودہ حالات میں تمہیں جولیا کا ساتھ دینا چاہیے۔ اگرچہ ہم ہر طرح اس کا خیال رکھتے ہیں لیکن اسے تمہاری رفاقت کی بھی ضرورت ہے۔ تم آتے جاتے رہو اور دونوں مل کر آنے والے ننھے مہمان کے مستقبل کے بارے میں بھی منصوبہ بندی کرتے رہو۔"

اور ایسا ہی ہوا۔ جون اکثر آنے لگا۔ وہ سب کے ساتھ مل بیٹھ کر بھی مجھ سے باتیں کرتا جب کہ آنٹی ہم دونوں کو تنہائی میں ملنے کا بھی موقع دیتیں۔ ایسے میں ہم ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے اور آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی بھی کرتے۔

"جون! تم مجھے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں بھاگو گے نا؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو جولیا!"

"دیکھو جان! اب مجھ سے زیادہ اس بے بی کو تمہاری ضرورت ہے۔" میں کہتی۔

وہ کہتا۔ "سوئیٹ بے بی! تم اطمینان رکھو تمہارا پاپا ہمیشہ تمہارے پاس رہے گا۔"

جون کے بارے میں مجھے جو ڈر خوف تھا کہ وہ مجھے اس حال میں چھوڑ کر بھاگ نہ جائے، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ روز بروز سنجیدہ ہوتا چلا گیا۔ اب اس نے چھٹی کے بعد چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم جاب کرنی شروع کر دی۔ ویک اینڈ میں اسے جو تنخواہ ملتی اس سے وہ ننھے منے کپڑے، کھلونے وغیرہ لا کر مجھے دیتا اور کچھ پیسے بھی میرے ہاتھ پر رکھتا۔ کبھی کبھی آنٹی کے بچوں کے لیے بھی چیزیں لے کر آتا۔ اس نے تو آنٹی کو بھی کچھ رقم میری خوراکی کے طور پر دینا چاہی تھی مگر آنٹی نے اسے ڈانٹ دیا۔

"جولیا میری بیٹی ہے، اس لیے میرے گھر میں ہے۔ فی الحال تمہیں اس کی لاجنگ بورڈنگ کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہاں تم ابھی بے بی کے لیے جو کچھ کر رہے ہو اس کے بارے میں، میں تمہیں روکوں گی نہیں۔"

وقت کو گزرنے میں دیر نہیں لگتی۔ آنٹی اکثر مجھے لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتیں اور معائنہ کرواکر اور دوائیاں وغیرہ لے کر آتیں۔ پھر ڈلیوری کا وقت بھی آ گیا۔ یہ مرحلہ بڑا مشکل تھا۔ جو آپریشن کے بغیر آسان نہیں ہوا۔ ننھی منی پری کو دیکھ کر میری ساری تکلیفیں دور ہو گئیں۔ اسپتال میں کئی دن گزار کر ہم آنٹی کے گھر آ گئے۔ آنٹی کے گھر میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنی حقیقی بیٹی کی ماں بننے کے بعد نانی بن گئی ہیں۔ جون بھی بہت خوش تھا۔ بیٹی کو گود میں لے کر دیر تک پیار کرتا رہتا۔

"دیکھو، کیسی عجیب بات ہے۔" میں نے جون سے کہا۔ "یہ لوگ میرے کچھ نہیں لگتے مگر کس قدر خوش ہیں۔ جو لوگ سب کچھ تھے انہوں نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی کہ زندہ بھی ہے یا مر گئی ہے۔ انہوں نے تو تھانے میں گمشدگی کی رپورٹ تک نہیں لکھوائی۔"

"تھانے والی بات کیسے معلوم ہوئی؟"

"انکل نے خفیہ طور پر معلومات حاصل کی تھیں۔"

"ایک دن جون نے مجھ سے پوچھا۔ "آنٹی اور کب تک تمہیں اپنے پاس رکھیں گی؟"

"ان کا کہنا ہے کہ جون جب تک اپنی تعلیم مکمل کر کے کوئی اچھی ملازمت نہیں کر لیتا اور تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کے قابل نہیں ہو جاتا ہم تمہیں اپنے ساتھ ہی رکھیں گے۔"

"یہ کیسے اچھے لوگ ہیں۔ غیر ہونے کے باوجود کتنے اپنے ہیں۔"

جون کے ساتھ یہ آسانی تھی کہ وہ اپنے گھر میں رہتا تھا اور اس کے ماں باپ اس کے تعلیمی اخراجات پورے کرتے

تھے۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کالج کے زمانے میں بھی وہ عارضی ملازمت کرتا رہا اور میری اور بے بی کی ضرورتیں پوری کرتا رہا۔

ہم دونوں کو اپنا الگ گھر بسانے کی بڑی تمنا تھی مگر آنٹی کا کہنا تھا کہ جب تم دونوں قانونی طور پر شادی کے قابل ہو جاؤ گے تب میں تمہیں باضابطہ دلہن بنا کر رخصت کروں گی۔ لہٰذا مجھے اپنے اٹھارہ سال کی عمر میں پہنچنے کا انتظار تھا جب جون 19 سال کا ہو جائے گا۔ آنٹی بڑی جہاندیدہ ہیں۔ اس لیے ہمارے جذبات و احساسات کا اندازہ لگاتے ہوئے انہوں نے ہمیں قربت کی اجازت دے دی تھی کہ اٹھارہ انیس سال کی عمر کو پہنچنے میں ابھی پانچ چھ سال باقی تھے۔ یوں بھی جب ہم ایک بچے کے ماں باپ تھے تو ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھنے کا جواز غیر منطقی تھا۔ بے بی ابھی ڈھائی سال کی ہی ہوئی تھی کہ ہمارا ایک بیٹا بھی پیدا ہو گیا۔

ایک دن میں نے انکل کو کہتے ہوئے سنا۔ ”بیگم زمانی! تمہارے گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ہمارے بچوں پر کیا اثر پڑے گا؟“

”میں نے بچوں کو پہلے ہی یہ بتا دیا تھا، سمجھا دیا تھا کہ جولی تمہاری بہن اور جون تمہارا بہنوئی ہے۔ دولہا بھائی ہے اور پھر یہ بھی سوچیں مسٹر زمان کہ جون کے پیروں میں تو زنجیر ڈالنے کی بھی ضرورت تھی اگر میں انہیں اس آزادی کی اجازت نہیں دیتی تو کیا اس کا امکان نہیں تھا کہ وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے جولیا سے دور ہو جاتا اور وہ...... کسی اور کا ہو جاتا؟“ آنٹی ذرا رکیں تو انکل بول پڑے۔

”زمانی بیگم تم تو بہت دور تک دیکھتی ہو۔ بہت دور کی سوچتی ہو۔“

”سوچنا پڑتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے زمانی صاحب! میں نے جولیا کو ایک بے سہارا لڑکی سمجھ کر سہارا دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں زندگی بھر اسے اپنے پاس رکھوں کیونکہ اس کا اصل اور حقیقی سہارا تو جون ہے۔ جس کے ساتھ اسے زندگی گزارنی ہے اس لیے اسی نے اس نادان اور کمسن لڑکی کو وقت سے بہت پہلے ماں بنا دیا ہے۔ آپ کو تو یہاں برطانیہ کے اس روش کا بخوبی علم ہے کہ یہاں کے بیشتر لڑکے اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ انہیں اپنی خواہشوں کا شکار بنانے کے بعد فرار ہو جاتے ہیں اور ان کے فریب میں پھنسنے والی لڑکیوں کو زندگی بھر خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔“

مجھے انکل اور آنٹی کی باتیں سن کر شدت سے احساس ہوا کہ ہم نے جو زبردست بھول اپنی کمسنی اور نادانی کی وجہ سے کی تھی اس کا کتنا گہرا اثر پڑا ہے اگر آنٹی اس کی گہرائی تک نہیں پہنچتیں تو میرا مستقبل بالکل تباہ ہو جاتا۔ میں کسی مستحکم سہارے کے بغیر زندگی کیسے گزارتی؟ میرے لیے جون کا ساتھ آنے والے دنوں کے لیے ضروری تھا اور میری پیاری بہت زیادہ پیاری اور دور اندیش آنٹی کی وجہ سے میری اس ضرورت کی تکمیل آخر کار ہو گئی۔

میری عمر 18 برس ہوتے ہی آنٹی نے میری اور جون کی شادی کروا دی۔ ہمارے مذہبی رسم و رواج اور عقیدے کے مطابق چرچ میں شادی کی رسم ادا کرا دی۔

اس وقت تک جون تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ آنٹی نے اس گھر کی ساری ضرورتیں اپنے خرچ سے پوری کر دی تھیں۔

اب میں خوش ہوں کہ ایک نیک اور ہمدرد خاتون کی وجہ سے میرا مستقبل تباہ ہونے سے بچ گیا۔ مجھے میری منزل مل گئی اور ناخوش بھی ہوں دکھی بھی ہوں کہ میرے دیکھے ہوئے خواب پورے نہ ہو سکے۔ میں ایک اچھی ڈانسر بننا چاہتی تھی۔ میں بہت زیادہ لکھنا پڑھنا چاہتی تھی مگر میری یہ خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔ میں اس بات پر بھی دکھی ہوتی ہوں کہ جون کو میرے اور دو بچوں کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ میں یہ سوچ کر بھی اکثر افسردہ ہو جاتی ہوں کہ دوسری بیویوں کی طرح معاشی طور پر اپنے شوہر کا ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔ اس کا بوجھ ہلکا نہیں کر سکتی۔ جون کے اس قدر محنت کرنے کے باوجود ہم اپنے بچوں کی تمام خواہشیں پوری نہیں کر سکتے۔ میں اکثر یہ بھی سوچتی ہوں کہ اگر اپنی کمسنی کے دور میں اتنی بڑی غلطی نہ کرتی تو اپنے پیرنٹس کے زیرِ سایہ رہ کر میرا مستقبل زیادہ شاندار ہوتا۔ آج میں زیادہ خوش حال زندگی بسر کر رہی ہوتی۔ کاش پاکستان جیسا معاشرہ ہمارا بھی ہوتا تو ہم بھی بہک نہیں پاتے۔

میں نے اپنی یہ کہانی اس لیے لکھی ہے کہ میری طرح دوسری لڑکیاں اپنی آنے والی زندگی کو مشکلات میں، خطرات میں نہ مبتلا کریں۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ خود ٹھوکر کھا کر گرنے سے بہتر ہے کہ دوسروں کو ٹھوکر کھا کر گرتے ہوئے دیکھ کر سنبھل کر اور احتیاط کے ساتھ چلنا سیکھیں۔ میری اس کہانی کا بھی یہی مقصد ہے۔

محترم مدیر
السلام علیکم
اشتہار دیکھا کہ آپ پُراسرار نمبر نکالنے والے ہیں۔ اسی مناسبت سے میں اپنی سہیلی شہناز کی داستانِ حیات لکھنے لگی کیونکہ اس داستان کی ایک کردار میں خود بھی ہوں۔ کہانی دلچسپ ہے اگر خاص نمبر کے معیار کی نہ ہو تو عام شمارے میں شامل کرلیں۔
حنا رئوف
(کراچی)

یہ پلاننگ ہم دونوں کی تھی۔
یعنی میری اور شہناز کی۔ بلکہ پوری پلاننگ اسی کی تھی۔
میں نے تو صرف اس کا ساتھ دیا تھا اور وہ بھی کسی خرابی یا کسی جرم کے لیے نہیں، بلکہ شہناز کی جان چھڑانے کے لیے۔
وہ میری، بہت اچھی دوست تھی۔
اور اب وہ نہ جانے کہاں ہے۔ میں نہیں جانتی۔
اس کے والدین اسے لے کر چلے گئے تھے۔ کہاں، یہ مجھے نہیں معلوم۔

اس کہانی کی ابتدا اس دن سے ہوتی ہے جب ایک شام شہناز کی کال آئی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں ہی تھی۔ جب میرے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ کال شہناز ہی کی تھی۔
''کیا ہوا میری جان؟'' میں نے پوچھا۔
''یار تو اس وقت میرے پاس آجا۔'' اس نے کہا۔
''خیریت تو ہے نا؟''
''خیریت ہی تو نہیں ہے۔ تم بس جلدی سے گھر

آجاؤ۔"

میں شہناز کے گھر پہنچ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھی۔ "ہاں بھائی کیا آفت آگئی تم پر۔" میں نے پوچھا۔

"کیوں کہ مجھے تو سب نارمل دکھائی دے رہا ہے۔"

"یار! نارمل اوروں کے لیے ہے۔ میرے لیے نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔

"ہوا کیا ہے؟"

"وہی کہانی پھر شروع ہوگئی ہے۔" اس نے کہا۔ "گھر والے امجد سے شادی کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔"

امجد، شہناز کا کزن تھا۔ میں بھی اس کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ایک نمبر کا فالتو انسان تھا۔ کئی لڑکیوں سے اس کے تعلقات تھے۔ اچھا خاصا بدنام شخص تھا۔ خوبی صرف یہ تھی کہ اس کے باپ کا اچھا خاصا بزنس تھا۔ پیسے والے لوگ تھے اور شہناز کے رشتے دار بھی ہوتے تھے۔

جب کہ شہناز ایک مختلف لڑکی تھی۔ لٹریچر سے دلچسپی رکھنے والی۔ نازک مزاج، خوب صورت، وہ گینڈا تو کسی طرح اس کے قابل نہیں تھا۔

"کیا ہوگیا ہے تمہارے گھر والوں کو، تم ان کو سمجھا تو چکی ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں لیکن ان کی سمجھ میں بات نہیں آرہی اور تم جانتی ہو کہ کاشان اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

میں کاشان کو بھی جانتی تھی وہ بالکل شہناز کے مزاج کا تھا۔ کھرا، پڑھا لکھا، نرم مزاج۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے پاس امجد جتنے پیسے نہیں تھے لیکن اسے آگے بڑھنے کی لگن تھی اور وہ آگے بڑھ سکتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہناز اور کاشان ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

"امجد کے گھر والے شادی کے لیے زور دے رہے ہیں۔" شہناز نے بتایا۔ "بلکہ ان کا خیال ہے کہ دو تین مہینوں میں شادی ہوجائے۔"

"تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے؟"

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا اس لیے تو مشورے کے لیے تم کو بلایا ہے۔"

"میں آنٹی سے بات کروں۔ ان کو سمجھاؤں۔" میں نے پوچھا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان کے سر پر بھوت سوار ہے۔" شہناز نے کہا۔ "انہیں امجد کے علاوہ کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔"

"تو پھر۔"

"پھر یہ کہ میں مختلف باتیں سوچ رہی ہوں۔ یہ مت سمجھ لینا کہ میں کاشان سے جاکر کورٹ میرج کرلوں گی نہیں یہ میرے مزاج اور میرے کردار کے خلاف ہوگا اور خود کاشان بھی ایسا نہیں چاہے گا۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ کاشان تمہیں پسند کرے گا۔"

"بس ایک راستہ رہ گیا ہے میرے پاس۔" اس نے پُراسرار انداز میں بتایا۔ "اس بارے میں تم سے مشورہ چاہیے تھا۔"

"کیسا راستہ۔"

"یہ آئیڈیا کل رات ہی میرے ذہن میں آیا ہے۔" اس نے کہا۔ "کل رات میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ایک ہارر موی دیکھ رہی تھی کہ یہ آئیڈیا آگیا۔"

"بتاؤ تو سہی کیسا آئیڈیا؟"

"کسی جن سے مدد لینے کا۔" اس نے بتایا۔

"کیا بکواس ہے۔ کوئی ڈھنگ کی بات کر۔"

"بہت زبردست پلاننگ ہے میری جان۔" اس نے کہا۔ "میری جو آنٹی ہیں، امجد کی اماں۔ وہ ایک نمبر کی وہمی عورت ہیں۔ جادو، ٹونے، چڑیل، بھوت اور جنوں وغیرہ پر یقین رکھتی ہیں۔ ہر جمعرات کو مختلف مزارات پر حاضری کے لیے جایا کرتی ہیں۔"

"یعنی وہ کمزور عقیدے کی عورت ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں بہت کمزور عقیدے کی۔"

"تو پھر تم کیا کروگی۔"

"ان کے اس کمزور عقیدے کا فائدہ اٹھانا ہے۔" اس نے کہا۔ "بس ایکٹنگ کرنی ہوگی۔ زوردار بھاری آواز بنا کر بولنا ہوگا۔ الٹی سیدھی حرکتیں کرنی ہوں گی۔ اس کے بعد کام بن جائے گا۔ اس عورت کو جیسے ہی یقین ہوجائے گا مجھ پر کسی جن یا بھوت نے قبضہ کرلیا ہے تو پھر وہ زندگی بھر ہمارے گھر کا رخ بھی نہیں کرے گی۔"

"ترکیب تو شاید کام آجائے لیکن اس میں ایک الجھن ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تم ہر وقت یہ ایکٹنگ کیسے کرتی رہوگی؟"

"پاگل ہو تم، اس قسم کے لوگ ہر وقت اس کنڈیشن میں نہیں رہتے۔ بس کبھی کبھی ان پر دورے پڑتے ہیں اور وہ جنونی ہو جاتے ہیں۔"

"کیا تم اس ڈرامے کو سنبھال لوگی۔"

"سو فیصد، تم خود دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔"

"اب اس میں ایک پہلو اور بھی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"سنا ہے کہ ایسے مریضوں کو کسی بابا وغیرہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو عورتوں اور لڑکیوں سے الٹی سیدھی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"ارے باباؤں کی ایسی کی تیسی۔" اس نے اپنی آستینیں اوپر چڑھالیں۔ "خوب مزہ آئے گا میں نے مارشل آرٹ کی ٹریننگ یوں ہی تو نہیں لی۔ بابا کے بھی ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو نے پکا ارادہ کر لیا ہے۔"

"بالکل پکا۔ لیکن میں یہ کام بڑی ہوشیاری کے ساتھ کروں گی۔" اس نے کہا۔ "یہ نہیں ہوگا کہ اچانک شروع ہو جاؤں۔ رہی آنٹی محترمہ تو وہ اگلے ہفتے منوڑہ کے مزار پر حاضری دینے کا ارادہ کر رہی ہیں اور ہم لوگوں کو بھی ساتھ لے جانے کا ارادہ ہے۔ میں وہاں جاؤں گی اور واپس آکر ایکٹنگ شروع۔"

"میرا خیال ہے کہ تیری یہ ترکیب کام آہی جائے گی۔"

"سو فی صد کیوں کہ صرف آنٹی ہی نہیں بلکہ پورا گھرانا وہمی ہے۔ اس قسم کی خرافات پر یقین رکھتا ہے۔ انور تو مجھے اس حال میں دیکھ کر دو میل دور سے بھاگ جائے گا۔"

دیر تک ہنستے رہے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد شہناز نے فون پر بتایا۔ "کام شروع ہو گیا ہے یار، ہم لوگ آج منوڑہ گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر میں کھوئی کھوئی رہنے لگی ہوں۔ خاموش رہنے کی اداکاری شروع کر دی ہے۔ کل تک دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔"

دوسری شام کو شہناز کی امی کا فون آگیا۔ وہ بے چاری بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ "بیٹی ذرا شہناز کو آکر دیکھ لو، کیا ہوا ہے اس کو۔"

"کیا ہوا ہے آنٹی؟"

"ہم سب کل منوڑہ گئے تھے۔" انہوں نے بتایا۔ "وہاں سے واپسی پر اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ تم آکر دیکھ لو۔ مشورہ دو بیٹا کہ ہم کیا کریں۔"

میں جب شہناز کے گھر پہنچی تو اس کی اداکاری اپنے عروج پر تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ کبھی ہنس رہی تھی۔ کبھی رو رہی تھی۔ کبھی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔

وہ موٹی اور بھدی آواز بنا بنا کر زور زور سے بولے جا رہی تھی۔ "میں دیکھ لوں گا سب کو۔ جلا کر خاک کر دوں گا۔ شہناز میری ہے۔ کوئی میرے راستے میں نہ آئے میں نے اس کو پسند کر لیا ہے۔"

پتا نہیں وہ کیا کیا بکواس کر رہی تھی۔

"بیٹا کیا ہو گیا ہے اس کو۔" شہناز کی امی سخت خوف زدہ ہو رہی تھیں۔ "کس کی نظر لگ گئی ہے۔ یہ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہے۔"

اس وقت میرے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو رہی تھی۔ کم بخت بلا کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

"آنٹی یہ کچھ خطرناک معاملہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دعا کریں اس کے لیے میں نے ایسے بہت سے واقعات دیکھ رکھے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

"اب بتاؤ بیٹا! ہم تو اس کی شادی طے کرنے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ یہ ہو گیا۔ خدا جانے کس کی نظر لگ گئی ہے اس کو۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا آنٹی۔" میں نے تسلی دی۔ "یہ کسی جھٹکے میں آگئی ہے ابھی اس کی شادی کا نہ سوچیں۔ پہلے اس کو ٹھیک ہونے دیں۔"

"ہاں بیٹا ایسی حالت میں کون اس سے شادی کرے گا۔"

آنٹی کچھ دیر بعد کمرے سے باہر چلی گئیں۔ شہناز نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ آنٹی کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اشارہ کیا کہ میں جلدی سے دروازہ بند کر دوں۔

میں نے دروازہ بند کیا اور وہ مجھ سے لپٹ کر بری طرح ہنسنے لگی۔ "ہاں اب بتاؤ کیسی رہی اداکاری؟"

"شاندار۔" میں نے اس کی تعریف کی۔ "تو ایک نمبر کی کمینی ہے۔"

"یار کیا کرتی، یہ لوگ تو پیچھے ہی پڑ گئے تھے۔" اس نے کہا۔ "جان عذاب میں گزر رہی تھی۔ میرے پاس تو اس کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔"

"میری جان یہ بتاؤ یہ ڈراما کب تک کرتی رہوگی۔"

"جب تک امجد سے جان نہیں چھوٹ جاتی۔"
"ایسا نہ ہو کہ تمہارے کاشان کو بھی پتا چل جائے کہ تم پر جن آنے لگے ہیں۔" میں نے کہا۔
"اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے اس کو اعتماد میں لے لیا ہے۔" شہناز نے بتایا۔
تیسرے دن شہناز کا پھر فون آگیا۔ "یار آجاؤ میرے پاس۔ ایک بہت زبردست بات ہوگئی ہے۔"
"کیا ہوگیا ہے۔"
"تم آؤ تو سہی۔" اس نے کہا۔ "ابھی صرف اتنا بتا رہی ہوں کہ دونوں ماں بیٹے آئے تھے۔ تم خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ ان کے آنے کے بعد کیا ہوا ہوگا۔"
یقیناً مزے کی بات ہوئی ہوگی۔ اس لیے میں بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔
وہ اپنے کمرے میں تھی۔ جب کہ اس کی امی لاؤنج میں تھیں۔ انہوں نے مجھے روک لیا تھا۔ "بیٹا کیا بتاؤں کہ کیا ہوا۔"
"کیا ہوا آنٹی۔"
"معاملہ اب بہت آگے بڑھ گیا ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "تم تو جانتی ہو کہ ہم نے امجد سے اس کا رشتہ طے کرلیا ہے۔"
"جی آنٹی، جانتی ہوں۔"
"کل امجد اور اس کی امی آئے ہوئے تھے۔ شہناز نے ان پر حملہ کردیا تھا۔"
"حملہ کردیا تھا!"
"ہاں بیٹی! وہ اپنی اسی جنونی کیفیت میں تھی۔ اس نے امجد کی امی کی گردن دبا دی تھی۔"
ایک بے ساختہ قہقہہ میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ شہناز نے تو انتہا ہی کردی تھی۔
"اس کے بعد کیا ہوا آنٹی۔" میں نے سنجیدہ صورت بنا کر پوچھا۔
"تم بتاؤ اس کے بعد کیا ہونا تھا۔ امجد کی امی ویسے ہی ڈرپوک اور وہمی قسم کی عورت ہیں۔ وہ توبہ کرتی ہوئی گھر سے بھاگ نکلیں۔"
"یہ تو بہت برا ہوا آنٹی۔" میں نے کہا۔ "وہ بے چاری رشتے کے لیے کب تک انتظار کریں گی۔"
"ارے بیٹا کہاں کا رشتہ، کیسا رشتہ وہ صاف انکار کر کے گئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ ایسی لڑکی سے کون شادی کرے جس کے اوپر جن آتے ہوں۔"
میں بری طرح ہنسنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے آنٹی سے کہا۔ "آنٹی میں ذرا دیکھ لوں اس کو۔"
"سنبھل کر جانا، ایسا نہ ہو تم پر بھی حملہ کردے۔"
"فکر نہ کریں۔ میں سنبھال لوں گی اس کو۔"
میں کمرے میں آئی تو شہناز دوسری طرف منہ کیے بیٹھی تھی۔
میری آہٹ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور خدا کی پناہ۔
کیا تھا وہ۔ اس کے چہرے کی کھال جگہ جگہ سے اس طرح سکڑی ہوئی تھی جیسے کسی نے اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا ہو اور آنکھیں جیسے اپنے حلقوں سے باہر آرہی تھیں اور اس کی آواز خدا کی پناہ وہ آواز اس کی تو نہ تھی۔ چاہے وہ لاکھ بن کر بولے وہ کوئی اور ہی تھا۔
"ہم لوگ اپنا مذاق اڑانے والوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں سمجھیں۔" پھر ایک وحشیانہ سا قہقہہ۔
مجھے صرف اتنا ہوش تھا کہ میں کس طرح اس کمرے سے باہر آئی تھی۔ بری طرح چیختی ہوئی۔ خوف کا ایسا بے پناہ احساس تو کبھی نہیں ہوا ہوگا۔
اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی سرخ آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں اور میں چیخ رہی تھی۔ رو رہی تھی۔ چلا رہی تھی۔
میرے پورے بدن میں بے شمار سوئیاں سی اتر گئی تھیں۔ میرا پورا بدن جل رہا تھا۔ کیوں کہ میں بھی اس پلاننگ میں شریک تھی۔ میں نے بھی شہناز کے ساتھ مل کر مذاق اڑایا تھا۔
اس بات کو کئی مہینے ہوگئے ہیں۔ ہاں کئی مہینے۔
شہناز کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی ہے۔ اس کو نہ جانے کہاں کہاں لے جاکر دکھایا گیا ہے۔ تعویذ گنڈے نہ جانے کیا کیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔
پہلے تو اس کا چہرہ ہی تڑخ رہا تھا اور اب اس کے ہاتھ اور پیروں کا بھی وہی حال ہوتا جارہا ہے۔ وہ انتہائی بدصورت ہوتی جارہی ہے اس کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے۔
اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میرے پورے بدن میں سوئیاں چبھتی رہتی ہیں۔ میں بھی کسی کام کی نہیں رہی ہوں اور یہ داستان میں ان لوگوں کے لیے تحریر کر رہی ہوں کہ وہ ایسی نادیدہ قوتوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

اجنبی راستے

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم
سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ پلیز میرا اصل نام کہانی کے ساتھ نہ لگائیں میں اپنی کہانی صرف اس لیے بھیج رہا ہوں کہ فی زمانہ انٹرنیٹ کی وجہ سے لوگ بہت زیادہ بھٹک رہے ہیں اگر ایک شخص نے بھی میری طرح خود کو بروقت سنبھال لیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہو گئی۔
عارف
(اسلام آباد)

میری بیوی آئینہ بہت خوب صورت ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس کی چاہت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میرا تبادلہ لاہور سے اسلام آباد ہو گیا۔ میں ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔ ملک کے ہر بڑے شہر میں اس کے دفاتر ہیں اور میں شروع سے اس کے لاہور والے دفتر میں کام کرتا آیا ہوں۔ میں نے جاب کا آغاز اسی کمپنی سے کیا اور بالکل تازہ ایم بی اے ہونے کی بنا پر کمپنی نے مجھے جاب دی۔ شاید اس لیے بھی کہ میں نے بہت ہائی

رینک کے ساتھ ایم بی اے کیا تھا اور ایک بہت اچھے ادارے سے کیا تھا۔ پرانے لاہور میں والد صاحب کی خاصی جائیداد ہے۔ مگر وہ انہوں نے وراثت میں تقسیم کے لیے رکھی ہے اور گزر اوقات کے لیے اسے کرائے پر دیا ہوا ہے۔ جب میں نے آئی کام کیا اور بیاسی فیصد مارکس کے ساتھ کیا تو میں نے بی بی آنرز میں داخلہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر میں جس یونیورسٹی میں جانا چاہتا تھا۔ وہ بہت مہنگی تھی۔ اس کا ایک سمسٹر ایک لاکھ روپے سے اوپر پڑتا تھا۔ والد صاحب اتنا خرچا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''پتر کسی سستی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر لے۔''

''اباجی فائدہ کچھ نہیں ہوگا۔ سستا ایم بی اے کر کے میں بیس سال میں اس مقام پر پہنچوں گا جہاں میں اس یونیورسٹی سے پڑھ کر پانچ سال میں پہنچ جاؤں گا۔''

اباجی روایتی اباجی تھے جو پلنگ پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے یا ہم پر حکم چلاتے تھے اس لیے مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ میری بات مانیں گے مگر کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے پہلے خوب غور کیا کہ ان کے کس سوال کا کیا جواب دینا ہے اور انکار پر کس زاویے سے پھر کوشش کرنی ہے۔ میری بات پر اباجی نے کہا۔ ''تو کیا چاہتا ہے؟''

''اباجی میں اسی یونیورسٹی سے ایم بی اے کرنا چاہتا ہوں۔''

فیس وغیرہ کے بارے میں اباجی کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔ انہوں نے حقہ گڑگڑایا اور آس پاس پھیلے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''لاکھ روپے ہر چھ مہینے بعد تجھے دوں تو ان لوگوں کو کیا فاقے کراؤں گا۔''

میرے چھ بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ چھ مجھ سے بڑے اور تین چھوٹے ہیں۔ ہم سب شاہدرہ کے قریب ایک حویلی نما مکان میں رہتے ہیں۔ مجھ سے بڑے دو بھائی اور دو بہنیں شادی شدہ ہیں اور بھائیوں کی بھی خاصی آل اولاد ہے۔ اس لیے حویلی بڑی ہونے کے باوجود بھری بھری لگتی تھی۔ میں نے ہمت کر کے بات جاری رکھی۔ ''اللہ نہ کرے کہ کوئی فاقہ کرے۔ بڑا اباجی رحمت اور حشمت بھائی اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنا خاندان دیکھ سکتے ہیں۔ شفقت بھائی بھی ملازمت کر رہے ہیں۔ راحت نہ پڑھ رہا ہے اور نہ جاب کر رہا ہے۔ صرف میں اور مجھ سے چھوٹے بہن بھائی پڑھ رہے ہیں تو اباجی آپ کی اصل ذمّے داری تو ہم ہیں باقی سب اپنا اپنا کر سکتے ہیں۔ اس لیے......''

''نہ پتر، جب تک میں زندہ ہوں تب تک سب میری ذمّے داری ہیں۔ میرے بعد سب اپنی اپنی دیکھنا۔''

''تب اباجی میں بھی تو آپ کی اولاد ہوں جب آپ کھاتے پیتے بیٹوں کے لیے کر رہے ہیں تو میرے لیے کیوں نہیں کر رہے؟''

''اس لیے بیٹا جی کہ میں سب کے ساتھ برابر کرتا ہوں اگر آپ کے ساتھ زیادہ کیا تو یہ دوسروں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ میں مہینے کے پانچ چھ ہزار کر سکتا ہوں لیکن سولہ سترہ ہزار نہیں کر سکتا۔''

اباجی کے جواب سے مجھے مایوسی ہوئی تھی مگر میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ یہ جواب میرے لیے متوقع تھا اور میں نے سوچا ہوا تھا کہ اس صورت میں مجھے کیا کہنا ہے۔ میں نے تمہید باندھی۔ ''اباجی میں آپ کا وارث ہوں آپ کی جائیداد میں میرا بھی حصہ ہوگا؟''

''کیوں نہیں ہوگا پتر جی، لیکن اس کے لیے میرے مرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''اللہ آپ کا سایا ہمارے سروں پر تادیر رکھے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں آپ سے کہوں کہ اپنی زندگی میں مجھے جو میرا حصہ بنتا ہے وہ دے دیں اس کے بدلے میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ آپ کی وراثت میں میرا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔''

اباجی سوچ میں پڑ گئے اور حقہ تیز تیز گڑگڑانے لگے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ گہری سوچ میں ہیں اور ایسے وقت کوئی بات کرے انہیں بالکل پسند نہیں تھا اس لیے میں صبر کے ساتھ ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ خاصی دیر بعد بولے۔ ''پتر جی آپ نے بات تو معقول کی ہے مگر ایک مسئلہ ہے۔ اس صورت میں ہر ایک اپنے اپنے حصے کی جائیداد مانگنے لگے گا اور میں کس کس کے منہ لگوں گا۔''

''اباجی سیدھی سی بات ہے۔ میں ایک مقصد کے تحت آپ سے مانگ رہا ہوں۔ پوری جائیداد نہیں مانگ رہا۔ بس اتنا دے دیں کہ میں ایم بی اے کر لوں۔ اگر کسی اور کا اتنا ہی بڑا مقصد ہو تو وہ آپ سے بات کرے۔ پھر اباجی آپ نے رحمت اور حشمت بھائی کو بھی کام کرا کے دیا جس سے وہ آج کما رہے ہیں اور انہوں نے آپ سے یہ بات بھی نہیں

کی ہوگی جو میں کر رہا ہوں۔ وہ سب لے کر بھی آپ کے پورے پورے وارث ہیں اور ان کو سب کے برابر حصہ ملے گا۔“

اباجی نے گہری سانس لی اور مجھ سے کہا۔”پتر جی مجھے دو دن سوچنے کی مہلت دو، اللہ نے چاہا تو میں تمہارا مسئلہ حل کردوں گا۔“

دو دن بعد اباجی نے مجھے بلایا اور پوچھا۔”پتر جی یونیورسٹی کی کل فیس کتنی ہوگی اور اگر ایک ساتھ ساری فیس دے دی جائے تو کتنی ہوگی؟“

ویسے تو پورا ایم بی اے ملا کر کوئی دس لاکھ میں ہو رہا تھا مگر میں نے اس زاویے سے معلومات حاصل نہیں کی تھیں۔ اگلے دن میں نے جا کر یہ معلومات حاصل کیں تو مجھے پتا چلا کہ یک مشت پورے ایم بی اے کی فیس جمع کرانے پر مجھے تیس فیصد ڈسکاؤنٹ ملے گا اور مجھے سات لاکھ جمع کرانے ہوں گے۔ میں نے اپنے آئی کام میں پوزیشن کا حوالہ دیا تو اس پر مجھے مزید پچاس ہزار کا ڈسکاؤنٹ مل گیا۔ مگر ساتھ ہی خبردار کیا گیا کہ اگر ایک بھی سمسٹر بڑھا تو مجھے پوری ایک لاکھ اضافی فیس دینا ہوگی۔ میں نے گھر آکر اباجی کو بتایا تو انہوں نے کہا۔”میں ساڑھے چھ لاکھ روپے کر دیتا ہوں لیکن اس کے علاوہ یونیورسٹی کے باقی خرچ تجھے خود برداشت کرنا ہوں گے۔“

”وہ میں کرلوں گا اباجی۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔”میں نے ابھی سے کچھ ٹیوشنیں تلاش کر لی ہیں۔ ان سے مجھے اتنا مل جائے گا کہ میں اپنا خرچ نکال لوں گا۔“

اباجی نے مجھے اگلے ہفتے ہی ساڑھے چھ لاکھ روپے لا دیئے۔ اس وقت میں سمجھا تھا کہ انہوں نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا یعنی میرے حصے کی جائیداد بیچ کر مجھے رقم دی تھی۔ مگر اباجی نے بہت سمجھداروں والا کام کیا تھا۔ اباجی پڑھے لکھے معمولی تھے۔ ان کے والد ہجرت کر کے امرتسر سے لاہور آئے تو انہوں نے یہاں ایک عمارت الاٹ کرالی اگرچہ وہ پیچھے بہت کچھ چھوڑ کر آئے تھے چاہتے تو بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔ مگر انہوں نے اسی بلڈنگ پر قناعت کی۔ یہی اباجی کو وراثت میں ملی جو اکلوتی اولاد تھے۔ انہوں نے اس بلڈنگ کو مختلف حصے کر کے ان کو کرائے پر دیا اور کرائے سے حاصل ہونے والی رقم سے مزید جائیداد خریدتے رہے۔ وہ خود میونسپلٹی میں ملازم تھے اور گھر کا خرچ تنخواہ سے چلاتے تھے۔ جب تک ہم بچے بڑے ہوئے انہوں نے خاصی جائیداد بنالی تھی جو جائیداد حاصل کرتے اسے بھی کرائے پر دے کر آمدنی کا ذریعہ بنالیتے تھے۔

وہ اس آمدنی سے گھر پر بھی خرچ کرتے تھے مگر صرف ضرورت کی حد تک۔ جب دوسری جائیداد خاصی ہوگئی تو انہوں نے داداجی کی الاٹ کرائی عمارت کو اپنی رہائش گاہ بنا لیا۔ سرخ پکی اینٹوں سے بنی اس دو منزلہ عمارت میں اوپر نیچے بیس کمرے تھے۔ پہلے لیٹرین اور غسل خانے چھت پر تھے مگر اباجی نے جب عمارت میں رہائش کا فیصلہ کیا تو اسے کچھ ری نیو بھی کرایا اور اس میں دونوں فلورز پر آٹھ عدد جدید واش روم بنائے تھے۔ شادی شدہ بھائیوں کو اوپر تین تین کمرے ملے۔ اباجی کا ارادہ تھا کہ جس بیٹے کی شادی کریں گے اسے تین کمرے دے دیں گے۔ کمرے بھی خاصے بڑے تھے۔ مکان کے پیچھے بڑا سا صحن بھی ہے جسے باغ بنایا ہوا ہے۔ مجھ سے بڑے شفقت بھائی نے میٹرک کر کے تعلیم چھوڑ دی اور کوئی کام بھی نہیں کرتے تھے ورنہ اباجی ان کی شادی بھی کر چکے ہوتے۔

حویلی کے علاوہ چھ مکانات جو تین اور چار منزلہ بھی تھے۔ ایک درجن دکانیں اور دو عدد باڑے اباجی کی ملکیت تھے۔ یہ سب انہوں نے کرائے پر دیئے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اباجی نے کوئی دکان بیچی ہوگی کیونکہ ساری دکانیں بھی اچھی جگہوں پر تھیں اور خاصی مالیت کی تھیں۔ مکان کہیں زیادہ مالیت کے تھے۔ انہیں اباجی صرف ساڑھے چھ لاکھ کے لیے فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ میں منتظر تھا کہ اباجی مجھ سے کاغذ پر سائن کرائیں گے مگر جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو ایک دن میں نے اباجی سے پوچھ لیا۔”آپ نے ساڑھے چھ لاکھ روپے کیسے کیے؟“

”پتر جی آم کھاؤ پیڑ نہ گنو۔“ انہوں نے مخصوص لہجے میں کہا۔ مگر میں نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے بتایا کہ انہوں نے ایک دکان گروی رکھ دی تھی۔ اس کی مالیت دس لاکھ تھی مگر انہوں نے ساڑھے چھ لاکھ میں گروی رکھی تھی اور دکان سے آٹھ ہزار روپے کرایہ آرہا تھا تو اب تہائی کرایہ مل رہا تھا اور جب تک وہ ساڑھے چھ لاکھ ادا نہیں کرتے کرایہ کم ملتا۔ جیسے جیسے وہ رقم ادا کرتے جاتے کرائے میں ان کا حصہ بڑھتا جاتا۔ میں اباجی کی سمجھداری پر حیران رہ گیا۔ انہوں نے دکان بھی اپنے پاس رکھی۔ میری تعلیم کے لیے رقم کا بندوبست کر لیا اور دکان کے بڑھتے کرائے سے ہی وہ

آنے والے چند سالوں میں گروی کی رقم بھی ادا کر دیتے۔ ان دنوں ملک بھر میں زمین جائیداد کی قیمت بڑھنے کا رجحان شروع ہوا تھا جو میرے ایم بی اے مکمل کرنے تک عروج پر پہنچ گیا۔ یہ آج سے آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ اباجی نے جو دکان گروی رکھی تھی اس کی قیمت تین گنا ہو کر بیس لاکھ تک چلی گئی تھی اور جیسے جیسے کرایہ بڑھتا گیا اباجی ادھار جلدی ادا کرتے گئے۔ پانچ سال سے بھی پہلے انہوں نے ادھار کی رقم اتار دی۔

میں نے ایم بی اے کے دوران بہت محنت کی اور دن رات پڑھتا تھا پھر ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا۔ ان پانچ سالوں میں، میں شاذ ہی کبھی رات بارہ بجے سے پہلے سویا اور ایسے موقع بھی کم آئے جب صبح چھ بجے کے بعد بھی سوتا رہا۔ اس محنت کا صلہ یہ ملا کہ میں نے ڈیپارٹمنٹ میں ٹاپ کیا تھا۔ پوزیشن کی وجہ سے مجھے رزلٹ آنے کے ایک مہینے بعد اس ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی جو الیکٹرانکس برانڈ بناتی ہے اور پورے پاکستان میں اس کے کئی مینوفیکچرنگ پلانٹس ہیں۔ میں انتظامیہ میں تھا۔ دو سال بعد میں اسسٹنٹ ایڈمن آفیسر بن گیا۔ میری تنخواہ اور دوسری سہولتیں اتنی تھیں کہ میں بیوی کا خرچ برداشت کر سکتا تھا۔ اس لیے اماں کو گرین سگنل دے دیا جو کب سے مجھے شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان پانچ سالوں میں نہ صرف شفقت بھائی بلکہ مجھ سے ایک سال چھوٹے عظمت کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ ایک تو وہ کم عمری سے کمانے لگا تھا دوسرے شادی اس نے پسند کی کی تھی۔ اماں اور اباجی کو خطرہ تھا کہ اس کی شادی میں تاخیر کی گئی تو وہ کوئی اور گل نہ کھلا دے اور انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑے۔

اماں نے مجھ سے لڑکی کے بارے میں پوچھا تو میں نے دو شرائط رکھ دیں۔ ایک لڑکی خوب صورت ہو اور دوسرے کم سے کم گریجویٹ ہو۔ اماں نے اسی لحاظ سے تلاش شروع کی جو آئینہ پر جا کر ختم ہوئی تھی۔ آئینہ ان دنوں گریجویشن کے آخری سال میں تھی۔ شکل صورت کے لحاظ سے لاکھوں میں ایک تھی۔ پہلے اماں اور جب میں نے دیکھا تو میں بھی فریفتہ ہو گیا۔ ہماری برادری کے تھے اور شاہدرہ میں ہی رہتے تھے۔ آئینہ کے گھر والوں نے اباجی کو دیکھا اور رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ مگر طے پایا کہ شادی اگلے سال ہو گی جب آئینہ کا بی اے کا رزلٹ آ جائے گا۔ ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اباجی نے شفقت اور عظمت کو فی الحال اوپر دو دو کمرے دے دیئے تھے یوں چاروں شادی شدہ بھائی اب اوپر تھے۔ اباجی نیچے کا حصہ بنوا رہے تھے اور اس میں کچھ وقت لگتا۔ قصہ مختصر کہ پانچ سال پہلے آئینہ میری زندگی میں آ گئی اور مجھے لگا جیسے میری اصل زندگی اب شروع ہوئی ہو۔

میں نے شادی کے موقع پر ایک مہینے کی چھٹی لی اور ہم پورے تین ہفتے تک ناردرن ایریا کی حسین وادیوں میں گھومتے اور ہنی مون مناتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ میرا واپس آنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر آنا مجبوری تھی۔ واپس آ کر میں دفتر میں اور آئینہ گھر میں لگ گئی۔ شادی کا ابتدائی جوش و خروش بھی کم ہو گیا تھا۔ اس لیے ہم معمول پر آتے گئے۔ اس وقت مجھے لگا کہ ہم ایک عام سے جوڑے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم میں میاں بیوی والی انسیت اور لگاؤ ہے لیکن وہ جو ایک دوسرے سے والہانہ محبت ہوتی ہے جو آدمی کو بے چین رکھتی ہے وہ ہمارے درمیان نہیں تھی۔ کیونکہ ہم ایک بڑے جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے۔ یہاں بے شمار لوگ تھے اور پرائیویسی کم تھی۔ پھر ہم نچلے فلور پر تھے جہاں تقریباً سب ہی رات گئے جمع رہتے تھے۔ اباجی نے پورشن سب کے الگ کر دیئے تھے مگر کچن ایک ہی اور بہت بڑا تھا۔ سب اپنا اپنا کھانا یہیں بناتے تھے۔

میں شادی کے بعد بھی اباجی کے ساتھ رہا تھا اور ہمارا کھانا مشترک ہوتا تھا۔ کیونکہ میرے ساتھ مجھ سے چھوٹی بہن زینب کی شادی بھی ہوئی تھی اور اب اماں اکیلی تھیں اس لیے آئینہ نے کہا کہ وہ ماں جی کے ساتھ رہے گی۔ یوں اس نے اماں اور اباجی کا کچن بھی سنبھال لیا تھا۔ اس پر میری بڑی بھابیوں نے برا منایا اور ہمیں چالاک قرار دیا کیونکہ اباجی کھانے پینے کو بہت کھلا لاتے تھے۔ ان کے کچن سے دوسروں کو بھی حصہ جاتا تھا۔ مگر یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ میں ساری تنخواہ بھی اباجی کے ہاتھ پر رکھتا تھا اور وہ اس میں سے جتنی رقم چاہے رکھ کر باقی مجھے دے دیتے تھے۔ میں نے پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا کہ انہوں نے اتنی رقم کیوں لی ہے۔ پر اباجی بھی مناسب ہی لیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب میں شادی شدہ تھا اور میرے بہت سے خرچے تھے۔ پھر اس رقم سے میں آئینہ اور اماں کو جیب خرچ دیتا تھا۔

شادی کو چھ سات مہینے گزرے اور کسی خوش خبری کے آثار نظر نہیں آئے تو ہم سے زیادہ اماں کو تشویش ہونے لگی۔

انہوں نے پہلے تو آئینہ کو لے جا کر اس کا معائنہ اور ٹیسٹ کرائے جو سب کلیئر آئے۔ ڈاکٹر کے مطابق اس میں کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے اماں نے آئینہ کے توسط سے مجھے کہلوایا کہ اب میں اپنا معائنہ کراؤں۔ اگرچہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا کیونکہ مجھے سب ٹھیک لگ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے آئینہ اور اماں کی تسلی کے لیے اپنا چیک اور ٹیسٹ بھی کرالیا اور یہ بھی کلیئر آیا تھا۔ گویا اب قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ اماں اس طرف سے مطمئن ہو گئیں مگر انہوں نے دوسرے ٹوٹکے شروع کر دیئے۔ وظائف جو آئینہ کو پڑھنے کے لیے دیئے اور دوائیں جو ہمیں کھانی پڑتی تھیں۔ آنے والے تین سالوں میں سب کر کے دیکھ لیا۔ مگر اولاد نہیں ہوئی۔ حد یہ کہ آئینہ ایک بار بھی اُمید سے نہیں ہوئی تھی۔

آئینہ شروع میں تو بہت فرسٹریٹ تھی کیونکہ اولاد کے لیے اماں کی طرف سے بھاگ دوڑ بھی زیادہ تھی اور اس سے ایک ماحول سے بن گیا تھا۔ مگر جب بے شمار جتن کے باوجود وہ اُمید سے نہیں ہوئی تو اس کی مایوسی فطری تھی۔ بہرحال رفتہ رفتہ سب کو صبر آ گیا اور اب اس معاملے کو تقدیر پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے میرا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔ اگرچہ میں نے یہ تبادلہ رکوانے کی کوشش کی تھی مگر اوپر سے حکم آنے کے بعد میرے ڈائریکٹر بھی بے بس ہو گئے جو مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ اصل میں اسلام آباد آفس میں کچھ گڑبڑ ہو رہی تھی اور وہاں کے ایڈمن آفیسر کو پُراسرار سے انداز میں جاب سے نکالا گیا تھا۔ مجھے اس کی جگہ ایڈمن آفیسر بنا کر بھیجا جا رہا تھا۔ مہنگا شہر ہونے کی وجہ سے مجھے تنخواہ کا دس فیصد مہنگائی الاؤنس بھی دیا جا رہا تھا اور میرا عہدہ بھی بڑھ گیا تھا اس کے باوجود میں بہ مشکل خود کو جانے پر آمادہ کر سکا تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ میں جاب ہی چھوڑ دوں مگر اباجی کے سامنے ذکر کیا تو انہوں نے بے بھاؤ کی سنا دیں۔

"پتر جی تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ روٹیاں لگ گئی ہیں۔ آس پاس آنکھیں کھول کر دیکھو، کتنے پڑھے لکھے معمولی ملازمتیں کر رہے ہیں یا بے روزگار ہیں۔ تمہاری تو اتنی اچھی جاب ہے پتر جی، چند سال میں اوپر والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔"

اباجی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ چند سال بعد جب نچلے افسران سے اوپری افسران کا چناؤ کیا جاتا تو اس میں میرا نام آنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ میری کارکردگی اتنی اچھی تھی کہ مجھے لگاتار دو سال بہترین ایمپلائی کا ایوارڈ ملا تھا۔ ممکن ہے یہ ایوارڈ زیادہ بار ملتا مگر کمپنی پالیسی کے مطابق ایک ملازم دو بار سے زیادہ حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر بھی میری سروس بک بہترین ریمارکس سے بھری ہوئی تھی۔ اباجی نے مجھے راضی کر لیا انہوں نے کہا کہ اسلام آباد کتنا دور ہے میں ہر ہفتے نہ سہی دو ہفتے بعد لاہور آ سکتا ہوں۔ کیونکہ کمپنی میں ہفتہ اتوار کی چھٹی ہوتی تھی اس لیے میں آرام سے آ جا سکتا تھا۔ اس لیے میں راضی ہوا۔ آئینہ مجھ سے زیادہ مشکل سے راضی ہوئی تھی۔ وہ رو دھو رہی تھی کہ وہ سب کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اماں نے بہ مشکل اسے راضی کیا کہ بیوی شوہر کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ ورنہ شادی کا فائدہ۔

پہلے میں گیا تھا کیونکہ مجھے مناسب رہائش بھی تلاش کرنا تھی۔ کمپنی کا دفتر اسلام آباد کے بلیو ایریا کے پاس ایک بڑی سی کوٹھی میں تھا اور مجھے یہاں رہائش کے لیے ایک کمرا مل گیا تھا۔ دفتر کا چارج لینے اور معاملات سمجھنے میں چند دن لگے تھے۔ اس کے بعد مجھے ذرا فرصت ملی تو میں نے مکان کی تلاش شروع کی۔ اسلام آباد خاصا مہنگا ہے اور یہاں چھوٹی رہائش کم ملتی ہے۔ اس لیے مجبوراً مجھے مری روڈ پر واقع ایک آبادی میں چھوٹا فلیٹ لینا پڑا۔ یہاں تمام سہولتیں تھیں اور کرایہ بھی مناسب تھا۔ بس یہ تھا کہ یہاں زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے اور آس پاس کا ماحول بہت اچھا نہیں تھا۔ فلیٹ مین روڈ سے ذرا اندر ایک عمارت کے دوسرے فلور پر تھا۔ دراصل یہ چار منزلہ مکان تھا۔ مالک نے اسے خاص طور سے کرائے پر دینے کے لیے بنایا تھا۔ ہر فلور پر دو فلیٹ تھے۔ ہر فلیٹ کے میٹرز الگ تھے۔ پانی کی موٹر چلانے اور سیڑھیوں کی لائٹ کے لیے الگ میٹر تھا جس کا بل سب مل کر ادا کرتے تھے۔

ہر فلیٹ میں دو بیڈ روم مع اٹیچ باتھ کے ساتھ تھے اور ایک بالکونی تھی جہاں کپڑے وغیرہ سوکھنے کے لیے لٹکائے جا سکتے تھے۔ ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا جس کے ساتھ ہی امریکن اسٹائل کا کچن تھا۔ آبادی سے قطع نظر فلیٹ بہت اچھا، نیا اور جدید انداز کا بنا ہوا تھا۔ کرایہ بھی مناسب تھا اور مجھے صرف ایک مہینے کا ایڈوانس اور ایک مہینے کا پیشگی کرایہ دینا پڑا تھا۔ چابی لے کر میں نے آنے والے پیر سے دو دن کی چھٹی لی اور جمعرات کی شام لاہور روانہ ہو گیا۔ جمعے کی صبح میں اور آئینہ اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے

پاس ذرا پرانے ماڈل کی ہنڈا سٹی کار تھی۔ اس میں ہم جس قدر ذاتی اور ضرورت کا سامان لا سکتے تھے وہ رکھ لیا تھا۔ آئینہ نے بیشتر کچن کا سامان لیا تھا۔ ہم فلیٹ پہنچے کچھ دیر آرام کیا۔ جمعہ پڑھا اور پھر شام کے وقت ہم دونوں ضروری فرنیچر اور سامان لینے نکلے۔

ہمیں زمین پر سونے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے ایک استعمال شدہ لکڑی کا ڈبل بیڈ بمعہ گدا، اس کے ساتھ کی ڈریسنگ اور ڈبل ڈور الماری لی تھی۔ ایک چھوٹا صوفہ سیٹ، قالین اور تین افراد کے لیے چھوٹی ڈائننگ ٹیبل لی تھی۔ ہفتہ اتوار بھی سامان لینے اور فلیٹ کی سیٹنگ میں گزر گیا۔ ان تین دنوں میں مسلسل کام کر کے ہم دونوں ہی تھک گئے تھے اس لیے پیر کے دن آرام کیا اور منگل کو ہم گھومنے نکلے تھے۔ خلافِ توقع آئینہ خوش تھی اور اپنی خوشی کا اظہار بھی کر رہی تھی۔ ہم نے اسلام آباد کی تقریباً ساری تفریحی جگہیں دیکھ لیں اور شام کے وقت کھانا دامن کوہ کے ایک ریسٹوران میں کھایا تھا۔ ہم اس سے پہلے بھی اسلام آباد آ چکے تھے اور یہاں گھومے پھرے تھے مگر وہ جلدی میں کیا ہوا ٹور تھا اب ہم نے ہر جگہ تسلی سے دیکھی اور شام کو جب واپس گھر آئے تو بہت خوش تھے۔

میرا دفتر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مشکل سے پندرہ منٹ میں دفتر پہنچ جاتا اور واپسی میں بھی اتنا ہی وقت لگتا تھا۔ چھٹی پر جانے سے پہلے میں بہت سے معاملات دیکھ چکا تھا اور ان سے متعلق مسئلے سلجھا لیے تھے۔ باقی میں نے چھٹی کے بعد کے لیے چھوڑ دیئے۔ مسئلہ ایڈمن کا ہی تھا اور وہ ایک دوسری ملٹی نیشنل کمپنی کے فیور میں یہاں کے انتظامی معاملات میں گڑبڑ کر رہا تھا تاکہ مقامی مارکیٹ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس نے خاصا نقصان پہنچا بھی دیا تھا مگر اس کی تلافی ممکن تھی۔ ہمارے کچھ ڈیلرز مقامی دفتر کے رویے سے بددل ہو کر ڈیلر شپ چھوڑ گئے تھے اور باقی بھی تنگ آئے ہوئے تھے۔ میں نے معاملات سلجھانے کے لیے ان کی میٹنگ بلائی اور اس میں ڈیلرز کے مسائل سن کر ایک رپورٹ تیار کر کے لاہور کے ہیڈ کوارٹر بھیج دی۔

میں نے کچھ سفارشات کی تھیں جو مان لی گئیں اور دو ہفتے میں وہ سارے مسئلے حل ہو گئے جو گزشتہ چھ مہینے سے حل نہیں ہو رہے تھے۔ جو ڈیلرز ڈیلر شپ چھوڑ گئے تھے ان سے رابطہ کیا اور انہیں کچھ مراعات کے ساتھ دوبارہ سے ڈیلر شپ لینے پر آمادہ کر لیا۔ یہ کسی قدر مشکل کام ثابت ہوا کیونکہ وہ لوگ دوسری کمپنی کی ڈیلر شپ میں سرمایہ کاری کر چکے تھے اور اب اگر وہ پیچھے ہٹتے تو انہیں نقصان ہوتا۔ مگر میری کمپنی نے انہیں یقین دہانی کرائی کہ ان کا نقصان پورا ہوگا اور وہ آگے بھی فائدے میں رہیں گے۔ اس شرط پر وہ مان گئے۔ میری روز ہی ان ڈیلرز سے میٹنگ ہوتی تھی اور اس وجہ سے میں اکثر دیر سے گھر آتا تھا۔ بعض اوقات تو نو دس بج جاتے تھے۔ چار دن میں آئینہ کے ساتھ رہا اور اس کے بعد آنے والے مہینے میں میری اس سے صبح کے بعد بس رات کے کھانے پر کچھ دیر بات ہوتی تھی۔ دفتر سے آنے کے بعد میں اتنا تھک جاتا تھا کہ دس بجے تک بستر پر لیٹتا تو اگلی صبح ہی میری آنکھ کھلتی تھی۔

ان دنوں میں آئینہ کو بالکل بھی وقت نہیں دے پایا تھا۔ دیکھا جائے تو میں اس کے ساتھ معمول کے مطابق ہی پیش آ رہا تھا۔ لاہور میں ہم دس ساڑھے دس تک کمرے میں جاتے تھے اور گیارہ ساڑھے گیارہ بجے تک سو جاتے تھے۔ وہاں ہم زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ دفتر سے آ کر میں زیادہ اپا جی اور بھائیوں سے لگا رہتا تھا۔ آئینہ اماں اور بھابیوں کے ساتھ ہوتی تھی یا بچوں میں گھری رہتی تھی۔ وہ بچوں سے پیار کرتی تھی اس لیے بچے بھی اسے گھیرے رہتے تھے۔ مگر یہاں ہم دونوں تھے۔ مجھے دفتر کی مصروفیت نے پکڑ لیا تھا مگر آئینہ فارغ تھی اور وہ میری توجہ چاہتی تھی۔ ہم آتے ہوئے اپنا بڑا سا ایل سی ڈی ٹی وی لے آئے تھے۔ میں نے کیبل لگوا لیا تھا۔ میرے پاس لیپ ٹاپ اور آئینہ کے پاس اسمارٹ فون کے ساتھ ٹیب بھی تھا۔ میرے خیال میں اس کے پاس وقت گزاری کے لیے اچھی خاصی چیزیں تھیں اس لیے میں نے زیادہ پروا نہیں کی۔ جب آئینہ نے دیکھا کہ میں اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا ہوں۔ تو اس نے کھل کر کہا۔

''میں سارا دن بور ہوتی ہوں اور رات کو آپ آتے ہیں کھانا کھاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔''

''بھئی تھکن اتنی ہوتی ہے کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہتا۔'' میں نے عذر پیش کیا۔ ''تم ٹی وی دیکھ لیا کرو۔''

''ٹی وی کتنا دیکھوں۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ''دیکھو یہاں کے معاملات سے لگ رہا ہے کہ میں دفتر سے دیر سے ہی آیا کروں گا۔ یہاں کام زیادہ نہیں ہے مگر کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جب تک وہ نہیں ہو جاتے میں دفتر سے اٹھ نہیں سکتا ہوں۔

اس لیے آنے میں دیر ہوجاتی ہے۔ میں کوشش کروں تو شاید آٹھ بجے تک آسکوں گا۔''

''اور اس کے بعد آکر سو جائیں گے۔'' آئینہ نے شکوہ کیا۔

''نہیں میں تمہیں وقت دوں گا مگر میں بات کر رہا ہوں دن کی جب تم اکیلی ہوتی ہو اور کرنے کو کچھ ہوتا نہیں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ انٹرنیٹ لگوا دوں تم نیٹ استعمال کرنا۔''

وہ خوش ہوگئی۔'' یہ ٹھیک رہے گا۔ مجھے ٹی وی کا شوق نہیں ہے فیس بک اور اسکائپ استعمال کرسکوں گی۔ میری بہت سی جاننے والیاں ہیں نیٹ پر۔''

اسے انٹرنیٹ لگوا دیا تو اس کا دن کا وقت اچھا گزرنے لگا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ صفائی اور کپڑوں سے فارغ ہو کر ٹی وی لگا لیتی یا پھر انٹرنیٹ استعمال کرتی تھی۔ دوپہر میں گزشتہ رات کا بنا ہوا سالن استعمال کرتی۔ روٹی ڈال لیتی یا پھر چاول بنا لیتی تھی۔ تازہ سالن وہ رات میں بناتی تھی۔ جب میں گھر آتا تو وہ کھانا وغیرہ بنا کر فارغ ہوجاتی تھی۔ میں نہا دھو کر تازہ دم ہوتا تو ہم مل کر کھانا کھاتے۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے رات کی چائے یا کافی پیتے اور دس بجے تک سونے کی تیاری شروع کر دیتے۔ مجھے صبح سات بجے اٹھنا ہوتا تھا۔ کیونکہ میں صبح بھی نہاتا تھا اور اس میں وقت لگتا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے میں دفتر کے لیے نکل جاتا تھا۔

ہفتہ اور اتوار کے دن میں باہر کے سارے کام نمٹاتا تھا۔ گھر کا سامان لاتا۔ آئینہ کو کچھ لینا ہوتا تو اسے لے کر وہ دلاتا۔ عام طور سے اتوار کی رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھاتے تھے۔ دیکھا جائے تو یہ دن بھی مصروفیت میں گزرتے تھے اور ہمیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر سکون سے بات کرنے کا موقع کم ملتا تھا۔ یہاں آنے کے ایک مہینے میں میری محلے میں اچھی خاصی جان پہچان ہوگئی تھی۔ ابا جی نے مجھے سمجھایا تھا کہ جہاں رہو وہاں کے لوگوں سے ہمیشہ تعلق رکھو کیونکہ کسی بھی مشکل وقت میں پڑوسی پہلے آتا ہے بھائی بعد میں آتا ہے۔ اس لیے میں نے یہاں لوگوں سے تعلق استوار کیا۔

لاہور میں، میں دفتر میں بہت مصروف ہوتا تھا اور یہاں اتنا آرام تھا کہ میں بور ہوجاتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں چیٹ میسجر استعمال کرتا تھا مگر اب ان میں بھی مزہ نہیں رہا تھا۔ فیس بک بھی ایک حد تک ہی تفریح دیتی تھی۔

ایک شام میں بیٹھا بور ہو رہا تھا اور ایسے ہی وقت گزاری کے لیے براؤزنگ کر رہا تھا کہ ایک سائٹ پر ڈیٹنگ سائٹ کا ایڈ نظر آیا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب میں نے کسی ڈیٹنگ سائٹ کا ایڈ دیکھا تھا۔ مجھے کبھی اس میں دلچسپی محسوس نہیں ہوئی اس لیے میں نے کبھی کسی ڈیٹنگ سائٹ پر جا کر نہیں دیکھا تھا۔ میں ایسی سائٹس کو فضول اور بیکار سمجھتا تھا۔ مگر اس شام میں نے سوچا کہ جا کر دیکھوں آخر ان سائٹس پر ہوتا کیا ہے؟ میں نے ایڈ پر کلک کیا تو سائٹ کھل گئی۔ آغاز میں ہی لڑکیوں اور لڑکوں کی تصاویر تھیں اور یہ سب نوجوان اور خوب صورت تھے۔ انہوں نے ایسی ڈریسنگ کی ہوئی تھی کہ ان کے جسم نمایاں تھے۔ یہ ابتدائی پیج تھا اور اصل پیج پر جانے کے لیے لاگ ان ہونا ضروری تھا۔ گویا میرا اکاؤنٹ ہونا لازمی تھا۔ پیج پر کری ایٹ اکاؤنٹ کا بٹن بھی تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے اس پر کلک کیا اور ایک فارم کھل گیا جس میں مجھ سے معلومات طلب کی گئی تھیں۔ میں فارم فل کرنے لگا۔

فارم فل کر کے سب مٹ کیا تو بتایا گیا کہ میرے ای میل پر جو میں نے فارم پر دیا تھا ایک ای میل اس ڈیٹنگ سائٹ کی طرف سے آئے گی۔ اس لنک کو کلک کرنا ہوگا تب میرا اکاؤنٹ ایکٹو ہوگا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور جب جا کر ڈیٹنگ سائٹ پر لاگ ان والے خانوں میں یوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ ڈالا تو میں لاگ ان ہوگیا۔ اس کے بعد ایک پیج کھلا اور مجھ سے پوچھا جانے لگا کہ میں کون ہوں اور کس سے ملنا پسند کروں گا۔ ظاہر ہے میں نے فیمیل کے بٹن پر کلک کیا اس کے بعد مجھ سے خواتین کی خصوصیات پوچھی جانے لگیں جو میں چاہتا تھا۔ میں نے ایسے ہی بغیر سوچے سمجھے کچھ خصوصیات کے بٹن دبا دیے۔ آخر میں مجھ سے ملک اور شہر کا پوچھا گیا۔ میں نے پاکستان اور اسلام آباد کا چناؤ کیا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ یہاں بھلا ڈیٹنگ کے لیے خواتین یا لڑکیاں کہاں ہوں گی؟ مگر جب رزلٹ آیا تو میں حیران رہ گیا۔

میری منتخب کی ہوئی پسند کی خواتین کی ایک لمبی لسٹ تھی۔ میں نے عمر کی حد پچیس کے آس پاس رکھی تھی۔ اس طرح آنکھوں، بالوں کے رنگ، جلد کی رنگت، جسمانی ساخت اور قد وقامت کے ساتھ کوئی دو درجن خواتین تھیں

جو کسی مرد سے بات کرنے کی منتظر تھیں اور مزے کی بات ہے کہ یہ اس وقت آن لائن تھیں۔ فوراً ہی مجھے ہائے، ہیلو اور سلام کے میسیج آنے لگے۔ میں نے فارم فل کرتے وقت اپنی عمر تیس بتائی تھی جو کہ اصل عمر سے ایک سال کم تھی کیونکہ تصویر دینا لازمی تھا اور میں اپنی اصل تصویر نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے کمپیوٹر میں موجود ریکارڈ سے اپنے آفس پیون ساجد کی تصویر دے دی۔ وہ خوش شکل تھا اور عمر تیس کے آس پاس تھی۔ میری طرح ان خواتین اور لڑکیوں نے بھی اپنی تصاویر دی ہوئی تھیں۔ میں نے تصاویر کا جائزہ لیا اور ایک نام لیلیٰ پر کلک کیا۔ اس کے ساتھ پرائیویٹ چیٹ کا خانہ کھل گیا۔ اس نے مجھے ہائے امانت کہا تھا۔ میں نے جواباً لکھا۔

''ہائے لیلیٰ۔''

اس کی طرف سے فوری جواب آیا۔'' آپ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی تبھی آپ کے نام پر کلک کیا ہے۔''

''مجھے آپ اچھے لگے ہیں۔'' وہ بے تکلفی سے بولی۔

''اپنے بارے میں بتائیں گے؟''

''میں ملازم پیشہ آدمی ہوں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا ہوں۔''

''شادی شدہ ہیں؟''

میں ہچکچایا مگر تسلیم کر لیا۔'' ہاں شادی شدہ ہوں۔''

''بچے ہیں؟''

''نہیں۔''

''شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟''

''ساڑھے تین سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔''

''اوہ تو آپ یا آپ کی مسز میں کوئی پرابلم ہے۔'' اس نے پوچھا تو ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ مجھ سے دور ہے اور میں اسے جانتا بھی نہیں ہوں اس لیے وہ یوں کھل کر بات کر رہی ہے ظاہر ہے وہ دو بدو اس قسم کا سوال نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے جواب دیا۔

''کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ہم دونوں ٹھیک ہیں بس قدرت کی طرف سے دیر ہے۔''

''اُمید ہے آپ دونوں کی یہ کمی پوری ہو جائے گی۔''

اب میں نے سوالات کا آغاز کیا۔'' آپ میرڈ ہیں؟''

''ہاں۔'' اس نے جواب دیا۔'' بچوں کا مت پوچھے گا کیونکہ ابھی میری شادی کو صرف چھ مہینے ہوئے ہیں۔''

''آپ کی شادی کو چھ مہینے ہوئے ہیں تب یوں کسی سے دوستی کرنے کی وجہ؟''

''میرے ہسبینڈ بہت روڈ اور بور آدمی ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور مجھ سے بلا ضرورت بات بھی نہیں کرتے ہیں۔ میرا سسرال بھی ایسا ہی روکھا پھیکا ہے۔ سات لوگ رہتے ہیں مگر سب اپنے اپنے کمروں میں گھسے رہتے ہیں۔ باہر سے آئیں گے اور سیدھا کمرے میں چلے جائیں گے۔ میری نندوں تک کا یہ حال ہے۔ میں بور ہوتی ہوں۔''

''تو اس کے لیے کسی مرد سے ہی دوستی کیوں؟ وہ بھی ایک ڈیٹنگ سائٹ پر۔''

اس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔'' اس میں ایک تھرل ہے جب میں کسی اجنبی مرد سے یوں بات کرتی ہوں تو میری بوریت تفریح میں بدل جاتی ہے۔''

''آپ کی اور مردوں سے بھی بات چیت ہے؟''

''آف کورس آپ اس سائٹ پر اکیلے مرد تو نہیں ہیں۔ میری شاید ایک درجن سے زیادہ مردوں سے بات ہے۔''

''آپ نے تصویر اصلی دی ہے؟''

اس نے ہنسنے کا سائن بنایا۔'' آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ تصویر اصلی نہیں ہے۔''

وہ پھر ہنسی۔'' آپ کا خیال غلط ہے یہ تصویر اصلی ہے اور تھرل کی وجہ بھی ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہوں۔ میرے شوہر یا ان کے جاننے والوں یا سسرال میں سے کوئی دیکھ سکتا ہے۔''

''تب آپ حماقت کر رہی ہیں یہ آپ کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔'' میں نے حیرت سے سنبھل کر جواب دیا۔'' میں نے پہلی بار اس قسم کی کسی سائٹ پر کسی عورت سے بات کی مگر میں نے اپنی تصویر اصلی نہیں دی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔'' میں نے آپ کی اصل تصویر دیکھ لی ہے۔''

میں اچھل پڑا۔'' وہ کیسے؟''

وہ پھر ہنسی۔'' آپ بہت سادہ آدمی ہیں۔ آپ نے اپنا ای میل دیا ہوا ہے اور میں نے آپ کو اتنی دیر میں فیس

بک پر تلاش کرلیا ہے اس میں آپ کی اصل تصویر موجود ہے۔''

میں جھینپ گیا اور ساتھ ہی بوکھلا گیا۔ ''میرے خدا مجھے اس چیز کا تو خیال ہی نہیں آیا۔''

''اور مزے کی بات ہے کہ اس میں آپ نے سب اوپن رکھا ہے میں آپ کی بیوی اور فیملی کے دوسرے افراد کی تصویریں بھی دیکھ رہی ہوں۔''

''سچی بات ہے مجھے ان چیزوں کا زیادہ علم نہیں ہے اور میں استعمال بھی کم کرتا ہوں۔''

''پھر آج ایک ڈیٹنگ سائٹ جوائن کرنے کی وجہ؟''

''دفتر میں بوریت۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہاں کرنے کو کچھ نہیں ہے اور خاص طور سے شام کے وقت مجھے دو ڈھائی گھنٹے فارغ بیٹھنا پڑتا ہے۔ میں براؤزنگ کررہا تھا کہ اس سائٹ کا ایڈ دیکھ کر اسے آزمانے کا سوچا۔''

''گویا آپ بھی اپنی بوریت مٹانے آئے ہیں۔''

''سچی بات تو یہ ہے کہ میں یہاں بھی براؤزنگ کی نیت سے آیا تھا میرا خیال تھا کہ ایسی سائٹس زیادہ تر دھوکے اور فراڈ پر مبنی ہوتی ہیں۔''

''آپ نے ٹھیک کہا لیکن اس سائٹ پر دھوکا نہیں ہوتا ہے۔ یہاں آپ کو سائٹ سے نہیں افراد سے دھوکا ملے گا۔''

''پلیز شرمندہ نہ کریں۔'' میں نے کہا۔ اس دوران میں میں بھی اس کی ای میل آئی ڈی کی مدد سے اسے فیس بک پر تلاش کررہا تھا مگر وہ فیس بک پر نہیں تھی۔ ''آپ فیس بک استعمال نہیں کرتی ہیں؟''

''یعنی آپ بھی مجھے تلاش کررہے ہیں۔'' وہ بولی۔ ''میں فیس بک استعمال کرتی ہوں مگر اس ای میل آئی ڈی سے نہیں۔''

وہ سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں اور بہت گوری رنگت والی خوب صورت عورت تھی۔ تصویر میں اس کا چہرہ اور شانے تھے مگر لگ رہا تھا کہ وہ متناسب جسم کی مالک ہوگی۔ وہ یقیناً خاصے عرصے سے اس سائٹ پر آرہی تھی اور مردوں سے بات کرتی رہی تھی اس لیے وہ زیادہ بے تکلفی سے بات کررہی تھی۔ اس نے لکھا۔ ''ویسے آپ نے جس کی تصویر دی ہے اس سے کہیں زیادہ ہینڈسم ہیں۔''

''شکریہ، آپ بھی بہت خوب صورت خاتون ہیں۔''

''اچھا، مجھ میں آپ کو کیا اچھا لگا؟''

''سب کچھ، آپ کی آنکھیں، نقوش اور بال سب خوب صورت ہیں۔ خاص طور سے اسکن کلر اور آئی کلر کنٹراسٹ بہت اچھا لگ رہا ہے ایسا میں نے بہت کم خواتین میں دیکھا ہے۔''

''آپ نے بہت غور کیا ہے میری تصویر پر۔''

''ہاں آپ غور کرنے کے قابل ہیں۔'' اب میں نے بھی بے تکلفی سے کہا۔ میں بہرحال مرد ہوں جو زیادہ بے باک اور پیش قدمی کرنے والے ہوتے ہیں۔

''آپ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں؟''

''اگر آپ کا اشارہ مزید تصویروں کی طرف ہے تو ضرور دیکھنا چاہوں گا۔''

میرا خیال تھا کہ وہ اپنی تصویر بدل دے گی مگر اس نے لکھا۔ ''میری تصویر پر کلک کریں، میرا البم کھل جائے گا اس میں میری کئی تصویریں ہیں۔ بہت سی فل فریم ہیں۔ دل بھر کر دیکھیے۔''

میں نے اس کی تصویر پر کلک کیا تو البم کھل گیا۔ اس میں اس کی درجن سے زیادہ تصویریں تھیں اور وہ درست کہہ رہی تھی ان میں سے اکثر فل فریم تھیں اور باقاعدہ کیمرے سے لی ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا وہ متناسب جسم کی مالک تھی اور اکثر تصاویر میں چست کپڑوں میں اس کا تناسب نمایاں تھا۔ میں تصویروں میں مگن تھا کہ اچانک موبائل نے بیل دی اور میں اچھل پڑا تھا۔ میں نے موبائل دیکھا تو آئینہ کال کررہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو۔''

''خیریت آپ کی سانس کیوں پھولی ہوئی ہے؟''

''میں نیچے کا چکر لگا کر آرہا ہوں شاید اس لیے۔'' میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔ ''کہو تم نے کیسے فون کیا؟''

''بور ہورہی تھی سوچا کہ آپ سے بات کرلوں آپ بھی اس وقت فارغ ہوتے ہیں۔''

میں فارغ نہیں تھا اور اسے اپنی مصروفیت کے بارے میں بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لیے پھر جھوٹ بولا۔ ''نہیں اتفاق سے کام کررہا ہوں ایک رپورٹ ہیڈ آفس بھیجنی ہے۔''

''اچھا۔'' آئینہ نے بجھے لہجے میں کہا۔ ''او کے بائی۔''

''بائی۔'' میں نے موبائل رکھا تو مجھے احساس ہوا کہ

اے سی کی خنکی میں بھی مجھے پسینا آیا ہوا تھا اور مجھے اپنی کیفیت پر حیرت ہوئی تھی۔ میں آئینہ سے بے وفائی یا لیلیٰ سے فلرٹ نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میں اندر سے اتنا بوکھلا گیا تھا۔ اس دوران میں لیلیٰ میسج کر رہی تھی۔ وہ اپنی تصویروں کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ مجھے کیسی لگیں۔ جب میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے پوچھا ہوا تھا کہ میں کہاں ہوں اور جواب کیوں نہیں دے رہا؟ میں نے جلدی سے ٹائپ کیا۔

''سوری آئینہ کا فون آگیا تھا۔''

''آپ بوکھلا گئے ہوں گے؟''

''ہاں۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''میں تمہاری تصویریں دیکھ رہا تھا کہ اچانک بیل بجی تھی۔ مجھے لگا میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔''

اس نے میرے طرز تخاطب میں تبدیلی پر ردِعمل نہیں دیا اور ہنسی کا سائن بنایا۔ ''اگر آپ کی وائف کو پتا چل گیا کہ اس وقت آپ ایک عورت سے بات کر رہے ہیں اور اس کی تصویریں دیکھ رہے ہیں تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟''

''ظاہر ہے ایسے موقع پر ایک بیوی کے کیا تاثرات ہو سکتے ہیں؟''

''مجھے اندازہ ہے کیونکہ میں خود کسی کی بیوی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''خیر چھوڑیں یہ بتائیں کہ ان تصویروں میں میں کیسی لگ رہی ہوں؟''

''میں بتا تو چکا ہوں لیکن ان فل فریم تصویروں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم ایک مکمل خوب صورت عورت ہو۔''

''مکمل کن معنوں میں؟'' اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرے منہ سے اپنی تعریف کھل کر سننا چاہ رہی تھی۔

''ویسے تو عورت ہونا ہی حسن کی علامت ہے۔ مگر ہم لوگوں نے اس کے کچھ پیمانے بنا لیے ہیں۔ تم سر سے پاؤں تک ان پیمانوں پر پوری اترتی ہو۔''

''اف اللہ آپ نے کتنے پیارے لفظوں میں تعریف کی ہے۔'' اس نے کہا۔

''کیا کسی اور نے بھی تعریف کی ہے؟''

''ان سب نے جن سے میں بات کرتی ہوں۔ مگر اتنے واہیات انداز میں اور بعض نے تو فحش الفاظ استعمال کیے تھے۔''

میں مرد ہوں اور سمجھ رہا تھا کہ مردوں نے کس انداز میں اس کی تعریف کی ہوگی۔ میں نے لکھا۔ ''شاید وہ تم کو صرف ایک عورت سمجھ رہے ہوں گے۔''

''اور آپ؟''

''سچ تو یہ ہے کہ تمہاری عورت ہونے کی کشش سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن تم نے آج مجھے جس طرح سے کمپنی دی ہے میں اس کے لیے ایک دوست کے طور پر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔''

اس نے جواب دیا۔ ''سچ کہوں تو جب سے میں نے یہ ڈیٹنگ سائٹ جوائن کی ہے پہلی بار مجھے کسی سے مل کر اچھا لگ رہا ہے۔''

ہمارے درمیان کچھ دیر اور بات ہوئی اور پھر وہ چلی گئی کیونکہ اس کا شوہر گھر آنے والا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور حیران ہوا کیونکہ ساڑھے سات بج گئے تھے۔ میں نے ساڑھے پانچ بجے اس سے گفتگو شروع کی تھی۔ لاگ آف کرکے میں نے سب سے پہلے اپنے کمپیوٹر کی ہسٹری صاف کی۔ اگرچہ کوئی میرے کمرے اور کمپیوٹر تک رسائی نہیں رکھتا تھا مگر بہرحال یہ دفتر کا کمپیوٹر تھا اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب کون اسے استعمال کرے اگر میں چند دن بیمار پڑ جاتا تو لازمی کوئی دوسرا میری سیٹ پر آتا اور اسے استعمال کرتا۔ ہسٹری صاف کرکے میں نے ایک فیصلہ اور کیا کہ اب میں اپنا لیپ ٹاپ دفتر لایا کروں گا اور اسی پر لیلیٰ سے رابطہ کروں گا۔ دفتر سے گھر جاتے ہوئے میں اسی قسم کی پلاننگ میں مصروف رہا کہ میں کس طرح لیلیٰ سے محفوظ رابطہ کروں جس کا آئینہ یا میرے دفتر میں کسی کو علم نہ ہو۔ آئینہ کو لیپ ٹاپ سے نہ تو دلچسپی تھی اور نہ ہی اسے معلوم تھا کہ اندر کی چیزیں کیسے تلاش کرتے ہیں۔

مگر رات جب میں سونے کے لیے لیٹا اور میرے پہلو میں آئینہ پہلے ہی سو رہی تھی تو مجھے خیال آیا کہ کہیں میں اس سے بے وفائی تو نہیں کر رہا ہوں۔ میں ایک غیر عورت سے رابطہ رکھ رہا تھا بے شک یہ رابطہ نیٹ کی حد تک تھا مگر بہرحال رابطہ تھا۔ میں اس کی تصویریں بھی دیکھ رہا تھا اور اس کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ اگر میں ذرا مختلف مزاج کا مرد نہ ہوتا تو لیلیٰ نے مجھے جس طرح اکسایا تھا میں بھی دوسرے مردوں کی طرح اس کی تعریف کرتا۔ مگر میں نے اخلاق اور تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ اسی بات نے لیلیٰ کو متاثر کیا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ جن دوسرے مردوں نے اس کی دیگر انداز میں تعریف کی تھی تو اس نے کیا ردِعمل دیا

تھا؟ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اگلے دن اس سے پوچھوں گا۔ آئینہ نے اس شام مجھ سے زیادہ بات نہیں کی اور ڈنر کے بعد کچن میں لگی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شام میں اس نے کچن صاف نہیں کیا تھا۔ ساڑھے دس بجے تک وہ تھک کر لیٹی اور فوراً ہی سو گئی تھی۔ اگلے دن ناشتے کے بعد میں نے لیپ ٹاپ بیگ میں رکھا تو اس نے پوچھا۔

''آپ لیپ ٹاپ لے جا رہے ہیں؟''

''ہاں دفتر کا کمپیوٹر کچھ گڑبڑ کر رہا ہے۔ اس کے ٹھیک ہونے تک میں لیپ ٹاپ استعمال کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تمہیں ضرورت ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے ہچکچا کر جواب دیا۔ ''میرے پاس موبائل بھی ہے اور ٹیب بھی۔''

میں دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے لیپ ٹاپ پر وہ سائٹ کھولی اور لاگ ان ہو گیا۔ مگر لیلیٰ لاگ آف تھی۔ میں نے اپنی آئی ڈی کو ہائیڈ کر لیا اب مجھے کوئی دوسرا تلاش نہیں کر سکتا تھا سوائے لیلیٰ کے کیونکہ وہ میرے پاس ایڈ ہو گئی تھی۔ جیسے ہی وہ آن لائن ہوتی مجھے پتا چل جاتا۔ اپنے کام نمٹانے کے دوران میں وقفے وقفے سے دیکھتا رہا تھا کہ وہ آن لائن ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ دوپہر تک نہیں آئی تھی شاید گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ لنچ کے بعد نیچے کے راؤنڈ پر جاتے ہوئے میں نے لیپ ٹاپ پر اسکرین سیور پاس ورڈ کے ساتھ لگا دیا۔ تاکہ کوئی میرے کمرے میں آئے بھی تو اسے کھول نہ سکے۔ راؤنڈ سے واپس آ کر میں نے لیپ ٹاپ دیکھا تو خوش ہو گیا۔ لیلیٰ آن لائن تھی اور اس نے میسج کیے ہوئے تھے۔ ''ہائے...... کیسے ہیں...... کب سے لاگ ان ہیں؟''

''ہائے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو؟...... میں تو صبح نو بجے سے لاگ ان ہوں۔''

اس نے ہنسی کا سائن بنایا۔ ''ہائے اللہ اتنی بے تابی؟''

میں جھینپ گیا۔ ''ہاں، وہ بس آتے ہی سائٹ کھول کر لاگ ان ہو گیا۔ کیا تم دیر سے ہوتی ہو؟''

''ہاں میں عام طور سے دوپہر میں تین بجے تک آتی ہوں کیونکہ دوپہر کا کھانا اور کچن میری ذمے داری ہے۔ اس سے نمٹ کر کمرے میں آتے آتے تین بج جاتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے اب میں بھی تین بجے ہی آؤں گا۔''

''نہیں۔'' اس نے جلدی سے لکھا۔ ''آپ نو بجے آ جائے گا۔ میں گیارہ بجے تک فارغ ہوتی ہوں اس کے بعد میرا کام شروع ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پاس صبح وقت ہوتا ہے تو ہم بات کر سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے صبح بھی گپ شپ کر لیا کریں گے۔''

''آپ یوں طے کر رہے ہیں جیسے ہمارے درمیان پکی دوستی ہو گئی ہے۔''

میں بے چین ہو گیا۔ ''تو کیا پکی نہیں ہوئی ہے؟''

اس بار اس نے شرارتی سائن دیا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے عورت اتنی جلدی راضی ہو جاتی ہے۔''

''میں نے تو سنا ہے عورت ایک نظر میں مان جاتی ہے۔''

''وہ تو محبت کے بارے میں کہا گیا ہے۔''

''اس میں دوستی بھی شامل کر لو۔''

''جی نہیں دوستی سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے۔'' اس نے لکھا۔ ''چند ایک مرد جو آغاز میں اتنے سوبر تھے کہ مجھے سسٹر تک کہہ دیا تھا مگر جب میں بے تکلف ہوئی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔''

''تب تم نے ایسے آپے سے باہر ہونے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟''

''میں نے ان کو بلاک کر دیا۔ وہ آئی ڈی بدل کر آئے مگر میں نے بات نہیں کی۔''

''ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مانو؟''

''پوچھیں۔''

''آج کل تمہاری کتنے افراد سے بات ہو رہی ہے؟''

''کل تک آپ سمیت تین افراد سے تھی۔''

''اور اب؟''

''آج صرف آپ سے ہے۔ آنے والے وقت کا میں کہہ نہیں سکتی کہ کس سے ہو گی یا نہیں ہو گی۔''

''تم صاف گو لڑکی ہو۔''

''میں عورت ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں لیکن دیکھنے میں لڑکی لگتی ہو۔ آئینہ بھی عورت ہے مگر دیکھنے میں لڑکی لگتی ہے۔''

''آپ نے ٹھیک کہا، شاید اس لیے کہ اس کے بچے نہیں ہیں۔'' لیلیٰ نے لکھا۔ ''بچے ہونے کے بعد بہت کم عورتیں لڑکیوں جیسی لگتی ہیں۔''

''شاید اس لیے کہ ہمارے ہاں عورتیں اپنی کیئر نہیں

کرتی ہیں۔‘‘

’’کر بھی نہیں سکتی ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’ہمارے ہاں عورت پر دوسری ذمے داریاں اتنی ہوتی ہیں کہ اس کے لیے اپنے پاس وقت بچتا ہی نہیں ہے۔‘‘

میں لیلیٰ سے گفتگو میں ایسا منہمک ہوا کہ مجھے آفس میں اپنی ذمے داریوں کا خیال ہی نہیں رہا۔ پھر نیچے سے کال آئی تو مجھے ہوش آیا۔ آدھے گھنٹے میں کام نمٹا کر میں دوبارہ سائٹ پر آگیا اس دوران میں لیلیٰ نے یہ کیا کہ اس نے اپنی مزید تصویریں البم میں ڈال دی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا اور میں نے البم کھول کر دیکھا۔ اس بار اس نے زیادہ تیاری والی تصویریں ڈالی تھیں ان میں وہ شاید کسی شادی کی تقریب میں تھی۔ جیسا کہ آج کل رواج چل نکلا ہے کہ عام خواتین اور لڑکیاں بھی شادیوں میں کھلے گلے والے لباس پہننے لگی ہیں اور دوپٹا ان کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ لیلیٰ نے چھوٹی سی کرتی کے ساتھ لہنگا پہنا ہوا تھا اور اس میں دوپٹا غائب تھا۔ چست کرتی کے سیاہ کروشیا والے گریبان سے اس کا دودھیا رنگ بہت نمایاں تھا۔ میں نے اس تصویر کی تعریف کی تو وہ کھل اٹھی۔ ’’سچ میں بہت اچھی لگ رہی ہوں؟‘‘

’’ہاں اچھی تو لگ رہی ہو لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔‘‘

’’وہ کیا؟‘‘

’’یہی کہ تم خواتین اس قسم کے لباس میں نہ تو گھر سے باہر نکلتی ہو اور نہ ہی گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس کے سامنے آتی ہو لیکن شادی کی تقریب میں سینکڑوں مردوں کے سامنے دوپٹے سے بے نیاز اور کھلے گلوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہو۔‘‘

’’آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں خود بھی ایسا ہی کرتی ہوں اور ایسے سوٹ کیا عام لباس میں بھی بغیر دوپٹے کے باہر یا گھر میں آنے والوں کے سامنے نہیں جاتی۔ مگر شاید یہ ہمارے ہاں رواج بن گیا ہے اور جو چیز رواج بن جائے وہ عجیب نہیں لگتی ہے۔‘‘

’’آئینہ شادی یا تقریب میں بھی ایسی ڈریسنگ نہیں کرتی ہے اس کا دوپٹا ہمیشہ سر اور سینے پر رہتا ہے۔‘‘

’’سب عورتیں نہیں کرتی ہیں مگر کچھ کرتی ہیں۔‘‘ اسے شاید میری بات بری لگی۔ ’’آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آئینہ زیادہ شریف عورت ہے۔‘‘

میں نے معذرت کی۔ ’’سوری اگر تمہیں یہ بات بری لگی۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا اور تم ٹھیک کہہ رہی ہو اکثر عورتیں ایسا نہیں کرتی ہیں خود میری بھابیاں اور بہنیں کھلے جلیے میں شادیوں میں شرکت کرتی ہیں اور اس وقت ہمیں عجیب نہیں لگتا ہے۔‘‘

’’میں نے برا نہیں مانا۔‘‘ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ’’آپ بتائیں آپ کو کیا اچھا لگتا ہے؟‘‘

’’میں اچھا یا برا کا فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے یہ اچھا بھی لگتا ہے اور نہیں بھی لگتا۔ اصل بات جو مجھے کھٹکتی ہے وہ دوہرا معیار ہے۔ کیا وجہ ہے کہ عورتیں اور لڑکیاں شادیوں اور تقریبات میں اپنی یوں نمائش کرتی ہیں جب کہ عام حالات میں وہ ڈھک چھپ کر رہتی ہیں۔‘‘

’’میں نے کہا نا یہ رواج بن گیا ہے۔‘‘ وہ بولی۔ ’’ایک زمانے میں گھروں میں عورتیں مردوں کے ساتھ بیٹھ کر فلم یا ٹی وی شوز نہیں دیکھتی تھیں خاص طور سے باپ بھائیوں کے ساتھ مگر اب یہ رواج بدل گیا ہے وہ سب بیٹھ کر دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔‘‘

اسی گفتگو میں وقت ہو گیا اور میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ میں نے لیلیٰ کو خدا حافظ کہا۔ سیلز والوں سے رپورٹ طلب کی اور اسے ہیڈ آفس روانہ کر کے میں خود بھی گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ کال بیل کے جواب میں آئینہ نے ذرا دیر سے دروازہ کھولا۔ وہ تروتازہ اور تیار تھی۔ اس نے نہا کر تازہ سوٹ پہنا تھا۔ میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ’’خیریت آج بہت تیار ہو؟‘‘

’’ہاں میرا دل چاہ رہا تھا۔‘‘ اس نے کہا۔ ’’آپ فریش ہو جائیں تو میں کھانا لگا دوں۔‘‘

آئینہ عام طور سے دوپہر میں نہا لیتی تھی اور اسی وقت کپڑے بھی بدلتی تھی۔ اگر موسم اچھا ہوتا تو دو دن بعد نہاتی اور کپڑے بدلتی تھی۔ ان دنوں جون کا آخر تھا اور گرمی شدت کی تھی اس لیے وہ روز ہی نہا رہی تھی مگر میں نے پہلی بار اسے شام میں نہاتے اور کپڑے بدلتے دیکھا تھا۔ میں فریش ہو کر آیا تو اس نے میز پر کھانا لگا دیا تھا۔ آج اس نے مٹن کڑاہی اور ساتھ میں فرنی بنائی تھی۔ دونوں میری پسند کی چیزیں تھیں۔ میرا موڈ مزید خوشگوار ہو گیا اور میں نے ڈنر کے بعد باہر چلنے کا کہا تو آئینہ خوش ہو گئی تھی۔ ’’سچ آج میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ ہم کہیں باہر جائیں۔ میں آپ سے کہنے والی تھی مگر آپ نے پہلے ہی میری خواہش پوری

کردی۔“
”کہاں چلیں؟“
”جناح سپر مارکیٹ وہاں آئسکریم فالودہ بہت اچھا ملتا ہے۔“
ہم باہر آئے اور جناح سپر مارکیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ کھانے کی سب سے اچھی چیزیں وہیں ملتی تھیں۔ میں نے آئینہ کی فرمائش پر آئسکریم فالودہ لیا۔ وہاں کھلی جگہ میزیں اور کرسیاں بھی تھیں۔ ہم ان پر بیٹھ کر فالودہ آئسکریم سے لطف اندوز ہونے لگے تھے۔ ہماری طرح بے شمار لوگ یہاں کھانے پینے آئے ہوئے تھے۔ اسی طرح شاپنگ کرنے والے بھی تھک کر یہاں تھکن کے ساتھ بھوک پیاس مٹانے آجاتے تھے۔ ہماری طرح بہت سے لوگ تھے۔ مگر سب آپس میں مگن تھے۔ میں ماحول سے بھی لطف اٹھا رہا تھا کہ اچانک میری نظر سامنے والی میز پر گئی وہاں لیلیٰ بیٹھی تھی۔ پہلے مجھے اپنی آنکھوں پر شبہ ہوا کہ آج میں نے اسے تصویروں میں بہت دیکھا تھا اس لیے مجھے اس عورت پر لیلیٰ کا گمان ہو رہا تھا۔ مگر جب میں نے غور کیا تو وہ لیلیٰ ہی تھی۔ اس نے سوٹ بھی وہ پہنا ہوا تھا جو ایک تصویر میں وہ پہنے ہوئے تھی۔

اس کے ساتھ ایک کسی قدر بڑی جسامت کا مگر فٹ آدمی تھا۔ اس نے ٹی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی جو اس کے باڈی بلڈرز جیسے جسم پر پھنسی ہوئی تھی اور وہ دل جمعی سے سامنے موجود پلیٹ سے تکہ کھا رہا تھا۔ لیلیٰ کے سامنے دہی بڑے کی پلیٹ تھی۔ وہ برائے نام کھا رہی تھی جیسے اس کا دل نہ چاہ رہا ہو۔ وہ دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ لیلیٰ مجھے پوری نظر آرہی تھی جب کہ اس کے ساتھ بیٹھا مرد پشت سے اور چہرے کے ایک رخ سے ذرا سا دکھائی دے رہا تھا۔ آئینہ فالودہ آئسکریم کھا رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ میں رکا ہوا ہوں تو اس نے کہا۔
”آپ کھا کیوں نہیں رہے یہ تو پگھل جائے گی۔“
میں چونکا اور کھانے لگا۔ اب میں چوری چوری لیلیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھی اور جب آدمی کچھ کہتا تو وہ بات کرتی تھی۔ آدمی کی جسامت کی طرح اس کی آواز بھی بھاری تھی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ آئینہ آرام سے کھا رہی تھی اور میں نے درمیان میں رکنے کے باوجود اپنا کپ جلدی خالی کر دیا تھا۔ میں نے آئینہ سے پوچھا۔
”چاٹ کھاؤ گی یہاں کی چاٹ بھی بہت مشہور ہے۔“

”گنجائش نہیں ہے لیکن آپ بھی کھائیں تو میں کھا لوں گی۔“
”میں ابھی لے کر آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر لیلیٰ والی میز سے ذرا فاصلے پر چاٹ والی شاپ پر پہنچا یہاں چاروں طرف کھانے پینے کی دکانیں تھیں۔ میں نے اس سے ایک چاٹ اور دو عدد کولڈ ڈرنک لیں۔ واپس میں لیلیٰ کی میز کے پاس سے آیا اور اس بار میں نے آدمی کو قریب سے دیکھا۔ وہ موٹے نقوش اور پہلوانوں جیسے جسم والا آدمی تھا۔ نازک اندام لیلیٰ اس کے سامنے ایسی لگ رہی تھی جیسے گینڈے کے سامنے ہرنی لگ سکتی ہے۔ قریب سے گزرتے ہوئے میں نے سنا آدمی کہہ رہا تھا۔ ”تم کھا کیوں نہیں رہی ہو؟“
”بس میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ لیلیٰ نے چمچ چھوڑ کر ٹشو اٹھالیا۔ اس دوران میں میں ان کے پاس سے ہو کر چلا گیا تھا۔ اگر وہ لیلیٰ کا شوہر تھا تو یہ بے جوڑ سی شادی تھی وہ عمر میں بھی اس سے بڑا لگ رہا تھا۔ مگر عمر اور شکل صورت ثانوی چیزیں ہوتی ہیں اصل چیز میاں بیوی کی ہم آہنگی ہوتی ہے اگر وہ ان میں ہوتی تو لیلیٰ یوں ڈیٹنگ سائٹ پر مردوں سے دوستی کرتی نہ پھر رہی ہوتی۔ جب میں آکر کرسی پر بیٹھا تو آدمی اسے کچھ سنا رہا تھا اور لیلیٰ کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان وہ بے عزتی کو زیادہ شدت سے محسوس کر رہی تھی اور مجھے اس آدمی پر غصہ آنے لگا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جا کر اسے سنادوں کہ وہ ہجوم میں بیٹھ کر اپنی بیوی کی بے عزتی کر رہا تھا۔ مگر اسی لمحے وہ اٹھ گئے۔ آئینہ کی آواز نے مجھے چونکایا۔
”کیا بات ہے آپ کہاں گم ہو رہے ہیں کیا یہاں مجھ سے بھی زیادہ کوئی خوب صورت عورت ہے۔“
میں جھینپ گیا۔ ”نہیں اصل میں ایک دفتری مسئلہ بار بار ذہن میں آرہا ہے۔ سوری اب بالکل نہیں غائب ہوں گا۔“
میں نے آئینہ کے ساتھ چاٹ کی پلیٹ شیئر کی اور بہت مزہ آیا۔ اس میں مرچیں کچھ تیز تھیں اور ہم ہر چمچ کے بعد کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ لیتے تھے۔ پلیٹ اور کولڈ ڈرنک دونوں ختم ہو گئیں مگر مرچیں لگی جا رہی تھیں اس لیے روانگی سے پہلے میں نے دو وٹن اور لیے تھے۔ وہ ہم نے راستے میں ختم کیے تو چین آیا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی میں خوشگوار موڈ

میں رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آئینہ مجھ سے بات کرے گی۔ سچ بات ہے کہ میرا بھی اس سے بات کرنے کا موڈ ہو رہا تھا مگر اس کی بجائے اس نے گھر آکر کپڑے بدلے اور اپنا ٹیب اٹھا کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ میں نے کپڑے بدلے اور واش روم سے آکر ڈرائنگ روم میں جھانکا تو وہ نہایت انہماک سے ٹیب پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''سونے کا ارادہ نہیں ہے گیارہ بج رہے ہیں؟''

''آپ سو جائیں۔'' اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ''میں کچھ دیر بعد سوؤں گی۔''

میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ آج میں نے آئینہ کو ٹیب لیے دیکھا تھا ورنہ وہ رات کو جلدی سونا پسند کرتی تھی۔ عام طور سے میرے ساتھ یا مجھ سے پہلے ہی لیٹ جاتی تھی۔ میرے آنے کے بعد وہ موبائل یا ٹیب استعمال نہیں کرتی تھی بلکہ ٹی وی بھی کم ہی دیکھتی تھی اور دیکھتی تو میرے ساتھ ہی دیکھتی تھی۔ جب سے میں نے نیٹ لگوایا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ رات کے وقت بھی نیٹ استعمال کر رہی تھی اس کا اندازہ مجھے اس کی ٹیب پر چلتی انگلیوں سے ہوا جیسے وہ کچھ لکھ رہی ہو۔ ظاہر ہے صرف انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے آدمی کچھ لکھتا ہے۔ جیسے ویب ایڈریس یا سرچنگ کے لیے کچھ لکھتا ہے۔ میں تھک گیا تھا اس لیے لیٹا اور کچھ دیر بعد سو گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ آئینہ کب میرے برابر میں آکر لیٹی۔ مگر صبح اس کی آنکھ خود نہیں کھلی تھی بلکہ میں معمول کے مطابق جاگا تو وہ سو رہی تھی اور میں نے اسے ہلایا۔

''آج ناشتا نہیں دینا کیا؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ اٹھی اور بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے بولی۔ ''ہاں ٹھیک ہوں، آپ واش روم سے ہو آئیں تب تک میں ناشتہ بناتی ہوں۔''

میں واش روم میں سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اتنی دیر تک جاگتی رہی تھی کہ صبح وقت پر اس کی آنکھ ہی نہیں کھلی۔ ورنہ آئینہ صبح خود اٹھ جاتی تھی اور اس کی عادت اتنی پختہ تھی کہ اسے الارم لگانے کی ضرورت بھی نہیں پیش آتی تھی۔ میں واش روم سے آیا تو وہ ناشتا لگا چکی تھی۔ مگر اس نے صرف میرا ناشتہ بنایا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تم ناشتا نہیں کرو گی۔''

''میرا موڈ نہیں ہے رات اتنا کھا لیا تھا کہ پیٹ ابھی تک بھرا ہوا لگ رہا ہے۔ آپ کے جانے کے بعد میں آرام کروں گی۔''

''تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی ہے کیا تم رات دیر تک جاگتی رہی تھیں؟''

''نہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں بارہ بجے تک آکر سو گئی تھی۔''

''تم نے رات کو نیٹ استعمال کیا کل کوئی خاص بات تھی۔''

''ہاں فیس بک پر تھی کچھ فرینڈز ہیں جو امریکا اور کینیڈا میں ہوتی ہیں وہ رات کے وقت ہی ملتی ہیں۔''

میری اطلاع کے مطابق اس کی ایسی کوئی بہت قریبی دوست نہیں تھیں جو کینیڈا اور امریکا میں تھیں اور رات کے وقت ہی دستیاب ہوتی تھیں۔ اصولاً تو ان کا نیٹ کا وقت ہمارے ہاں صبح کا وقت ہوتا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں آئی لیکن میں نے خاص توجہ نہیں دی۔ میں دفتر جا رہا تھا اور مجھے لیلیٰ کا خیال آرہا تھا۔ میں بے چین تھا کہ اس سے کل رات کی بات کروں۔ ناشتا کر کے میں دفتر روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر میں نے لیپ ٹاپ پر ڈیٹنگ سائٹ کھول لی۔ آج لیلیٰ موجود تھی۔ اس نے پہلے کہا۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں لیکن کل تمہیں دیکھا تو تم ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں۔''

وہ چونکی۔ ''آپ نے کہاں دیکھ لیا۔''

''کل میں اور آئینہ جناح سپر آئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''تم شاید اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھیں۔ بڑے جثے والا آدمی جو تمہارے ساتھ ذرا بھی میچ نہیں کر رہا تھا۔''

''لیکن بدقسمتی سے وہ میرا شوہر رئیس ہمدانی ہے۔'' لیلیٰ کے الفاظ تلخ سے تھے۔ ''مگر آپ کہاں تھے کاش کہ مجھے پتا ہوتا کہ آپ آئے ہیں تو میں آپ کو دیکھتی۔''

''میں تمہارے سامنے تھا مگر تم وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھیں۔''

''آپ نے ٹھیک کہا کیونکہ رئیس مجھے زبردستی لایا تھا میرا بالکل موڈ نہیں تھا۔''

''زبردستی کیوں لایا تھا؟''

لیلیٰ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے لکھا۔ ''وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے کسی کو دکھانا ہے۔''

''کسی کو دکھانا ہے؟'' میں سمجھا نہیں تھا۔

''اس کی کسی عورت سے دوستی ہے اور وہ اسے دکھانا

چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کیسی ہے۔''
میں حیران رہ گیا تھا۔ ''یہ کس قسم کا شوہر ہے۔''
اس نے ہنسی کا سائن بنایا۔ ''مجھ جیسی بیوی کا شوہر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اس سے چھپ کر کئی مردوں سے نیٹ پر دوستی کی ہے۔ وہ مرد ہے اور کھل کر کسی عورت سے مل بھی سکتا ہے۔''
میں کچھ دیر کے لیے چپ ہوا تھا پھر میں نے پوچھا۔
''تمہارے خیال میں یہ مکافات عمل ہے؟''
''ہاں کل رات جب اس نے گھر آکر مجھے یہ بات بتائی تو مجھے ایسا ہی لگا تھا۔''
''وہ وہاں تمہیں ڈانٹ بھی رہا تھا؟''
''ہاں، وہ کہہ رہا تھا کہ میں خود کو سمجھتی کیا ہوں۔ کیا میں ہی دنیا میں ایک حسین عورت رہ گئی ہوں جو اس کے ساتھ یوں نخرے دکھاتی ہوں۔ اس نے کہا کہ دنیا میں ایک سے بڑھ ایک حسین عورت ہے۔ گھر آکر اس نے مجھے اس عورت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ حسین ہے۔''
''وہ جھوٹ کہتا ہے تمہیں جلانا چاہ رہا ہے۔ تم کسی سے کم نہیں ہو۔''
''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رئیس ایسا آدمی نکلے گا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ اسے عورتوں سے دلچسپی نہیں ہے اور وہ تو مجھ پر بھی زیادہ توجہ نہیں دیتا ہے۔ بیٹھ کر دو منٹ بات نہیں کرتا ہے اور نہ کہیں لے کر جاتا ہے۔ جب کل اس نے چلنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا تب اس نے مجھے زبردستی تیار کرایا اور ساتھ لے کر آیا تھا۔''
مجھے لیلیٰ کے شوہر پر غصہ آرہا تھا۔ وہ نہ جانے کس قسم کا شخص تھا اس کی بیوی اتنی حسین تھی اور وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے اندر سے ایک آواز ابھری۔ ''حسین تو آئینہ بھی کم نہیں ہے مگر تم دوسری عورت کے چکر میں ہو۔''
میں نے گھبرا کر سوچا کہ میں نے لیلیٰ سے صرف دوستی کی ہے۔ اندر کی آواز نے جواب دیا۔ ''ضروری نہیں ہے کہ عورت سے جسمانی تعلقات قائم کیے جائیں۔ اگر تم اپنی بیوی سے چھپ کر کسی دوسری عورت سے بات کر رہے ہو تو یہ بھی بے وفائی ہے۔ اگر آئینہ ایسا ہی کرے تو کیا تم اس بات کو پسند کرو گے۔''
میں نے تسلیم کیا کہ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ اب میں نے اس زاویے سے سوچا تو مجھے رئیس اور لیلیٰ دونوں ہی برابر کے قصوروار نظر آئے تھے۔ دونوں اپنے جائز رشتے کو چھوڑ کر دوسروں سے ناجائز رشتے قائم کر رہے تھے اور یہی غلطی میں بھی کر رہا تھا۔ تب مجھے خیال آیا کیا آئینہ ایسا کر سکتی ہے؟ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے اس کی رات کی سرگرمی یاد آئی جب وہ ٹیب لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی تھی اور صبح وقت پر اس کی آنکھ بھی نہیں کھلی تھی۔ یہ سوچ ذہن میں آتے ہی مجھے بے چینی سی ہونے لگی تھی۔ لیلیٰ کا میسج آیا تو میں چونکا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''آپ نے کچھ کہا نہیں۔''
''کیا کہوں، میں تو اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''اگر آئینہ کسی آدمی سے یوں چھپ کر نیٹ پر بات کرے تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔''
''مگر یہاں تو میرا شوہر بھی بے وفا نکل آیا ہے۔'' وہ بولی۔ ''اگر میں نے غلطی کی ہے تو اس نے بھی تو غلطی کی ہے۔''
''وہ اس عورت میں کس حد تک انوالو ہے؟''
''پتا نہیں لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت بہت حسین ہے۔''
''شاید یہ اس کا خیال ہے آدمی کو دوسرے کی بیوی زیادہ اچھی لگتی ہے۔''
''آپ کا مطلب ہے کہ وہ عورت مجھ سے زیادہ خوب صورت نہیں ہوگی لیکن پرائی عورت ہے تو اس لیے رئیس کو زیادہ خوب صورت لگ رہی ہے۔''
''ہاں میرا یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ آئینہ لیلیٰ سے زیادہ حسین تھی لیکن لیلیٰ میں مجھے زیادہ کشش محسوس ہوئی تھی۔ وجہ وہی تھی کہ پرائی عورت زیادہ اچھی لگتی ہے۔ میں بے چین ہونے لگا تو کیا آئینہ کسی اور کو زیادہ اچھی لگتی ہوگی۔ دراصل لیلیٰ کی اس بات نے مجھے زیادہ بے چین کر دیا تھا کہ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس بات کو مکافات عمل سمجھتی ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ اس طرح اگر میں آئینہ سے چھپ کر لیلیٰ سے رابطہ رکھے ہوئے تھا تو اس کا بھی کوئی مکافات عمل ہوتا اور آئینہ بھی مجھ سے چھپ کر کسی سے دوستی کرتی۔ ممکن ہے اگر آئینہ گزشتہ رات دیر تک ٹیب لے کر ڈرائنگ روم میں نہ بیٹھی رہتی تو میرے ذہن

میں یہ خیال نہ آتا۔ مگر اب یہ خیال اتنی شدت سے میرے دماغ میں تھا کہ میں نے گھبرا کر آئینہ کو کال کر دی۔ اس نے خاصی دیر بعد کال ریسیو کی۔

''کہاں تھیں تم؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اتنی دیر سے بیل بج رہی تھیں۔''

''کیا کہہ رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''تین بیل کے بعد ہی اٹھالیا۔ کچن میں تھی اور خیریت آج کیسے یاد کرلیا۔''

میں اپنے انداز پر جھینپ گیا اس لیے شرمندگی مٹانے کے لیے کہا۔ ''وہ میں نے سوچا کہ آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔''

''باہر مگر ہم کل ہی تو باہر سے ہو کر آئے ہیں اور آج تو چھٹی کا دن بھی نہیں ہے۔''

''ہاں لیکن میں آجاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم تیار رہنا۔''

''کتنے بجے تک؟''

''میں سات بجے تک آجاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا اور کال کاٹ دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں نے اسے باہر ڈنر کا کہہ دیا۔ شاید میں تلافی کرنا چاہ رہا تھا کہ میں نے اس سے چھپ کر ایک عورت سے رابطہ رکھا ہوا تھا۔ لیلیٰ گیارہ بجے چلی گئی کہ اسے دوپہر کا کھانا بنانا تھا۔ میں اپنے کاموں میں لگ گیا۔ آج اتفاق سے کام خاصا تھا۔ ہیڈ آفس سے کئی انکوائریز آئی تھیں ان کا جواب دینا تھا پھر یہاں ڈیلرز کی طرف سے ایک میٹنگ کی درخواست تھی ان کے نمائندے سے بھی بات کرنا تھی۔ یہ سب نمٹاتے ہوئے تین بجے جا کر مجھے لنچ کا موقع ملا۔ اس کے بعد میں فارغ ہوا تو مجھے لیلیٰ کا خیال آیا مگر میں لاگ ان نہیں ہوا۔ میرے اندر سے آواز آرہی تھی کہ مجھے اس سلسلے کو یہیں روک دینا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود میں نے خود کو بڑی مشکل سے روکا۔ کتنی بار میرا ہاتھ لیپ ٹاپ کی طرف بڑھا تھا اور میں نے روک لیا۔

پھر دفتر والوں کی طرف سے کچھ کام آگئے اور میں ان کو نمٹانے لگا۔ چھ بجے میں نے سوچا کہ کشمکش میں بیٹھے رہنے سے بہتر ہے میں گھر چلا جاؤں۔ آئینہ سے سات کا کہا تھا لیکن میں چھ بجے بھی چلا جاتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے سیلز والوں سے کہا کہ وہ اپنا کام مکمل کر کے جائیں میں رپورٹ کل بنالوں گا۔ میں دفتر سے نکلا اور پندرہ منٹ بعد فلیٹ کے دروازے پر تھا۔ کال بیل کے جواب میں دو منٹ بعد آئینہ کی آواز آئی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ کون ہے میں نے جواب دیا تو اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ ''آپ...... لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ سات بجے آئیں گے؟''

''کہا تھا لیکن آفس سے جلدی فری ہو گیا اس لیے جلدی آگیا۔'' میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا کر رہی ہو؟''

''میں شاور لینے جا رہی ہوں۔'' اس نے کہا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے لیپ ٹاپ میز پر رکھا اور اندر آیا۔ آئینہ واش روم میں جا چکی تھی۔ میں الماری کھول کر اپنا لباس نکال رہا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے آئینہ کا ٹیب دیکھا مگر وہ یہاں نہیں تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ صوفے کے عقب میں قالین پر رکھا تھا اور چارج ہو رہا تھا۔ ساکٹ وہیں تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر آن کیا۔ فیس بک کا بٹن دبایا تو وہ لاگ ان ہی تھی۔ میں نے اس کا پیج چیک کیا۔ اگر وہ رات کے وقت واقعی اپنے امریکا اور کینیڈا والی دوستوں سے بات کر رہی تھی تو یہ فیس بک پر ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کے پیج پر مجھے ایسی کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ یعنی اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں ٹیب بند کر کے واپس رکھنے جا رہا تھا کہ مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اسے پھر اٹھایا۔

اس بار میں نے اس کے میسج کھولے اور ان میں اس کی تین مختلف خواتین سے بات چیت موجود تھی۔ یہ تینوں امریکا اور کینیڈا میں تھیں اور ان کی باتوں سے ظاہر تھا کہ ان میں پرانی دوستی تھی۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ آئینہ اولاد کے حوالے سے پریشان تھی اور ان سے پوچھ رہی تھی کہ کیا کوئی دوا ہے جو اس سلسلے میں مدد کر سکے۔ اس نے دبے لفظوں میں میری بے اعتنائی اور اپنی تنہائی کا شکوہ بھی کیا تھا۔ مگر اسے اچھالا نہیں تھا۔ اس کی دوست بھی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اسے مشورے دیئے تھے کہ وہ ایک بار کسی اچھی گائنا کولوجسٹ کو دکھائے اور اس کے مشوروں پر عمل کرے کیونکہ اس میدان میں میڈیکل سائنس نے بہت ترقی کر لی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ آئینہ واش روم سے نکل آئی اور اس کی آواز سن کر میں نے جلدی سے ٹیب آف کر کے اپنی جگہ رکھ دیا۔ میں نے کپڑے بدلے اور ہم باہر نکل گئے۔ آئینہ نے شاید میرا بدلا ہوا رویہ محسوس کر لیا تھا اس نے ایک سنسان

جگہ سر میرے شانے پر رکھ دیا۔
"میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔"
"میں سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ کسی اچھی گائنا کولوجسٹ سے رابطہ کرتے ہیں۔ بے شک ساڑھے تین سال سے زیادہ عرصہ ہوا ہے مگر یہ زیادہ دیر نہیں ہے لوگوں کے ہاں تو دس اور پندرہ سال بعد بھی اولاد ہوتی ہے۔"
"سچ میں؟" وہ خوش ہوگئی۔
"ہاں میں کل ہی سے تلاش شروع کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اس رات ڈنر کے دوران ہم نے بہت عرصے بعد بہت ساری باتیں کیں اور جب واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ اگلے دن میں نے دفتر جاتے ہی سب سے پہلے ڈیٹنگ سائٹ کھولی۔ حسب توقع لیلیٰ موجود تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ "آپ کہاں تھے کل دوپہر میں بھی نہیں آئے۔"
"اب میں کبھی نہیں آؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے احساس ہوگیا ہے کہ میں نے غلط کام کیا اور اپنی بیوی کو دھوکا دیا ہے۔"
"تب میرا کیا ہوگا۔" وہ روہانسی ہوگئی اس نے رونے والا سائن بنایا تھا۔ "میں آپ سے منسلک ہوگئی ہوں۔"
"لیلیٰ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں اور تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ یہ سلسلہ یہیں روک دو۔ گھر سے باہر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ رئیس جیسا بھی ہے تمہارا شوہر ہے اور اگر تم اس کے ساتھ نہیں رہ سکتیں تو دوسرے راستے ہیں مگر جو راستے گھر سے باہر ہوں وہ ہمیشہ کسی کھائی یا دیوار پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہے۔"
لیلیٰ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر رئیس جو کر رہا ہے؟"
"یہ اس کا اپنا فعل ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے مجھے سمجھ آئی ہے اسی طرح اسے بھی سمجھ آسکتی ہے۔ توفیق تو اوپر والا ہی دیتا ہے۔ اگر تم یہ راہیں چھوڑ دوگی تو ہوسکتا ہے کہ وہ بھی تمہاری طرف پلٹ آئے۔"
"لیکن آپ جو میرے لیے ہو چکے ہیں اس کا کیا ہوگا؟"
"مجھے بھول جاؤ سمجھ لو کہ میں زندگی کے طویل سفر میں راستے میں آنے والا ایک سایہ دار درخت تھا اور درخت کتنا ہی سایہ دار کیوں نہ ہو مسافر اس کے نیچے بس ستانے کے لیے ہی رکتا ہے۔"
"تو آپ مجھ سے کبھی نہیں بات کریں گے؟"
سچی بات ہے کہ میں دل پر جبر کرکے یہ سب کر رہا تھا اور ان چند دنوں میں اس نے میرے اندر ایک مقام بنالیا تھا۔ میں نے بادل ناخواستہ کہا۔ "مناسب یہی ہے۔ اس تعلق کا کوئی قانونی، اخلاقی اور معاشرتی جواز نہیں ہے اس لیے اس کا ختم ہوجانا ہی مناسب ہوگا۔"
اس نے کچھ دیر بعد لکھا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... اللہ حافظ۔"
"ایسے نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "جانے سے پہلے مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"
"میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب کسی اجنبی مرد سے بات نہیں کروں گی اپنی راہ گھر کے اندر ہی تلاش کروں گی۔" اس نے جواب دیا وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس سے کیا وعدہ لینے جا رہا تھا۔
"شکریہ، مجھے یقین ہے تمہیں گھر کے اندر ہی خوشی ملے گی۔" میں نے کہا۔ "میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گا اور تمہارے لیے دعا کروں گا...... خدا حافظ۔"
"میں بھی آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"
میں نے ڈیٹنگ سائٹ کو ہمیشہ کے لیے بند کیا تو اندر سے ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ جب کہ پہلے میرا خیال تھا کہ میرا دل بوجھل ہوگا۔ مگر شاید غلط راہ سے نکلنے کے بعد انسان ایسا ہی محسوس کرتا ہے۔ آج اس بات کو تقریباً ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے۔ اللہ نے پھر میرے قدموں کو مضبوط رکھا اور مجھے کبھی کسی دوسری عورت سے دوستی کرنے کا خیال نہیں آیا۔ میں نے ایک اچھی اور ماہر گائنا کولوجسٹ تلاش کی تھی۔ دو مہینے بعد آئینہ امید سے ہوگئی تھی اور آج ہمارا سات مہینے کا بیٹا ہے۔ سال بھر بعد میں واپس لاہور آگیا تھا اور اب اپنوں کے ساتھ ہوں۔ اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے اور کوئی کمی نہیں ہے۔ کبھی کبھی لیلیٰ کا خیال آتا ہے تو دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ اسے سیدھی راہ پر رکھے اور اس کی مشکلات آسان کرے۔ صرف اسے ہی نہیں بلکہ ان تمام عورتوں اور مردوں کو سیدھی راہ دکھائے جو اپنی شریک سفر سے کسی وجہ سے دور ہوگئے ہوں اور اجنبی راستوں پر بھٹک رہے ہوں۔

ماماز بوائے

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
میری زندگی کسی ناول یا فلم سے کم نہیں۔ ایسے ایسے موڑ آئے ہیں کہ جب میں غور کرتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں کہ یہ سب میرے ساتھ رونما ہوا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں اگر سرگزشت کے معیار کی ہے تو اسے شاملِ اشاعت بھی کرلیں۔

مسز فواد
(اسلام آباد)
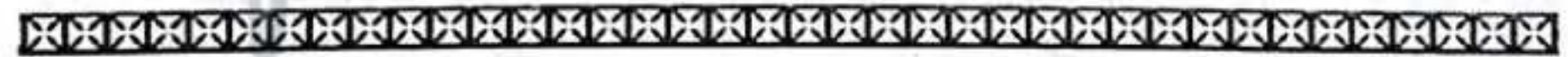
رات کے آٹھ بج رہے تھے لیکن فرہاد کا کہیں پتا نہیں تھا۔ وہ عموماً چھ بجے سے پہلے ہی گھر آجاتا تھا اور اگر کبھی دیر ہوجائے تو مجھے فون کرکے بتا دیتا تھا لیکن اس روز نہ جانے کیا بات ہوئی کہ اس نے فون کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ باہر بارش بھی زوروں پر تھی اور ایسے موسم میں بائیک چلانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے جنم لے رہے تھے۔ باہر بجلی کڑکتی یا بادل گرجتے تو میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوجاتی اور میں رب کریم سے اپنے بچے کی سلامتی اور گھر بحفاظت واپسی کے لیے دعائیں مانگنے لگتی۔ اس وقت گھر میں تنہا تھی کام کرنے والی ماسی پانچ بجے چلی جاتی تھی اور اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی فرہاد آجاتا تھا تو مجھے تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ گھر آنے کے بعد وہ صرف ایک پیالی چائے پیتا اور پھر ٹیلی ویژن دیکھنے بیٹھ جاتا۔ رات کا کھانا وہ میرے ساتھ

ہی کھاتا۔ اسے ٹیلی ویژن دیکھنے کا بہت شوق تھا اور کھانے کے بعد بھی وہ دو تین گھنٹے مختلف اسپورٹس چینل پر اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھا کرتا۔

فرہاد میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ شادی کے چھ سال بعد ہی میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پر فائز تھے اور میں بھی ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک کالج میں لیکچرار لگ گئی تھی۔ شادی کے بعد شوہر نے اصرار کیا کہ ملازمت چھوڑ دوں لیکن میں نہ مانی۔ اچھی بھلی سرکاری نوکری تھی۔ اسے چھوڑ دینا کفرانِ نعمت ہوتا۔ لہٰذا میں نے منت سماجت کر کے انہیں راضی کرلیا۔ شادی کے ایک سال بعد فرہاد پیدا ہوا تو یہ مسئلہ ایک بار پھر کھڑا ہوگیا۔ اس بار وہ مجھے کوئی رعایت دینے پر تیار نہیں تھے لیکن اللہ بھلا کرے میری ساس کا۔ انہوں نے اس موقع پر میرا پورا ساتھ دیا اور بچے کو سنبھالنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ مجھے تین مہینے کی چھٹی ملی تھی اس دوران میں، میں نے ایک آیا کا بندوبست کرلیا تاکہ وہ فرہاد کی دیکھ بھال کرے۔ ساس کا کام صرف اس کی نگرانی کرنا ہوتا تھا۔ ویسے بھی میں ایک ڈیڑھ بجے تک گھر واپس آجاتی تھی اس لیے یہ مرحلہ بھی آسانی سے طے ہوگیا۔

زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی کہ اچانک ہی خزاں نے میرے آنگن میں ڈیرے ڈال دیے۔ میں وہ شام کبھی نہیں بھولوں گی جب میری زندگی کا ساتھی ایک حادثے کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس روز میرا دل صبح سے ہی بے چین تھا۔ بڑے برے خیالات آرہے تھے۔ میں نے فواد کی طرف دیکھا وہ حسبِ معمول خوشگوار موڈ میں دفتر جانے کی تیاری کررہے تھے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا سلیقہ مند اور نظم و ضبط کا پابند شخص نہیں دیکھا۔ عام شوہروں کی طرح وہ اپنی چیزوں کے لیے آواز نہیں دیتے تھے اور انہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ وہ عموماً رات کو ہی کپڑے استری کرلیتے، جوتوں پر پالش کرتے اور اپنا بریف کیس بھی تیار کرلیتے۔ صبح اٹھ کر انہیں صرف شیو، غسل اور ناشتا کرنا ہوتا، اسی دوران میں وہ سرسری طور پر اخبار کی سرخیاں بھی دیکھتے اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے دفتر کے لیے روانہ ہوجاتے۔

اس روز بھی میں نے معمول کے مطابق ان کے لیے ناشتا بنایا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ آج آپ دفتر نہ جائیں؟''

''کیوں؟'' وہ چونکتے ہوئے بولے۔ ''کوئی کام ہے کیا؟ یا کہیں جانا ہے؟''

''نہیں۔ کوئی کام نہیں ہے اور نہ ہی کہیں جانا ہے۔''

''پھر میں کیوں چھٹی کرلوں؟'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولے۔

''میں نہیں چاہتی کہ آج آپ دفتر جائیں۔ نہ جانے میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے۔ عجیب عجیب خیالات آرہے ہیں۔''

''بعض اوقات بدہضمی کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ شاید تم نے رات زیادہ کھالیا ہوگا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولے۔

''مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اچھا بھلا تو ہوں تم اپنے دل میں وہم کو جگہ نہ دو۔ شام کو تیار رہنا۔ ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔''

یہ کہہ کر وہ اپنا بریف کیس سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے حسبِ عادت سوتے ہوئے فرہاد کی پیشانی کو بوسہ دیا اور چلے گئے۔ میں کوشش کے باوجود انہیں نہ روک سکی۔ اس وقت تک فرہاد کی آیا بھی آچکی تھی۔ میں نے اسے معمول کے مطابق ہدایات دیں اور کالج جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ میرا پہلا پیریڈ ساڑھے نو بجے لگتا تھا۔ اس لیے آرام سے تیار ہوتی تھی۔ وین والا نو بجے آتا تھا اور میں پندرہ بیس منٹ میں کالج پہنچ جاتی تھی۔ اس دن اتفاق سے میرا ایک ہی پیریڈ تھا۔ اس لیے پرنسپل سے اجازت لے کر رکشے کے ذریعے گھر آگئی۔ شام تک میں نے اپنے آپ کو مختلف کاموں میں مصروف رکھنا چاہا لیکن دل کسی طرح قابو میں نہیں آرہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میری گھبراہٹ بڑھتی جارہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

بالآخر وہ منحوس گھڑی آہی گئی جس نے مجھے صبح سے بے چین کر رکھا تھا۔ ساڑھے پانچ یا پونے چھ کا وقت ہوگا جب ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے اپنی جگہ سے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ کس کا فون ہوسکتا ہے، فواد کا تو ہوگا نہیں، یہ تو ان کے گھر آنے کا وقت تھا۔ میں نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا اور بولی۔ ''ہیلو۔''

دوسری طرف سے مجھے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

''کیا مسز فواد بول رہی ہیں؟''

''جی ہاں! میں مسز فواد ہی ہوں۔''

''محترمہ میں...... اسپتال سے بول رہا ہوں آپ

کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ آپ فوراً اسپتال آجائیں۔''

یہ سنتے ہی مجھے زور کا چکر آیا اور ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اگر فوراً ہی صوفے کا سہارا نہ لیتی تو میں فرش پر گر سکتی تھی۔ میرے حلق سے ایک چیخ ابھری۔ چیخ کی آواز سن کر میری ساس اور دیور فراز دوڑتے ہوئے آئے اور دونوں ہی میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں انہیں حادثے کے بارے میں بتایا تو فراز فوراً ہی دروازے کی طرف دوڑا، میں بھی اس کے ساتھ اسپتال جانا چاہ رہی تھی لیکن امی نے مجھے روک دیا اور فراز اکیلا ہی اپنی بائیک پر اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی مصلّیٰ بچھا کر بیٹھ گئی اور اللہ تعالیٰ سے اپنے سہاگ کی سلامتی کی دعا مانگنے لگی۔ ایک گھنٹا گزر گیا لیکن فراز کا کہیں پتا نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کوئی فون کیا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی پھر ایمبولینس کی آواز سن کر میرا دل حلق میں آگیا۔ میں دیوانہ وار دروازے کی طرف بھاگی تو لوگ ایمبولینس سے اسٹریچر اتار رہے تھے۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسٹریچر کی طرف دیکھا۔ لاش کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میں اسٹریچر کی طرف لپکی لیکن فراز نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور بولا۔ ''بھابی! اندر جائیں بھائی جان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔''

تین دن تک مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ میں نہیں جانتی کہ اس دوران کون آیا اور کون گیا۔ لوگ آتے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے۔ تسلی دلاسے دیتے اور چلے جاتے۔ ہمدردی کے یہ بول میرے دکھ کا مداوا نہیں ہو سکتے تھے۔ میرے سامنے پہاڑ سی زندگی تھی اور ذہن میں ایک ہی سوال گردش کر رہا تھا۔ اب کیا ہو گا۔ پانچ سالہ فرہاد کو دیکھتی تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا۔ اس غریب نے دیکھا ہی کیا تھا کہ باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ ہر آنے والے کی زبان پر ایک ہی جملہ ہوتا۔ ''اب اس کی پوری ذمہ داری تم پر ہے تمہیں ماں اور باپ دونوں کا فرض نبھانا ہے۔'' یہ رسمی جملے میرے تن بدن میں آگ لگا دیتے۔ کیا میں نہیں جانتی تھی کہ فرہاد کی پوری ذمے داری میرے ناتواں کندھوں پر آن پڑی ہے۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا کہ فرہاد ہی میری زندگی ہے۔ اسے ایک اچھا اور کامیاب انسان بنانے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دوں گی۔

اس حادثے کے بعد میں فرہاد کا سایہ بن کر رہ گئی۔ چالیس دن گزر گئے تو ایک بار پھر سب سر جوڑ کر بیٹھے۔ میرے ماں باپ اور بڑے بھائی بھی آئے ہوئے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ میٹنگ کس مقصد سے ہو رہی تھی۔ میں سب لوگوں کے لیے چائے لے کر آئی تو ساس صاحبہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور شفقت سے بولیں۔ ''بیٹی جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ قدرت کے کاموں میں کسے دخل ہے۔ ہم سب کا دکھ ایک جیسا ہے۔ وہ صرف تمہارا شوہر ہی نہیں بلکہ میرا بیٹا اور فراز کا بھائی بھی تھا لیکن ہم اسے واپس نہیں لا سکتے۔ اس لیے صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اب ہمیں آگے کی طرف دیکھنا چاہیے۔''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ تمہید کس لیے باندھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی۔ انہوں نے دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔ ''دیکھو بیٹی! ہم سب اپنی اپنی منزل کے مسافر ہیں۔ میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ کسی وقت بھی بلاوا آسکتا ہے۔ فراز بھی امریکا جا رہا ہے۔ اس کی تیاری مکمل ہے۔ وہ تو صرف بھائی کے انتقال کی وجہ سے رک گیا تھا۔ ہم دونوں کے بعد تم بالکل تنہا رہ جاؤ گی۔ میکے میں بھی تم زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتیں۔ جب تک ماں باپ زندہ ہیں وہ تمہیں ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھیں گے۔ اس کے بعد......'' وہ کہتے کہتے رک گئیں پھر بولیں۔ ''معاف کرنا بیٹی عورت اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہے۔''

''تو کیا یہ میرا گھر نہیں رہا؟'' میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''توبہ توبہ بیٹی۔ تم غلط سمجھ رہی ہو میرا مطلب تھا......!''

شاید وہ اپنی بات کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھیں۔ انہوں نے ابو کی طرف دیکھا تو وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔ ''بیٹی ہم چاہتے ہیں کہ تم عقد ثانی کر لو۔ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی اس معاشرے میں عورت کے لیے تنہا رہنا بہت مشکل ہے۔''

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ میں تقریباً چلاتے ہوئے بولی۔ ''کیا؟ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ابھی تو میرے مرحوم شوہر کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور آپ لوگوں کو میری شادی کی فکر پڑ گئی۔''

''ٹھیک ہے۔ ابھی نہیں تو سال چھ مہینے بعد تمہیں اس

بارے میں ضرور سوچنا ہوگا۔'' ابو نے کہا۔
''سال چھ مہینے تو دور کی بات ہے آپ لوگ میرا فیصلہ ابھی سن لیں۔ میں ساری عمر دوسری شادی نہیں کروں گی چاہے بڑی سے بڑی قیامت آجائے۔ اپنے بیٹے پر سوتیلے باپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔''
''خیر جیسے تمہاری مرضی اس وقت تم رنج اور غصے کی کیفیت میں ہو۔ ہم پھر کبھی اس موضوع پر بات کریں گے۔'' ابو آہستہ سے بولے۔
''کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''اگر کسی نے دوبارہ یہ بات کی تو اس سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرلوں گی اور بھول جاؤں گی کہ میرا آپ سے کوئی رشتہ ہے۔''
اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ سب لوگوں نے چائے پی اور رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد ساس صاحبہ نے کہا۔ ''تم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اچھا کیا لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں جن پر ہمیں بات کرنا ہوگی۔ تم سن رہی ہونا بیٹی؟''
''جی ہاں، آپ کہیں۔'' میں نے سعادت مندی سے کہا۔
''فراز تو چند روز بعد چلا جائے گا۔ اس کے بعد ہم دونوں کو ہی سب کچھ دیکھنا ہے، تم کل بینک چلی جاؤ اور معلوم کرو کہ فواد کے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے۔ کمپنی کی طرف سے اس کے واجبات کا چیک آگیا ہے۔ وہ بھی اس اکاؤنٹ میں جمع کروا دینا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ بن جائے تو انشورنس کلیم بھی داخل کرنا ہوگا۔ فرہاد کی گاڑی تو اس قابل نہیں رہی کہ اس کی مرمت ہو سکے اگر کوشش کی جائے تو کمپنی سے اس کی جگہ دوسری گاڑی مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ تم فرہاد کی الماری بھی دیکھو کہ بینک اکاؤنٹ کے علاوہ بھی کیا اس نے کچھ رقم کہیں انویسٹ کر رکھی ہے۔''
مجھے اپنی ساس کی باتیں سن کر حیرت ہوئی۔ وہ کتنے احسن طریقے سے میری رہنمائی کر رہی تھیں ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اپنی تنخواہ سے ہی سارے اخراجات پورے کرنا ہوں گے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک بات اور آئی ہے اگر اوپر کا پورشن کرایہ پر دے دیا جائے تو ہمیں ہر ماہ ایک معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔''
''اچھا خیال ہے لیکن اس کے لیے فراز سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔''
فراز کو اس تجویز پر اعتراض تھا۔ اس کا خیال تھا ''کرایہ دار بہت تنگ کرتے ہیں اگر کوئی قبضہ کر کے بیٹھ گیا تو آپ دونوں پریشان ہو جائیں گی۔''
''اس کی تم فکر نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ ''میری ایک کولیگ کو مکان کی ضرورت ہے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ شریف خاندان کی ہیں۔ ان کے شوہر بھی سرکاری ملازم ہیں۔ ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔''
''دیکھ لیں۔ جیسے آپ کی مرضی۔'' فراز نے کہا۔
آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو گیا۔ انشورنس کی رقم مل گئی اور کمپنی نے دوسری گاڑی بھی دے دی۔ میں نے ڈرائیونگ سیکھ لی اور خود گاڑی چلا کر کالج جاتی۔ فرہاد کو اسکول چھوڑتی اور واپسی میں ساتھ لے لیتی۔ آصفہ باجی جنہیں ہم نے اپنا مکان کرائے پر دے دیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی آتی جاتی تھیں۔ ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ وہ لڑکے میرا بہت کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کے آجانے سے کافی سہارا ہو گیا تھا۔ اب فرہاد اسکول جانے لگا تھا اور مجھے آیا کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں نے اسے ساس صاحبہ کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں کے لیے رکھ لیا۔ فواد کے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم تھی جو مجھے کچھ سالوں کے لیے کافی ہوتی۔ اس کے علاوہ کافی تعداد میں انہوں نے شیئرز، بانڈز اور سیونگ سرٹیفکیٹ خرید رکھے تھے جن سے معقول منافع ملتا تھا۔ فراز نے بھی پیسے بھیجنے شروع کردیے تھے۔ وہ میں ساس صاحبہ کے حوالے کر دیتی کیونکہ ان کا حق زیادہ تھا۔
مجھے مالی طور پر اطمینان ہوا تو میں نے پوری توجہ اپنے بیٹے پر مرکوز کر دی۔ اب وہی میری امیدوں کا مرکز تھا۔ میں اسے ایک اچھا اور کامیاب انسان بنانا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جن بچوں کے باپ نہیں ہوتے۔ ان کی شخصیت تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کسی بھی ماں کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کی سرگرمیوں اور گھر سے باہر ہونے والی حرکت پر نظر رکھ سکے۔ ان لڑکوں کے پاس ماں کو بے وقوف بنانے کے لیے سو بہانے ہوتے ہیں۔ مثلاً کالج میں ایکسٹرا کلاسیں ہو رہی ہیں۔ دوست کے گھر چلا گیا تھا۔ ہم کمبائنڈ اسٹڈی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کالج کے گیٹ کے باہر چھٹی کے وقت کئی آوارہ لڑکے منڈلا رہے ہوتے تھے تاکہ لڑکیوں کا پیچھا کریں اور ان پر آوازیں کسیں۔ میں اس طرح کے تماشے

روز دیکھا کرتی تھی۔ اب مجھے ماں کے ساتھ باپ کا رول بھی ادا کرنا تھا تاکہ میرا بیٹا ان خرافات سے محفوظ رہے۔

میں نے شروع دن سے ہی اس پر کڑی نگرانی رکھی۔ اسی لیے اپنے ساتھ اسکول لے کر جاتی اور واپس لاتی تاکہ وین میں دوسرے بچوں سے اس کا میل جول نہ ہو۔ ہفتے میں ایک دو مرتبہ اس کے اسکول ضرور جاتی اور پرنسپل سے لے کر کلاس ٹیچر تک سے اس کی پروگریس کے بارے میں سوالات کرتی۔ ساتھ میں یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ اس کا دوسرے لڑکوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کیسا ہے گھر آنے کے بعد بھی میں اس کے ساتھ چپکی رہتی۔ میں نے اس کا ایک ٹائم ٹیبل بنا دیا تھا کہ جس میں اس کے صبح بیدار ہونے، رات کو سونے، دن میں ہوم ورک کرنے اور ٹی وی دیکھنے کے اوقات مقرر تھے۔ وہ جب ٹی وی دیکھتا تو اس کے پاس ہی بیٹھی رہتی کہ کہیں وہ ناپسندیدہ چینل دیکھنے نہ بیٹھ جائے۔

پانچ سال تک وہ میرے اشاروں پر چلتا رہا۔ اب مجھے اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھڑی کی سوئی کے مطابق سارے کام کرلیتا۔ اس کی ہر ضرورت بغیر کہے پوری ہو جاتی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ بازار لے کر جاتی اور اس کی پسند کی چیزیں اسے خرید کر دیتی۔ ایک دن اس نے کرکٹ بیٹ کی فرمائش کی تو میں چونک گئی اور اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم بیٹ کا کیا کرو گے؟''

''کھیلوں گا۔'' اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''لیکن کس کے ساتھ کھیلو گے۔ ارسلان اور ارشد (اوپر والوں کے لڑکے) تو شام کو کوچنگ سینٹر چلے جاتے ہیں اور ہمارے گھر میں اتنی جگہ بھی نہیں ہے کہ وہاں کرکٹ کھیلی جاسکے۔''

''اوہ مما! آپ بھی بہت بھولی ہیں میں گھر میں نہیں بلکہ گراؤنڈ میں جا کر کھیلوں گا۔ وہ جو ہمارے گھر کے پیچھے ہے، میرا دوست راشد بھی وہاں کھیلتا ہے۔ اسی نے مجھ سے کہا ہے کہ تم بھی آجایا کرو۔''

وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں اسے کھیلنے سے منع کر دیتی یا اس کی فرمائش پوری نہ کرتی۔ میں نے اسے ایک قیمتی بیٹ دلوا دیا اور ساتھ ہی رنگین کٹ، جوتے، موزے، گلوز اور کیپ بھی لے کر دیا۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ وہ چپل پہن کر کھیلنے جائے اور گراؤنڈ میں ننگے پیر دوڑتا رہے۔ وہ یہ چیزیں لے کر خوش ہوگیا۔ میں نے بھی اپنے دل کو تسلی دی کہ اگر وہ گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا کے لیے کھیلنے جائے گا تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ میں خود کسی روز گراؤنڈ میں جا کر دیکھوں گی کہ وہ کن لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

اب میں نے اس کے ٹائم ٹیبل میں ترمیم کردی تھی۔ پانچ بجے وہ ایک گھنٹے کے لیے کھیلنے جاتا۔ میں نے اسے تاکید کر رکھی تھی کہ وہ ہر صورت میں مغرب کی اذان سے پہلے گھر آجائے۔ اس نے میرا یہ حکم بھی بلاچوں چرا مان لیا اور سختی سے اس ٹائم ٹیبل پر عمل کرنے لگا۔ میں نے اسے گراؤنڈ میں جا کر کھیلنے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن دل اندر سے مطمئن نہیں تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا تو تیسرے یا چوتھے روز شاپنگ کے بہانے گھر سے نکلی اور بازار کا ایک چکر لگا کر گراؤنڈ پہنچ گئی۔ اس وقت اتفاق سے فرہاد ہی بیٹنگ کر رہا تھا۔ اس نے پیڈ اور گلوز کے علاوہ ہیلمٹ بھی لگا رکھا تھا اور آگے بڑھ کر زوردار شارٹس کھیل رہا تھا۔ میں دلچسپی سے اسے کھیلتا ہوا دیکھتی رہی پھر میں نے دوسرے لڑکوں کی جانب بھی توجہ کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ دو لڑکے فیلڈنگ کرنے کی بجائے باؤنڈری کے باہر بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے جبکہ ان کے دوسرے ساتھی آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ فرہاد کی باری ختم ہوئی تو میں نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا اور گاڑی میں بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''مما ابھی تو مغرب ہونے میں کافی دیر ہے۔ میں کھیل ختم ہونے پر آجاؤں گا۔''

''نہیں۔'' میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تمہیں میرے ساتھ ماموں کے گھر چلنا ہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے جھوٹ موٹ کا بہانہ بنایا تو وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گھر آکر اس نے نہا دھو کر کپڑے بدلے اور پروگرام نہ ہوتے ہوئے بھی میں اپنے بھائی کے گھر چلی گئی۔

دوسرے روز رات کے کھانے پر وہ کچھ افسردہ تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ لڑکوں نے اس طرح چلے آنے پر اس کا بہت مذاق بنایا۔ وہ اسے ماماز بوائے کہہ کر چھیڑ رہے تھے۔ میں نے یہ الفاظ پہلی بار سنے جو اچھے لگے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ناراض ہونے والی کیا بات ہے۔ تم واقعی ماماز بوائے ہو اور مجھے فخر ہے کہ تم میری ہر بات مانتے ہو۔''

یہ سن کر اس کے چہرے کی شگفتگی لوٹ آئی اور وہ چہکتے

ہوئے بولا۔ ''اوہ مما، یو آر سو گریٹ۔''

میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی اور بولی۔ ''بیٹا میں کل تم لوگوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تم تو اچھی خاصی بیٹنگ کرلیتے ہو لیکن دوسرے لڑکوں کا لیول کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ وہ نہ تو ٹھیک طرح سے گیند کررہے تھے اور نہ ہی ان سے فیلڈنگ ہو رہی تھی۔ اس طرح تو تمہارا کھیل بھی خراب ہو جائے گا۔ تم کوئی اکیڈمی کیوں نہیں جوائن کرلیتے۔''

''اوہ مما! وہاں کی تو فیس بہت زیادہ ہوتی ہے؟''

''کوئی بات نہیں۔ کم از کم تم اچھے ماحول میں کچھ سیکھ تو سکو گے؟''

دوسرے روز میں اسے اپنے ساتھ گھر کے قریب واقع ایک اکیڈمی میں لے گئی جہاں ایک سابق کرکٹر لڑکوں کی کوچنگ کررہے تھے۔ مجھے وہاں کا ماحول بہت پسند آیا۔ سب لڑکے رنگین کٹ میں ملبوس تھے اور کوچ کی زیرِ نگرانی بیٹنگ بولنگ اور فیلڈنگ کررہے تھے۔ میں نے فارم بھرا، مقررہ فیس ادا کی اور اس طرح فرہاد نے اکیڈمی جوائن کرلی۔

زندگی اپنی ڈگر پر گزر رہی تھی۔ فرہاد پوری طرح میرے قابو میں تھا اور ایک روبوٹ کی طرح میرے اشاروں پر چلتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنا ذہن و دل میرے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ اس کی اپنی کوئی سوچ نہیں تھی اور وہ ہر کام مجھ سے پوچھ کر کیا کرتا۔ نویں جماعت کے رجسٹریشن فارم بھرنے کا وقت آیا تو وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''مما! آپ بتائیں کہ اس میں کیا بھرنا ہے؟''

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟ کیا تمہیں اپنا نام، باپ کا نام، گھر کا پتا اور مضامین کے بارے میں علم نہیں ہے؟''

''مجھ سے کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ بولتی جائیں۔ میں لکھتا رہوں گا۔''

اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ فرہاد میں خود اعتمادی کی بہت کمی ہے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی اور وہ پوری طرح مجھ پر انحصار کررہا تھا۔ میں نے یہ مسئلہ اپنی ساس کے سامنے رکھا تو انہوں نے بھی مجھے ہی الزام دیا اور بولیں۔ ''یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تم نے اسے پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ اسے ہلنے جلنے کی بھی آزادی نہیں۔ پھر بھلا اس میں خود اعتمادی کہاں سے آئے گی؟''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنا شکنجہ ڈھیلا کرنا شروع کردیا لیکن شاید دیر ہو چکی تھی اور وہ ان پابندیوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ایک روز اسے اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے گئی۔ اس کے لیے کچھ کپڑے خریدنا تھے۔ میں نے سیلز مین سے کہا کہ وہ کچھ شرٹس اور پینٹس دکھائے۔ اس نے چند ہی منٹ میں ڈھیروں قمیصیں اور پتلونیں سامنے لاکر رکھ دیں تو میں نے فرہاد سے کہا کہ وہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کپڑوں کا انتخاب کرے۔ تو اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مما میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ آپ بتائیں کون سا رنگ اچھا رہے گا۔''

اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ جیسے تیسے شاپنگ مکمل کی اور گھر آگئی لیکن میرے دل میں ایک پھانس چبھ کر رہ گئی۔ وہ واقعی ماماز بوائے بن چکا تھا۔ اس کا ہر جملہ آپ بتائیں سے شروع ہوتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی مرضی تھی نہ کوئی پسند۔ وہ ہر کام مجھ سے پوچھ کر کیا کرتا۔ میٹرک کے بعد کالج میں داخلے کا مرحلہ آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مستقبل میں کیا بننا چاہتا ہے۔ اس نے حسبِ عادت کہا ''آپ بتائیں''۔ مجھے غصہ آگیا میں جھنجلاتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری اپنی بھی کوئی مرضی ہے یا ہر کام مجھ سے پوچھ کر ہی کرو گے۔''

وہ میرے غصے سے ڈر گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔''

''اونہہ!'' میں منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''آج کل ڈاکٹروں کو کون پوچھتا ہے۔ ہاؤس جاب کے بعد بھی نوکری کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ سرکاری ملازمت ملتی نہیں اور پرائیویٹ والے آٹھ دس ہزار سے زیادہ نہیں دیتے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کامرس میں داخلہ لینا چاہیے۔ ایم بی اے کرنے کے بعد کسی بھی ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب مل جائے گی۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے ایک بار پھر میرے آگے سر جھکا دیا لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اگر اپنی ہی مرضی چلانی تھی تو مجھ سے کیوں پوچھا؟

اب اس نے اکیڈمی جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور پوری طرح پڑھائی کی طرف متوجہ ہوگیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ کامرس کی پڑھائی بہت سخت ہوتی ہے۔ اس لیے اکیڈمی نہیں جارہا۔ ویسے بھی مجھے کون سا ٹیسٹ کرکٹر بننا

ہے۔ اصل وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ ان کی ٹیم کوئی ٹورنامنٹ کھیلنے لاہور جارہی تھی لیکن فرہاد نے یہ کہہ کر منع کردیا کہ مما اجازت نہیں دیں گی۔ اس پر لڑکوں نے اس کا خوب مذاق بنایا اور ماماز بوائے کا خطاب دے ڈالا، اسی لیے اس نے اکیڈمی جانا چھوڑ دیا تھا۔

فرہاد کو کالج میں داخلہ لیے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ میری ساس کا انتقال ہوگیا۔ اس سے پہلے میری امی اور ابو بھی اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے۔ بھائی اپنے حال میں مست تھے اور میرا دیور فراز امریکی شہریت اختیار کرچکا تھا۔ اس دوران وہ صرف ایک مرتبہ پاکستان آیا اور شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے گیا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ اکثر فون پر میری خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ اب گھر میں صرف میں اور فرہاد رہ گئے تھے۔ آیا کو میں نے ابھی تک ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت ڈھارس تھی۔ فرہاد اب بھی میرے ساتھ ہی کالج جاتا۔ واپسی پر میں اسے پک کیا کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کئی دفعہ کہا کہ واپسی میں سیدھی گھر چلی جایا کروں لیکن مجھے گوارہ نہیں تھا کہ تپتی دوپہر میں میرا بچہ بسوں کے دھکے کھاتا ہوا آئے۔

میرے بیٹے نے بہت اچھے نمبروں سے انٹر کامرس کا امتحان پاس کیا اور اس کا بہ آسانی آئی بی اے میں داخلہ ہو گیا۔ جہاں بھی میری ہٹ دھرمی قائم رہی۔ اس کے کئی دوست ایک مشہور پرائیویٹ یونیورسٹی میں داخلہ لے رہے تھے۔ فرہاد کی بھی خواہش تھی کہ وہ ان کے ساتھ پڑھے لیکن میں نے اسے آئی بی اے کے ٹیسٹ میں بٹھا دیا اور اس نے ایک بار پھر میری خواہش کے آگے سر جھکا دیا لیکن اب اس کے لیے آنے جانے کا مسئلہ پیدا ہوگیا تھا کیونکہ اس کی کلاسوں کے اوقات بالکل مختلف تھے اور میرے لیے اسے ساتھ لے جانا اور واپس لانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنی گاڑی دینا چاہی لیکن وہ نہ مانا۔ مجبوراً میں نے اسے ایک بائیک لے کر دے دی تاکہ اسے آنے جانے میں کوئی تکلیف نہ ہو لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کردی کہ وہ کالج سے سیدھا گھر آئے گا۔ اس نے ماماز بوائے ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے یہ شرط بھی قبول کرلی۔

وقت تیزی سے پر لگا کر اڑتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرہاد نے ایم بی اے کرلیا اور اسے میری خواہش کے مطابق ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت بھی مل گئی لیکن وہ ماماز بوائے ہی رہا۔ اس کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ جب اسے پہلی تنخواہ کا چیک ملا تو وہ میرے پاس آکر بولا۔ ''مما یہ رکھ لیں۔''

''یہ کیا ہے؟'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ چیک مجھے کیوں دے رہا ہے۔

''مما مجھے تنخواہ ملی ہے۔ یہ اسی کا چیک ہے۔''

''یہ چیک تم مجھے کیوں دے رہے ہو۔ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروادو۔''

''میرا تو کوئی اکاؤنٹ ہی نہیں ہے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے کل صبح میرے ساتھ بینک چلنا۔ میں تمہارا اکاؤنٹ کھلوادوں گی۔''

عملی زندگی میں آنے کے بعد بھی اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ صبح دفتر جاتا اور چھٹی ہوتے ہی شام کو گھر آجاتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور نہ ہی وہ کہیں گھومنے جاتا تھا۔ گھر واپس آنے کے بعد اس کا سارا وقت میرے ساتھ ہی گزرتا۔ ابھی تک وہ اپنے کپڑوں، جوتوں اور دیگر ضرورتوں کے لیے میرا محتاج تھا اور میں ہی اس کے لیے سب چیزوں کا بندوبست کرتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے بھی کچھ کرے لیکن وہ ہر کام کے لیے میری طرف ہی دیکھتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے دفتر میں کسی غریب آدمی کی بیٹی کی شادی تھی۔ سب لوگ اس کے لیے پیسے جمع کررہے تھے لیکن فرہاد اپنے طور پر فیصلہ نہ کرسکا کہ اسے اس نیک کام میں کیا دینا چاہیے۔ شام کو اس نے ڈرتے جھجکتے یہ مسئلہ میرے سامنے رکھا اور بولا۔ ''مما آپ ہی بتائیں کتنے پیسے دوں؟''

مجھے غصہ آیا اور ساتھ ہی ہنسی بھی چھوٹ گئی۔ ''مجھ سے پوچھ رہے ہو جو تمہارا دل چاہے دے دو۔''

''دس ہزار دے دوں؟''

''ہاں ضرور اس نیک کام میں کنجوسی نہیں کرنی چاہیے۔''

اس طرح کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا کہ یہی حال رہا تو کسی دن وہ واش روم بھی مجھ سے پوچھ کر جائے گا۔ میں اسے اس خول سے باہر نکالنا چاہ رہی تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو جن دیواروں میں قید کرلیا تھا انہیں توڑنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک دن رات کے کھانے پر میں نے اس سے کہا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم دفتر سے آنے کے بعد گھر میں ہی رہتے ہو۔ نہ کہیں جاتے

ہو۔ نہ کسی سے فون پر بات کرتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے بیٹا۔ آج کل تو لڑکیاں بھی اس طرح گھر میں بند ہو کر نہیں بیٹھتیں۔ کبھی کبھار کہیں چلے جایا کرو اس طرح تمہاری طبیعت بھی بہل جائے گی۔''

''مما آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے اور نہ ہی مجھے فالتو گھومنا پھرنا پسند ہے۔''

''اس شہر میں تمہارے ماموں اور خالہ بھی رہتی ہیں۔ انہی کے گھر چلے جایا کرو۔ ان کے بچوں کے ساتھ تمہارا اچھا وقت گزر جائے گا۔''

''جی اچھا۔'' اس نے حسبِ معمول سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اگلے روز اتوار تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر مہینے بھر کی خریداری کی فہرست بنا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فرہاد کے ساتھ سپر اسٹور جا کر پورے مہینے کا سامان خرید لوں کہ بالکل اچانک ہی گیارہ بجے کے قریب میری سوتیلی بہن ناہید اپنی بیٹی نائلہ کے ہمراہ بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہو گئی۔ میں نے ہمیشہ اس سے فاصلہ رکھا اور ہمارا بہت کم ملنا جلنا ہوتا تھا۔ خدانخواستہ میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن اس کی عادتوں کی وجہ سے میں نے اس سے دور رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔ میں اس کے یہاں خاص خاص موقعوں پر جاتی تھی جب کہ وہ موقع بہ موقع منہ اٹھائے میرے پاس آجاتی تھی۔ دراصل اس کی کچھ حرکتیں مجھے سخت ناپسند تھیں۔ اس نے ہمیشہ میری تقلید کی۔ کپڑوں، جوتوں، ہیئر اسٹائل ہر چیز میں وہ میری نقل کرتی۔ البتہ دو چیزوں میں وہ مجھ سے پیچھے رہ گئی۔ میں نے ایم ایس سی کر لیا لیکن وہ میٹرک سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اسی طرح میری شادی فواد جیسے پڑھے لکھے خوش شکل اور اچھے عہدے پر فائز شخص سے ہوئی جب کہ اس کے حصے میں نعیم بھائی آئے جو شادی کے وقت کسی سرکاری محکمے میں کلرک تھے اور بیس سال میں ترقی کرتے کرتے بمشکل سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچ سکے۔ البتہ اوپر کی آمدنی ہونے کی وجہ سے گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ اس نے فرہاد کی حرص میں اپنے بچوں کو بھی اچھے اسکولوں میں داخلہ دلوایا لیکن جس گھر میں حرام کی کمائی آرہی ہو گھر کے افراد رات کو دیر تک جاگتے اور صبح دیر تک سوتے ہوں۔ دن رات ٹی وی چلتا ہو بہانے بہانے تقریبات منعقد ہوتی ہوں اور رات کا کھانا اکثر باہر سے آتا ہو۔ وہاں پڑھائی کا کیا کام۔ اسی لیے ناہید کا کوئی بھی بچہ انٹر سے آگے نہ پڑھ سکا۔ البتہ نائلہ نے بی اے کا پرائیویٹ امتحان دیا اور اتفاق سے پاس بھی ہو گئی۔

وہ پہلی بار ہمارے گھر آئی تھی۔ میں نے کافی عرصہ بعد اسے دیکھا تھا۔ اچھی خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ اگر ڈھنگ کے کپڑے پہنتی تو اور اچھی لگ سکتی تھی لیکن اس نے تو عجیب حلیہ بنایا ہوا تھا۔ ٹی شرٹ اور ٹائٹ جینز میں وہ بالکل کارٹون لگ رہی تھی۔ دوپٹے کی بجائے اس نے گلے میں اسکارف ڈال رکھا تھا۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور کولڈ ڈرنک سے ان کی خاطر تواضع کی۔ فرہاد گھر پر ہی تھا۔ میں نے اسے بھی ڈرائنگ روم میں بلایا۔ وہ اس سے پہلے میرے ساتھ دو تین مرتبہ ناہید کے گھر جا چکا تھا لیکن نائلہ سے اس کا تعلق ہائے ہیلو سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا جب اس نے فرہاد کو بڑی بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ڈیئر کزن، تم پر کئی مٹھائیاں ڈیو ہیں۔ تم نے ایم بی اے کر لیا پھر جاب بھی ہو گئی لیکن ہم لوگوں کو پوچھا تک نہیں۔ بس انتظار ہی رہا کہ تم کوئی پارٹی وغیرہ دو گے۔''

فرہاد کے لیے یہ ایک غیر متوقع صورت حال تھی۔ آج تک کسی لڑکی نے اس سے اس انداز میں گفتگو نہیں کی تھی۔ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''مما بتائیں میں کیا جواب دوں۔''

میں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئی اور اس کی طرف سے جواب دینے کا فریضہ مجھے ہی انجام دینا پڑا۔ میں نے نائلہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''پارٹی بھی ہوتی رہے گی لیکن آج میں تمہیں اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی مزے دار ڈش کھلاؤں گی کہ تم بازار کے کھانے بھول جاؤ گی۔''

''اوہ ونڈر فل، یو آر گریٹ۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی پھر اس نے فرہاد سے کہا۔ ''چلو، مجھے اپنا کمرا دکھاؤ، دیکھوں تو سہی کہ تمہارے پاس کیا کلیکشن ہے؟''

وہ توقع کر رہی تھی کہ فرہاد کے کمرے میں دیواروں پر فلم اسٹارز کے پوسٹرز لگے ہوں گے۔ ڈھیروں سی ڈیز ہوں گی۔ جدید ترین ساؤنڈ سسٹم اور ہوم تھیٹر ہوگا۔ فرہاد نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ ''مما لے جاؤں۔''

میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی۔ ''ہاں فرہاد! تم نائلہ کو اپنا کمرا دکھاؤ۔ میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔''

میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کہ نائلہ کو فرہاد کے کمرے میں جا کر شدید مایوسی ہوگی کیونکہ اسے وہاں ایک لیپ ٹاپ کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ فرہاد کو بس پڑھنے کا شوق تھا۔ نہ فلمیں دیکھنے اور میوزک سننے کا۔ اس لیے اس کے کمرے میں سی ڈی اور کیسٹ کہاں سے آتے۔ میں نے ناہید کو بھی ساتھ لے لیا تاکہ کام کے ساتھ ساتھ ہم کچن ٹیبل پر بیٹھ کر باتیں بھی کرتی رہیں حالانکہ ہم دونوں کی ذہنی سطح میں نمایاں فرق تھا۔ ناہید کے پاس سوائے مہنگائی، فیشن اور گھر کی سجاوٹ کے علاوہ کوئی موضوع نہیں تھا جب کہ میں کالج کولیگز سے سیاست، حالات حاضرہ اور سماجی مسائل پر گفتگو کیا کرتی تھی لیکن اس وقت وہ میری مہمان تھی اور اسے کمپنی دینا میرا فرض تھا۔

میرا خیال تھا کہ نائلہ پانچ دس منٹ بعد ہی کمرے سے بور ہو کر باہر آجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا ان دونوں کی واپسی دو گھنٹے بعد ہوئی۔ نہ جانے اتنی دیر وہ کیا باتیں کرتے رہے۔ بہر حال کھانا لگ چکا تھا۔ سب نے مزے لے کر کھانا کھایا۔ ناہید حسبِ عادت مجھ سے کھانوں کی ترکیبیں پوچھتی رہی جب کہ نائلہ کھانے کی میز پر بھی فرہاد سے باتیں کرتی رہی اور وہ بے چارہ میری وجہ سے ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اچانک نائلہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

”آنٹی! آپ نے فرہاد کو اتنا پڑھایا لکھایا لیکن بولنا نہیں سکھایا۔ میں دس باتیں کرتی ہوں تو یہ ایک کا جواب دیتا ہے۔“

وہ اتنی بے تکلفی سے فرہاد کا ذکر کر رہی تھی جیسے بچپن سے دونوں ایک ساتھ کھیلتے آئے ہوں۔ میں اتنی دیر میں اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ بے حد چرب زبان اور باتونی ہے۔ اس لیے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ چلتے وقت اس نے فرہاد سے کہا۔ ”ڈیئر کزن، کسی روز ہمارے گھر آؤ۔ میں تمہیں اپنی سہیلیوں سے ملواؤں گی۔ ہر وقت اپنے کزنز کا نام لے کر شیخی بگھارتی ہیں۔ ذرا انہیں بھی تو پتا چلے کہ میرا بھی ایک لائق فائق کزن ہے۔“

فرہاد نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا تو میں بولی۔ ”میں تو کل ہی اس سے کہہ رہی تھی کہ اپنی خالہ اور ماموں کے گھر چلے جایا کرو۔ اب تم نے کہہ دیا ہے تو یہ ضرور آئے گا۔“

☆......☆

فرہاد کی واپسی رات دس بجے کے قریب ہوئی۔ وہ میری طرح بارش میں بھیگ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی لیکن یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی ”کہاں رہ گئے تھے؟“

”وہ......! ناہید خالہ کے یہاں چلا گیا تھا۔“ اس نے مجرموں کی طرح سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”گھڑی دیکھی ہے تم نے؟ کیا وقت ہو رہا ہے تمہاری چھٹی تو پانچ بجے ہو جاتی ہے۔“

اس نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر آپ اجازت دیں تو میں کپڑے تبدیل کرلوں۔ اس کے بعد آپ کو پوری بات تفصیل سے بتاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے تم کپڑے تبدیل کر کے آؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔“

”میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔“ اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں تو اس کے انتظار میں بھوکی اور پریشان بیٹھی ہوئی تھی اور وہ مزے سے دعوت اڑا کر آ گیا۔ ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ مجھے بغیر بتائے کہیں گیا ہو۔ وہ پانچ گھنٹے وہاں بیٹھا رہا اور اس نے مجھے فون کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ میرے ذہن میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں ناہید اور اس کی بیٹی کوئی نیا کھیل تو نہیں کھیل رہیں لیکن میں نے اس خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ جب تک فرہاد سے بات نہ ہو جاتی۔ میرے لیے کسی وہم کو دل میں جگہ دینا ٹھیک نہیں تھا۔

چند منٹ بعد ہی وہ واپس آگیا اور کہنے لگا۔ ”دراصل آج نائلہ کی سالگرہ تھی۔ اس نے مجھے ساڑھے چار بجے فون کر کے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے فوراً ہی آپ کو فون کر کے بتانے کی کوشش کی لیکن شاید ہمارا فون خراب ہے۔ تین چار مرتبہ گھر کا نمبر ملایا لیکن رابطہ نہ ہو سکا میں نے سوچا کہ خالہ کے گھر سے فون کر کے آپ کو بتا دوں گا لیکن وہاں سے بھی فون نہ ہو سکا۔ میں نے نائلہ سے کہا کہ جلدی گھر چلا جاؤں گا کیونکہ مما کو بتا کر نہیں آیا۔ یہ سن کر اس نے میرا ریکارڈ لگا دیا کہ تم ننھے بچے نہیں ہو جو کہیں گم ہو جاؤ گے۔ آرام سے چلے جانا۔ ابھی تو مہمان بھی نہیں آئے۔ اس کی سہیلیوں کی آمد سات بجے کے بعد شروع ہوئی۔ آٹھ بجے کیک کاٹا گیا۔ اس دوران میں نے اپنے موبائل سے

بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن آپ کا موبائل بند تھا۔ سالگرہ کی تقریب ختم ہوئی تو میں نے گھر آنے کا قصد کیا۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ خالہ نے کھانا لگوا دیا اور کہا کہ بارش تھم جائے تو چلے جانا۔ جیسے ہی بارش کا زور کم ہوا میں گھر کے لیے روانہ ہوگیا لیکن سڑکوں پر پانی اور پھسلن بہت تھی۔ اس لیے گھر پہنچنے میں دیر ہوگئی۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے معصومیت سے بولا۔ ''مما آپ ناراض تو نہیں ہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے پیار سے کہا۔ ''لیکن تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے یاد ہے کہ موٹر سائیکل خریدتے وقت تم سے طے ہوا تھا کہ کہیں جانا ہو تو گھر آنے کے بعد جاؤ گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مما لیکن نائلہ نے عین وقت پر فون کیا اگر پہلے گھر آجاتا تو وہاں پہنچنے میں دیر ہوجاتی۔''

''خیر جو ہوا سو ہوا آئندہ خیال رکھنا۔''

وہ سونے چلا گیا تو میں سوچوں کے بھنور میں گھر گئی۔ فرہاد نے جو کہانی سنائی اس میں کوئی جھول نہیں تھا۔ واقعی گھر کا ٹیلی فون صبح سے خراب تھا اور میں نے اس کی شکایت بھی کردی تھی۔ ادھر میرے موبائل کی بیٹری کام نہیں کررہی تھی اور میں اسے چارج پر لگانا بھول گئی تھی لیکن میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھی کہ ناہید اور اس کی بیٹی نے فرہاد کو پھانسنے کے لیے جال بچھا دیا تھا ورنہ اسے پہلے بھی فون کرسکتی تھی۔ عین وقت پر فون کرنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ اسے گھر آنے یا مجھ سے پوچھنے کی مہلت نہ ملے اور وہ نائلہ کا خیال رکھنے کی خاطر سالگرہ کی تقریب میں دوڑا چلا آئے۔ نہ جانے نائلہ اور اس کے درمیان ٹیلی فون پر رابطے کا سلسلہ کب سے چل رہا تھا البتہ اس سے پہلے وہ کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔

اس کے بعد فرہاد نے وقفے وقفے سے ناہید کے گھر جانا شروع کردیا۔ کبھی وہ خود چلا جاتا اور کبھی اسے کسی نہ کسی بہانے بلا لیا جاتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ وہ ہمیشہ مجھے بتا کر جایا کرتا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے وہاں جانے سے روک سکتی کیونکہ میں نے خود ہی اس سے کہا تھا کہ کبھی کبھی خالہ اور ماموں کے یہاں چلے جایا کرو۔ اس نے میری آدھی بات پر عمل کیا۔ خالہ کے گھر کے چکر تو لگانا شروع کردیے لیکن ماموں کے یہاں جانے کا کبھی ذکر نہ کیا۔ اس میں کچھ میرے بھائی اور ان کے گھر والوں کا بھی قصور تھا۔ انہوں نے ہم سے واجبی سا تعلق رکھا ہوا تھا اور صرف نام کی رشتے داری نبھا رہے تھے۔

نائلہ کی سالگرہ والے واقعے کو چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ میرا اندیشہ حقیقت بن کر سامنے آگیا۔ ایک روز رات کا کھانا کھانے کے بعد فرہاد نے شرماتے اور جھجکتے ہوئے کہا کہ نائلہ اسے پسند ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ سنتے ہی میرے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا اور مجھے لگا کہ میرے سامنے ماماز بوائے کی بجائے ایک خودسر اور اپنے فیصلے خود کرنے والا بیٹا بیٹھا ہوا ہے۔ جس نے ساری زندگی چھوٹے چھوٹے کام بھی مجھ سے پوچھ کر کیے۔ اب اس میں اتنی ہمت آگئی تھی کہ اس نے اتنا بڑا فیصلہ اپنے طور پر کرلیا۔ ناہید اور اس کی بیٹی نے ہی اسے اس موڑ تک پہنچایا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرسکے۔

میں کسی قیمت پر بھی نائلہ کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھی لیکن اس نے یہ حق مجھ سے چھین لیا تھا اور میں اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اس فیصلے کی مخالفت کرسکوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ابھی تک اس کی شادی کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا اور نہ ہی میرے ذہن میں کوئی لڑکی تھی۔ اتنا تو میں سمجھ گئی تھی کہ نائلہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور میری مخالفت بے سود ہوگی۔ البتہ یہ خطرہ ضرور تھا کہ ایسی صورت میں وہ مجھ سے باغی ہوسکتا ہے۔ فرہاد میرا اکلوتا بیٹا تھا اور میں اس سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ فیصلہ تم نے سوچ سمجھ کر کیا ہے؟''

''فیصلہ تو آپ کریں گی۔ میں نے تو صرف اپنی پسند بتائی ہے۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے وہی ہوگا جو تم چاہتے ہو۔ میں اگلے اتوار کو ناہید کے گھر رشتہ مانگنے جاؤں گی۔''

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''اوہ مما یو آر گریٹ، مجھے معلوم تھا کہ آپ میری خوشی کی خاطر سب کچھ کرسکتی ہیں نائلہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ آپ کا بڑا خیال رکھے گی۔''

میں نے جمعہ والے دن ناہید کو فون کرکے بتا دیا کہ اتوار کو ایک ضروری بات کرنے اس کے گھر آرہی ہوں۔ بھائی صاحب سے کہنا گھر پر ہی رہیں۔ شام کی چائے تمہارے ساتھ ہی پیوں گی۔ وہ میرا اشارہ تو سمجھ گئی ہوگی لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا البتہ یہ ضرور کہا کہ میں فرہاد کو بھی ساتھ لے کر آؤں۔ دوسرے روز میں نے بازار جا کر ایک قیمتی انگوٹھی خریدی اور اتوار کے دن مٹھائی لے کر

فرہاد کے ہمراہ ناہید کے گھر پہنچ گئی۔ ان لوگوں نے میرا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد میں حرف مدعا زبان پر لے آئی اور کہا میں نائلہ کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔ وہاں تو سب کچھ پہلے سے طے تھا۔ ناہید نے رواج کے مطابق سوچنے کے لیے بھی وقت نہیں مانگا اور بولی۔ ''تم میری بہن ہو اور فرہاد گھر کا بچہ ہے۔ ہمارے لیے اس سے بڑی عزت افزائی کیا ہوگی کہ نائلہ تمہاری بہو اور فرہاد کی دلہن بنے۔ مجھے یہ رشتہ قبول ہے۔''

اتنی دیر میں نائلہ چائے لے کر آگئی۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور ناہید کی اجازت سے اسے انگوٹھی پہنا دی۔ پھر سب لوگوں کا منہ میٹھا کر دیا گیا میں اس کام میں تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے طے پایا کہ شادی چھ ماہ بعد ہوگی اور اگلے اتوار کو وہ لوگ فرہاد کو انگوٹھی پہنانے ہمارے گھر آئیں گے۔ پھر اگلا اتوار بھی آگیا۔ ناہید اور اس کا شوہر انگوٹھی اور مٹھائی لے کر آئے۔ نائلہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس کی آزاد خیالی اور بے باکی دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ شاید اسے اس گھر میں آنے کی بہت جلدی تھی۔

دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں اور پھر وہ دن بھی آگیا جب نائلہ دلہن بن کر ہمارے گھر آگئی۔ میں نے فرہاد کی شادی میں دل کھول کر پیسا خرچ کیا تھا اور کسی چیز میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایسی شاندار بری بنائی کہ دیکھنے والے اش اش کر اٹھے۔ ولیمہ بھی ایک بڑے کلب میں ہوا.... نائلہ اپنے ساتھ واجبی سا جہیز لے کر آئی لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا اور مزید چیزیں رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔

دلہن بیگم نے شادی کے دوسرے روز سے ہی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ مجھے ہمیشہ سے ہی صبح سات بجے ناشتا کرنے کی عادت ہے اور فرہاد بھی میرے ساتھ ہی ناشتا کیا کرتا تھا۔ برسوں سے یہی معمول چلا آرہا تھا۔ اس روز میں نے جان بوجھ کر ایک گھنٹا تاخیر سے ناشتا لگوایا کہ رات کو یہ لوگ دیر سے سوئے ہوں گے لیکن جب آیا انہیں بلانے گئی تو بہو بیگم نے کہلوا دیا کہ آپ ناشتا کرلیں ہم دیر سے کریں گے۔ پچیس سال میں یہ پہلا موقع تھا جب میں نے تنہا ناشتا کیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور یوں لگا کہ ماماز بوائے کسی مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔

دونوں میاں بیوی گیارہ بجے ناشتے کی میز پر آئے۔ مجھے سلام کیا اور ناشتا کرنے بیٹھ گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور ناشتا کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں صوفے پر بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔ آنے والے دنوں کی تصویر میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں نے اس منظر کو ذہن میں رکھ کر حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگر نائلہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ فرہاد کو مجھ سے چھین لے گی تو یہ اس کی بھول تھی۔ وہ وقت آنے سے پہلے میں خود ہی فرہاد کو اپنی زندگی سے نکال دوں گی۔ میں اس کی محتاج نہیں میرے پاس اب بھی اتنا جمع تھا کہ بقیہ زندگی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی تھی۔

ماماز بوائے نے پہلی بار اس وقت میرے حصار سے باہر نکلنے کی کوشش کی جب نائلہ کے گھر والوں نے ہمیں چوتھی کی دعوت میں بلایا۔ میں وقت پر تیار ہوگئی لیکن وہ دونوں ابھی تک کمرے سے باہر نہیں آئے تھے۔

خدا خدا کر کے دو گھنٹے بعد ان کی تیاری مکمل ہوئی۔ میں حسبِ معمول فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے لگی تو نائلہ ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑی ہوگئی اور اس نے تیز نظروں سے فرہاد کو گھورا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''مما پلیز آپ پیچھے بیٹھ جائیں۔ نائلہ کو آگے آنے دیں۔''

اس لمحے مجھے شدت سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ جی چاہا کہ جانے سے انکار کر دوں لیکن سمدھیانے کا معاملہ تھا۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ سارے راستے میں فرہاد کے طرزِ عمل پر غور کرتی رہی۔ یہ وہی لڑکا تھا جو ساری عمر میرے اشاروں پر ناچتا رہا لیکن دو دن میں ہی اتنا بدل گیا کہ اس نے میری سیٹ اپنی بیوی کو دے دی۔ اگر یہی حال رہا تو چند ہی دنوں میں وہ مجھے بھی گھر سے باہر نکال دے گا۔ اسی وقت میں نے اپنی حکمتِ عملی طے کرلی۔ پہلا فیصلہ تو یہ کیا کہ آئندہ کبھی ان لوگوں کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی کیونکہ میں اپنی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ان دونوں میاں بیوی کو مکمل طور پر نظرانداز کروں گی اور ان کے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی۔ ناشتے یا کھانے پر بھی ان کا انتظار نہیں کروں گی۔

میں تو اپنی طرف سے مورچہ بندی کر کے بیٹھ گئی لیکن فرہاد ابھی تک ماماز بوائے ہی تھا۔ اب بھی وہ بہت سے کام

مجھ سے پوچھ کر کیا کرتا تھا لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایسا کرے کیونکہ اس وقت نائلہ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اسے فرہاد کا یہ انداز بالکل پسند نہ تھا۔ اس کی چھٹیاں ختم ہوئیں تو زندگی اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی۔ نائلہ کو دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔ اس لیے فرہاد نے ایک بار پھر میرے ساتھ ناشتا کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں ریٹائر ہو چکی تھی اس لیے پوری طرح گھر پر توجہ دینا شروع کر دی۔ میں نائلہ کو یہ احساس دلانا چاہ رہی تھی کہ اس گھر کی اصل مالکن میں ہوں اور اس کی حیثیت رعایا جیسی ہے میں نے اسے گھر کے کاموں سے دور رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کر رہی تھی۔

ایک دن ہم تینوں لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے کہ فرہاد بولا۔ ''مما مجھے کمپنی سے تفریحی الاؤنس کی مد میں کچھ پیسے ملے ہیں۔ لہٰذا ارادہ ہے کہ پندرہ دنوں کے لیے شمالی علاقوں کی سیر کو چلے جائیں۔ مما آپ بتائیں کہ مری سوات ٹھیک رہے گا یا کاغان اور ناران۔''

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی۔ نائلہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تنتناتے ہوئے بولی۔ ''آنٹی سے کیا پوچھ رہے ہو کیا تمہاری اپنی کوئی سوچ نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ تم ساری عمر ماماز بوائے ہی بنے رہو گے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ماں کی طرف دیکھو گے۔''

فرہاد کو بھی غصہ آ گیا اور وہ بولا۔ ''اور تم جو سارا سارا دن اپنی ماں سے ٹیلی فون پر بات کر کے انہیں منٹ منٹ کی رپورٹ دیتی ہو اس وقت کچھ نہیں ہوتا۔''

''باتیں ہی کرتی ہوں۔ ان سے مشورہ نہیں مانگتی اور نہ ہی وہ ہمارے گھر کے معاملات میں دخل اندازی کرتی ہیں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ تم انہی کا پڑھایا ہوا سبق دہرا رہی ہو۔''

''کیا...... کیا کہا تم نے؟'' وہ بھڑکتے ہوئے بولی۔

''تم میری ماں پر الزام لگا رہے ہو؟''

''یہ الزام نہیں حقیقت ہے۔ وہ سارا دن نہ جانے تمہیں کیا پٹی پڑھاتی رہتی ہیں میں نے خود اپنے کانوں سے تمہاری باتیں سنی ہیں۔ اگر میں نے اپنی ماں سے ایک بات پوچھ لی تو تمہارے آگ لگ گئی۔''

فرہاد کا جارحانہ انداز دیکھ کر میں سہم گئی اور رفع شر کی خاطر بولی۔ ''بھئی تم لوگ میری وجہ سے اپنی تفریح کا مزا کرکرا مت کرو۔ میں کیا بتاؤں کہ تمہیں مری سوات یا کاغان میں سے کہاں جانا چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی بیوی سے مشورہ کرو کیونکہ وہی تمہاری مشیر خاص ہے۔''

''لگتا ہے آپ ناراض ہو گئیں لیکن مجھے ان باتوں کی پروا نہیں ہے۔ میں تو بچپن سے ہی ماماز بوائے کا طعنہ سنتا آ رہا ہوں۔ آج بیوی کی زبان سے بھی سن لیا۔ نائلہ مجھے ماماز بوائے ہونے پر فخر ہے۔ مما کے مشوروں اور رہنمائی کی بدولت ہی آج اس مقام تک پہنچا ہوں اور اب بھی ضرورت پڑنے پر ان سے مشورہ کرتا رہوں گا چاہے تم مجھے بار بار ماماز بوائے کہو۔''

''دیکھو نائلہ۔'' میں نے ملائمت سے کہا۔ ''اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے۔ مانتی ہوں کہ میں نے ضرورت سے زیادہ فرہاد کو اپنے ساتھ جوڑے رکھا لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ مجھے بیک وقت ماں اور باپ دونوں کا فرض انجام دینا تھا۔ ڈرتی تھی کہ اگر اس پر کڑی نظر نہ رکھی تو یہ بگڑ جائے گا۔ اس لیے اس کا سایہ بن کر رہ گئی۔ ہر وقت اس کے ساتھ رہتی کہ یہ کہیں کسی کے بہکاوے میں نہ آ جائے رفتہ رفتہ یہ میرا عادی ہوتا گیا۔ واقعی اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔ جو پہناتی وہ پہن لیتا، جو کھلاتی وہ کھا لیتا۔ کالج میں آیا تو اس کے لیے سبجیکٹ کا انتخاب بھی میں نے کیا اور اگر تم درمیان میں نہ آتیں تو شاید اس کی شادی بھی میں اپنی مرضی سے کرتی۔''

''گویا اس شادی میں آپ کی مرضی شامل نہیں تھی؟'' نائلہ تڑخ کر بولی۔

''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ مجھے تو اتنی مہلت ہی نہیں ملی۔ اس سے پہلے ہی فرہاد نے تم سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کر دی اور ظاہر ہے کہ مجھے اپنے بیٹے کی خوشی عزیز تھی اس لیے تمہارا رشتہ مانگنے چلی گئی۔''

''ہو سکتا ہے کہ آپ کی باتیں درست ہوں لیکن اب فرہاد کو ماماز بوائے کے خول سے باہر آ جانا چاہیے۔ شادی کے بعد انسان کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ آپ نے فرہاد کے ساتھ جو کچھ کیا وہ احسان نہیں فرض تھا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ ساری عمر اس کا خراج ادا کرتے رہیں۔ اب انہیں اپنے فیصلے خود کرنا چاہئیں۔ مجھے بڑی کوفت ہوتی ہے جب یہ ہر بات میں مما سے پوچھ لو مما سے پوچھ لو کی رٹ لگاتے ہیں۔''

''واقعی اب اسے مما کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

میں تو خود یہی چاہتی ہوں کہ تم دونوں اپنے فیصلے خود کرو اور مجھے اس فرض سے سبکدوش کردو۔ ویسے زبان سے کہنا آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ ہر ماں یہی چاہتی ہے کہ مرتے دم تک بیٹے پر اس کا تسلط قائم رہے۔ ساس اور بہو کے درمیان جھگڑے کی اصل بنیاد ہی یہ ہے۔ جس طرح دو ملاؤں میں مرغی حرام ہوتی ہے۔ اسی طرح ماں اور بیوی کے بیچ مرد گھن چکر بن جاتا ہے اس کا اندازہ تمہیں اس وقت ہوگا جب خود ایک بیٹے کی ماں بن جاؤ گی۔"

"میں تو کبھی اپنے بیٹے کو ماماز بوائے نہیں بناؤں گی۔" وہ نخوت سے بولی۔

"یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلے گا۔"

اس کے بعد بھی کئی واقعات ہوئے۔ میری جگہ کوئی کمزور عورت ہوتی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایدھی سینٹر میں پناہ لے لیتی لیکن میں بڑے مضبوط اعصاب کی واقع ہوئی تھی۔ شکست ماننا میری سرشت میں نہیں تھا۔ میں نے ساری عمر زمانے کے گرم وسرد کا مقابلہ کیا نائلہ تو میرے سامنے طفل مکتب تھی۔ اسے راہ راست پر لانا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ ہر عورت کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ اس کا اپنا گھر ہو جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق سجائے لیکن سردست اس خواہش کا پورا ہونا ممکن نہیں تھا۔ فرہاد کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ علیحدہ مکان لے سکتا اور اسے ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ یہ مکان بھی اسی کا تھا تاہم میری زندگی میں وہ اس پر اپنا حق ملکیت نہیں جتا سکتا تھا۔ گھر کی مالکن میں تھی اور میں نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے۔ نائلہ کو میں نے ایک کمرے تک محدود کردیا تھا۔ وہ ایک مہمان کی طرح اس گھر میں رہ رہی تھی اور اسے اتنا اختیار بھی نہیں تھا کہ وہ ایک کرسی بھی ادھر سے ادھر کردے۔

ایک دن ناہید اپنی بیٹی سے ملنے آئی۔ دونوں ماں بیٹی کافی دیر تک کمرے میں کھسر پھسر کرتی رہیں۔ میری عادت ٹوہ لینے کی نہیں تھی لیکن اتفاق سے میرا گزر اس کمرے کے پاس سے ہوا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے میں ہونے والی باتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اچانک میں اپنا نام سن کر ٹھٹک گئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔ ناہید کہہ رہی تھی۔

"تمہاری ساس کو تو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

نص

آشکارا، کھول کھول کر بیان کرنا۔ وہ قرآنی آیات جو بالکل ظاہر ہیں، جمع نصوص۔ اس کا اطلاق قرآن وحدیث دونوں پر ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ احکام جو قرآن یا حدیث میں ہیں نصی کہلاتے ہیں۔

مرسلہ: نوروز خان، شیخوپورہ

جبرائیل

ایک جلیل القدر فرشتے کا نام جو انبیا کی طرف وحی لاتا تھا قرآن میں حضرت جبرائیلؑ کا نام تین جگہوں پر آیا ہے۔ دوسرے مقامات پر فقط اشارے ملتے ہیں۔ روایت ہے کہ شب معراج میں حضرت جبرائیلؑ براق لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے تھے اور مقام خاص تک ہمرکاب رہے۔ قدیم افسانوی ادب، انجیل اور توریت میں بھی آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مرسلہ: زرافشاں پروین۔ حیدرآباد

وہ اول درجے کی کنجوس عورت ہیں لیکن تمہیں تو ان باتوں کا خیال ہونا چاہیے۔ دیکھو تو گھر کی کیا حالت ہوگئی ہے۔ کئی سالوں سے نیا رنگ روغن نہیں ہوا سب چیزیں پرانی اور بوسیدہ ہوگئی ہیں۔ ٹی وی، فریج، قالین، صوفے، پردے سب کو بدلنے کی ضرورت ہے گھر کیا ہے لگتا ہے کسی میوزیم میں آگئے ہیں۔"

"امی میں کیا کروں۔ میری اس گھر میں حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک مہمان کی طرح رہ رہی ہوں سب کچھ تو آنٹی کے ہاتھ میں ہے۔ ان کی مرضی کے بغیر تو اس گھر میں ایک گملا بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوسکتا۔"

"فرہاد سے کہو۔ اسے احساس دلاؤ کہ گھر کی حالت بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی ماں کا بہت لاڈلا اور چہیتا بیٹا ہے اور ماں کو نئی چیزیں خریدنے پر قائل کرسکتا ہے۔"

"ہونہہ! ماماز بوائے۔" نائلہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ کیا بات کریں گے۔ ان کی تو ماں کے سامنے زبان نہیں کھلتی۔ میں نے گاڑی بدلنے کی بات کی تھی تو مما سے کہو یہ انہی کی گاڑی ہے۔ مجھے تو بڑی شرم آتی ہے اس پچیس سالہ پرانی گاڑی میں کہیں جاتے ہوئے۔ لوگ بھی کیا کہتے ہوں گے۔"

"کیا فرہاد کی اتنی حیثیت بھی نہیں کہ وہ دوسری گاڑی

جنت البقیع

جنت البقیع مدینہ منورہ کا معروف قبرستان ہے یہ قبرستان مسجد نبوی سے مشرق کی سمت واقع ہے۔ پہلے زمانے میں یہاں تک پہنچنے کے لیے سادات کی آبادی کی بہت سی گلیوں سے گزرنا پڑتا تھا لیکن اب حکومت نے مسجد نبوی اور بقیع کے درمیان سیدھی، کھلی پختہ سڑک بنادی ہے۔ جنت البقیع کا قبرستان زمانہ جاہلیت سے اہل مدینہ کا قبرستان چلا آرہا ہے۔ عثمانیوں کے دور میں یہاں بھی بہت سی پختہ قبریں اور ان پر خوب صورت قبے بنے ہوئے تھے لیکن سعودی حضرات نے شریف حسین کو شکست دے کر جب مدینہ منورہ پر قبضہ کیا تو یہاں کے اکثر قبے گرادیے اور قبریں توڑ دیں۔ اس قبرستان کی فضیلت میں کئی احادیث مروی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ ''جو شخص مدینے میں مرے اور بقیع میں دفن کیا جائے وہ میری شفاعت سے ممتاز ہوگا۔'' ایک اور حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے آنحضورؐ اپنی قبرِ مبارک سے اٹھیں گے ان کے بعد اہلِ بقیع اور پھر اہل مکہ اٹھیں گے۔ حدیث میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ دو مقبرے ایسے ہیں جن کی روشنی آسمان پر ایسی ہے جیسی کہ زمین پر چاند اور سورج۔ ایک تو مقبرہ بقیع ہے اور دوسرا مقبرہ عقلان۔ اس قبرستان میں بے شمار صحابی مدفون ہیں۔ مسلمانوں میں سے جنت البقیع میں سب سے پہلے دفن ہونے والوں میں حضرت عثمان بن مظعون ہیں ان کے بعد سیدنا ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی قبرستان میں دفن کیے گئے۔ جب جنت البقیع میں زیارت کے لیے جائیں تو

خرید سکے۔'' ناہید نے چڑ کر کہا۔

''اس کے لیے بھی مما سے پوچھنا پڑے گا۔'' نائلہ نے چڑ کر کہا۔

''بس تو بیٹھی رہو اسی طرح بے یارو مددگار، مجھے اگر پتا ہوتا کہ فرہاد اس بری طرح ماں کے زیرِ اثر ہے تو کبھی اس کے ساتھ تمہاری شادی نہیں کرتی۔ میں نے ایسا کوئی مرد نہیں دیکھا جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔''

''اب کیا ہو سکتا ہے۔'' نائلہ بے بسی سے بولی۔

''میں تو اس دن کا انتظار کررہی ہوں۔ جب اس گھر پر میرا راج ہوگا۔''

گویا دوسرے لفظوں میں وہ میرے مرنے کا انتظار کررہی تھی۔ فرہاد کو تو مجھ سے چھین نہ سکی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلے۔ اب مجھے اپنے تحفظ کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ نائلہ کو آہستہ آہستہ گھر کے معاملات میں شریک کیا جائے تاکہ اقتدار میں حصہ ملنے کے بعد وہ مطمئن ہو جائے اور میرے مرنے کا انتظار نہ کرے چنانچہ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد میں نے رات کے کھانے پر نائلہ کی موجودگی میں فرہاد سے کہا۔

''میرے خیال میں تمہیں دوسری گاڑی لے لینی چاہیے۔ میری کار تو ویسے بھی بہت پرانی ہو چکی ہے۔ اسے میں اپنے استعمال میں رکھوں گی۔''

فرہاد نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''مما دوسری گاڑی کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو بائیک پر دفتر جاتا ہوں اور کہیں آنے جانے کے لیے یہ گاڑی کافی ہے۔''

''میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی کار سے دفتر جاؤ۔ شہر کا ٹریفک بہت خراب ہوگیا ہے۔ بائیک پر اتنی دور کا سفر ٹھیک نہیں۔''

''لیکن مما دوسری گاڑی کے لیے تو بہت پیسے چاہئیں۔ میں شاید افورڈ نہ کرسکوں۔''

''کوئی بات نہیں اگر کمی ہوگی تو میں دے دوں گی لیکن یہ کام اسی ہفتے ہوجانا چاہیے۔''

شکر ہے کہ فرہاد نے یہ نہیں پوچھا کہ مما کون سے میک اور ماڈل کی گاڑی خریدوں ورنہ نائلہ کو پتنگے لگ جاتے۔ اس وقت تو نئی گاڑی کا سن کر وہ کافی خوش نظر آرہی تھی۔ پھر میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''نائلہ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اپنے کمرے سے باہر نکلو اور گھر کے معاملات میں حصہ لینا شروع کردو تاکہ تمہیں بھی معلوم ہو کہ گھر کس طرح چلایا جاتا ہے۔''

''آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' اس نے تڑخ کر جواب دیا۔

''میں یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہوں اور اب

سنت یہ ہے کہ بقیع کے دروازے پر پہنچ کر السلام علیکم یا اہل القبور کہے اور۔۔ دعا پڑھیں۔ نیز دعا سے پہلے یا بعد گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب اہلِ مقبرہ کی ارواح کو ہدیہ کرے۔ سلام کی نیت اور مقصود یہ ہونا چاہیے کہ جمیع آل و اصحاب اور مومنین جو اس قبرستان میں آرام فرما ہیں انہیں ثواب پہنچے پھر اپنا منہ آنحضورؐ کی پھوپی کی قبر کی جانب کرے جو بقیع کے دروازے کے متصل بائیں جانب مدفون ہیں اور زیارت ختم بھی انہیں پر کرنی چاہیے۔ اس بارے میں بعض علما کا اختلاف ہے کہ کس قبر سے زیارت کی ابتدا کرے۔ اہل گروہ کے نزدیک حضرت عباس اور ائمہ اہلِ بیت سے جو لوگ آپ کے قبہ میں مدفون ہیں ان سے ابتدا کرے کیونکہ یہ قبہ قریب ہے اور یہاں سے گزر کر دوسروں کی زیارت کی طرف متوجہ ہونا ایک قسم کی بے ادبی ہے نیز وہ گروہ اپنی دلیل میں یہ بات بھی کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں اہلِ مدینہ کا یہی عمل تھا۔ دوسرے گروہ کے نزدیک زیارت کی ابتدا حضرت ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کرے کیونکہ ان کے ساتھ ان کی بہنیں مدفون ہیں اور چونکہ یہ آپؐ کے جزو شریف اور آپ کے ٹکڑے ہیں اس لے دوسروں کو ان پر مقدم کرنا مناسب نہیں۔ بعض علما کے نزدیک حضرت عثمانؓ بن عفان سے زیارت کی ابتدا کرے اس لیے کہ آپ اہلِ بقیع میں افضل ہیں۔ اسی طرح بعض علمانے اس سے مختلف آرا کا اظہار بھی کیا ہے۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلوپیڈیا صفحہ نمبر 669

مرسلہ: رامش عطاری، کراچی

مجھے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ میں تم سے یہ نہیں کہہ رہی کہ چولہا ہانڈی کرو۔ کپڑے اور برتن دھوؤ یا فرش پر پونچھا لگاؤ۔ ان کاموں کے لیے آیا اور ماسی موجود ہیں۔ گھر کا سودا میں خود لے کر آتی ہوں۔ تمہیں صرف میرے ساتھ رہنا ہے۔ یقین جانو بھی بھی آدھا دن تو صرف یہ سوچنے میں گزر جاتا ہے کہ آج کیا پکایا جائے گا۔“

”مما ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ فرہاد بولا۔ ”واقعی! انہوں نے بہت کام کرلیا۔ اب تمہارا فرض ہے کہ ان کا ہاتھ بٹاؤ۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے۔ آنٹی جو کہیں گی میں وہی کروں گی۔“

میرا پہلا داؤ کامیاب رہا۔ میں نے گاڑی کا جھانسا دے کر نائلہ کو اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ وہ فرہاد کو مجھ سے چھیننا چاہ رہی تھی اور میں نے اسے ہی ماماز گرل بنانے کے منصوبے پر کام شروع کردیا تھا۔ تین چار دن بعد ہی فرہاد نے مجھے بتایا کہ ایک کار ڈیلر نے اس کی گنجائش کے مطابق تین چار گاڑیاں دکھائی ہیں اور اب میں اس کے ساتھ جاکر کوئی ایک گاڑی فائنل کرلوں۔

”میں جاکر کیا کروں گی۔ تم نائلہ کو ساتھ لے جاؤ۔ یہ اپنی پسند کے مطابق گاڑی منتخب کرے گی۔“

”آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ نائلہ خوشی سے چہکتے ہوئے بولی۔ ”میں اپنی پسند کی گاڑی خریدوں گی۔“

یہ بھی میری ایک چال تھی۔ پرانی گاڑیوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا اگر کل کو اس میں کوئی بڑا کام نکل آیا تو میں ہی قصوروار ٹھہرائی جاؤں گی۔ اس لیے میں نے نائلہ کو آگے کردیا تاکہ ساری ذمے داری اس پر آجائے۔

دوسرے دن نائلہ نے فرہاد کے ساتھ جاکر گاڑی پسند کرلی۔ فرہاد نے مجھ سے ایک پیسا بھی نہیں لیا اور پوری پیمنٹ خود ہی کی۔ یہ سلیٹی رنگ کی کلٹس تھی۔ نائلہ گاڑی لے کر آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ وہ مٹھائی بھی لے کر آئی تھی۔ فرہاد نے کہا۔ ”مما چلیں میں آپ کو گاڑی میں ایک چکر دے دوں۔“ حالانکہ میں نے تہیہ کررکھا تھا کہ کبھی ان کے ساتھ گاڑی میں نہیں بیٹھوں گی لیکن اس خوشی کے موقع پر فرہاد کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تیار ہوگئی۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولا تو نائلہ میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

”نہیں آنٹی آپ آگے بیٹھیں۔ میں پیچھے بیٹھ جاتی ہوں۔“

میں نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔ یہ کایا پلٹ کیسے ہوگئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ حسنِ سلوک سے دلوں پر کس طرح حکومت کی جاتی ہے۔ میں نے صرف فرہاد کو گاڑی خریدنے کی اجازت دی تھی اور نائلہ کو اپنے ساتھ شریک

اقتدار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے حق سے دستبردار ہوگئی اور مجھے فرنٹ سیٹ پر بٹھا دیا۔

دو تین ہفتے گزر جانے کے بعد میں نے نائلہ سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں گھر کی سیٹنگ تبدیل کر لینی چاہیے۔ سب چیزیں پرانی ہو چکی ہیں اور رنگ روغن کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے۔ تم اپنی گنجائش اور پسند کے مطابق ایک ایک کر کے چیزیں تبدیل کر سکتی ہو۔ میں سمجھتی ہوں کہ سب سے پہلے نیا رنگ ہونا چاہیے۔“

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ میں نے اس کے دل کی بات جو کہہ دی تھی اور ساتھ ہی اسے یہ اختیار بھی دے دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق تبدیلیاں لا سکتی ہے۔ اس میں میرا کچھ نہیں بگڑ رہا تھا۔ وہ بااختیار بننے کے شوق میں اپنے میاں کی کمائی جس طرح چاہے خرچ کرے۔

اس نے یہی بات فرہاد سے کہی تو وہ حسب عادت بولا۔ ”مما سے پوچھ لو۔“ اس پر نائلہ چڑ گئی اور جھلاتے ہوئے بولی۔ ”یہ انہی کا مشورہ ہے تم کل ہی کسی اچھے سے پینٹر کو بلاؤ تاکہ میں اسے کلر اسکیم سمجھا سکوں۔“

دوسرے دن سے ہی گھر میں تبدیلیوں کا آغاز ہو گیا۔ پہلے رنگ روغن ہوا۔ پھر ایک ایک کر کے قالین، صوفے اور پردے تبدیل ہوئے۔ پھر ٹی وی اور فریج کی باری آئی۔ جس دن گھر میں نیا ایل ای ڈی لگا۔ اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فرہاد کی اتنی تنخواہ تھی کہ وہ ہر مہینے ایک چیز خرید سکتا تھا۔ پھر اس کا بینک بیلنس بھی اچھا خاصا تھا۔ کیونکہ اس کی پوری تنخواہ تو بینک میں ہی جا رہی تھی۔ گھر کا خرچ، ملازموں کی تنخواہ اور بلوں کی ادائیگی اب بھی میرے ہی ذمے تھی۔ بینک سے ملنے والے منافع اور پنشن کے ذریعے میرے سارے اخراجات بخوبی پورے ہو رہے تھے۔

انہی دنوں مجھے خوش خبری ملی کہ نائلہ اُمید سے ہے اور چند ماہ بعد اس نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا۔ مجھے لگا کہ دوسرا فرہاد اس دنیا میں آگیا ہے۔ وہ ہو بہو فرہاد جیسا تھا۔ اس کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو فرہاد نے اپنا روایتی جملہ دہرایا۔ ”مما آپ بتائیں۔“

مجھے غصہ آگیا اور بولی۔ ”تم بچے کا نام بھی نہیں رکھ سکتے۔ تم دونوں مل کر ہی کوئی نام تجویز کر لو۔“

بہت سوچ بچار کے بعد اس کا نام فرجاد رکھا گیا۔ نائلہ اتنی خوش تھی جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔ وہ اس کی جان سے زیادہ حفاظت کر رہی تھی کہ کہیں کوئی اس سے یہ دولت چھین نہ لے۔ وہ شروع دن سے ہی بچے پر پوری طرح قابض ہو گئی تھی۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ بچے کو گود میں لوں۔ جب بھی آیا کے ذریعے بچے کو اپنے پاس بلاتی تو چند منٹ بعد ہی نائلہ کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے ساتھ لے جاتی وہ چوبیس گھنٹے اسے اپنے پاس رکھتی اور کسی کو اس کے قریب نہ آنے دیتی۔ جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو اسے اسکول چھوڑنے جاتی اور چھٹی ہونے پر خود ہی لے آتی۔ اس کام کے لیے وہ میری گاڑی استعمال کر رہی تھی۔ فرہاد نے بہت کہا کہ وین لگا لو لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ اس کے طور طریقے دیکھ کر مجھے اپنا وقت یاد آ گیا لیکن وہ مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ فرجاد کی پوری ذمے داری اس نے لے رکھی تھی۔ اسے کیا کھانا ہے، کیا پہننا ہے، کس اسکول میں پڑھنا ہے، کب سونا ہے، کب اٹھنا ہے، سب کچھ وہ خود ہی طے کرتی تھی۔ اسے اسکول میں کسی کے ساتھ کھیلنے یا کسی کو دوست بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے تو پھر بھی فرہاد کو گراؤنڈ میں کھیلنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اس معاملے میں وہ مجھ سے بھی زیادہ سخت نکلی اور اس نے فرجاد کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے پہلی بار اس کے معاملے میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تو بچے کی شخصیت بالکل دب کر رہ جائے گی اگر تم اسے اسی طرح اپنے اشاروں پر چلاتی رہیں تو یہ بھی فرہاد کی طرح ماماز بوائے بن جائے گا۔“

”میں بھی یہی چاہتی ہوں۔“ اس نے ننھے فرجاد کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

شمارہ جنوری 2016ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش......آپ کا انتخاب

☆ اول: چھوٹا سا کام......رابعہ (لاہور)

☆ دوم: خانہ خالی......فیصل (سیالکوٹ)

☆ سوم: خواب یا سچائی......ندیم انصاری (کراچی)

پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے فیصلے آپ ہی نے کیے ہیں۔ ہم آپ کی رائے کا احترام کرتے ہیں